شیرازہ

Sheeraza Urdu
JAWAHAR LAL Nehru NO.

شیرازہ

دوماہی   سرینگر

جواہر لال نہرو نمبر

جولائی ۱۹۶۴ء

جلد ۳   شمارہ ۴

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

طابع و ناشر : سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر
مطبع : کوہ نور پریس، لال کنواں دہلی

سرورق
جواہر لال نہرو
عمل : جی، آر سنتوش

قیمت سالانہ : دس روپے
فی شمارہ : دو روپے
جواہر لال نہرو نمبر : تین روپے

"شیرازہ" سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

محمد یوسف ٹینگ ایڈیٹر "شیرازہ"
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ترتیب



ایک کشمیری لڑکی جواہر لال نہرو کو پھولوں کی سوغات پیش کر رہی ہے

حرفِ آغاز

جواہر لال نہرو نمبر پیشِ خدمت ہے۔

جواہر لال نہرو کی زندگی ایک پوری تاریخ تھی۔ اُن کی موت ایک دَور کا خاتمہ ہے۔ ہماری قومی زندگی کے ایک ایک شعبے پر اُن کے افکار، اُن کی شخصیت اور اُن کے کارناموں کی ایسی گہری چھاپ ہے کہ اس کو الگ کرکے آج کے ہندوستان کا کوئی تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جب جواہر لال نہرو کی موت کی خبر ملی تو اکادمی نے بھی "شیرازہ" کا شائع ہونے والا شمارہ اُن کی یاد میں وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس "محیطِ بےکراں" کو "شیرازہ" کے محدود صفحات کی "تنگنائے" میں سمونے کی کوشش کس قدر جگر کاوی اور جگرداری کا کام ہے۔ اُن کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش تو ایک طرف چھوڑیئے، کشمیر سے اُن کا جو گہرا تعلق رہا ہے اور اپنی ماتر بھومی کے نقوش میں جس انداز سے اُنھوں نے رنگ بھرا ہے اُس کی تصویر کشی بھی ایک بہت بڑی تاریخی دستاویز کی صورت میں سامنے آ سکتی ہے۔ جب ہم نے نہرو جی کے احباب اور اُن کے جاننے پہچاننے والوں سے تاثرات قلم بند کرنے کی گذارش کی تو اکثر صورتوں میں ہمیں یہی جواب مِلا کہ ؏

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

ابھی ساری قوم اس صدمۂ جانکاہ سے سنبھلنے نہیں پائی ہے۔ اُن کے احباب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ آہستہ آہستہ جب وقت کا پُر اسرار مرہم زخموں کو مندمل کرتا جائے گا، ذہن سنبھل جائیں گے تو یہ دل فریب کہانی منظرِ عام پر آ جائے گی۔ لیکن ہم نے اپنی کوتاہیوں کے باوجود یہ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے

زیرِ نظر شمارے میں نہرو جی کی ذاتی زندگی کے بارے میں مضامین کی کمی نظر آئے گی۔ لیکن میری ناچیز رائے میں یہ کوئی اتنی بڑی کوتاہی نہیں ہے۔ کیونکہ جواہر لال نہرو کی ذاتی زندگی خلوت تک محدود نہیں تھی۔ وہ اُن معدودے چند محبوبِ روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کی خلوت میں جلوت کی رعنائی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ کروڑوں دیش واسیوں کی نگاہوں کے سامنے دن رات کا اکثر حصہ بسر کرتے تھے۔ وہ لوگوں میں بیٹھ کر سوچتے تھے۔ برسرِ عام غصے ہوجاتے تھے۔ کھلے بندوں اپنی طبیعت کی شفقت اور مروّت کے دریا بہادیتے تھے۔ عوام کی نگاہوں کے سامنے غم و الم کی لکیریں اُن کے چہرے پر نمودار ہوجاتی تھیں اور اُن کے سامنے اُن کے چہرے پر مُسکراہٹ کی کرنیں ناچتی تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں اپنی قوم کے ذہن اور رُوح سے رابطہ پیدا کرکے اُن ہی میں سما گئے تھے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ نہرو جی کی عظیم شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے۔ اِس غرض کے لئے بعض مضامین ہمیں انگریزی میں دستیاب ہوئے۔ اسی لئے اُن کا ترجمہ دیا جارہا ہے تصویروں کے بارے میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ زیادہ تر اُنہیں کشمیر کے پس منظر میں ہی پیش کیا جائے۔ ہم ان تصویروں کی فراہمی کے لئے حکومت کشمیر کے محکمہ اطلاعات اور مرکزی سرکار کے پریس انفارمیشن بیورو کے شکر گذار ہیں۔

یہ نمبر کسی حیثیت سے بسوط اور مکمل نہیں کہلایا جاسکتا۔ جس ہستی کو ان صفحات میں پیش کیا جانا مقصود ہے۔ اُس کی تصویر کشی کے لئے انسائیکلو پیڈیا کی وُسعتیں اصل مقام ہیں۔ لیکن ان صفحات میں اس عظیم آدمی کے چند رواں دواں نقوش نظر آسکتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہم صرف یہ توقع رکھیں گے کہ ان نقوش کی رعنائی اور زیبائی کا مشاہدہ کرکے بہت سارے قارئین کو غالب کا یہ شعر یاد آئے گا ؎

دیکھو تو دِل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی!

(محمد یُوسف ٹینگ)

(ڈاکٹر) کرن سنگھ

جواہر لال نہرو —— ایک چراغ۔ ایک نشان

آج قومی ماتم کے دن ختم ہو رہے ہیں اور قوم پھر آگے منزل کی طرف گامزن ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ بھارت تاریخ کی ابتدا سے ثابت قدم رہا ہے اور یہ ضروری ہے کہ ملک ترقی اور خوش حالی کی طرف آگے قدم بڑھائے۔ تاہم اب ہمارے دلوں میں ایک خلا رہے گا۔ کیونکہ جواہر لال نہرو ہم سے رخصت ہوئے ہیں۔ اب ہم رہنمائی اور فیضان کے لئے ان سے رجوع کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اب ہم ان کی روشن اور نورانی شخصیت سے ملاقی نہیں ہو سکتے۔ اب ہم ان کی جانی پہچانی اور انتہائی محبوب صورت کو اپنے درمیان کشمیر کی اس خوبصورت وادی میں نہیں دیکھ پائیں گے۔ یہیں سے ان کے آباد اجداد صدیوں پیشتر نقل وطن کر کے گئے تھے۔ اس ریاست میں ان کو ہمارے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا۔ اور جب بھی ممکن ہوتا وہ یہاں کے پہاڑی مقامات پر، جن سے انہیں بے حد وابستگی تھی، کچھ دن گزارنے کی کوشش کرتے اور بشاش اور تازہ دم ہو کر واپس دہلی جاتے۔ اس بزرگ اور نیک آدمی کی یاد جو ایک ساتھ ایک ممتاز لیڈر اور جذبۂ انسانیت سے سرشار حیثیت کا مالک تھا، ہمارے قیمتی سرمایہ کا ایک جزو بن کر رہے گی۔

پچھلے تیرہ دنوں میں قومی ماتم اور رنج و غم کے غیر معمولی منظر دیکھنے میں آئے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ تھی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو درد سے آزاد تھا۔ جواہر لال نہرو کے پھول ملک کے طول و عرض میں بکھیر دئے گئے ہیں اور تمام مشہور ندیاں، جو ہمارے ملک کو سیراب کرتی ہیں، ان کے پھولوں سے پوتر بنا دی گئی ہیں۔ ان کی یاد میں بہت سی یادگاریں تعمیر کی جائیں گی لیکن جواہر لال کی سچی یادگار صرف وہی ہوگی جو ہم اپنے دلوں میں بنائیں گے۔ یعنی اُن آدرشوں کے لئے اپنی جان نئے سرے سے وقف کریں جن کے لئے وہ زندگی بسر کر گئے اور سرگرم عمل رہے اور ان کے خوابوں کے بھارت کی بنا ڈالنے کے عزم پر مہر توثیق ثبت کریں۔

وہ آدرش کیا تھے جن کو حاصل کرنے کے لئے وہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک نہایت انتھک

کوششوں سے کام کرتے رہے؟ میرے خیال میں ان کے عام فلسفہ کے نمایاں پہلو سائنس اور ٹیکنالوجی پر مبنی اور اشتراکی اصولوں، سیکولرازم اور بین الاقوامی اتحاد سے بھرپور قومی سالمیت، پارلیمانی جمہوریت، معاشرتی بے نیازی اور اقتصادی شعور تھے۔

اس قوم کی یک جہتی جو کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے آسام تک پھیلی ہوئی ہے، ایک آدرش تھا جس کے لئے پنڈت جی مسلسل کوشاں رہے۔ وہ ہمیشہ ایسے رُجحانات پر، جن کا مطلب یہ ہو کہ زندگی کی کئی صورتیں مساوی حصوں میں بٹ کر الگ الگ تعداد میں بڑھ جائیں اور محدود علاقہ بندیاں، جن سے بھارت کی یک جہتی کو خطرہ لاحق تھا، افسوس ظاہر کرتے تھے۔ وہ کبھی اس بات کا اظہار کرنے سے تنگ نہ آتے تھے کہ قوم کی محبت کو دوسری تمام وفاشعاریوں سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ ہمیں یک جہتی کو برقرار رکھنے کی بہرحال کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہماری یک جہتی ہی میں ہماری طاقت پنہاں ہے اور یہی ہماری آیندہ عظمت کی ضامن ہے۔ کتنی ہی پیشین گوئیاں سننے میں آئیں کہ ان کے گزر جانے کے بعد ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور یہ امر اُس سالمیت کو، جو آزادی کے زمانے سے جواہر لال کی قیادت میں عمل میں لائی گئی ہے اور لوگوں کا سیاسی بیداری اور ان کے آزاد اور متحد رہنے کے عزم کو خراج عقیدت ادا کر رہا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت ہی وہ طرزِ حکومت ہے جو ہمارے آئین کے مرتّب کرنے والوں نے، جن میں سورگیہ پنڈت جی خود پیش پیش تھے، کافی غور و خوض کے بعد مُلک کے لئے منتخب کیا۔ اس سے انفرادی آزادی و عظمت کی ناقابلِ تنسیخ وابستگی مقصود ہے اور گذشتہ سترہ برسوں میں، جن کے دوران پنڈت جی مُلک کے وزیرِ اعظم رہے، انہوں نے پارلیمانی حکومت کی تعمیر کو غیر معمولی طور پر مضبوط بنایا۔ وہ خود ایک بے عیب پارلیمانی ماہر کی حیثیت سے جمہوری روایات کے لئے جو بے حد احترام رکھتے تھے، اس نے بھارت میں جمہوریت کو اُستوار بنانے میں مدد دی۔ ان کے سرگباش ہونے کے چند دِن بعد تھوڑی دیر کے لئے مجھے پارلیمنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا جو اس وقت تک ان کی وفات کے ہوش رُبا صدمہ سے کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ اور لوک سبھا کی کارروائی بالکل معمول کے مطابق جاری تھی۔ یہ امر بجائے خود پارلیمانی جمہوریت کو قوّت بخشنے میں جواہر لال کے کارِ نمایاں کے لئے بہترین خراج عقیدت ہے۔

پنڈت جی سیاسی جمہوریت کو بجائے خود کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی دُور رس نظر ایسے سماجی انقلاب سے ہم آغوش تھی جس میں ذات پات کی تکلیف دِہ پابندیوں کو ہٹا دینا لازمی اور ہر فرد کے لئے ایک آزاد قوم کے آزاد شہری کی حیثیت سے ایک باعزّت مقام کا حاصل کرنا یقینی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پنڈت جی ہماری مملکت میں اُن تعصّبات کے خلاف، جن پر گہرا رنگ چڑھ گیا ہے، ان تھک کوششوں سے لڑتے رہے۔

انہوں نے ہریجنوں اور دوسرے پس ماندہ طبقوں اور اقوام کی اصلاح و ترقی کے لئے مہاتما گاندھی کے خوابوں کو عملی جامہ پہنایا۔ وہ ہمیشہ ناگوار اور حقیر سماجی امتیازات کے مٹائے جانے کی اہمیت پر بے حد زور دیتے رہے۔ خصوصاً مفلسوں اور ناداروں کی فلاح و بہبود کو وہ دل سے چاہتے تھے۔ اور جس بھارت کی تعمیر کے وہ خواہاں تھے وہ ان کی نظر میں ایسا ہونا چاہیئے تھا جس کا کوئی بچہ بھوکا یا اَن پڑھ نہ ہو۔ جہاں کسی عورت کو پوشش یا مکان کی کمی محسوس نہ ہو اور جہاں کوئی مرد بیکار نہ ہو۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پنڈت جی کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کے لئے کم از کم ایک اقتصادی انقلاب کی ضرورت تھی۔ ان کی رائے میں اس مسئلے کے ساتھ نپٹنے کے لئے یہ لازمی تھا کہ آج کل کی دُنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی خصوصی اہمیت سے آگاہی ہو۔ ان کا سائینسی اور تاریخی نقطۂ نگاہ قومی منصوبہ بندی میں ہمارے بے شمار اقتصادی مسائل کا جواب تلاش کرتا رہا۔ آزادی حاصل کرنے کے وقت سے انہوں نے منصوبہ بندی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے ہماری اقتصادی حیاتِ نو کی بُنیاد ڈالنے اور جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت عوام پر ذہن نشین کرنے میں مدد کی۔ وہ اشتراکیت کے بہترین اصولوں سے وابستہ رہے۔ یعنی یہ کہ معاشیاتی نظام اس طرح کارفرما ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ اور سماج کے کمزور طبقوں کو معاشی اعتبار سے نجات دلانے کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ پنڈت جی خود غیر معمولی طور پر ایک سائنس دان کے عقلیت پسند، جدید اور عملی و افادی طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی کے جامع نقطۂ نظر اور دُور بینی کا ایک مجموعہ تھے۔

سیکیولرازم ہمارے آئین کی بُنیادوں میں ہی جاری و ساری ہے اور یہ ان اصولوں میں سے ایک تھا جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو والہانہ انداز میں وقف کر رکھا تھا۔ مذہب کی بنا پر اذیت رسانی یا بیرتری ان کے نزدیک ایک لعنت تھی اور وہ اس معاملے میں کبھی کسی سے کوئی بھی رعایت برتنے میں ہرگز تیار نہ تھے۔ اس امر کا احساس رکھتے ہوئے کہ بھارت کثیر النسل اور کثیر المذہب باشندوں کی قوم کا وطن ہے، وہ ہمارے ملکی نظام کی غیر مذہبی بُنیادوں کو مستحکم بنانے کی بے حد اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن ان کا سیکیولرازم کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا محض مادّی افادیت کی بنا پر نہ تھا۔ انہیں اس بات کا پکّا یقین تھا کہ مذہب ایک انفرادی یا ذاتی معاملہ ہے اور حکومت کو کسی خاص مذہبی فرقے کی حمایت کرنے سے کلیتاً باز رہنا چاہیئے۔

آخر میں جو رول انہوں نے ادا کیا وہ ایک عظیم بین الاقوامی قائد کی حیثیت میں تھا۔ چونکہ وہ حد درجہ ہندوستان کے شیدائی تھے۔ ان کی نظر صرف ہماری قومی سرحدوں تک محدود نہ تھی بلکہ ایشیا اور افریقہ

کے از سرِ نو زندگی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لانے کے لئے ان سرحدوں سے پار ہو جاتی اور تمام نوعِ انسان سے ہم آغوش ہونے کے لئے وہاں سے بھی دُور نکل جاتی۔ پنڈت جی اپنے قرن کے لوگوں میں تقریباً ہر شخص کے مقابلے میں ایٹمی جنگ کی ہولناک امکانی قوّت سے بخوبی آشنا تھے۔ جب بھی دُنیا کے لئے ایٹمی جنگ کی عالم گیر بربادی کا شکار ہونے کا خطرہ پیدا ہوا۔ انہوں نے بار بار امن و آشتی کے لئے آواز بلند کی۔ اس طرح انہوں نے سرد جنگ کے شدائد کو کم کرنے میں نمایاں حصہ لیا جس کا دُنیا کو دوسری عالم گیر جنگ کے خاتمے پر سامنا ہو رہا تھا۔ وہ ہر جگہ کے پامال لوگوں کے زبردست اور بے باک حامی تھے اور نوآدیاتی راج سے آزادی حاصل کرنے میں ان کی حمایت نے ہم عصر تواریخ کی رفتار سے متعلق اعداد و شمار کا نقشہ پیش کرنے میں بہت کچھ کیا۔ ان کے خواب کی دُنیا ایک پُر امن دُنیا کا خواب تھی۔ جس میں تمام قومیں نسلِ انسانی کی حالت کو بہتر بنانے کے برترین عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں اور یہی وہ اعلیٰ پایہ کی مدبّرانہ نظر تھی جس نے ان کو اپنے ملک کے مقابلے میں دوسرے ممالک میں محبوب اور محترم بنا دیا۔

ان کے بلند آدرشوں میں سے یہ چند آدرش تھے جن کے لئے جواہر لال نہرو نے زندگی بسر کی اور جن کے لئے وہ کام کرتے رہے۔ آج وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی آتما زندہ ہے اور ان کی ہدایات برقرار ہیں تاکہ ہم ان پر عمل پیرا ہوں۔ اگر ہم ان کی یاد میں فقط زبانی ہمدردی کا اظہار کریں تو ہم ان کے ساتھ اتنی بے انصافی نہیں کریں گے جتنی کہ اپنے حق میں۔ ہمیں اس نئے تاریخی دَور کے آغاز میں صدقِ دلی سے ان آدرشوں کو اپنانا چاہیئے جن کا بیڑا جواہر لال نہرو نے اُٹھایا تھا۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ شری لال بہادر شاستری کی قیادت میں نئی حکومت قائم ہوئی ہے جو نہرو جی کی روایات کو جاری رکھنے اور ان کے نظریہ کی تکمیل کے وعدوں کی پابند ہے۔

آخر میں، میں اُن ہم وطنوں سے ایک خاص اپیل کرنا چاہتا ہوں جو میری طرح ہندوستانیوں کی اس پَود سے متعلق ہیں جس کو میں آزادی کے بعد آنے والی پَود کا نام دیتا ہوں۔ یعنی وہ پود، جو ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد بلوغت کو پہنچی۔ بالآخر ہماری اس عظیم قوم کی بہبُودی کی ذمّہ داری کا بوجھ ہمارے ہی کندھوں پر ہے۔ ہمیں ثابت کرنا چاہیئے کہ ہم پیش آنے والی ذمّہ داریوں کو سنبھالنے اور ان تابناک آدرشوں کی تکمیل کرنے کے قابل ہیں جن کے ساتھ ایک نام ہمیشہ کے لئے شریک رہے گا یعنی جواہر لال نہرو کا نام!

(ترجمہ از انگریزی: پروفیسر نند لال طالب)

(خواجہ) غلام محمد صادق
وزیر اعظم جموں و کشمیر

شری جواہر لال نہرو

جواہر لال نہرو نے ملک اور قوم کو دل کی گہرائیوں سے چاہا اور قوم نے ان کو اپنی بے پناہ محبت دی۔ موت محبت کا رشتہ ختم نہیں کر سکتی۔ موت نے جواہر لال کو ہم سے چھین لیا ہے۔ لیکن اُن کی محبت ایک ایسی چیز ہے جو موت ہم سے نہیں چھین سکتی۔ جواہر لال کی موت پر ہم آپ جس طرح روئے ہیں اور دُنیا جس طرح روئی ہے، اس طرح کسی اور کا غم نہیں منایا گیا ہے۔ رونا غم کا اظہار ہے، یہ ہم نے کیا۔ لیکن ابھی ہمیں جواہر لال سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنا باقی ہے۔ محبت اور عقیدت کا اظہار الفاظ اور آنسوؤں سے زیادہ کسی اور بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہمیں اپنے عمل سے یہ دکھانا ہوگا کہ ہم واقعی جواہر لال کی محبت کے اہل ہیں۔ جواہر لال ہمارے ہی نہیں، دُنیا کے لیڈر تھے۔ اُن سے عالمی امن نے اور محکوم قوموں کی آزادی کی جد و جہد نے تقویت حاصل کی۔ لیکن یہ وقت جواہر لال کی قومی اور بین الاقوامی خدمات پر تبصرہ کرنے کا نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ملک اور قوم کو جو کچھ دیکھنا چاہتے تھے اس میں جو کمی رہ گئی ہے اس کو ہم پورا کریں۔ جواہر لال نے قوم کو ایک قوم بنایا۔ سماج، سیاست اور معیشت کو نئی اور صالح بنیادوں پر استوار کرنا چاہا اور اس میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ زندگی ایک مسلسل عمل اور ایک مسلسل جد و جہد ہے۔ اس لئے کوئی منزل آخری نہیں ہوتی۔ جواہر لال ملک اور قوم کو آزادی، جمہوریت اور ترقی کی جس منزل تک لائے، ہم وہاں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ خود وہ بھی مطمئن نہیں تھے اور اس کو ہمارے سفر کی منزلِ مقصود نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہند کو اور بھی آگے لے جانا چاہتے تھے۔ جو راستہ اُنہوں نے اختیار کیا، وہ صحیح ہے اور ان کے اصول ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ ہمیں ان کے راستے پر چلنا ہوگا اور اُن کے اصولوں پر چلنا ہوگا۔

جواہر لال نئے ہندوستان اور نئی ہندوستانی قوم کے سب سے بڑے معمار ہیں۔ گاندھی جی نے ملک کو

کچھ اصول دئے اور بیداری پیدا کی اور تحریک آزادی کو آزادی کی منزل تک پہنچایا۔ جواہر لال نے آزادی کو عام آدمی کے لئے معنی دئے۔ جواہر لال کے تصوّر کا ہندوستان وہ ہے جس میں ایک آدمی بھی بھوکا ننگا اور بے سہارا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے نزدیک سیاسی جمہوریت اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک اقتصادی جمہوریت نہ ہو۔ یعنی ہر شخص کو معاشی انصاف، برابری اور مساوات میسّر نہ ہوں۔ یہ بات کافی نہیں ہے کہ سب کو برابر کے مواقع میسّر ہوں۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ دولت کی تقسیم میں جو نابرابری ہے وہ ختم ہو۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ممکن ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اُس کی ابتدا خود جواہر لال نہرو نے کی۔ یہ کام منصوبہ بندی کے تحت ترقی سے ہو سکتا ہے۔ پلاننگ کمیشن کے صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے جواہر لال نہرو نے اس عظیم کام کے لئے پروگرام مرتب کئے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہدایت دی۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی دُور رس نظروں نے جو پروگرام مرتب کیا ہے اُسے پورا کرنے سے فلاحی ریاست قائم ہو گی جو ہمارے عظیم آئین کے ہدایتی اصولوں میں سب سے اہم ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ ترقی کے جو منصوبے جواہر لال نے بنائے تھے، ہم اُن کو آگے لے جائیں۔ جواہر لال کا دِل وسیع تھا۔ اُن کی نظر وسیع تھی۔ اُن کا مشرب وسیع تھا اور وہ یہ خوبیاں اپنی قوم میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان، دُنیا کی سب سے بڑی غیر مذہبی جمہوریہ ہے، تو یہ اس وجہ سے کہ جواہر لال نے اس کو ایسا ہی چاہا۔ اُن کا سیکولرازم کا تصوّر نئے ہندوستان کی اُن روایات کی رُوح ہے جو قدیم بھی ہیں اور جدید بھی اور جن کی وجہ سے ہندوستان کو اقوامِ عالم میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہے۔ جواہر لال نے یہ بات بار بار کہی ہے کہ قوم اُسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس کے سامنے بڑے مقاصد ہوں اور بڑے مقاصد کے لئے صرف بڑے آدمی ہی کام کر سکتے ہیں۔ بڑے دولت اور طبقہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑے ان معنوں میں کہ ان کے خیال بڑے ہوں۔ ان کے دِل بڑے ہوں اور اُن کے ذہن بڑے ہوں۔ جن کے ذہن تنگ ہوں، دِل تنگ ہوں، خیال تنگ ہوں، وہ صرف چھوٹی باتیں سوچ سکتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ جو لوگ چھوٹی باتیں سوچیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں اُلجھے رہیں وہ مُلک اور قوم کے لئے کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ وہ تو مُلک اور قوم کو اپنی ہی طرح چھوٹا کر دیتے ہیں۔ حقیر کر دیتے ہیں۔ مذہب، فرقے ذات پات، زبان، ریاست، صوبے اور علاقے سے تعلق رکھنے والے جھگڑے مُلک اور قوم کو تنزّل کی طرف

لے جاتے ہیں۔ یہ تنگ نظری کی دلیلیں ہیں اور جواہر لال کے اصولوں کے سراسر خلاف ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم جواہر لال کی محبت کا دم بھرنے کے اہل اُسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہم ہر قسم کی تنگ نظری سے دُور رہیں اور ہمارے دامن پر جہاں بھی تنگ نظری کے دھبے پڑے ہیں اُنہیں دھو ڈالیں۔ کشمیر جواہر لال کو بہت عزیز تھا اور کشمیر کو جواہر لال بہت عزیز تھے۔ کشمیر میں اور کشمیر کے باہر جہاں بھی کوئی کشمیری تھا اُس کو جواہر لال کی وفات سے بے انتہا دُکھ ہوا۔ کشمیر اور اہلِ کشمیر کو جواہر لال کے دِل میں ایک خاص جگہ حاصل تھی۔ اس لئے ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں جواہر لال کے آدرشوں پر چلنا اہلِ کشمیر کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ یہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ کشمیر کی سیکیولر روایات دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ رہی ہیں۔ آیئے ہم عہد کریں کہ ہم اپنی سیکیولر روایات کو مستحکم رکھیں گے۔ فلاحی ریاست کے قیام کے لئے اَن تھک کوششیں کریں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک سماج سے ہر بدعنوانی اور نابرابری دُور نہ ہو اور ہر فرد کو سماجی اور معاشی انصاف اور مساوات میسّر نہ ہو۔ ہم ہر قیمت پر اپنے ملک کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت کریں گے!

انگریزی سانیٹ : ڈاکٹر کرن سنگھ

اُردو ترجمہ : کمال احمد صدیقی

نہرو کی یادیں!

چلے گئے ہو تم اُن کی صفوں میں ملنے کو
ہیں جن کے نام امر، زندہ، زندۂ جاوید
حیات بخش، مسرّت فزا مہک کے ساتھ
کسی گلاب کی کھِلتی ہوئی کلی کی طرح
تمہاری ذات کا جو جُزوِ بے تکلّف تھی!

ہماری قوم پہ نرغہ اندھیری رات کا تھا
ترس رہی تھی یہ سُورج کی اِک کرن کیلئے
تم اُٹھے، اور لڑے، جد و جہد کرتے رہے
سیاہیوں کے خلاف، اور روشنی کے لئے
بقائے قوم، اور آزادیٔ وطن کے لئے
تم اُٹھے سارے سلاسل کو توڑنے کے لئے
وطن کو، قوم کو جکڑے تھیں جو کہ صدیوں سے

تمہاری مدِّ مقابل تھی خسروی طاقت
تم اُس کے قہر و غضب سے کبھی نہ گھبرائے

تم اس کے سطوت و جبروت سے بھی ٹکرائے
ہر ایک درد و اذیت، ہر ایک رنج و زیاں
گوارا تم نے کیا، جد و جہد کرتے رہے
ہماری فتح ہوئی ایک روز آخرِ کار
ہر ایک سمت ہوا سیلِ نورِ آزادی
اور اس کے فیض سے ہم کو ملا مقام اپنا
وُہ روشنی تھی کہ ہر ذرّہ جگمگا اُٹھا
فلک پہ قوم کے سورج بنی تمہاری ذات
تمہارے پیشِ نظر قوم کی بھلائی تھی
اور اس کے واسطے کوشاں رہے ہو تم دن رات

چلے گئے ہو تم ایسے، کہ آ نہیں سکتے
تمہارے بعد جو ہم لوگ رہ گئے ہیں یہاں
متاعِ بیش بہا ایک پاس رکھتے ہیں
تمہاری یادوں کی میٹھی کسک پہ جیتے ہیں
ہر ایک یاد تمہاری عزیز ہے ہم کو
عروج و اوج کے جو خواب تم نے دیکھے تھے
ہم اپنے فکر و عمل کی ہر ایک قوت سے
اُنہیں ضرور حقیقت بنائیں گے اِک دِن
وطن کو قوم کی جنّت بنائیں گے اِک دِن!

انگریزی سانیٹ : ڈاکٹر کرن سنگھ

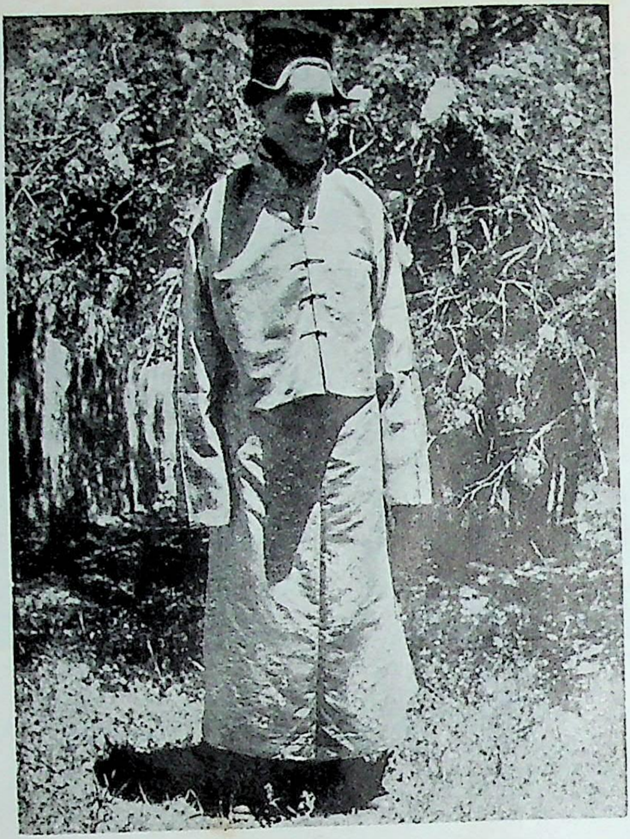
کشیری ترجمہ : محمد امین کامل

چانۍ یاد

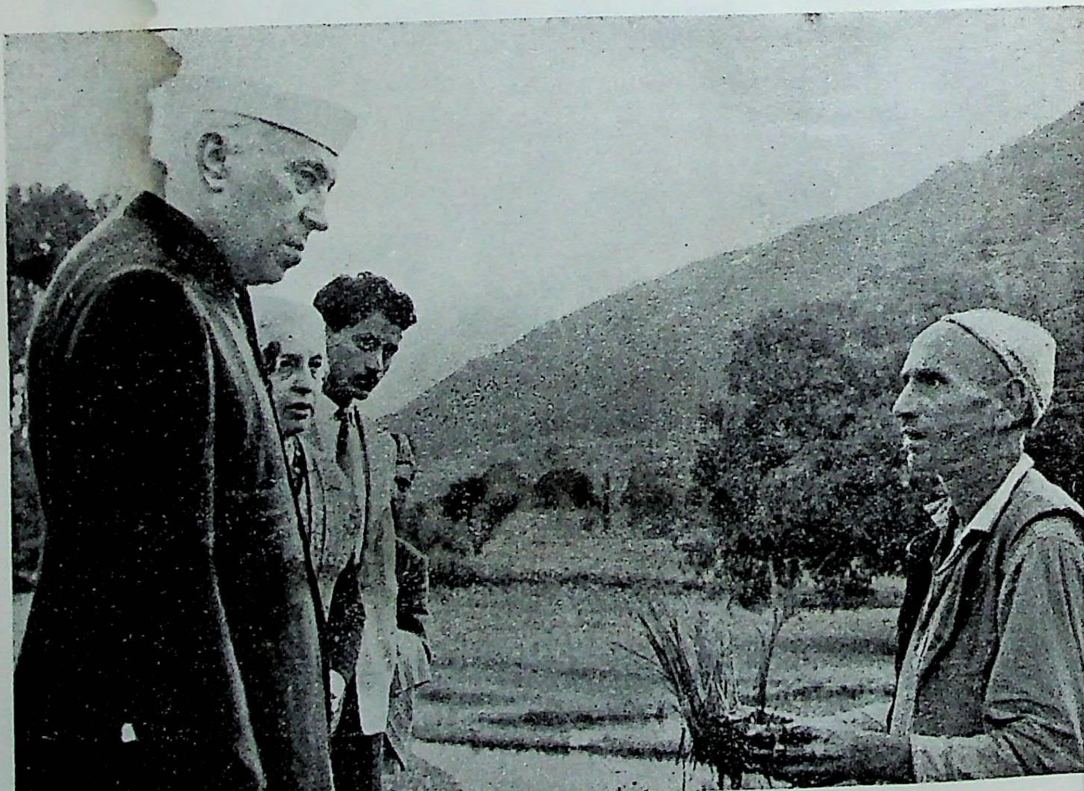
وقتک اسہ داغ دِتھ، دوتکھ ہمن یارن اندر
تا ابد روزان یہنز سینن اندر یاد اوری
یاد — یتھہٕ کنۍ آسہ مشکنۍ دار ہیتھ پھولہ دُن گولاب
شے گولاب یُس چانہِ ذاتک ادس اکھ نندہ بون انگ

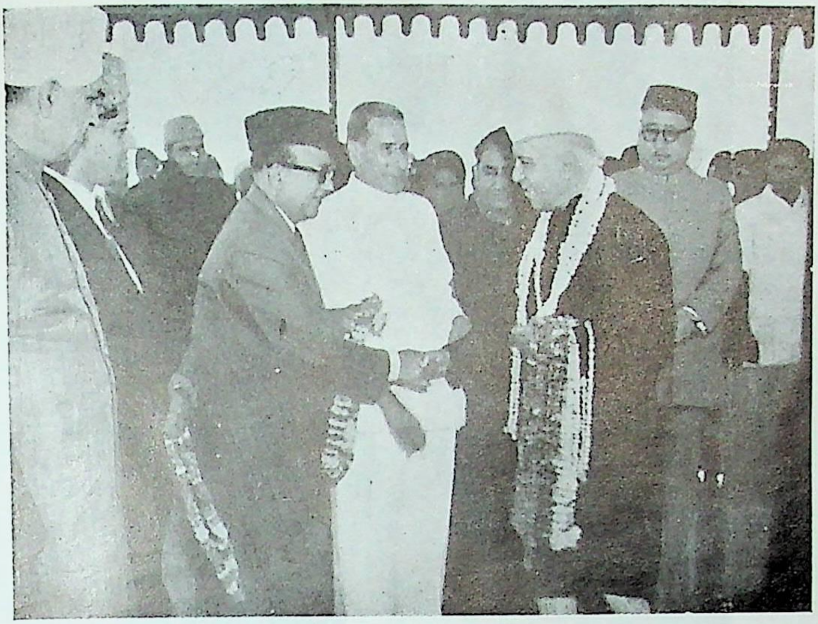
چانۍ جبروتن کنۍ یلغار کرُ، وبسری داتھ
چانۍ ہمتن شوقہٕ ژھارنۍ لاج پراگاشچ سبیل
ناد آزادی ژیہٕ لویتھ، پانہِ زنجورن کجیتھ
قیصری وولیو، خسرو خانہ نادو نار گوو
دادی دوکھ ژالتھ تہٕ وبراوِتھ ستم، خارۍ تیجتھ
چانہِ ہمتہٕ کار کور، آخر تہٕ گیہ اُسی کامیاب
سانہِ آزادی تہٕ لوب سرتازہ نورانۍ مقام
نور — اوہ اگر میک بس آس چانۍ نیک ذات
داکھ دوہ یکجا کرِتھ کانچھ ژیہٕ قوچ زِندگی

فرقتک اسہ داغ دِتھ دوہنۍ گوکھ پانس — ژوہ اُسی
خوش یونۍ یاد اوری ہیتھ چانۍ، سمسارس اندر
دعدہ یی کورمت چھہٕ، یوت تامت چھہ اسہ باقی یہ دم
اُسی کرو ہندوستانکہِ عظمتکی تعبیر خاب



لداخی لباس میں





خواجہ غلام محمد صادق کے ساتھ



ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ سری نگر کی ایک شاہراہ سے گذرتے ہوئے

آصف علی اصغر فیضی

جواہر لال نہرو

گاندھی جی کا تصوّر کیا جائے تو چٹان اور فولاد اور قدرت کی بے پناہ اور طوفانی طاقتوں کا خیال آتا ہے۔ اُن کی اہنسا ... پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور اُن کی صداقت تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھی۔ لیکن نہرو کا خیال آنے کے ساتھ چمکیلے جواہرات، تازہ پھولوں اور کشمیر کے شفق آمیز غروب آفتاب کے خواب مچلنے لگتے ہیں۔ اُن کی رُوح تہذیب اور حُسن کے سرچشموں سے نہا کر نکلی تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں جو تحریریں سب سے زیادہ پسند آئی ہیں اُن میں نہرو کا وہ مشہور اقتباس بھی شامل ہے، جس میں کشمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

"ایک بے پناہ خوبصورت نازنین کی طرح، جس کا حُسن تقریباً غیر شخصی اور انسانی تمنّا کی رسائی سے بالاتر ہو، کشمیر کے نسوانی حُسن کا ایک پہلو یہ تھا' اپنے دریاؤں اور وادیوں اور طرح دار درختوں کے نسوانی حُسن سے معمور۔ اور پھر اس جادو اثر حُسن کا ایک اور منظر نظروں کے سامنے اُبھرتا ... کوہستانوں اور پہاڑوں، برف پوش چٹانوں اور گلیشروں اور نیچے وادیوں کی طرف مستانہ وار لپکتے ہوئے تیز رفتار پہاڑی جھرنوں کا مردانہ حُسن اس خوبصورتی کے سینکڑوں چہرے اور اَن گنت گوشے تھے۔ جو ہمیشہ نئی کیفیتیں دکھلاتے ابھی مُسکرا رہے ہیں اور ابھی مغموم اور الم ناک ہیں۔ دُھند ڈل جھیل سے اُبھرتی اور ایک شفاف نقاب کی طرح اپنے عقب میں پوشیدہ منظر کی جھلک دکھاتی۔ بادل اپنی باہیں کھول کر کسی چٹان کو آغوش میں چھپا لیتے ... یا چوری چوری نیچے اُتر آتے۔ جس طرح بچّے کھیل کے وقت کرتے ہیں ... میں اس رنگ بدلتے ہوئے حیرت انگیز تماشے کو دیکھتا رہا ... بعض اوقات اس بے انتہا حُسن کی ادائے دِلبری مجھ پر

غالب آجاتی ... اور میں تقریباً بے ہوشی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ جب میں ان نظاروں کو دیکھتا تو ... یہ مجھے خواب کی مانند اور غیر حقیقی معلوم ہوتے تھے ... اُن اُمیدوں اور تمنّاؤں کی طرح جو ہمارے دِل میں مچلتے رہتے ہیں ... لیکن جنھیں شاذ ہی کامرانی کی مُراد مِلتی ہے ... یہ معشوق کے چہرۂ زیبا کی خاصیّت رکھتے ہیں ... جو آدمی خواب میں تو دیکھتا ہے لیکن جو جاگ اُٹھنے کے ساتھ ہی نظروں سے غائب ہوجاتا ہے۔"

جواہر لال نے جو کچھ کشمیر کے متعلق لکھا ... وہ کسی حد تک ایک اور خاص پس منظر میں اُن پہ بھی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ دِلربائی کا مجسمہ تھے۔ اُن کے ذاتی معالج نے مجھ سے کہا کہ گو وہ بدن کے زیادہ مضبوط نہ تھے۔ لیکن اُن کی جیسی جسمانی ساخت لاکھوں میں سے کسی ایک کے نصیب میں آتی ہے۔ اُن کی مُسکراہٹ بے پناہ تھی ... اُن لوگوں کی خوش قسمتی کا کیا کہنا جنھیں جواہر لال جھاڑ دیتے ... کیونکہ ذرا دیر بعد وہ اس کی حد سے زیادہ تلافی کر دیتے .. ناراض ہونے یا بگڑنے کے بعد وہ کچھ اس انداز سے معذرت کرتے تھے کہ زندگی کے روزمرہ "گناہوں" بے رنگ معمولات اور بے کیف مشغولوں میں ملاحت کا حُسن پیدا ہوجاتا۔

میرے لئے اُس خطیبانہ زورِ بیان اور جذبات نگاری میں اضافے کی کوشش کرنا ایک بے کار سی بات ہوگی، جو اُن کے مرقد پہ نچھاور کئے گئے ہیں۔ میں اُس دُھندلی سی تصویر کا نقش پیش کرنے کی کوشش کروں گا ... جو میرے ذہن میں جواہر لال ... ایک انسان ... ایک مدبر اور ایک قومی ہیرو کی طرح موجود ہے۔

ایک انسان کی حیثیت سے وہ بڑے متلون مزاج تھے ... جاذبیت اور تنوّع سے بھرپور۔ سامعین کے کسی مجمعے، کسی انٹرویو کرنے والے یا کسی ڈپلومیٹ کو اُن سے زیادہ اور کوئی اپنا فریفتہ نہیں بنا سکتا تھا ... میں نے سُنا ہے کہ چار سینئر سیکرٹری اُن کے پاس اپنی تنخواہ اور آیندہ امکانات کی بہتری کے بارے میں استدعا لے کر گئے۔ چاروں خوش خوش، لیکن بے وقوف بن کر واپس آگئے ... وزیر اعظم نے اُن سے کہا کہ اُن کے محکموں میں ابھی کتنا کام باقی ہے اور کس طرح یہ بات ناممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک مُلک کے لاکھوں بھوکے عوام کے مسائل کے بغیر کسی اور معاملے کو ذہن میں لائے۔ اس کے ساتھ اُنھوں نے استدعا کرنے والوں سے یہ بھی کہا کہ ایسے معاملات طے کرنے سے پہلے ہندوستان کے بے شمار غم زدہ عوام کے آنسو پونچھنا کتنا ضروری ہے۔

ایک مرتبہ وہ ناگالینڈ گئے اور وہاں کہا۔ "بتایا جاتا ہے کہ آپ لوگ یہاں ایک دوسرے کے سر کاٹ لینے کے عادی ہیں ... ... یہ شاید بہت اچھا کام ہے بھی نہیں ... لیکن لوگوں کے دلوں کو روندنے سے تو یہ بہتر ہے کہ اُن کے سر کاٹ لئے جائیں۔"

ایک مدبّر کی حیثیت سے اُنہیں جانچنا ہمارا نہیں، آیندہ نسلوں کا کام ہے۔ میرے اپنے تاثرات کچھ ملے جلے ہیں ... یہ بدنصیبی کی بات ہے کہ لفظوں کے ایک فن کار، ایک مفکّر اور ایک دانش ور کو ایک وسیع اور متنوع ملک کے روزمرہ انتظامی مسائل کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بنا دیا جائے۔ اُنہوں نے ہندوستان کو آزادی کے بعد سولہ برس تک متحد رکھا اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ لیکن اُنہوں نے بہت سی غلطیاں بھی کیں۔ اُن کی خارجہ پالیسی تنقید سے بری نہیں ہے۔ وہ ذاتی وفاداریوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے رہے ... اُن کی فطرت اتنی مہربان تھی کہ وہ بے ایمانوں کے "قتل" میں توقف کرتے تھے ... اُن کی شفیق سرشت بداطواری کو اس طرح سے جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جس طرح اُن کی قدوقامت کی اور شخصیتوں نے کیا ہے۔ اس شخصیت کے کچھ تاریک گوشے بھی تھے۔ ... ... لیکن جیسا کہ "ٹائمز" لندن (۲۸ مئی) نے لکھا ہے وہ ایک بڑے مدبّر تھے۔ کیونکہ طبعاً وہ تنگ ظرف اور کوتاہ اندیش نہیں ہو سکتے تھے ... کسی حال میں بھی نہیں۔

وہ ہندوستان کے قومی ہیرو تھے ... اور بے حدوحساب حد تک تھے ... اُن کی ذات میں اس ماتر بھومی کے تمدّن کے تین رُخ ایک سنگم پر آن ملے تھے ... گفتگو میں وہ اُردوئے معلیٰ اور "ملکہ کی انگریزی" بولتے تھے ... تقریباً ایک ہی سانس میں اور اکثر ایک دوسرے کے آگے پیچھے ... ...

اُنہوں نے ایک مرتبہ مولانا آزاد کی ایک تقریر کو انگریزی کا لباس پہنایا۔ اور ابوالکلام نے اسے قریب قریب اصل سے زیادہ پسند کیا ... اُن کے ذہن کا خمیر انقلابِ فرانس کی رُوح سے فیضان یافتہ اور اُن کی رُوح کا لوتھر کے ساتھ کوئی باطنی رشتہ تھا۔ ہندوستان کی پراچین سنسکرتی نے اُن کے پیکر میں نیا جنم لیا تھا ... اور اُن میں اُن ہی دلبرانہ اداؤں کی شانِ محبوبی جلوہ گر تھی جو لازوال محبوب کرشن کنہیا سے منسوب ہیں۔ اُنہوں نے ایک مرتبہ ایک ننھی سی بچی کو اپنے بازوؤں میں لے کر اُچھالا۔ پُرنم آنکھوں سے اُس کو چوم لیا۔ کیونکہ وہ پولیس کا گھیرا توڑ کر اُنہیں یہ بات بتانے آئی

تھی کہ اُس کی زندگی کا ارمان اُن ہی کی طرح پر دھان منتری بننے کا ہے۔ ہولی کے رنگ رنگیلے تہوار کو وہ نفاست آمیز فن کاری کے ساتھ مناتے تھے اور ہماری دُھندلی نظروں کو یہ نظارہ دکھاتے تھے کہ کرشن صرف ایک روایتِ پارینہ ہی نہیں ہیں بلکہ وہ مجسّم مسرّت کی رُوحِ ابد بن کر پھر جلوہ نما ہو سکتے ہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ: محمد یوسف ٹینگ)

محبُوب ترین شخصیّت

"... مسٹر نہرو نہ صرف ہندوستان کے وزیر اعظم تھے بلکہ عوام کے باپ تھے۔ ان کی قیادت میں عوام نے آزادی کی جنگ جیتی تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کی شخصیّت بنائی تھی۔ ان کو نئی قدریں عطا کی تھیں اور بُوڑھوں میں جوانوں کی سی رُوح پھُونک دی تھی۔ اور اعلیٰ اخلاقی معیار اور قدر کی وہ علامت بن گئے تھے۔ ان کی وسیع القلبی کی وجہ سے سب ان کو اپنا سمجھتے تھے۔ منظم اور سخت محنت اور سُتھرے ذوق نے ان کو سب کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ان کی شخصیّت میں اس وجہ سے بڑی کشش پیدا ہو گئی تھی۔

"ہندوستانی تاریخ میں مجھے پنڈت نہرو سے زیادہ کسی دوسری شخصیّت میں اتنی کشش نظر نہیں آتی۔ صحیح معنوں میں وہ عوام کے محبُوب تھے ساری دُنیا ان میں اپنے لئے اسی کشش کو محسوس کرتی تھی..."

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

جواہر لال نہرو

(" گاشہ پھولہٕ نس یاتری پزاران آسی ")

اسہِ چھُہ ژُنہِ کوتاہ یکُن، کوتاہ یکُن !
اکھ سیٚد گوڈ دأنسہ کأژاہ، کوُت وَرخ
اکھ زماناہ، اکھ یوگاہ، کیتیاہ ؤری
قافلاہ ڈٲیوو سکھرِ تھ دوُر پیٹھ
ای سیٚد مُشخص زِہ وَتھ نوٗ ژھارہ ہوَ
نب ہیٚنن اسہِ رُود ہُتھ ژکرِ تھ سیٹھاہ
پرانہِ وترِ یکہ نس چھُہ گومُت کاہہ طین
یال ہُتھہِ ٹاکارہ شینوٗ سہہ، وٗنت
آسمانس تام کوڈمُت کاڑ اُمی
کھنبرہ بن کھڑاشن پوٗلادی تیز دند
شینہ تیٚناٰلین تھزر، تھزرُک غروُر
تھوٗنگی نبس سیتی زنتہ کیاہ تاں زرہ گران
ای سیٚد مُشخص زِہ نوٗ وَتھ ژھارہ ہوَ
یاتری ساری چھِہ آسی برونہہ برونہہ پکو
برونہہ پکو، یکجا پکو، زینو پڑاو
روت شہلس مُنزِ لس تاں واترِ نزٕ

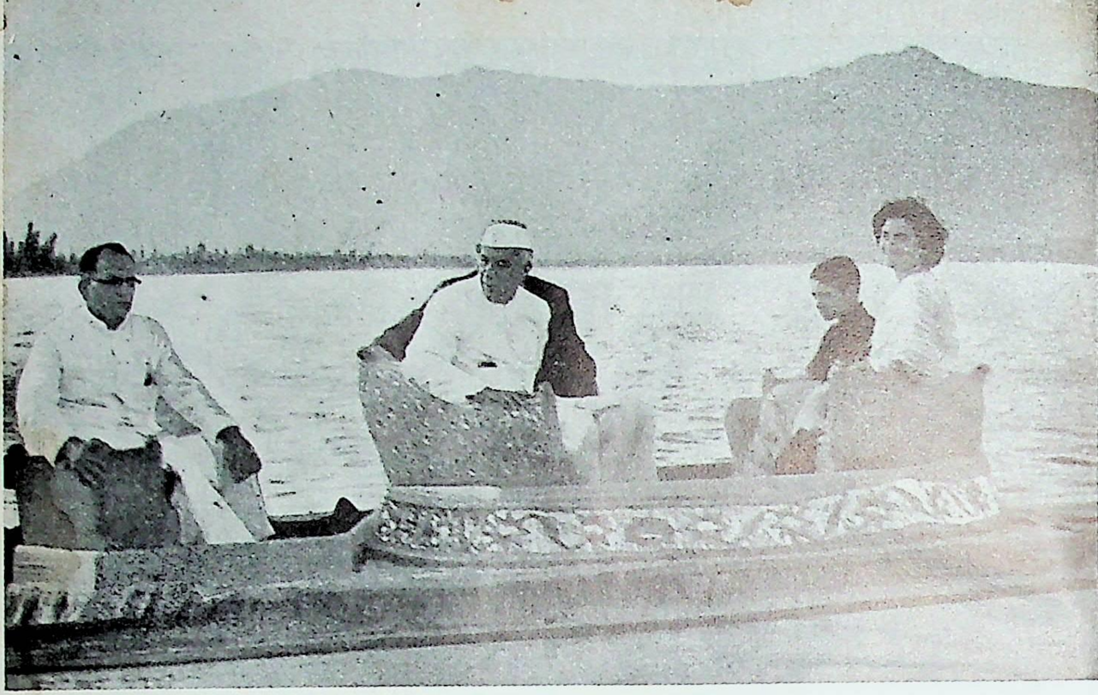
اِتہٕ چھُہ ممکن وُلی وُلی از گاش پھوٗل
اکھ اُکس اُسو دِل رچھو، ہمت کرو
وَتہٕ پٮ۪دِ ین نوِہ آیہٕ گرٕزھہ بلیٖہ زان سائنی
ہم سفر بُت رات پننی ٹائٹھ موج
تس چھُہ اُسو ساری پننٕ ہٮ۪رٕتھ ہتھ گبر
کیاہ دوٗسُتھ کیاہ، وتھ چھِنا لیہٕ نے یوان؟
ژونگ زائلو گاشس ہٕدِ و یانہٕ وٕنی
اَدہ پھولن سنگر، سوٗ پھل گرٕزھہ یاترا
اُسو کُنہٕ اُسی؟ وونی سپدی اُسی واریاہ
اکھ تہٕ اکھ گوو کاہ۔ تہٕ سُے گوو کاروال
اسہِ چھُہ وُنہٕ کوتاہ پکُن، کوتاہ پکُن!
اَی سِدُ مُتخص چھُہ زیٖنُن یال از
کیاہ وَنو کُس نیرہ وُن تھوٗک اڈ وَتے؟
شائی تارک ڈیٹھی کُی، کُس شوق نُوس؟
ہاے وَن وِگنیوٗ اِہ کُس کوٗر تارہ دِل؟
کُمی ہُنتھ ہتھ بوٗنہٕ شہلس ترٛوو ڈاف؟
اکھ اُکس تو ہی دِل دٕ چھو ہٕز ستھ کرٕو!
سُتھرِ چھُہ طوفان، تس گلٕبن چھا رز کرٕنی؟
بڑٕہ دِیو آلو دِیو بڑٕہ حوصلن!
دوٗٹ اِرادن یلہ جلو تیٖلہِ کیاہ چھُہ غم؟
وونی جنونس پٮ۪ن ہشُن کُجہ یاوہ پنجہ
پھرٕکھ چھُہ کھوٗت مُت! پھرٕکھ کھٕمُن نبفسِ حیات
قافلس مُنز ہی سوٗت قدم، مُنز ہی تیز دَم
روت ژھایو ہیوٗت اماوز بانبرمن

بالہِ تینتالین ژوہَن لجہِ مان ہش
ہُنتھ بُتھس تل وائتی ووہنی، نئی ژھٹ کڈان !
تیرہ کُنڈی کھتی ؟ تیرہ کُنڈی گیہ زندگی !
کینہہ ہیتن بلیہ بلیہ ٹھکنہ، کینہہ رُودی پتھ
کینہہ دیپان مندر آژو، پُوزا کرو !
کینہہ دیپان ییتہ یتھی دیس آہی منگو
کینہہ مشیدن ژاے یلہ لُوزکھ اذان
کینہہ مُشتھ گیہ آسمانکی رنگ وُچھت
کینہہ تر ژیای بالس وُچھک یلہ ووکھ موکھ
کینہہ دیپان لوس خمارس منز چھُ سوکھ
جان گوو یس میوٹھ لوگ تس میوٹھ لوگ
اسہ چھُ وُنہ کوتاہ پکُن، کوتاہ پکُن !
ییتھ پلس لوگ تار پتہ چھنہ کانہہ فکر
ہُنتھ کوٹھس واتو تہ پتہ لس مرگہ کینہہ ؟
وُنلہ زن وول بال نظرن وژھ وُتل
وُزہ ملو کھہرنہ کڈنی ہیتی تیز دند
کُس سنا ژھینہ گوو ؟ کمس آو ضعاف منزی ؟
رتھ کہوند لارِیو کھراشن کھنبرن
منزلس تام وُنہ خبر کیتاہ ژھوکن
بال ژھاران سانہ جگرُک تازہ خوُن
تو تہ کیاہ گوو، اسہ چھُ زینن راتس از
وُہو ! ہیائی کرکھ گیہ ! یہ کس پھرُ نارہ تربٹھ ؟
کس یپائی کھوہ ڈول یہ کس چھپیہ لوگ گوہس
زیون مرُن یہ چھُ آمہ تُے یہ چھُ آمہ تُے !

اُسی ژھوکَو نۆی نۆی پکَن ہیتھ لوٚو نار
بال زینۍ گوٚو پہٕ عشقس ناد دِیُن
نارٕ منقل ہیتھ پکُن واوس اندر
خارٕ زارن ستی محرم پُڈی کرِنہٕ
وَتھ سیٹھاہ وُنہِ زیٹھ باسال واریاہ
اسہِ چھُہ وُنہِ کوتاہ پکُن، کوتاہ پکُن!
سبزٕ زارَو دِژاے، مرگوَ ترٕی سیٹھاہ
مُنزی ڈُلامیو کنہِ پَلو پیٹھی ژھال دِژ
مُنزی سنبو نالوَ ترِٕتھ کھُتی وُل مینن
وُنہِ چھہ تھدی تھدی تھوٚنگی یوان بُتھِ واریاہ
مُنزی چھُہ باسان وا اُتی شاید مُنزِ بس
مُنزی دُو ژِٕیوٚت گوٚو یلہِ دُو وُوت آویہٕ وُنٹھ کانہہ
کتھ کلِس نکھہ تھک دِژوو؟ سو چھہَ پۆرٕ آنی کتھ
یَتھ پلس تل تم ہیٚژوو، سُہ ترِ گوو مُشتھ
بالہٕ دامنہٕ دِژاے کرٕ اُسی، کُس ژٕتس؟
ترٕ اُوی وَتہٕ پُڈی پت سیٹھاہ، نِوٕ آیہٕ پکی
بس یہِ ہے کُل رُوز نوٚ کانہہ وَتھ کڈو
شینہٕ ماٗدانن ترٕو کمہِ آیہٕ اُسی
گوڈٕ گوٚو ڈُک چکہ چاو موٚٹھ یلہِ تُل قدم
خام خاہش پوٚختہٕ کرٕ اسہِ شوقہٕ ستی
عام ارمانوَ پولادٕ چھ ترٕاے رُٹ
برو نہہ ہنائکی لوٚب اِرادوَ نوٚو خمار
جوشں کھوٚت کہہَ وچہِ نظر گیہِ تیز سانی

میٹھ اکھ آواز ۄنی بوٗز پھیری پھیری
اکھ مژھل آواز، آلو ٹاچھرُک
ستی ستی ٹکی ٹکی تہٕ برفہٕ برفہٕ نیری نیری
گاہ وَنان "بھایو تھکُن گوو ناروا"
گاہ دپان وونی واتٕ آشن سگ دِوان
گاہ نِوان کھوٚنہٕ مُنزِ کڈتھ لگہٕ ما اشُد
گاہ وودِنی بالن کھسان پلہٕ وَن کرِتھ
گاہ پکان بوٚنی بوٚنی زِ ژھوٚٹ وَتھ زیٹھی تن
تیٚتھ زِ یُتھ ہیوٚر تام باسی کینہہٕ تھکُن
رنزٕ دان منزِ منزِ ژندن کُلی ہادی ہادی
برو نہٕ پکتھ تھدی پیٹھ دِوان زن آواہ
"چل ٹکو، چل چل ٹکو، یکجا ٹکو"
یُتھ نہٕ کوہ تیتوٚل ڈلِہ وونی نظرِ زانہہ
اسہٕ چھُ واتُن اُوری سارینٕ سارِنی
جُت کرُن اسہٕ آسمانس جُت کرُن
دراے ینہٕ سفرس تہٕ ینہٕ آواز بوٗز
قافلس یتی برونٹھ گتھ کرِ اُمی دوہے
شینہٕ پیٹھی پیٹھی یِمہٕ یدِن ہندی نوٚی نشان
یِم نشان، یِم میٹھی آلو، ستی بوج
ستی بوچھاہ، ہم سفر، وَتہٕ ہادُ گاہ
ۄنلہٕ گراپاہ آیہٕ ہُمہٕ وَتہٕ ژھلے ہش
بُتھ رتس ۄچھمُت چھُہٕ ۄچھ کیتھ کت سینو کھ؟
اوس کُس تام ستی ۄنی، ۄنی نظرِ ڈوٚل

رات سوریمژ چھِہ صُبحس آو آو
ہُتھہ ژندن کُلہِ سی چھہٕ شاید تال نُنہٕ !
بالہٕ تھِنتالیک یہِ پرتو چھا پوٚزُے ؟
شک گنیوے کیاہ تام ؟ راوی ژٹکی زن
ازمیہٕ باسان اسہِ چھُہ جلدی جُت کرُن
اکھ ژیوٗہا اکھ زنتہٕ گوٚو لچھ لچھ وٗری
اوٚبرہ ژھایا پھیر زن اسمأنی نہ انڈ
اوسس کُس تام سیتھ وُنی، وُنی نظرِ ڈوٚل
بُرِم اُچھن ہُند بالہٕ پیٚٹھ، یہِ چھُہ آمہٕ تے
آسہِ یِیٚتھ پتہٕ برونٹھی، کُس گوٚو ؟ کور گوٚو ؟
اسہِ چھُہ وُنہِ بروٚنہہ کُن پکُن، وارہ پکُن !
نظرِ ڈوٚل کانہہ، توتہِ کیاہ گوٚو ؟ تھاوکن !
یوز آلو میٹھی آلو تِم چھِہ یِیٚتی
شیٖنہٕ پیٚٹھی پیٚٹھ وُچھ پدن ہُندی نوٚی نشان
وتھ کڈان بروٚنہہ بروٚنہہ پکان اسہِ سیتی سیتی
سیتی بوجاہ ہم سفر، وَتہٕ ہاوٗکاہ
نظرِ ڈوٚل، کوٚت ژوٚل ؟ سُہ چھُے یِیٚتی ژھایہٕ ہوٚل
ہأجی باوُن گاہ دِوان یلہِ شاہ ہوان
اسہِ چھُہ وُنہِ بیٚیہٕ ہن پکُن، بیٚیہٕ ہن پکُن
اسہِ چھُہ ہُت واتُن بس اُتی جُت کرُن !



آبی پرندے پر ڈل کی سیر



ڈل کے کنارے آبی مارچ پاسٹ پر سلامی لیتے ہوئے

تصویر: ایس۔پی۔ساہنی



(ڈاکٹر) سیّد عابد حسین

نہرو کے بعد کون ؟

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

سچ ہے جب کسی بدبخت کے دِل میں آس کی روشن لو نراس کے آنسوؤں سے بجھتی ہے تو آہِ سرد لب پر آ ہی جاتی ہے، نالہ درد مُنہ سے نِکل ہی جاتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ ۲۷ مئی کو دِن کے دو بجے رنج و یاس کے سیلاب میں شمعِ اُمید کے بجھنے کی صدا کروڑوں ہندوستانیوں کے دِل سے ایک دردناک آہ بن کر نکلی اور فضائے دہر پر اس طرح چھا گئی کہ ان کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے دوسرے سال میں جب ہماری قسمت کا آفتاب گاندھی جی کی شہادت کے ساتھ غروب ہوا تھا تو ہماری آنکھوں کے سامنے بے دِلی اور مایوسی کا اندھیرا اس سے بھی زیادہ گہرا، گھناؤنا اور ڈراؤنا تھا۔ پھر بھی اس گھٹاٹوپ تاریکی میں ایک گوشے سے روشنی جھلکتی نظر آ رہی تھی اور ہمارے دِلوں کو تسکین دے رہی تھی کہ جہاں سُورج ڈُوبا ہے وہیں سے چاند نِکلنا شروع ہو گیا ہے۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کا طالع بیدار جواہر لال نہرو کی شکل میں اُٹھ کر ہماری زندگی کے اُفق پر چمکا اور اس نے سارے دیس میں، اس سِرے سے اُس سِرے تک اُجالا کر دیا۔ جواہر لال کی رہنمائی میں ہندوستان ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اور سولہ برس میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اس کی ساکھ بڑھی۔ اس کا مان بڑھا اس کا نام روشن ہوا۔ تھوڑے دِن سے پھر مصیبت کی کالی گھٹائیں ہمارے دیس کی طرف بڑھ رہی تھیں مگر ہمیشہ یہ بھروسہ تھا۔ یہ گھمنڈ تھا کہ جواہر لال کا نورِ بصیرت ان ظلمتوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دے گا۔ پر تقدیر کا لکھا کس نے دیکھا ہے۔ مشیّت کا بھید کس نے پایا ہے۔ یکایک

زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہمارا ماہِ درخشاں، ہمارا رہنما ستارہ دیکھتے دیکھتے آفاق کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا اور ہماری زندگی تاریکی کا ایک اُداس سمندر بن کر رہ گئی جس کا کہیں اور چھور نہ تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس بحرِ ظلمات میں کبھی روشنی کی لہر نہ اُٹھے گی۔ مایوسی کے اس شدید رُوحانی صدمے سے ہمارا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور لختِ دِل آنسو بن کر بہہ رہے تھے۔

مگر جب تڑپتا ہوا دِل ذرا ٹھہرا۔ بے ہوش دماغ کو کچھ ہوش آیا تو ہم نے سوچا کیا اس اُلفت کا جو ہمیں جواہر لال سے تھی، بس یہی تقاضا ہے کہ ہم اس کے غم میں آہ و زاری کرتے رہیں ہمیں وہ بات یاد آئی جو افلاطون نے سقراط کی زبان سے کہلوائی تھی کہ سچا عشق جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہوتا ہے۔ دراصل اشتراکِ قدر پر مبنی ہے۔ یعنی دو دِل ایک دوسرے کو اس لئے چاہتے ہیں کہ دونوں ایک ہی قدرِ اعلیٰ، ایک ہی عین، ایک ہی نصب العین کے شیدائی ہیں اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم جواہر لال کی محبت کا حق محض نالہ و شیون سے ادا نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے آپ کو ان قدروں کی خدمت میں کھپانا ہوگا جو جواہر لال کو عزیز تھیں اور جن کی وجہ سے جواہر لال ہمیں عزیز تھا۔ یعنی عقلی طرزِ فکر، علمی اندازِ نظر، ریاسی آزادی، سماجی انصاف، عالمی امن، انسانی برادری۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے ہندوستان کی قومی زندگی پر، جس میں ہمیں اپنی راہِ عمل ڈھونڈنی ہے، نظر ڈالی تو یہاں بھی جواہر لال کے بعد وہی اُداسی، وہی تاریکی محسوس ہوئی جو ہمارے دِل و دماغ پر مسلط تھی۔ ہم نے اپنے آپ سے پوچھا کیا اب ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اسی طرح گھُپ اندھیرا چھایا رہے گا اور روشنی کا نام و نشان تک نہ ہوگا؟ کیا اب ہمیں آگے بڑھنے کی راہ کسی طرح نظر نہ آئے گی اور ہم کولھو کے بیل کی طرح روزمرہ کی زندگی کے تنگ دائرے میں چکر لگاتے رہیں گے؟ اس کے جواب میں ہمارے دِل نے کہا اور دماغ نے اس کی تصدیق کی کہ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ جب کوئی قافلہ وادیٔ حیات میں سیدھی راہ پر پڑ جاتا ہے تو اس کے قدم کبھی نہیں رُکتے۔ آفتاب غروب ہو جائے تو وہ چاند کی ٹھنڈی ملائم روشنی میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور جب چاند بھی ڈوب جائے تو تاروں کی چھاؤں میں دھیرے دھیرے ہی مگر برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بس ایک شرط ہے کہ قافلے والے منزلِ مقصود کا ایک واضح تصور اور اس کی سچی طلب رکھتے ہوں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا جواہر لال نہرو کے بعد ہمارے قافلے میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ذہن میں جواہر لال کی منزل کا صحیح تصوّر اور دل میں وہاں تک پہنچنے کی سچی لگن ہے؟ جواہر لال کی زندگی میں بہت سے لوگوں کو ان سے یہی شکایت تھی کہ انہوں نے ایسے کارکنوں کی تربیت پر دھیان نہیں دیا جو ان کے مقاصد کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور ان کے بعد ان کے کام کو جاری رکھیں مگر دراصل یہ شکایت جواہر لال کے فلسفۂ زندگی اور طریق کار، ان کی طبیعت اور مزاج سے ناواقفیت پر مبنی تھی۔ وہ محض سیاسی اعتبار سے جمہوریت پسند نہ تھے بلکہ ان کا سارا فکر و عمل جمہوریت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ انہیں اپنے مُلک کے عوام پر اور ان کے سیاسی وجدان اور اخلاقی شعور پر پُورا بھروسہ تھا۔ ہندوستانی عوام سے ان کا پہلا سابقہ وہ زبردست اور اہم ترین تجربہ تھا جس نے ان کی زندگی کے دھارے کو پلٹ دیا اور انہیں آرام کرسی کی سیاست سے کھینچ کر عوامی سیاست کے میدان میں گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے لا کر کھڑا کر دیا۔ اس واردات کو، جو ۱۹۱۹ء میں یُو۔ پی کی کسان تحریک کے سلسلے میں، دیہات کا دَورہ کرتے ہوئے ان پر گزری، خود ان کی زبان سے سُنیئے :-

"انہوں نے (یُو پی کے کسانوں نے) ہم پر اُلفت اور محبّت کی بارش کر دی۔ ہمیں ایسی اُمید اور محبّت بھری نظروں سے دیکھتے تھے جیسے ہم راحت و مسرّت کا پیام لے کر آئے ہیں یا خضرِ راہ ہیں جو انہیں ارضِ موعود تک پہنچا دیں گے۔ ان کی مصیبتوں اور اتھاہ محبت کو دیکھ کر میری گردن افسوس اور شرم سے جُھک گئی۔ شرم تو مجھے اپنے عیش و آرام کی زندگی پر اور شہروں کی اس کم نظر سیاست پر آتی تھی جو وطن کے نیم برہنہ بیٹوں اور بیٹیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ اور رنج اس لئے تھا کہ ہندوستان کی مُفلسی اور پستی کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا اب میری آنکھوں میں مادرِ وطن کی نئی تصویر پھرنے لگی۔ یعنی ایک ننگی، بھُوکی، ستم رسیدہ، خستہ حال مخلوق کی۔ غرض اُن لوگوں کو ہم پر، جو دُور کے ایک شہر سے یہاں آئے تھے، غیر معمولی بھروسہ تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی اور ایسی نئی ذمہ داری کا بار محسوس ہوتا تھا جس کے خوف سے میں کانپا جاتا تھا [1]"

---

[1] جواہر لال کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ "میری کہانی" جلد اوّل صفحہ ۹۶

یہ بھروسہ یک طرفہ نہ تھا۔ جواہر لال کو بھی اس "ننگی، بھوکی، ستم رسیدہ، خستہ حال مخلوق" پر کامل اعتماد تھا۔ انہیں اس کی فطرت کی بُنیادی صلاحیت اور اس کی قسمت کی خیر و برکت پر ایک طرح کا مذہبی یا باطنی اعتقاد تھا جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

"اعتقاد خواہ ترقی پر ہو، خواہ کسی تحریک اور نصب العین پر، خواہ انسان کی نیکی اور انسانی تصویر پر، کیا ہر صورت میں قریب قریب ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا خدا کا عقیدہ؟ اگر ہم ان عقائد کی توجیہ عقل اور منطق سے کرنا چاہیں تو فوراً مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے سینوں میں کوئی چیز ہے جو اس اعتقاد اور سہارے کو پکڑے رہتی ہے۔ ورنہ اگر زندگی سے یہ سہارا ابھی چھین لیا جائے تو وہ ایک لق و دق صحرا بن کر رہ جائے جس میں نخلستان کا نام تک نہ ہو۔"[1]

ان جاہل اور غریب ہندوستانی عوام سے جو سچی محبت اور گہری عقیدت جواہر لال کو تھی۔ اس کا راز یہ تھا کہ انہیں ان کے اندر اپنے محبوب اور محترم وطن ہندوستان کا جیتا جاگتا جلوہ نظر آتا تھا جسے وہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"اگرچہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصائب سے دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا غبار تھا۔ مگر اس کے ساتھ اس میں ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خد و خال میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کے اچھوتے تصورات، نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات ایک ایک کر کے اس کے چہرے پر اُبھر آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک ابھی تک نظر آتی تھی۔"[2]

آیئے اب اس پس منظر میں دیکھیں کہ جواہر لال کے پاس اس کا کیا عذر تھا کہ انہوں نے کوئی ایسی جماعت یا گروہ تیار نہیں کیا جو ان کے بعد ان کے نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھے۔ ۱۹۶۰ء میں مشہور جرنلسٹ آر۔ کے کرنجیا صاحب نے ایک طویل انٹرویو میں جواہر لال سے ان کے سیاسی اور سماجی فلسفہ اور طریق کار کے بارے میں جو سوالات پوچھے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا۔ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ روزانہ ایک گھنٹے کے قریب اپنے نظریاتی پیروؤں کی جماعت یعنی

---

[1] "میری کہانی" جلد دوم صفحہ ۳۴۶ - ۳۴۷

[2] "میری کہانی" جلد دوم صفحہ ۲۵۵

اُن نوجوان کانگریسیوں کی تربیت میں صرف کریں جو آپ کے خیالات کو سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ آپ کے پاس ان کے لیئے کوئی وقت نہیں ہے۔[1]" جواہر لال نے جواب دیا:

"میرا طریقہ ہمیشہ سے یہ ہے کہ مجمعوں، عام جلسوں یا چھوٹے گروہوں سے خطاب کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہے کہ عوام کے طرزِ فکر کو بدلا جائے اور ہر چیز کے بارے میں صحیح عوامی ردِّعمل پیدا کیا جائے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ سے مجموعی طور پر لوگوں میں اشتراکی رُجحان پیدا ہو گیا ہے۔ میں اپنے وقت کا بڑا حصہ اس کوشش میں صرف کرتا ہوں۔ شاید ہی کوئی دِن ایسا گُزرتا ہو کہ صبح کے وقت اپنے گھر پر کئی سو آدمیوں سے مِل کر بات چیت نہ کروں۔[2]"

سائل نے کہا۔ "غالباً آپ خاص طور پر کسانوں سے مِلتے ہیں؟" تو بولے۔ "(ان دِنوں) زراعتی نمائش کی وجہ سے، جو ابھی ختم ہوئی ہے، زیادہ تر کسان ہی آتے رہے۔ مگر یوں سبھی آیا کرتے ہیں۔ کسان، مزدور اور بہت بڑی تعداد میں طالب علم۔ یہ سلسلہ روزانہ جاری رہتا ہے۔ آج صُبح کوئی تین چار سو آدمی آئے۔ کچھ روہتک کے تھے، کچھ میسور کے، اور کچھ مہاراشٹر کے ضلع ستارا کے۔ ان میں سے بہت سے پس ماندہ ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ آتے ہیں اور میں انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہوں۔[3]"

آگے چل کر سائل نے صاف صاف لفظوں میں اس شُبہ کا اظہار کیا جو ان کے دِل میں کھٹک رہا تھا۔ "کیا آپ کے خیال میں ہندوستانی عوام مادّی ترقی اور اخلاقی قوّت کے بل پر موجودہ حالت میں جب کہ سماجی اور معاشی انقلاب کی بُنیادیں کمزور اور نامکمل ہیں، ترقی کے دھارے کا رُخ پلٹ دینے کی ہر کوشش کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟" تو اُنہوں نے پُورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "جب لوگوں کو ایک بار جمہوریت کی صحیح بُنیاد یا لنگر مِل جائے تو ان کو بحیثیتِ جماعت اپنی راہ سے ہٹانا یا ان کا رُخ پلٹ دینا مُشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی کی رفتار کو دھیما یا تیز کیا جا سکتا ہے۔ مگر میرے نزدیک ایک پُوری قوم کو دھکیل کر پیچھے کی طرف لے جانا ممکن نہیں ہے۔[4]"

---

[1] [2] The mind of Mr Nehru by R. K. Karanja صفحہ ۶۳، صفحہ ۶۳ اور ۶۴

[3] [4] " " " " " صفحہ ۶۶ - ۶۷

آپ نے دیکھا کہ اس سوال کا، جس نے ہمیں ایک مدّت سے اُلجھن اور پریشانی میں ڈال رکھا ہے یعنی "نہرو کے بعد کون؟" خود جواہر لال نہرو کے پاس بالکل صاف، اور قطعی جواب تھا۔ "نہرو کے بعد نہرو کی قوم ـــــ ہندوستانی عوام۔" ممکن ہے آپ میں سے بعض کو یا اکثر کو یقین نہ آئے کہ یہ غریب، جاہل، قدامت پسند، توہّم پرست ہندوستانی عوام ان اعلےٰ قدروں، عقلی طرزِ فکر، علمی اندازِ نظر، سیاسی آزادی، سماجی انصاف، عالمی امن اور انسانی برادری ـــــ کو، جو جواہر لال نہرو کے پیشِ نظر تھیں، سمجھنے کے قابل ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے لئے نہرو کی بنائی ہوئی راہ پر چلیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی قوم کے مستقبل کے بارے میں، جو محکومی کی قید سے ابھی ابھی آزاد ہوئی ہے اور افلاس و جہالت کی قید سے ابھی تک پُوری طرح آزاد نہیں ہوسکی ہے، مایوسی کی گنجائش زیادہ ہے اور اُمید کی کم ہے۔ یہ بھی مُسلّم ہے کہ عام طور پر اہلِ دُنیا کے نزدیک مایوسی کا اظہار کرنے والے عقل مند اور اُمید و عقیدت رکھنے والے سادہ لوح سمجھے جاتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کی پچھلے چالیس برس کی تاریخ ان اہلِ نظر کی بدگمانی کو غلط ثابت کر چکی ہے، جو تحریکِ آزادی کے سلسلے میں ہندوستانی عوام سے مایوس تھے اور ان سادہ لوحوں کی (جن میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو بھی شامل تھے) خوش عقیدگی کو حق بجانب قرار دے چکی ہے جو ان عوام کی سمجھ اور ہمّت پر پورا بھروسہ رکھتے تھے۔ یہی غریب، جاہل، قدامت پسند اور توہّم پرست عوام تھے جنہوں نے چھوت چھات کے مخالف، عورتوں کی آزادی کے حامی، قومیت اور جمہوریت کے جدید تصوّرات کے علم بردار مہاتما گاندھی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر آزادی کی لڑائی لڑی اور جیتی۔ اور یہی تھے جنہوں نے اندھی روایت پرستی، جامد مذہبیت، نسبی امتیاز، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دُشمن ـــــ جواہر لال کی رہنمائی میں نئے ہندوستان کی سیکولر، جمہوری اشتراکی ریاست کی بُنیاد رکھی۔ تو کیا ان کروڑوں آدمیوں نے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی پیروی بالکل آنکھ بند کر کے، دیکھے بھالے، جانچے پرکھے بغیر کی تھی اور ہزاروں لاکھوں نے اپنے سُکھ چین، جان و مال کی قربانی سمجھے بُوجھے بغیر دی تھی؟ کیا انہوں نے چالیس برس تک اپنے زمانے کے سب سے بڑے خُدا پرست مُعلّم اور سب سے بڑے انسان دوست مُدبّر کے سایے میں رہ کر کچھ نہیں پایا۔ ان کے مکتب میں سبق پڑھ کر کچھ نہیں سیکھا؟ یا پھر جو کچھ ایک مدّت میں پایا تھا وہ جواہر لال نہرو کی آنکھ بند ہوتے ہی کھو دیا۔ جو کچھ برسوں میں سیکھا تھا وہ دم بھر میں بھُلا دیا اور اب وہ سیکولر جمہوری

سوشلسٹ ریاست کے ادھورے ڈھانچے کو، جو ان کی تائید اور مدد سے بنا تھا، برباد ہوجانے دیں گے؟ اس کو ارباب دانش وحکمت کی بلند و برتر عقل مانے تو مانے، ہماری آپ کی معمولی سمجھ تو کسی طرح قبول نہیں کر سکتی۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ ہندوستانی عوام خصوصاً ہندوستانی کسانوں کے دل میں نئی بات بڑی مشکل سے بیٹھتی ہے۔ مگر جب ایک مرتبہ بیٹھ جائے تو پھر آسانی سے نہیں نکلتی۔

غرض ہمارے آپ کے نزدیک اس سوال کا کہ نہرو کے بعد ان کی پالیسی کو کون چلائے گا؟ ایک ہی جواب ہو سکتا ہے ـــــ ہندوستان کے عوام۔ ہمارا دل اور دماغ تو یہی کہتا ہے کہ ہندوستانی عوام نے یا کم سے کم ان میں سے اکثر نے، چاہے گاندھی جی کے تصورات اور جواہر لال کے خیالات کی باریکیوں کو، جن میں بہت کچھ اختلاف ہے، نہ سمجھا ہو مگر اُن چند باتوں کو، جو دونوں کی تعلیمات میں مشترک ہیں، موٹے طور پر سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی ریاست اور ایک ایسا سماج بنانا ہے جو کسی ایک مذہب کے رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو بلکہ اُس کے اندر مختلف عقیدوں کے لوگ مل جُل کر اُن اخلاقی اصولوں کے مطابق، جن پر سبھی مذہبوں نے زور دیا ہے زندگی بسر کریں۔ جس میں سیاسی آزادی، قانونی مساوات اور معاشی انصاف ہو۔ جس میں قومی برادری عالم گیر انسانی برادری سے ہم آہنگ ہو۔ اور وہ انہیں لیڈروں کی پیروی کریں گے جو ایسا سماج اور ایسی ریاست بنانے کا بیڑا اُٹھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ جواہر لال کے بعد مدّتوں تک کوئی لیڈر ان میں وہ جوشِ جنوں نہ پیدا کر سکے کہ وہ دشتِ جنوں میں پیادہ پا تپتے ہوئے ریگ زاروں سے گذرتے، چُبھتے ہوئے خار زاروں کو کچلتے منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں اور اس عرصے میں ان کے قدم کچھ دھیرے دھیرے، رُک رُک کر، جھجک جھجک کر پڑیں لیکن اگر ان کا رُخ منزل کی طرف ہو، سفر جاری رہے تو خواہ رفتار دھیمی کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی پہنچ ہی جائیں گے اور کون کہہ سکتا ہے، شاید ایک دن پھر جواہر لال کی خاک سے، جو ہندوستان کی سرزمین سے اُٹھ کر اُسی میں مل گئی، کوئی اور جواہر لال اُٹھ کھڑا ہو۔ سُنیئے اُس کی آواز، جو دیس کے طول و عرض میں اور دیس والوں کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے ؎

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

جواہر لال نہرو

وہ زندگی کہ درد ہو جس میں عوام کا　　جمہوریت کی شان کو کرتی ہے سربلند
بیدار جس کی رُوح کو خالق نے کر دیا　　بیدار کر کے قوم کو کرتا ہے ارجمند

جس کا چلن ہو عظمتِ انساں کا احترام　　مخدومِ اہلِ عصر ہے وہ افتخارِ قوم
جس کا ہمیشہ شُغل رہا خدمتِ عوام　　بے تاج ہو کے بھی ہے وہی تاجدارِ قوم

وہ امن و اتحاد کا اِک پیکرِ حسیں　　جو سب کا دوست، مونس و ہمدم تھا چل بسا
گاندھی کا اور ٹگور کا مداح و جانشیں　　جو اس صدی کا رہبرِ اعظم تھا چل بسا

ہر سینہ زخم دار ہے ہر آنکھ اشک بار　　دِل ہر بشر کا حسرت و غم سے ہے داغ داغ
اہلِ وطن تمام ہیں مغموم و سوگوار　　جس سے ضیا تھی دیس میں وہ بُجھ گیا چراغ

وہ مہرِ حُریّت نہیں اب ضو فشاں، غلط
او جھل نظر سے ہو کے بھی پیشِ نظر ہے وُہ
نہرو کی موت موت ہے، یہ ہے گماں غلط
اہلِ نظر کی رائے میں طالب امر ہے وُہ

ظ انصاری

جواہر لال نہرو

(فکر اور عمل میں ایک سنگم)

"... بچپن ہی سے مجھ کو الہ آباد کے سنگم پر گنگا اور جمنا دریاؤں سے وابستگی رہی ہے اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، یہ تعلق بھی بڑھتا گیا۔ موسموں کی تبدیلی کے ساتھ میں نے ان کے بدلتے ہوئے موڈ دیکھے ہیں اور اکثر یہ خیال آیا کہ تاریخ اور افسانہ، روایت اور گیت اور قصے کہانی کے کتنے ہی سلسلے مدتوں میں ان دریاؤں کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں..."

(وصیت نامے کے چند الفاظ)

۴۵ سال سے ہندوستان کی تہذیب اور سیاست کی کوئی ایسی راہ گذار نہیں ہے جس پر جواہر لال نے نشان نہ چھوڑے ہوں۔ ہمارے ملک کا یہ سب سے مہذب آدمی رواں دواں بھی گذرا ہے اور سینے کے بل بھی۔ ہندوستان کی قومی تحریک، جو اعتدال کا دامن پکڑے ہوئے چلی جا رہی تھی، پہلی جنگ عظیم کے ساتھ اس مرحلے میں داخل ہو گئی جسے غالب کی زبان سے بہتر ادا نہیں کیا جا سکتا ہے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب

اک آبلہ پا وادئ پر خار میں آوے

گاندھی جی نے اس وادئ پر خار میں قدم رکھا اور ۱۹۱۹ء تک تمام ہندوستان کو متھ ڈالا۔ قوم کو عنقریب آزاد ہونا ہے۔ یہ یقین انہوں نے دور دراز کے دیہات سے لے کر سجے سجائے ڈرائنگ روموں تک پہنچا دیا۔ اور ملک کے گوشے گوشے سے بہترین دماغوں اور با اثر لوگوں کو اپنے کچے دھاگے میں لپیٹ لیا۔ کہاں گاندھی جی کی درویشی اور کہاں "آنند بھون" کا طمطراق! لیکن الہ آباد کے ذہین اور حسین کشمیری پنڈت جو پہلے سے ہی زندگی کی دوڑ میں تیز جا رہے تھے، قومی تحریک کے نرم و گرم دھاروں میں بھی آگے آگے ہوئے۔ نہرو خاندان میں دونوں کا اثر سرایت کر گیا۔

پھولوں کی سیج پر

جس خاندان میں جواہر لال نے آنکھیں کھولیں اُسے دولت، عزّت، شہرت اور اقتدار سب کچھ نصیب تھا، پہلی اولاد تھے۔ ان کی نازپروردگی کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے۔ نانی دادی کی زبانی جو کہانیاں اپنے پُرکھوں کی سُنی ہوں گی، سمندِ ناز پر انہوں نے بھی تازیانے کا اثر کیا ہوگا۔ الٰہ آباد کے مٹی پانی سے جو محبّت مرتے دم تک رہی وہ خاندان کی اس بھری پُری زندگی کی خوش گوار یادوں کا حصّہ تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ بھی ہے کچھ۔

الٰہ آباد میلوں لمبی، صاف سُتھری سڑکوں کا شہر بہت سے تاریخی اثرات کا ایک منی ایچر پینٹنگ ہے۔ یہ وہی پریاگ ہے جو بنارس کی علمی، مذہبی اور صنعتی زندگی کے بالمقابل خاکِ اودھ سے اٹھا۔ جلال الدین اکبر نے اسے بے وجہ دینِ الٰہی کا مرکز نہیں بنایا تھا۔ تین مقدّس دریاؤں کے سنگم پر اشنان کرتا ہوا اکبر کا قلعہ آج بھی تاریخ و فلسفے کے طالب علم کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر یہاں خسرو باغ ہے۔ باغی مغل شاہزادے کا مقبرہ۔ پلاسی کے بعد یہیں مُغل شاہ عالم اور شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور پھر ۱۸۵۷ء کے معرکے سے نمٹنے کے بعد انگریزوں نے الٰہ آباد کو یُو، پی کا انتظامی اور تعلیمی مرکز قرار دیا۔ ہائی کورٹ کے وکیل، یُونی ورسٹی کے پروفیسر، اودھ کے چند جاگیردار اور بڑے بڑے عہدہ دار پُرسکون سڑکوں کے کنارے کُشادہ بنگلوں میں سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُردو، ہندی، ہندوستانی کی علمی ادبی تحریک کا بھی یہی ایک بڑا مرکز بنا۔ ۱۹ویں صدی کے آخر سے یہاں ہندی اور اُردو کے بڑے عالم جمع ہونے لگے۔ کانگرس کے کلچرل فرنٹ کے رہنماؤں نے یہیں ہندوستانی اکاڈمی کی بُنیاد رکھی۔

گورنر بٹلر کے ہم پیالہ، ہم نوالہ دوست موتی لال نہرو جو پہلے شہر کے ایک پُرانے محلے میر گنج میں رہتے تھے۔ جب سول لائن میں اپنا محل تعمیر کرانے کے بعد وہاں اُٹھ آئے تو جواہر لال خاصے سیانے ہو چکے تھے۔ محلّے کے بچے انہیں کس طرح رشک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ کھیلنا فخر کی بات ہوگا۔ ان کے ماموں، چچا، تایا اور دوسرے عزیز، ان عزیزوں کے بچّے، موتی لال نہرو کے نک ٹک سے درست سجیلے بیٹے کی ایک ایک ادا نظر میں رکھتے ہوں گے۔ مُلازموں کی فوج میں ہر شخص جاں نثاری میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا ہوگا۔

الٰہ آباد کے پُرانے محلّوں اور سول لائن کی کوٹھیوں سے جو گیارہ برس کے لڑکے نے ذہنی رشتہ

قائم کیا تھا وہ اس مقام کی ہندوستانی تاریخ تک، اس کی رنگارنگی، تضادوں اور پیچیدگیوں تک بھی پھیلتا ہوگا اور پھر اپنے وجود کی چار دیواری میں سمٹ آتا ہوگا۔ عزت وعقیدت، فخر و انکسار، خدمت اور محبت کے اس ہجوم میں رہ کر بھی موتی لال نہرو کا اکلوتا بیٹا کس قدر اکیلا تھا، خودنوشت سوانح عمری کے بعض واقعات میں جواہر لال کے کردار کی اُٹھان کا اور انجمنِ خیال کی ان خلوتوں کا پورا نقشہ ملتا ہے۔

موتی لال اپنے بیٹے سے عشق کرتے تھے، مگر ایک خوش حال، بے فکر اور خودپسند آدمی کے عشق کی طرح۔ اس جذبے میں سُپردگی نہیں تھی۔ حاوی رہنے اور اپنی بات منوانے کا جلال موجود تھا۔ جواہر لال کو اس جلال کے سامنے جب بھی پسپا ہونا پڑا۔ وہ گھر کے ایک مختارِ عام منشی مُبارک علی کی آغوش میں پناہ لیتے رہے (یہ منشی مُبارک علی رُوپ بدل بدل کر زندگی کے اکثر موڑوں پر انہیں ملتے رہے ہیں) ان کا آئرش اتالیق کتابوں کے علاوہ ادب آداب سکھاتا تھا، لیکن آئرش مزاج کی بذلہ سنجی کی کوئی نہ کوئی بوند بھی ضرور ٹپکتی ہوگی۔ اور پھر وہ پکے بالوں کی انگریز عورت اس مطلع پر اپنے خیالات کی دُھوپ چھاؤں لیے ہوئے نمودار ہوئی جس نے اپنی نجی زندگی کی ناکامیوں کو غمِ دوراں کے فلسفیانہ اَیرورچ میں گُم کر دیا تھا اور مغرب کی مادّی ہماہمی سے دامن چھڑا کر جنوبی ہند کے کرشنا مورتی میں مسیح کا جلوہ دیکھ لیا تھا۔ مسز اینی بیسنٹ نے جواہر لال کے کچّے ذہن کو، نہرو خاندان کے خوبصورت اور مطمئن ماحول کو اپنے سُہانے خیالات اور مُشفق وجود سے اتنا متاثر کیا کہ وہ سوٹ بُوٹ، صوفے، قالین اور شمپین تج کر گاندھی جی کی ہماتمائیت پر ایمان لانے کے لیئے ہر وقت تیار ہو گیا۔ الہ آباد کے اس سنگم پر جتنے تہذیبی اور سیاسی دھارے آکر ملے تھے۔ نوعمر جواہر لال کی آنکھیں اور دِل و دماغ ان سب سے سیراب ہوا۔ دُور و دراز مغرب کی فضا میں پہنچنے سے پہلے ۱۹ ویں صدی کے گزران ماحول کا لذت آشنا ہو گیا۔ راحت ومسرّت کی اس رُوحانی فضا میں پھولوں کی سیج پر جواہر لال نے بہت کروٹیں بدلی ہوں گی۔ سوانح عمری پڑھے بغیر بھی اس کا اندازہ کرنا مُشکل نہیں ہے۔

جہاں مشرق ومغرب مِلتے ھیں

سولھویں برس انگلینڈ بھیج دیئے گئے۔ ہیرو (HARROW) بورڈنگ اسکول میں، جہاں لارڈ ڈلہوزی اور ونسٹن چرچل نے تعلیم پائی تھی، دو ہی سال کے اندر جواہر لال کا جی بھر گیا۔ کیمبرج

کے ٹرینیٹی کالج سے تین سائنسی مضمونوں میں گریجویٹ ہوئے اور بیرسٹری کا امتحان (جو قانونی مطالعے سے زیادہ انگریزی تمیزداری کا امتحان ہوتا ہے) پاس کر لیا۔ تب تک وہ کچھ الگ تھلگ رہے یہاں ایک سے ایک امیر زادہ پڑا ہوا تھا۔ ان سے لاڈ پیار کون کرتا۔ اس پیاس کو انہوں نے لندن آکر بجھایا اور تعلیم کے بہانے دو سال یہاں کے بیدار مغز لوگوں اور نرم محفلوں میں چین کی بنسری بجاتے رہے۔

عمر کے ۲۶ ویں سال کو پہنچتے پہنچتے جواہر لال نہرو نے مغرب کی ایک ترقی یافتہ قوم میں رہ کر صنعتی زندگی کے اُس ماحول سے علمی اور عملی واقفیت حاصل کر لی۔ جس کے متعلق جوشؔ نے کہا ہے ؎ مری راتیں نگاروں میں، مرے دن کارخانوں میں

پھر یورپ کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور دہلی میں ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔

قدرتی بات ہے کہ زندہ اور روشن نگاہ متضاد منظروں سے اتنا کچھ سیکھ لیتی ہے جتنا اخلاقیات اور سیاسیات کی کتابیں نہیں سکھا سکتیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کتنی ایسی باتیں ہیں جو نیم انگریز جواہر لال کو انگریزوں میں رہ کر انگریزوں سے بھی زیادہ صاف نظر آئی ہوں گی اور انہوں نے اپنے قدیم، مذہبی، افسانوی اور پس ماندہ ملک کی صدیوں پُرانی کمزوریوں کو زیادہ شدت سے محسوس کیا ہوگا۔ عام خوش حالی، خوش باشی، پارلیمنٹری جمہوریت، عام تعلیم، مردوں عورتوں کا کھلے عام ملنا جلنا، آبلتے ہوئے شہر سے باہر دیہات کے صاف ستھرے خوشنما علاقوں کی سیر، سات برس تک یورپ کے ان مناظر نے انہیں راحت بھی دی ہوگی، تربیت بھی کی ہوگی۔

جواہر لال جب اپنی سوانح عمری میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ میں پیدائش سے ہندو، کلچر سے مسلمان اور تعلیم و عادات کے لحاظ سے انگریز ہوں تو اس میں نہ مبالغہ ہے نہ انکساری۔ یہ تو اصل میں اقرار ہے اس بات کا کہ اُنیسویں صدی کے آخر میں یو۔ پی کے ایک امیر کبیر اور تعلیم یافتہ گھرانے کا فرزند اپنے خاندان کے آداب، وسیع النظری، نفاست اور نزاکت کا سرمایہ سنبھالے ہوئے اُن صفات کو اپنے اندر جذب کر سکا جو یورپ کے ترقی یافتہ صنعتی ماحول کی پیداوار تھے اور صنعتی سرگرمی کے زمانے میں بیسویں صدی کے ہندوستان کو درکار تھے۔

اپنی سوانح عمری میں کہیں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کی [غیر صنعتی متوسط طبقے

کی — ظ!] سوسائٹی میں جو نرم روی، انسانیت اور روشن خیالی کا چلن تھا، اس کا مجھ پر اتنا اثر ہے کہ میں اس سے بری نہیں ہو سکتا اور میری جڑیں پچھلی صدی کے اُن ہی طور طریقوں میں اُتری ہوئی ہیں ——— یہ قدامت نہیں بلکہ ایک جدید "رِسن تھی رسس" کی پردہ داری ہے۔ اس میں وُہ روّیہ ہے جسے اقبال نے بڑی سادگی سے یوں کہا ہے ؎

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

گاندھی واد اور مارکسزم

کسی "شب کو سحر" کرنے کے لئے اُٹھنا بہت تیاریاں چاہتا ہے۔ اس کے لیے لا اور اِلّا دونوں مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جواہر لال نے عملی زندگی میں جو پہلا قدم رکھا وہی غلط پڑا۔ وکیلوں کے جوڑ توڑ اور گواہوں کے جھوٹ سچ میں وہ کھپ نہیں سکے۔ دو تین سال کی ناکام وکالت کے زمانے میں جب وہ پہلی دفعہ بانکی پور کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ اصل میدان کہاں ہے کام کرنے کا۔ پس ماندہ مُلکوں میں وکالت اور سیاست کا پیشہ ایسا ہے جو اوسط درجے کی رُوحوں کو خوب راس آتا ہے۔ سیاسی شہرت کی وجہ سے موکّل زیادہ ملتے ہیں اور زیادہ موکّلوں کی بدولت ووٹ کا تھوک بیوپار چل نکلتا ہے۔ شاید یہی سوچ کر موتی لال نہرو نے ہونہار بیٹے کو کانگرس کا ڈیلی گیٹ چنوایا ہوگا!

۱۹۱۶ء کی لکھنؤ کانگرس میں جب گاندھی جی سے مُلاقات ہوئی تو اس "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کی ایک عارفانہ نگاہ نے جواہر لال کو عوامی تحریک میں کھینچ لیا۔

گاندھی جی صرف ایک پالی ٹیشن نہیں تھے، نئے انداز کے ایسے سماجی ریفارمر بھی تھے جو کسی قوم کے ماضی کے گودام سے کچا مال حاصل کرنا چاہتا ہے اور پوری قوم کی پراگندہ رُوح ایک مرکز پر سمیٹ لیتا ہے۔ ایسے رہنماؤں کے یہاں مذہب، سیاست، طرزِ زندگی، طرزِ فکر ایک ہی قندیل کی گھومتی ہوئی تصویریں ہوتی ہیں۔

گاندھی جی کے گرد جو فلسفے، مذہب اور سیاست کا ایک ہالہ تھا۔ اس میں ہر ایک قد و قامت کے لوگ آن بسے تھے۔ کچھ اُنہیں صرف اوتار سمجھ کر اُن کے ساتھ تھے، کچھ اُن میں کرم یوگ کا نیا جلوہ دیکھتے تھے۔ کچھ نے اُن کی بساطِ شطرنج پر، نہتّے، کمزور بکھرے ہوئے ہندوستانی عوام کی بازی

جیتنے کا اُستادانہ ہاتھ دیکھا۔ کچھ لوگ ان کی مسکراتی ہوئی، اَن تھک اور بے لوث شخصیت کے جادو میں اسیر ہوگئے اور کچھ بے چارے اس لئے کہ گاندھی جی اور گاندھی واد کے سہارے کے بغیر وہ خود بالکل ہی "بچارے" رہ جاتے۔ اِس طرح گاندھی جی کا آشرم جو متحرک بھی تھا، ساکن بھی، سیاست اور تہذیب کے کئی ہلکے گہرے، صاف اور دُھندلے اثرات کا سنگم بن گیا تھا۔

وہ فلسفہ، جس نے بعد میں "گاندھی واد" نام پایا، مہاتما کا ایک آزمودہ ہتھیار بھی تھا اور پختہ عقیدہ بھی۔ آچاریہ ونوبابھاوے یا کاکا صاحب کالیکر نے اُسے دونوں حیثیتوں سے قبول کیا۔ لیکن جواہر لال نے اُسے ہتھیار یا پالیسی تو مان لیا، کامل عقیدہ کبھی نہیں بنایا۔ وہ صبر کے میٹھے پھل سے مُنکر نہیں ہوئے لیکن صابر بن کر جینا نہیں چاہتے تھے۔ یہی راز تھا اُن کے اور گاندھی جی کے درمیان بار بار اختلافات بڑھ جانے کا۔ اور اس اختلاف میں ابوالکلام اور بھولا بھائی ڈیسائی کسی قدر جواہر لال کے ہم خیال اور ہم قدم نکلے۔

گاندھی واد نے قومی آزادی کو منزلِ مقصود بنا کر گاؤں کی اقتصادیات کو پہلا پوئنٹ بتایا۔ گاؤں کو اپنی ضروریات کا مکتفی ہونے پر زور دیا تاکہ میٹرو پولی ٹن کی اقتصادی حکومت کی اصل جڑ کٹ جائے۔ بڑے شہروں کی مرکزیت ٹوٹنے سے اِمپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار پر بھی ضرب پڑے اور بدیسی انتظامی مشین کی چستی وچالاکی پر بھی۔ "کمیون" لفظ استعمال کئے بغیر یہ دیسی ساخت کے کمیون قائم کرنے کی ترکیب تھی جسے "پیرس کمیون" یا روسی کمیون سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ گاندھی جی کا چرخہ لنکاشائر، مانچسٹر اور برمنگھم کی دیو قامت مشینوں میں پھنسنے لگا تو بہت لوگ، جو ان مشینوں کی طاقت سے ہیبت زدہ یا مُتنفر تھے، چرخے کے میکانزم کا لوہا مان گئے اور قوم میں وہ یقین پیدا ہوا جو تقدیروں کے بدلنے میں فیصلہ کُن ثابت ہوا کرتا ہے۔

جواہر لال ان ہی معنوں میں گاندھی جی کے چیلے اور جانشین تھے کہ وہ اس راہ سے مُلک کے کسان، اس کی تباہ حالی، اس کی بے بسی اور یقین کی قوت سے آگاہ ہوئے اور بالآخر یُو، پی کے دیہات میں زرعی اور سیاسی ایجی ٹیشن چلاتے چلاتے دُور اُفتادہ انسانوں کے مزاج شناس ہو گئے۔ کیمبرج کی لائبریری اور لندن کے دھوئیں سے اُٹے ہوئے شہر نے جو بصیرت دی ہوگی وہ یک رُخی رہ جاتی۔ اگر گاندھی بابا نے اُنگلی پکڑ کر اُنہیں گاؤں کی کچی سڑکوں کے گرد و غبار میں نہ نہلایا ہوتا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۶۴ء میں آدھی صدی کا فاصلہ ہے لیکن جواہر لال کی تب کی تقریروں میں اُن کی

وصیت کا یہ ٹکڑا صاف مل جائے گا:۔

"... میری خاک کا بڑا سا حصّہ اُوپر لے جا کر اُن کھیتوں پر چھڑک دیا جائے جہاں ہندوستان کا کسان پسینہ بہاتا ہے تاکہ یہ خاک ہندوستان کی دُھول مٹی میں رل مل جائے ..."

نازپروردہ اور خودپسند جواہر لال، جنہیں اپنے فوٹو جمع کرنے کا شوق تھا، جنہیں خلافِ مزاج بات سُننے کی تاب نہ تھی، اس مشفق سادھو کے زخمی قہقہوں میں اپنے لئے ایک بڑی تربیت گاہ پاتے ہوں گے۔ نتھورام گوڈسے کی گولی سے پہلے کے تیس برس میں نہ جانے کتنی گولیاں گاندھی جی کے بدن میں پیوست ہو چکی تھیں اور وہ تھے کہ ہنستے اور چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ "چورا چوری" کے واقعے پر جب گاندھی جی نے ستیہ آگرہ کی تیز رفتار تحریک پر ایک دم بریک لگا دیا۔ گاندھی اِرون پیکٹ پر بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد جب انہوں نے صفائے قلب کے لئے ۲۱ دن کا برت رکھ لیا، ۱۹۳۴ء میں بہار کے تباہ کُن زلزلے کو جب گاندھی جی نے "چھوت چھات کے گناہ" کی سزا بتا دیا تو عہدِ حاضر کا باخبر آدمی، گاندھی جی کا چیلا اپنے گُرو پر بُری طرح بپھر گیا۔ لیکن گاندھی جی نے تھپک کر، چمکار کر پھر قابو پا لیا۔ مخالفانہ نقطہ نظر کو برداشت کرنے، اُسے اظہار کا پورا موقع دینے اور مخالفین کا استقبال کرنے میں ایک منزل آگے تک جانے کا یہ خاص ہندوستانی چلن جواہر لال نے اسی گورو کے چرنوں میں سیکھا تھا۔ اور یہی وہ خصوصیّت تھی جو ہندوستان کے وزیرِ اعظم کو، ڈکٹیٹرشپ کے تمام ساز و سامان اور جراثیم رکھنے کے باوجود اپنے زمانے کا مثالی ڈیموکریٹ بنانے میں کام آئی۔

مغربی سیاست کی بعض نمایاں ہستیاں، جن میں چرچل اور ٹرومین شامل ہیں، جواہر لال کو اور اُن کی خارجہ پالیسی کو برملا ناپسند کرتی رہیں۔ لیکن برسوں کی اس نکتہ چینی اور تجربے کے بعد جب جواہر لال نہرو کی شخصیت اور کاموں کا جائزہ لیا گیا تو صدر کینیڈی نے انہیں ابراہام لنکن اور جارج واشنگٹن کے طاقِ عبادت میں سجا دیا۔ اس مقام کو پہنچنے میں بہت کچھ گاندھی جی اور گاندھی واد کی دین تھی۔

لیکن دوسرا بڑا اثر، جس نے اپنے ملک کی تاریخ و سیاست کو باقی تمام دُنیا کے چوکھٹے میں لگا کر دیکھنا سکھایا، مارکسزم کا تھا۔

کیمبرج اور لندن میں، پیرس اور ہندوستان میں جواہر لال ایسی کتابوں اور "اہلِ کتاب" سے واقف ہو چکے تھے جنہوں نے مارکسی اندازِ نظر کو قبول کر لیا تھا، لیکن ہندوستان کی قومی تحریک، آزادی کی جنگ، کسانوں کے مسائل، الہ آباد میونسپلٹی کی چیئرمینی، چھوٹی سی ریاست نابھہ کی اڑھائی

برس کی قید، کانگریس کے اجلاس، متوسط طبقے کی بے خبری اور تنگ نظری، ارسٹاکریسی کے سیاسی اور سماجی چونچلے۔ ان تمام آنچوں میں تپنے کے بعد جب جواہر لال نے دوبارہ ۳۶ برس کی عمر میں یورپ کی سیر کی تو وہ یورپ اُن کی نوجوانی کا سہانا، سلونا یورپ نہیں تھا وہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کا یورپ نہیں تھا، اب اُس کے ذہنوں میں اور بستیوں میں ایک لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ فرانس، ہنگری جرمنی میں معلوم ہوتا تھا، کل صبح انقلاب ہو جائے گا۔ رُوس کے انقلاب (۱۹۱۷ء) نے تمام صنعتی دُنیا کی زمین ہلا دی تھی۔ زرعی ملک چین میں انقلابی فوج برسرِ پیکار تھی۔ ہر طرف مارکسزم کے فلسفے اس کی عملی قوت اور لینن کی تنظیمی صلاحیت کا چرچا تھا۔ روس کی کارگاہوں میں جو ہتھوڑے ٹھنا ٹھن بج رہے تھے اُن سے امیر زادوں کی نیندیں اُچاٹ اور لبرل سیاست دانوں کی پارلی منٹری جمہوریت کا ایوان لرزاں تھا۔

جرمن فلسفی کارل مارکس نے انگریزوں کے ترقی یافتہ علم پولیٹیکل اکانومی کو اپنی تحقیق کی بُنیاد بنایا۔ جرمن فلسفے کے اُستادِ اعظم ہیگل سے جدلیات کا طریقہ لے کر ایک محدّب شیشے کی طرح استعمال کیا اور سماجی مظاہر کی ایک ایک حرکت و سکون کو غور سے دیکھا۔ فرانس کی انقلابی مزدور تحریک کی منزلوں میں صنعتی دُنیا کے مستقبل کا سُراغ لگایا اور اس طرح فلسفے، تاریخ، سیاست اور اقتصادیات میں ایک ایسے بھرپور نظریے کا صور پھونک دیا جس کی بُنیاد سائنسی تحقیقات پہ رکھی ہوئی تھی، اتفاق سے اُن ہی سائنسوں پر، جن سے جواہر لال کو لڑکپن سے مرتے دم تک خاص تعلق رہا۔

بیمار بیوی کو ذرا افاقہ ہونے لگا۔ تو جواہر لال روا روی میں روس پہنچے۔ چار پانچ دن ٹھہرے۔ لینن کا انتقال ہو چکا تھا (ورنہ معلوم نہیں گاندھی اور لینن کی شخصیتوں کو جواہر لال کے اندر کہاں کہاں سرحدیں طے کرنی پڑتیں) انہوں نے صرف خانہ جنگی کا ملبہ اور نئی تعمیر کا ولولہ دیکھا اور جتنا کچھ دیکھا وہ ایچ، جی ویلز کے وسیع مطالعے پہ بھاری تھا۔

ایک دبی کچلی ایشیائی قوم کا بیدار فرزند یورپ کی نیم مشرقی قوم کے اس ہم ہمے میں، شور و شغب میں کھُردرے پن کی زندگی میں، بے سروسامانی کے باوجود انقلابی عزم میں خوابوں کا ایک جہاں دیکھ سکا جس کی تصدیق بعد میں گورو دیو ٹیگور نے کر دی۔

اے، کے سین نے نہرو کو "ترمورتی" کا ایک رُخ کہا ہے اور ترمورتی ہے: گاندھی، ٹیگور اور نہرو یہ سچائی کا صرف تہائی حصہ ہے۔ نہرو کے ایک رُوپ میں گاندھی اور ٹیگور آتے ہیں، دوسرے میں کارل مارکس

اور لینن اور تیسرے میں خود نہرو، جو عنقریب ختم ہونے والے اس دَور کا، اس دَور کی تمام ذہنی لرزشوں اور عملی آویزشوں کا بہترین نمائندہ ہے۔

اب جو نہرو، یوُرپ کے کئی ترقی یافتہ مُلکوں میں گھوم کر، باخبر لوگوں سے مِل مِلا کر سوویت یُونین کی ایک جھلک دیکھ کر واپس آئے۔ وہ گاندھی جی کے مطالبوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ وہ چھ لاکھ دیہات کے اس وسیع مُلک میں صنعتی مرکزوں اور صنعتی مزدوروں کے تاریخی رول سے آگاہ ہو چکے تھے اور ناپختہ، مگر جوشیلے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا دھڑکتا ہوا دِل بن گئے تھے۔ اب جواہر لال کی گفتگو میں صرف ہندوستان کی غلامی، اس کا عظیم ورثہ، شان دار ماضی، بدیشی مال کا بائیکاٹ اور نو آبادیاتی درجہ نہیں تھا۔ اب ان کے یہاں ہندوستان کی مکمل آزادی، اس آزادی کا دوسرے نو آبادیاتی کمزور مُلکوں سے گہرا رشتہ، یوُرپ میں اقتصادی بحُران کے آثار، اس کا ہندوستانی صنعتوں سے تعلق، کسان سبھا کی تحریک کے ساتھ بمبئی، کان پور اور کلکتے کی ٹریڈ یُونینوں کا پُرزور احتجاج، ہڑتال، مصر و فلسطین پر برطانوی دراز دستی، بلقان کی بندر بانٹ، ترکی کی نئی راہ اور دُنیا جہاں کے ایک ایک واقعے سے ہندوستان کی سیاست اور اُس کے مستقبل کا دیکھا اَن دیکھا سمبندھ اُبھر کر آتا تھا۔ گاندھی جی کی ناراضی کے باوجود انہوں نے دو سال تک کانگرس کی صوبائی کمیٹیوں میں مکمل آزادی اور سوشلزم کا ڈنکا بجایا اور بالآخر وہی ریزولیوشن، جو دس برس پہلے بھرے اجلاس میں ناکام ہو چکا تھا ۱۹۲۹ء میں پاس ہو گیا۔ ہندوستان پُورن سوراج کی منزل پر پہنچ کر دَم لے گا۔ یہ فیصلہ کرا لینا جواہر لال کی بھرپُور، سرگرم اور باخبر شخصیت کی ہی نہیں بلکہ ان بدلے ہوئے حالات کی بھی فتح ہے جنہوں نے دُنیا میں طاقتوں کے توازن کو اُلٹ پلٹ دیا تھا اور خوابیدہ قوموں کو مکمل آزادی کی آس بندھا دی تھی۔

اب جواہر لال نے "گھاس پات" پر بسر کرنا چھوڑ دیا۔ دھوتی کُرتے کی بجائے چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی یا کُرتے اور واسکٹ نے لے لی۔ چرخہ کارکنوں کے ساتھ اور نمک ستیہ گرہیوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ ناگ پور کی آل انڈیا لیبر کانفرنس میں بھی صدارت کرنے گئے اور مزدوروں کے مسائل کو وہ ہندوستان کی آزادی کے بُنیادی مسائل کے ساتھ جوڑنا بیان گئے۔

کھان پان، لباس، اندازِ گفتگو اور عادات میں یہ خاموش تبدیلی اُس نظریاتی تبدیلی کا ایک رُوپ تھی جو گاندھی واد اور مارکسزم، دیہات اور شہر، چرخہ اور مشین، ماضی اور مستقبل کے درمیان لمبی کشمکش نے ان کے وجود کے اندر پیدا کر دی تھی۔

زندگی کے ایک ایک سرچشمے سے سیراب ہونے والے ارسٹاکریٹ اور ڈیماکریٹ نے یہاں پہنچ کر اپنے زمانے کے اہم نظریوں اور غیر معمولی شخصیتّوں کے کاندھوں پر اُچکنے کے باوجود اپنی جھکلی ہوئی زمین پر اچھی طرح پاؤں گاڑ دئے تھے۔ یہ مشہور یونانی سورما آنکلی کی ایڑی تھی جو دھرتی ماں سے کبھی جُدا نہیں ہونے پائی اور جب جُدا ہونے کا وقت آیا تو وہ خود دُنیا سے اُٹھ گیا۔

... بہ ہر یک قدم دو سیر

لکھنؤ کے ایک کشمیری پنڈت [دیا شنکر نسیم] نے، کہتے ہیں کہ دہلی والوں کے بھیجے ہوئے ایک مصرع ؎

من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر

(میں کعبے کو جاتا ہوں اور میرا دل بُت خانے کی طرف)

پہ گرہ یوں لگائی تھی :۔

دارم زِ کفر و دین بہ ہر یک قدم دو سیر

(ایک ایک قدم پر دو لُطف حاصل ہیں، کفر کا بھی، دین کا بھی)

جواہرلال کے دِل و دماغ کے ساتھ زندگی نے اور بالآخر موت نے بھی، جو انصاف کیا۔ وہ ان کے ساتھیوں میں بہتوں کو نصیب نہ ہوا۔ قوم کو آزادی، امن اور سوشلزم کی منزل کی جانب لے جانے میں نہ قافلے سے بہت آگے نکل سکتے تھے نہ پیچھے رہ سکتے تھے۔ واسطہ سُبھاش چندر بوس جیسے طوفانی مزاج کے لوگوں سے بھی تھا اور راجندر پرشاد جیسے نیک بُزرگوں سے بھی، جن پر رومی کا کہا یاد آتا ہے کہ ؎

زیں ہمرہانِ سُست عناصر دِلم گرفت

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں، دوسری ذہنی تحریکوں کی طرح احیا پرستی (ریوائی وَلزم) کی زیریں لہر ہمیشہ چلتی رہی ہے اور گاندھی جی کے اثر و نفوذ سے اس کو اور بھی سہارا ملا۔ جواہر لال نہ گاندھی جی کے تمام خیالات سے رشتہ توڑ سکتے تھے۔ کیونکہ یہیں وہ ذخیرہ مہیّا تھا جو آگے کے سفر میں کام آتا۔ اور نہ رشتہ پوری طرح جوڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اوّل تو گاندھی جی کا بُنیادی نقطۂ نظر ہندوستان کے روشن ماضی کو، اس کے بکھرے ہوئے، پچھڑے ہوئے دیہات کو اوّلیت دیتا تھا اور جواہرلال سائینس کی نئی ترقیوں کے معترف ہو کر صاف دیکھ رہے تھے کہ مُلک کو بھاری صنعتوں کا جال پھیلانا ہے اور نتیجے میں مزدور طبقے کو آگے آنا ہے۔ پھر گاندھی جی انٹرنیشنل واقعات کو بھی صرف محدود نیشنل نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ نہرو نے اس کے برخلاف نیشنل واقعات کو انٹرنیشنل

نظر سے دیکھنا سیکھ لیا تھا۔ نتیجہ چاہے دونوں کا ایک ہی نکلے لیکن جیسا کہ ارل ایٹلی نے ایک جگہ کہا ہے:

"قوم پرستی اچھی خدمت گزار ہے لیکن بُری آقا ثابت ہوتی ہے۔"

گاندھی جی نے سمندر پار کی ساری دُنیا میں یُوں تو جواہر لال کی پالیسی کو چھُوٹ دے رکھی تھی۔ مگر جب وُہ وقت آیا کہ جواہر لال نہرو کا یہ بین الاقوامی ذہن دوسری جنگ عظیم کی بگڑی ہوئی رفتار دیکھ کر نازیوں اور فاشسٹوں کے مقابلے میں اتحادیوں کی ہمدردی جتانے لگا تو گاندھی جی برداشت نہیں کرسکے۔ ۱۹۴۱ء کی انفرادی ستیہ آگرہ اور ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑدو" تحریک میں جواہر لال نے گاندھی جی سے کچھ زیادہ ہی جیل کاٹی۔ لیکن وہ تھے اس نقطۂ نظر کے خلاف اور اُن کا ہم نوا اُن کے کیمپ میں کوئی نہ تھا۔ اس قومی اُبال کے دِنوں میں جواہر لال سب کے ساتھ تھے اور بالکل تنہا۔ پارٹی کے وقار، گاندھی جی کے احترام اور کاروان کی ہمراہی میں خوُد کعبے کو چلے جا رہے تھے اور دِل بُت خانے کی طرف تھا۔

پانچ سال کی اس مسلسل کش مکش نے بالآخر سارے بندھن توڑ دئے اُس وقت جب کلکتے اور دہلی میں آزاد ہند فوج کی حمایت میں عام بغاوت کا ہنگامہ گرم ہوا اور بمبئی اور کراچی میں جہازیوں نے بغاوت اور مزدُوروں نے ہڑتال کردی۔

جواہر لال کو جنگ جُوئی کے ان مناظر میں شکاگو کے مزدُور، مارسیلز کے باغی جہازی، نپولین بوناپارٹ کے لشکر، انقلاب فرانس کے محنت کش اور سفید پوش ترکی کے طالب علم اور مُسلح سپاہی برلن کے کمیونسٹ، پیٹرسبورگ کے بالشویک انقلابی اور اسپین کے جانباز اشتراکی پھر سے اُٹھتے دکھائی دئے ہوں گے!

۱۹۴۲ء کی تحریک کی افسوس ناک شکست کے بعد بین الاقوامی حالات کے ٹمپریچر نے جوانوں کا لہو گرما دیا تھا اور سیاسی صورت حال ایسی تھی جس کا اندازہ قومی آزادی کے فیصلہ کُن لمحے کا منتظر وہی جواہر لال کرسکتا تھا جس کی نگاہ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد آنے والے دَور پر صاف تھی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں یہ ایک ایسا موڑ آگیا جہاں وار دھا آشرم دم بخود ہو گیا۔ انقلابی گروہ خاص کر کمیونسٹ اپنے کمزور بازوؤں سے فیصلہ کُن جنگ نہ لڑسکے اور جواہر لال کی بین الاقوامی بصیرت نے اُنہیں تذبذب اور دو دِلی کے عالم سے نِکال کر سب سے آگے کھڑا کردیا۔ راج گوپال آچاری، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد، جو نہرو کے مقابلے میں برابر کے دعویدار تھے، اس طوفان سے افسردہ ہوگئے اور گاندھی جی کی جانشینی کا سوال قطعی طور سے طے پا گیا۔

آزادی کا جلوس بے قصور لوگوں کی لاشوں پر سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا اور ابھی ہندوستان و پاکستان کی حکومتوں نے دفتر نہیں سنبھالے تھے کہ جواہر لال نے پُرانے قلعے میں ایشین ریلیشنز کانفرنس کرڈالی۔ ہندوستان کی لُٹی پِٹی آزادی اپنے قدموں پر کھڑے ہونے سے پہلے ہی ہمسایہ قوموں کو آزادی کا پیغام دینے لگی۔ جواہر لال کے عمر بھر کے رفیقوں کے لئے یہ عجب تماشا تھا اور جواہر لال، جو قوم کے دُکھ سُکھ کو اقوام کے دُکھ سُکھ کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتے تھے، صدیوں کے سیاسی اور تہذیبی تعلقات کی انجمن سجائے ہوئے، بے برات کے دُولھا معلوم ہو رہے تھے۔

۱۹۳۵ء میں جواہر لال نے اپنی سوانح عمری لکھ کر تمام کی۔ اس میں ہمیں جنگ اسپین پر یہ خیالات ملتے ہیں :-

"جنگِ اسپین کا مجھ پر یہ اثر تھا کہ ہندوستان کا مسئلہ دُنیا کے دوسرے مسائل سے پُوری طرح وابستہ نظر آیا۔ چین، اسپین، ابی سینیا، فلسطین، وسطی یورپ اور ہندوستان کے سیاسی یا اقتصادی مسئلے، سب کے سب ایک ہی عالمی مسئلے کے مختلف پہلو تھے۔ آخری حل نکل نہیں سکتا، جب تک کہ اس ایک عالمی مسئلے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ کچھ عجب نہیں کہ آخری حل نکلنے سے پہلے ایک بڑا ہنگامہ برپا ہو اور تباہی کا سامنا کرنا پڑے۔ آج کی دُنیا میں جس طرح امن ناقابلِ تقسیم ھے اسی طرح آزادی بھی ناقابلِ تقسیم ھے۔ اور اب یہ بات بہت عرصے تک نہیں چلنے والی کہ دُنیا کا ایک حصّہ آزاد ہو، ایک حصّہ آزاد نہ ہو۔ فاشزم اور نازی ازم بھی شہنشاہیت کا چیلنج ہیں۔ یہ دونوں جڑواں ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ شہنشاہیت یا سامراج نے مقبوضہ علاقوں اور دبے ہوئے مُلکوں میں کارروائی کی اور فاشزم یا نازی ازم خود اپنے وطن میں وہی (جابرانہ) طریقے اختیار کرتا ہے۔ اگر دُنیا میں آزادی قائم کرنی ہے تو صرف فاشزم یا نازی ازم کا ہی خاتمہ نہیں بلکہ امپیریلزم کا بھی قطعی صفایا کرنا ہوگا۔"

ہندوستان کی خُون آلُود آزادی نے جواہر لال کو اپنی زندگی کے دوسرے سخت امتحان سے دوچار کیا۔ ایک ایسا شخص، جس نے زندگی کے کڑے کوسوں میں ہمیشہ محبّت اور عزّت کی گھنّی چھاؤں پائی تھی، جس نے راحت، مسرّت، علم اور خبر کی ہر ایک دولت سے فیض اُٹھا کر اجزا کے اختلاف میں "کل کا تماشا" کیا تھا، جس نے اپنے وجود کی سب سے بڑی شادمانی کو، قوم کی شادمانی میں حل کر دیا تھا، سیاسی اور مذہبی جنون میں قومی تباہی کا منظر بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور خود اس کے رفیق اپنے

اتھلے ذہنوں کی بدولت حریف بن گئے تھے۔

قومی ٹریجڈی گاندھی جی کی شہادت کے ساتھ اپنے نقطۂ انجام کو پہنچ کر گزر گئی۔

باہمہ اور بے ہمہ

اب نئے آزاد ہندوستان کی تعمیر کا اور باقی دُنیا سے اس کے تعلقات کا مسئلہ درپیش تھا۔ بین الاقوامی سیاست کی اُونچ نیچ نہرو کی آنکھوں کے سامنے تھی اور اس میں اشتراکی نظریات کا ایک ہمسایہ مُلک کی حدوں سے نکل کر عالمی نظام میں تبدیل ہو جانا سب سے نمایاں حقیقت تھی جس کے مستقبل سے نہرو بھی واقف تھے اور نہرو کے ری ایکشن سے اُن کے نکتہ چین بھی۔ اشتراکیت کی مداحی کے باوجود کسی ایک سیاسی اور معاشی نظریے کو پُوری طرح نہ اپنانے کی وجہ سے ہندوستان کا وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بین الاقوامی سیاست کے مطلع پر ایسا روشن ستارہ بن گیا جسے جذبِ باہم کے نظام میں نہ معلوم کہاں جگہ بنانی تھی۔

تہذیبی اور سائنسی معاملات میں نہرو کے خیالات بالکل واضح تھے۔ وہ تاریخ عالم کی متحرک قوتوں کے ساتھ جانا اور مُلک کو لے جانا چاہتے تھے۔ نہرو کی اپنی شخصیت کی طرح قدیم اور درمیانی صدیوں کے ہندوستان کی گنی چنی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے وہ آزاد قوم کو عہد جدید کی برکتوں سے فیض یاب کرنا چاہتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی میں، سائنس کانگرس میں تاریخ کی کانگرس میں، ایٹمی انرجی کمیشن کے سامنے، یونی کافے کے سامنے اور خود یُو، این، او کی جنرل اسمبلی میں جو تقریریں انھوں نے کیں وہ ان کے ایسے خیالات کا آئینہ تھیں جنھیں تہذیب، سیاست اور اقتصادیات کے نیشنل اور انٹرنیشنل نظریات کا ایک سنگم کہنا چاہیئے۔

نیا ہندوستان اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتا تھا اور نہرو اُس کے ترجمان تھے۔

خارجہ پالیسی میں غیر جانب داری، ہر سوال کو پرکھنے اور تب فیصلہ کرنے، اپنی آزاد رائے قائم رکھنے کے اعلان نے امریکہ کے اہل اقتدار کو مایُوس کیا اور منصوبہ بند اکانومی کے چرچے نے وہاں کے اُن سرمایہ داروں کو شبہ میں ڈالا جو سمجھتے تھے کہ دُنیا کے تین بڑے سامراجوں کے ٹوٹ جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے اُس میں اوّل ہندوستان کو اور پھر چھوٹی بڑی قوموں کو بہر حال امریکہ کی مالیاتی اجارہ داریوں سے ہر شرط پر معاملہ کرنا پڑے گا۔

مارشل اتالن کی سنٹرل کمیٹی ابھی تک ہندوستان کو برطانوی کامن ویلتھ کی چلمن سے جھانکتے دیکھ رہی تھی۔ اسے گاندھی جی کی طرح نہرو پر بھی کچھ اعتبار نہیں تھا۔

چین میں کمیونسٹ پارٹی کی مکمل فتح کے بعد امریکن لابی نے تبت کی چھت کی طرف اُنگلیاں اُٹھائیں

اور خطرہ دکھایا۔ سمجھاؤ بھی دئے۔ جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کا ایک مضبوط فوجی بلاک بنانے کی شہ بھی دی۔ کئی سال تک امریکہ کا ہاتھ ہندوستان کی طرف پھیلا رہا۔ لیکن یہ دستِ سوال نہیں تھا۔ دستِ شفقت تھا اور جب نہرو کی خارجہ پالیسی نے اس سے باوقار تغافل برتا تو مجبوراً پاکستان کو تھپ تھپا کر بغداد پیکٹ میں لپیٹ لیا گیا۔

صنعتی سرگرمیوں کی راہ پر نہرو کے ہندوستان کو بہرحال بڑھنا تھا ہی، لیکن تہذیب کی طرح اس بنیادی مسئلے پر کئی متضاد اور مخالف نظریے صف بند کھڑے تھے۔ گاندھی واد کا معاشی نظریہ جہاں دیہاتی صنعتوں اور کھادی کے فروغ پر زور دیا گیا ہے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے بعد کے نظریات جن میں سرکار کی طرف سے کم از کم دخل اندازی (Laissez faire) پسند کی جاتی ہے وسط یورپ خاص کر جرمن قوم کی صنعتی ترقی کی مثال، جو ہندوستانی متوسط طبقے کے لئے [جس کے مشترکہ خاندانوں میں صدیوں سے سرمایہ فراہم کرنے کا رجحان ایک عادت بن گیا ہے] بڑی کشش رکھتی ہے۔ امریکہ کی اقتصادی خوش حالی، جو دو صدیوں کے تھوک بیوپار پر قائم ہوئی تھی اور پھر قومی اکانومی کو پیداوار اور تقسیم دونوں میں منصوبہ بند کرنے کا اصول، جس کی کامیاب مثال روس نے دنیا کی اقتصادیات کے سامنے رکھی ہے اور جس میں استعمالی اشیا کی پیداوار روک کر تمام قومی ذرائع بھاری اور بنیادی صنعتوں کی تعمیر پر لگائے گئے تھے۔

جواہر لال نے مغربی ملکوں کے سرمایہ دارانہ نراج میں نوآبادیوں کی جو لوٹ اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ روس کی اقتصادی منصوبہ بندی کو وہ راہِ نجات سمجھتے، یہی ہوا بھی۔ انہوں نے کانگرس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ایک پلاننگ کمیٹی کی بنیاد ڈال دی۔ بعد میں جو سیاسی رہنما ان کی مخالف صفوں میں کھڑے ہوئے، ان میں سے کئی ایک جواہر لال کے ساتھ پلاننگ کمیٹی میں کام کر چکے تھے۔ قوم جب سیاسی طور پر آزاد ہو جائے گی تو اقتصادی آزادی کی منزل پر پہنچنے کی تدبیر کیا ہوگی، اس کا جو نقشہ جواہر لال کی کوششوں سے کاغذ پر منتقل ہوا۔ وہ نہ پوری طرح گاندھی واد کا تھا، نہ مارکسزم کا، نہ مغربی "جمہوری" سرمایہ داروں کا۔ بلکہ یہاں پھر ہمیں ایک اقتصادی سنگم نظر آتا ہے۔ ملی جلی اکانومی کی وہ تصویر ابھرتی ہے جسے جواہر لال نے خود "ڈیموکریٹک پلاننگ" سے تعبیر کیا تھا۔

۱۹۵۰ء میں انڈین ری پبلک قائم ہوتے ہی پہلا پنج سالہ پلان طے پایا اور جس کی روح جواہر لال کے ہشت پہل تصورات سے اُتری تھی، کسی ایک مقررہ اقتصادی نظریے کے سانچے میں نہیں ڈھل سکی۔

ہندوستان کو بھاری صنعتوں کی تعمیر کے لئے غیر مُلکی سکّے کی بھاری رقم چاہیئے تھی۔ ایکسپورٹ کی آمدنی کا ایک تہائی سے زیادہ سرمایہ باہر کے مُلکوں سے غذا خریدنے میں نکل جاتا تھا۔ مارکسی اقتصادیات کے مطابق بھاری اور بُنیادی صنعتوں کی تعمیر سے اشتراکی انداز کا اقتصادی ڈھانچہ بننا چاہیئے تھا۔ لیکن پہلے پلان میں غذائی پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا اور پن بجلی پر وجیکٹوں پر، جن سے چھوٹی بڑی صنعتوں کو بھی آگے چل کر بجلی ملے اور کھیتوں کی پیاس بجھے۔ پہلا پلان درحقیقت ایک زرعی مُلک کی ترقی کا پلان تھا۔

دوسرے پانچ سالہ پلان میں مُلک کے بجلی کرن پر' بھاری اور بُنیادی صنعتوں پر زور دیا گیا۔ پہلے ہی پلان کے تجربے سے ثابت ہو چکا تھا کہ ہندوستان کا بڑا سرمایہ دار دیسی رجواڑوں کی طرح کمزور اور بے بس نہیں ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے برّ اعظموں میں سب سے زیادہ منظّم، مضبوط، باا ثر اور باخبر سرمایہ دار طبقہ جو ہندوستان میں پچھلی صدی کے اندر اُبھرا ہے، آسانی سے اقتصادی منصوبہ بندی کو چلنے نہیں دے گا۔ بھاری صنعتوں اور بجلی کرن میں سرکاری اجارہ داری کو وہیں روکے رکھنے کے لئے اس کے پاس مثبت اور منفی کئی آزمودہ حربے موجود ہیں اور ملک کی صنعت کاری میں اس کی اپنی اُمنگیں سوشلسٹ نظریات سے بالکل مخالف سمت رکھتی ہیں۔

منصوبہ بندی اور سرکاری سرمایے کے اضافے کے ذریعے جواہر لال مُلک کو جس خوش حالی کی راہ پر لے جانا چاہتے تھے وہ راہ اور لمبی ہو گئی اور اپنی کیبنٹ میں، جن پر تکیہ تھا، وہی پتّے ہوا دینے لگے۔

جواہر لال اگرچہ سوویت یُونین کے متعلق بہت پہلے یہ رائے ظاہر کر چکے تھے کہ اتنے قریبی ہمسایے سے ہندوستان بے تعلق نہیں رہ سکتا، لیکن حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد وہ خود کو بَین بَین سنبھالے ہوئے چلے جاتے تھے۔ (شاید انہیں خود بھی اندیشہ تھا کہ سوویت یُونین ابھی اس قابل نہیں ہے کہ صنعتی ترقی کے پروگرام میں ہندوستان کی مدد کر سکے) لیکن اِدھر پاکستان نے بغداد پیکٹ کے ذریعے امریکہ سے ناطہ جوڑا۔ اُدھر نہرو اور کانگرس نے احتجاج کیا کہ سرد جنگ ہمارے دروازے تک آ گئی ہے اور ابھی یہ شور احتجاج برپا تھا کہ نہرو کو سوویت یُونین کے نئے انتظام اور ہوش مند دماغوں نے بُلاوا بھیج دیا اور اس زور و شور سے استقبال کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

جون ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کے وزیر اعظم کی یاترا اور پھر جواباً خروشچیوف اور وزیر اعظم بُلگانن کا ہندوستان آنا، یہ انٹرنیشنل واقعات کے دباؤ کا ایسا نتیجہ سمجھنا چاہیے جس سے جواہر لال کی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو گئی۔

یہ ہندوستان کی تاریخ اور سیاست کا اہم موڑ تو ضرور تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ صفیں بھی

دوسری طرف کو مڑنا شروع ہوگئیں جو آج تک نہرو کی رہنمائی میں کانگرس کے ساتھ جیسے تیسے چلی جا رہی تھیں۔ آزادی کے اجلاس اور روس کی دوستی نے جواہر لال کو ہمت کے ساتھ ایک سمت میں تیزی سے بڑھنے کا موقع دیا تھا لیکن بڑی سے بڑی تعداد کو ساتھ لئے بغیر وہ کیسے جست لگاتے! اُن کی تنہائی اور بڑھنے لگی۔

گاندھی جی کے گرام سدھار کو جواہر لال نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے نام سے نیا ذہن دیا اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق پر پُرزے بھی لگائے۔ مگر یہاں پھر وہی دشواری پیش آئی جو دو بڑے پلانوں کی کامیابی میں حائل تھی۔ کاغذ پر نئے نقشے کھینچے جا سکتے ہیں لیکن کاغذی پیرہن کے ساتھ وہ لوگ نہیں پیدا کئے جا سکتے جو ان پلانوں کو عملی صورت دے سکیں۔

کانٹوں بھری راہ پر تنہا

اس کے بعد کے آٹھ سال جواہر لال کی زندگی کے بڑے دردناک سال ہیں۔ وہ شخص جو اپنی جوانی میں انتخابی مہم کے سلسلے میں چند مہینے کے اندر ۳۳ ہزار میل کا طوفانی دورہ کر چکا تھا اور دشمنوں کے قلعے پر قلعے فتح کرتا نکل گیا تھا، جسے مخالف طبقوں اور گروہوں کا اعتماد حاصل تھا، جو ایک ہی تقریر میں زمین سے آسمان تک زقند بھرتا تھا، اب اس کے لئے خود اپنی پارٹی کی بساط پر ایک ایک مہرہ اُٹھانے بٹھانے میں دشواری ہونے لگی۔

موت سے پہلے یہ آخری آٹھ سال جواہر لال کی زندگی کی شدید محنت، سخت مقابلوں، جان توڑ کوششوں کا اور اسی کے ساتھ دُکھ بھری ناکامیوں کا منظر پیش کرتے ہیں۔

عربی شاعر ابنِ ہانی کہتا ہے ؎

وَاِذَا کَانَتِ النُّفُوسُ کِبَاراً
تَعِبَتْ فِی مُرَادِھَا الْاَجْسَامُ

(جب ہستیاں بڑی ہوں تو اُن کے مقاصد بھی اُونچے ہوتے ہیں اور وہاں تک پہنچنے میں بدن تھک کر چور ہو جاتے ہیں)

اگر جواہر لال کی شخصیت یا اُن کی سیاست یک رُخی ہوتی، کسی ایک مقررہ سانچے میں ڈھلی ہوتی تو اس طرزِ فکر کے لوگوں کو پوری طرح ساتھ رکھنا اُن کے لئے آسان تھا۔ مگر فکر و عمل میں، فرد اور جماعت میں، تہذیب و سیاست میں وہ رنگا رنگی کے قائل تھے، ایک ایسے امتزاج کے حامی تھے جس میں مختلف نظریوں، عقیدوں اور سانچوں کا بہترین نچوڑ آ گیا ہو۔ وہ فکری اور سماجی انقلاب کو پُر امن

ارتقا کی راہ سے گزارنا چاہتے تھے۔ سیاسی آزادی کا سارٹیفکیٹ تو ہماری قوم نے پورا امتحان دئے بغیر پالیا لیکن اقتصادی اور تہذیبی آزادی کی راہ اس سے کچھ سوا قربانیاں طلب کرتی ہے۔ وہاں جواہر لال کو بھاری ذہنوں اور تنگ دماغوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس گروہ کا ئے جسے جواہر لال نے گاندھی جی کی طرح اپنے ساتھ چلنے کو تیار نہیں کیا تھا۔ اور چونکہ ستر سال کی عملی تربیت اور ذہنی ترتیب نے انہیں مِل جُل کے چلنا، مخالف نظریوں کے درمیان سے راہ نکال لینا، اپنی رائے کو ہر وقت ترمیم کے لئے تیار رکھنا سکھایا تھا۔ وہ کبھی دھارے کے خلاف جارحانہ تیور سے ڈٹ کر نہیں کھڑے ہوئے۔

جواہر لال اپنی ایک رائے قائم کرکے، اسے آخری اور اٹل سمجھ کر دوسروں سے منوانا نہیں جانتے تھے۔ اس صفت کے لئے جلالی کردار کے علاوہ ایک اور شے بھی چاہیئے۔ وہ ہے تنگ نظری یا ذہن کا یک رُخاپن۔ وہ اپنی رائے پر اُس وقت تک اصرار کرتے تھے جب تک اس کے خلاف دلیلوں اور رایوں کا انبار جمع نہ ہو جائے۔ کوئی رائے ان کے لئے قطعی اور آخری نہیں تھی، کوئی عقیدہ یا نظریہ ناقابلِ شکست کلیہ نہیں تھا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار کرتے کرتے، مخالف رائے کی معقولیت کی وجہیں تلاش کرنے لگتے تھے اور اس طرح ترمیموں کی پیچ در پیچ گلیوں سے گزر کر ان کی رائے، ان کی نظر اپنی سیدھ کھو بیٹھتی تھی اور رائے عامہ کے ساتھ ہو لیتی تھی۔ اسے بعض لوگوں نے تذبذب اور سمجھوتہ بازی کہا ہے۔ لیکن اس مزاج اور برتاؤ کی جڑیں اشوک، اکبر اور گاندھی کے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی تاریخ میں دبی ہوئی ہیں۔ یہی اس کی قوت اور یہی اس کی کمزوری کا راز ہے اور اسی عمل کی بدولت یہ تہذیب کہہ سکتی ہے ؎

مثلِ سبزہ بارہا روئیدہ ایم   صد ہزاراں صد چو قالب دیدہ ایم

[سبزے کی طرح ہم سوکھ کر بارہا اُگے ہیں۔ اور ہم لاکھوں سانچوں میں ڈھل کر نکلے ہیں]

جواہر لال نے کانگرس کے اوادی اجلاس میں سوشلسٹ انداز کا سماج منوا لیا اور یہ اُن کی پچاس برس کی جد و جہد کا حاصل تھا۔ بنڈونگ کانفرنس میں "پنچ شیل" کا مقدمہ جیت لیا۔ یہ اُن کی خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کی اخلاقی جیت تھی۔ ایک ہی وقت میں روس، امریکہ، مغربی جرمنی اور برطانیہ سے مدد لے کر چار بڑے فولادی دلیہ قومی صنعت کے حوالے کر دئے۔ نجی صنعتوں میں مغربی سرمایہ داروں کو سرمایہ لگانے کی شہ دے دی اور قومی ملکیت کی صنعتوں میں اشتراکی ملکوں کی امداد حاصل کر لی۔ تاریخِ عالم کا یہ بے مثال کارنامہ کسی چال بازی یا ریا کاری کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس میں جواہر لال کی پہلودار شخصیت اور اس لچکیلی پالیسی کا فاتحانہ جال پوشیدہ ہے جس کے نزدیک ہر مسئلے کے دو نہیں، دو سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں۔ جس کے نزدیک کوئی تصویر سفید و سیاہ رنگ سے تیار نہیں ہوتی۔ بہت سے

ہلکے اور گہرے رنگوں کی مِلاوٹ سے بنتی ہے۔ جس کے نزدیک کائنات کے تمام مناظر حق و باطل کی دو علیحدہ صفوں میں تقسیم نہیں ہوا کرتے۔ جس کے نزدیک زندگی کے ماہ و سال دِن کی روشنی اور رات کی تاریکی کے دو پہیّوں پہ اپنا سفر طے نہیں کرتے بلکہ وقت کی گنگا جمنی کیفیت کے تمنّائی رہتے ہیں۔

جواہرلال اپنی زندگی کی آخری منزلوں میں وہ دِن دیکھنے کے لیئے بے تاب تھے جب ان کے خوابوں کا ہندوستان تعبیر سے آشنا ہو۔ جب وہ اپنی عظمتِ رفتہ سے فیضان (اِنسپریشن) اور حوصلہ تو پائے۔ مگر اس کی طرف اُلٹے پاؤں نہ جائے۔ جب وہ آزاد قوموں کی سبھا میں بلند مقام تو ہو لیکن نیشنل شاونزم (قومی عصبیّت) کے موذی مرض میں گرفتار نہ ہونے پائے۔ جب ہندوستان اشتراکیت کے انداز کو تو قبول کرلے، لیکن اسے مذہب کے اندھ وِشواس میں تبدیل نہ کرے۔ جب مادّی خوش حالی کے ساتھ علم و ہنر کے سرچشمے اتنے عام ہوجائیں کہ ہندوستان کی پُرانی صد رنگ قوم یک رنگی اور بے نمکی میں مُبتلا نہ ہوجائے، کسی ایک سِمت پر شدّت نہ ہو اور پُرانے تعصّبات پر اصرار کی عادت نہ ہو۔

ان مقاصد تک پہنچنے کے لئے مُلک کو اور مُلک سے پہلے کانگرس کے صفِ اوّل کے رہنماؤں کو اپنے رفیقانِ ہم سفر کو پُرانے خول سے باہر نکالنا ضروری تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی دُنیا کے مسائل اس سے پہلے کی دُنیا سے بہت کچھ مختلف تھے۔ مگر وہ لوگ اس زبردست تبدیلی کا استقبال کرنے کو تیار نہ ہوسکے۔ مُلک کے اندر کی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور باہر مُلکوں کی شطرنج سی پلاننگ میں کرشنا مینن، یہ دو بازو تھے جواہرلال کے۔ اور شدید امتحان کے دو نازک لمحوں میں ایک کے بعد دونوں جُدا ہوگئے۔ جواہرلال کی زندگی کے آخری آٹھ سال کو ایک گراف بنا کر سخت جدوجہد اور سخت ناکامی کی دو متوازی لائنوں میں دکھایا جاسکتا ہے۔ ۴۵-۵۰ سال کے سیاسی اور ذہنی معرکوں نے جواہر لال کو جو کچھ سکھایا تھا، انہوں نے وہ سب ان چند برسوں میں داؤ پر لگادیا۔ اور نصف صدی میں اُن کی شخصیّت کی ہمہ گیری اور عالم گیری پھر سمٹ کر اسی نقطے پر آگئی جسے وجود کی تنہائی کہتے ہیں۔ جواہر لال کی صد جلوہ شخصیّت ہجوم میں رہ کر کس قدر تنہا ہوگئی تھی!

خاتمۂ کلام

وجود و عدم کا یہ جوکھٹا اس خاموشی سے اپنا طول و عرض بدل رہا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہماری صدی کا خاتمہ رُوئے زمین کو کس کس رنگ میں رنگا ہوا دیکھے گا، لیکن یہ پیش گوئی کرنا آج بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک تیز گہرا رنگ پُورے رقبے کے لئے ناکافی رہے گا، کوئی ایک نظریہ مکمل، قطعی اور فاتحِ عالم نہیں ہونے والا —— کہیں کسی ایک ٹیڑھی سی لکیر پر کئی ایک رنگ مِل مِلا کر جینا

سیکھ لیں گے۔ آدمی کی مقناطیسی بے چین اور متحرک شخصیت فلسفے اور ریاست کے نپے تلے فارمولوں میں کبھی دیر تک ٹھہر نہیں سکی اور اب تو وہ اتنی پھرتیلی، ہنگامہ خیز اور قدآور ہو گئی ہے کہ زمین کی حد بندیوں تک میں رہنے کو تیار نہیں۔

تہذیبوں اور سیاستوں کے، فلسفوں اور ریاستوں کے طویل سلسلے کہاں کن نقطوں پر سنگم بنائیں گے، کچھ ابھی کہا نہیں جا سکتا۔ ہر ایک فارمولا انسان کی بلند بالا شخصیت کے گھٹنوں سے اوپر نہیں پہنچ رہا ہے۔ اور وہ وقت ہے کہ فارمولوں کے گز سے آدمی نہیں ناپے جائیں گے، آدمی کے عمل سے فارمولوں کا قد و قامت طے کیا جائے گا۔

۲۱ ویں صدی کا مورخ جب ہماری تحریک آزادی کے ان پچاس سال کا بھرپور جائزہ لے گا تو وہی بتا سکے گا کہ جواہر لال نے اپنی ہشت پہل پالیسیوں سے، اپنی ہمہ گیری سے، اپنے اثر و اقتدار سے اس ملک کو خاموشی کے ساتھ اشتراکیت کے اعلیٰ مقاصد کی طرف بڑھایا تھا یا اشتراکیت کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے اس کی رفتار میں بریک لگا دیا تھا۔ لیکن یہ ایک برہنہ اور بے رحم حقیقت ہے کہ ۱۹۶۰ء ختم ہوتے ہوتے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام سُست اور بعض جگہ بالکل ناکام ہو گیا۔ دولت کی تقسیم میں اشتراکی مساوات کی بجائے سرمایہ داری مزاج بڑھ گیا۔ صنعتی انقلاب میں قومی سرمایے کو پرائیویٹ سرمایے نے دبا لیا اور ہمارے عہد کے ایک سائنسی عقیدہ رکھنے والے زبردست عقلیت پسند وزیراعظم کے آنکھوں دیکھتے پرانے تعصبات اور جذامی مذہبیت نے تندرست انسانوں تک کو مُہلک مرض لگا دیا۔ سیکولرازم کے آئڈیل کو تباہ کر ڈالا اور بالآخر وہ ہوا جس کا خود جواہر لال کو سان گمان نہ تھا۔ اشتراکی چین کی فوج سے خون ریز معرکہ، جس نے جواہر لال کی چٹان جیسی شخصیت کو بدحواس تو نہیں کیا، البتہ ہمارے ملک کی اشتراکی رفتار کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالا۔

جنگی محاذ پر جو تدبیریں بھی کی گئیں، ان کا حال ہر اُس شخص کو معلوم ہے جس کی جیب میں روپے کا وزن کم ہو گیا ہے۔ لیکن ذہنی اور سیاسی محاذ پر جواہر لال نے سنگِ سخت کا جواب سنگِ سخت سے دیا اپنے طور پر۔ بھونیشور میں کانگریس کا اجلاس، اس اجلاس میں جواہر لال کی انتہائی کوشش کہ اشتراکی مقصد کا مفہوم بہت صاف کر دیا جائے اور کانگریس پارٹی، کانگریس گورنمنٹ ملک کو تیزی سے اس سمت لے چلیں، یہ ان کی زندگی کی آخری اور سب سے بڑی کوشش تھی اور کامراج پلان سیاسی شطرنج کا ایک بے پناہ اُستادانہ ہاتھ۔

بس، یہ معراج تھی اس زندہ وجود کے کارناموں کی جسے اپنے باپ کے جلال سے، اپنے اُستادوں کی شفقت سے، اپنے خاندان کی نفاست سے، اپنے پڑوسیوں کے ہنگاموں سے، اپنے شہر کے فلسفیانہ سنّاٹوں سے، اپنی گنگا میّا کی نرم رفتاری سے، اپنی قوم کے دُکھ سُکھ سے، اپنے محنت کشوں کے لہو پسینے سے، اپنے سچے رفیقوں سے، اپنے انٹرنیشنل تعلقات کی نزاکتوں سے، اور اپنے چاہنے والے مردوں عورتوں سے بھرپُور محبّت کرنا نصیب ہوا۔

جواہر لال نے بڑی بھری پُری زندگی پائی۔ وہ قوم کے "معشوق ہزار شیوہ" تھے اور قوم نے اُن کے ناز بھی ایسے اُٹھائے کہ اس ایک ہزار برس میں شاید کسی کے اُٹھائے ہوں۔ وہ مذہب کے مُنکر بھی تھے مشکک بھی تھے اور رام اور کرشن کی مُورتیوں کے بیچ میں ان کی تصویر گھر گھر لٹکی ہوئی ہے۔ بہتوں نے تو اُن کو وشنو کا دسواں اوتار مانا اور ہندوستانی مُسلمان نے انہیں اپنا نجات دہندہ جانا۔

اس ایک شخص پر تہذیبوں اور سیاستوں کے کتنے سلسلے آکر مِل گئے تھے! کتنے بہت سے رنگوں میں جواہر لال کی دلرُبا تصویر بنتی ہے! جس عقیدت کے وہ عمر بھر مُنکر رہے وہی عقیدت اُن کو بھرے خزانے ملی۔ تاریخ اپنے آپ کو سطحیں بدل بدل کر دُہرایا کرے لیکن اب اس پہلو سے تو نہیں دُہرائے گی۔ جواہر لال کے ہوتے یہ بہت سی زبانوں، مذہبوں، رسموں، رواجوں، عقیدوں، نظریوں اور تنظیموں کا رنگ برنگا بانکا سجیلا دیش کیسا بھرا بھرا لگتا تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہوں یا نکیتا خروشچیوف، شیخ عبداللہ ہوں یا کرشنا مینن، آچاریہ ونوبا بھاوے ہوں یا مشری پت، آمرت ڈانگے سب جواہر لال کی رنگ برنگی شعاعوں سے تارِ نظر جوڑے ہوئے تھے اور ان کے قلبی رشتوں میں جُڑے ہوئے۔

اب جواہر لال نہیں ہیں۔ وہ اپنا کام پُورا کر کے "صد گونہ زخم ہائے تمنّا لئے ہوئے" سدھار گئے اور اس گھر کے کواڑ چوپٹ کھُلے پڑے ہیں۔

جُز آں کی محفل افروز درخانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست
(غنیؔ کاشمیری)

[جب وُہ محفل سجانے والا ہی گھر میں نہ رہا تو پھر اس سے زیادہ سُنسان اور کون گھر ہو گا؟] بزبانِ اقبال

لٹوین نظم : مرڈزا کیمپ

اُردو ترجمہ : نذیر بنارسی

راکھ کیا گا رہی ہے سُنو

[نہرو کی وصیّت کی بُنیاد پر لکھی گئی لٹویا (روس) کی ایک خاتون مرڈزا کیمپ کی نظم کا ترجمہ]

ایک بیباک شعلہ تھا میں
آج شعلہ نہیں راکھ ہوں
راکھ کیا گا رہی ہے سُنو
اور اُوپر بُلالو ہمیں
آسماں تک اُٹھالو ہمیں
راکھ ہوں اور بیدار ہوں
چاہتی ہوں کہ اُڑ جاؤں میں
راکھ کیا گا رہی ہے سُنو
نیلے پُر شوق آکاش پر
اور پھر نیلے آکاش پر
اس طرح سے بکھیرو مجھے
ماں کی چھاتی پہ بو دو مجھے
میں اُسے ڈھک لوں اچھی طرح
پھیل کر اور نرمی کے ساتھ
بھر کے لہجے میں معصومیت
پُوچھوں گی کر کے سرگوشیاں

لال تیرا ترے پاس ہے
ماں تجھے بھی کچھ احساس ہے
جیتے جی اور مرنے پہ بھی
شعلے اور راکھ کی شکل میں
ہر طرح ماں ترے لال نے
خُود کو تیرے حوالے کیا
ہِل گیا سُن کے ماتا کا دِل
بے زبانی زباں ہو گئی
مادرِ ہند کہنے لگی
میرے لال اے جواہر مرے
ہر جگہ ساتھ ہوں میں ترے
میں اجازت نہ دوں گی تجھے
ایک لمحہ بھی آرام کی
لوٹ چل موت کے گھاٹ سے
میں اُترنے نہ دوں گی تجھے
سُرخ ہنستے ہوئے سے گلاب

جن کی تازہ کلی کے لئے
ماں کے سینے میں دل کی طرح
اب تری راکھ بیتاب ہے
پر تری زندگی کا کمل
مجھ میں کھلتا رہے گا سدا
راکھ کیا گا رہی ہے سُنو

موجِ دریا کی مانند میں
بے نیازِ اسیری رہا
ماں ترے ہاتھ ہے میری ساکھ
میں ہوں اب سبز خاموش راکھ
راکھ کیا گا رہی ہے سُنو

جس کی لہروں میں کھیلا ہوں میں
دیکھتی ہوگی وہ میری آس
مجھ میں سے لے کے اک مٹھی راکھ
جاؤ تم لوگ سنگم کے پاس
اور جاکر وہاں شوق سے
راکھ کو نذرِ دریا کرو
موج جھولا جھولاتی ہوئی
جاکے گنگا میں مل جائے گی
اور گنگا کی لہروں سے میں
ہر سمندر میں آجاؤں گا
جتنے دُنیا میں انسان ہیں
سب کے ذہنوں پہ چھا جاؤں گا
جو خیالوں میں آباد ہو
کوئی اس کو اجاڑے گا کیا
مجھ سے آ آ کے پوچھیں گے وہ
درحقیقت جو انسان ہیں
امن کے دوست یہ تو کہو
کیوں تم آرام کرتے نہیں
تب وہ موجِ رواں جس کے سر
تاج ہوگا مری راکھ کا
یوں محبت سے دے گی جواب
آؤ مل لو گلے سے گلے
پھر لگا کر گلے سے گلے
اور اک دوسری موج کو
اپنے احسان کے بار سے
سب کے سر کو جھکاتی ہوئی
سب کو دیتی ہوئی زندگی
اور با عالمِ اضطراب
لے کے ساتھ اپنی بے چینیاں
موج آگے نکل جائے گی
ہر جگہ پریم کے ساز پر
امن کے گیت گاتی ہوئی

موج آگے نکل جائے گی
ہر جگہ پریم کے ساز پر
امن کے گیت گاتی ہوئی

عبدالقادر سروری

پنڈت نہرو بہ حیثیت ایک مصنّف کے

پنڈت جواہر لال نہرو، زندگی کی وسیع، اہم اور توجہ کو پوری طرح اُلجھائے رکھنے والی مصروفیتوں کے باوجود ایک مصنّف تھے اور سائنس کی حدود کو نہ چھوتے ہوئے، ہم شاید یہ کہنے میں بھی ناحق بہ جانب نہیں کہ وہ اچھے مصنّف تھے۔ ان کی دلچسپیاں بہت وسیع تھیں، لیکن تصنیف و تالیف ان کی زندگی کا معین مشغلہ تھا۔ وہ ذہین انسان تھے اور دوسری مصروفیات کے مقابلے میں لکھنا ان کے لئے ذہنی پناہ تھی۔ بہت سے خطوط کے علاوہ انہوں نے تین یادگار تصانیف چھوڑیں اور یہ تینوں انگریزی میں لکھی گئی ہیں اور انگریزی زبان میں ایک ممیز مقام رکھتی ہیں۔ بچپن سے ہیرو اور پھر کیمبرج کے قیام نے انھیں انگریزی زبان پر خاص عبور عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ذہن لسانی عصبیت سے پاک تھا۔ سائنسی تربیت نے انہیں علمی نقطہ نظر بخشا تھا اور یہ تربیت، ان کے فطری ادبی رجحانات کے ساتھ پیوند پاکر، ان میں فکر و نظر کی بہت سی صلاحیتوں کی افزائش کا باعث بن گئی تھی۔

ادبیات کے بارے میں پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ اس کی دلچسپیاں مجھے بہت زیادہ گرویدہ نہ کرسکیں۔ لیکن ان کی تصانیف کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی دلچسپیوں نے ان کی تحریری صلاحیتوں کو سنوار اور نکھار دیا تھا۔ لیکن مسز سروجنی نائیڈو اور انگریزی کے بعض اور ہندوستانی مصنفین کی طرح پنڈت نہرو نے اپنے قلم کو ادب کے لئے وقف نہیں کیا۔ اور یہ اچھا بھی ہوا۔ کیونکہ اجنبی زبان میں کوئی بلند پایہ ادب پیدا نہیں کرسکتا۔ علوم و فنون کی بات دوسری ہے۔

پنڈت نہرو کے دِل و دماغ کی صلاحیتیں، ایک مفکّر کی صلاحیتیں تھیں۔ اور ان کی جودتِ طبع کا دائرہ عمل بہت وسیع تھا۔ اس لئے وہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ پر پائیدار اہمیت کے کارنامے چھوڑ سکے۔ ان کی خود نوشت اور بھارت کی تاریخ میں خود ان کی ذات اور بھارت، دونوں تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں سے وہ دِل کش نقش و نگار اُبھرے ہیں جنھوں نے ان تصانیف کو بار بار پڑھنے کی کتابیں بنا دیا ہے۔

پنڈت جی کے خطوط اور خطبات سے قطع نظر اُن کی پائیدار اہمیت رکھنے والی تصانیف تین ہیں:

(۱) گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری (۲) جواہر لال نہرو۔ این آٹو بیوگرافی (۳) دی ڈسکوری آف انڈیا

لیکن ترتیب کے لحاظ سے ان کے وہ خطوط سب سے پہلے ہیں جو اُنہوں نے ۱۹۲۸ء میں اپنی صاحبزادی اندرا پریہ درشنی کے نام لکھے تھے۔ اس زمانے میں بیٹی کی عمر کوئی دس برس کی تھی اور گرمی کی چھٹیوں میں وہ مسوری میں مقیم تھیں۔ پنڈت نہرو الہ آباد میں تھے۔ پنڈت جی کو اپنی بیٹی کی تربیت کا اتنا خیال تھا کہ بقول اُن کے "نجی خطوط" کو بھی تعلیم و تربیت کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان خطوط میں "نجی" بات کوئی نہیں بلکہ یہ معلومات سے پُر ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ مجموعہ معلومات عامہ کی ایک اچھی خاصی کتاب بن گئی ہے۔ اپنی ذاتی خوبیوں کے علاوہ یہ خطوط ایک خاص امتیاز یہ بھی رکھتے ہیں کہ یہ ایک معنی میں ان کی معرکتہ الآرا تصنیف "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" کے نقشِ اوّل اور نقشِ اصغر ہیں، نقشِ اوّل اپنے ادبی روپ اور مشتملات دونوں میں۔ چنانچہ "گلمپسز" کا وجود بھی خط ہی کے رُوپ میں ہوا۔

پنڈت جی نے پہلے ہی خط میں بیٹی کو لکھا ہے کہ:

"میں اس دُنیا کی، جس میں ہم رہتے ہیں، اور ان بہت سے چھوٹے بڑے مُلکوں کی، جن سے مِل کر اتنی بڑی دُنیا بنی ہے، کچھ باتیں لکھتا رہوں گا۔"

تقریباً یہی بات انہوں نے "گلمپسز" کے پہلے خط میں بھی کہی ہے کہ اس دُنیا کے بارے میں، میں نے تمہیں کچھ باتیں بتائی تھیں، لیکن کچھ مزید باتیں لکھوں گا۔

اس "تمہیدی" گلمپسز میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، وہ زیادہ تر بُنیادی ہیں۔ "گلمپسز" تاریخی عہد پر حاوی ہیں۔ یہ اُس وقت لکھے گئے تھے جب بیٹی سن شعور کو پہنچ چکی تھی، ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی، ان کا علمی اُفق زیادہ وسیع ہو گیا تھا اور علم و فراست اور تہذیب و شائستگی کی باتیں سُننے کے لئے تیار تھا۔ پہلے خطوط زیادہ تر ارضیاتی اور حیاتیاتی تاریخِ عالم پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کے مباحث زمین کیسے بنی، جاندار کس طرح پیدا ہوئے، انسان کس طرح پیدا ہوا، زبانیں، تہذیب، مذہب، کھیتی باڑی، قبیلے اور ان کے سردار سب کی تفصیلات ہیں۔ ان کے علاوہ مصر اور کریٹ کا تمدن، چین و ہندوستان کا تمدن، آریوں کا ہندوستان میں آنا، رامائن اور مہابھارت وغیرہ پر بھی لکھا ہے۔ آخری خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بے موقع ہیں، لیکن یہ اُن کی دوسری اہم تصنیف۔ دی ڈسکوری آف انڈیا کی بُنیاد ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے ان خطوط کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان سے پنڈت نہرو کے ذہن کے ارتقا کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ خطوط جیسے سلیس اور سادہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں وہ ایک تجربہ کار مصنف کے لئے بھی قابل رشک ہے۔

گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری

اس یادگار کارنامے کی ابتدا اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں پنڈت نہرو نینی سنٹرل جیل میں تھے۔ اپنی صاحب زادی اندرا پریہ درشنی کی تیرہویں سالگرہ کے موقع پر وہ حسب عادت تحفہ بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن جیل میں اس کا موقع کہاں تھا؟ اس لئے ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ بیٹی کے لئے ایسا تحفہ بھیجنا چاہیئے جو یادگار رہے۔ لکھتے ہیں:—

"اپنی سالگرہ کے موقع پر تم تحفے اور مبارک باد قبول کرنے کی عادی ہو۔ مبارک باد تم کو اب بھی بھرپور مل جائے گی، لیکن نینی جیل سے میں تم کو کیا تحفہ بھیج سکتا ہوں؟ میرے تحفے مادی اور ٹھوس نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف ہوائی اور ذہنی اور روحی ہو سکتے ہیں۔ ایسے، جیسے کوئی اچھی پری تم کو عطا کر سکتی تھی، چیزیں جنہیں جیل کی اونچی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔"[1]

یہ کتاب اگست ۱۹۳۳ء میں مکمل ہوئی اور پہلی بار دو جلدوں میں ۱۹۳۴ء میں ہندوستان میں

---

[1] "On your birthday you have been in the habit of receiving presents and good wishes Good wishes you still have in full measures, but what present can I send you from Naini prison? My presents cannot be very material or solid. They can only be of the air and of the mind and the spirit, such as a great fairy might have bestowed on you — things that even the high walls of prison cannot stop. (P.1)

شائع ہوئی۔ اس کے بعد نظرِ ثانی کیا ہوا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۹ء میں اس کے مابعد ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔

بلا شبہ پنڈت نہرو جیسے مصروف آدمی کے لئے یہ بڑا حوصلہ مندی کا کام تھا۔ تاہم نینی جیل میں ان کو لکھنے پڑھنے کی فرصت تھی۔ مگر دقّت یہ تھی کہ نینی جیل، کتب خانہ نہیں تھا۔ انہوں نے زیادہ تر اپنے پچھلے مطالعے اور حافظے کی مدد سے اس عظیم الشان کام کو ہاتھ میں لیا اور دو سال گیارہ مہینوں کے دوران میں کوئی ۱۹۶ خطوط میں تاریخ عالم کے سارے اہم پہلوؤں پر یہ جھلکیاں مکمل ہو گئیں۔ بعد میں ۱۹۳۸ء میں اس میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا۔ یہ بھی بحیرہ عرب سے سفر کے دوران میں خط کی صورت میں صاحبزادی کو لکھا گیا تھا۔

پنڈت نہرو کا اپنی صاحبزادی کے لئے یہ ذہنی اور رُوحانی تحفہ بڑے سے بڑے مادّی تحفے کے مقابلے میں بھی بہت زیادہ بیش قیمت ہے۔ مادّی تحفوں کی بقا ماہ و سال کی رہین ہے، لیکن اس ذہنی اور رُوحانی تحفے پر مرورِ ایّام کا کوئی اثر نہیں۔ پھر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ تحفہ محض بیٹی کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ ساری قوم کی بیٹیوں اور بیٹوں کے لئے بھی ہے، ساری مہذب دُنیا کے لئے ہے۔ چارلس ٹریویلین نے اپنے ایک خط میں پنڈت نہرو کو لکھا تھا کہ وہ ان سے، ان کی تصانیف کے ذریعے روشناس ہوئے[۱]۔ برنارڈ شاؔ کی طرح دُنیا کے بہت ایسے پڑھے لکھے لوگ ہوں گے جو پنڈت جی سے ان کی تصانیف کے ذریعے واقف ہوئے ہوں گے۔

پنڈت جی اپنی صاحبزادی کو اس بات کی تلقین کرنا چاہتے ہیں کہ تو عمروں کو اپنی آنکھیں اور اپنے دِل کے دروازے کھُلے رکھنا چاہیئے تاکہ کائنات کے حقائق اور فطرت کے مظاہر دِل و دماغ میں راہ پا سکیں۔ اس سلسلے میں چینی سیّاح ہیون سانگ کے سفرنامے سے جنوبی ہند کے ایک دلچسپ انسان کا واقعہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ یہ آدمی اپنے پیٹ کے اطراف تانبے کی تختیاں باندھے رہتا تھا اور سر پر ایک جلتی ہوئی شمع اُٹھائے پھرتا تھا۔ اس انوکھے لباس کے ساتھ، ہاتھ میں عصا لئے وہ تمکنت کے ساتھ قدم تول تول کر رکھتا ہوا راہ چلتا تو لوگ محوِ حیرت بنے اس کو دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن جب کوئی من چلا اُس سے اس ہیئت کذائی کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ جواب دیتا کہ اس میں عقل و فراست کی اتنی بہتات ہے کہ اگر وہ تانبے کی تختیاں پیٹ کے اطراف باندھے نہ رہے تو اُسے ڈر ہے کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ سر پر روشنی اس لئے رکھی ہے کہ اسے دُنیا کے لوگوں

[۱] صفحہ ۸۳

کی جہالت پر رحم آتا ہے، جو گھور اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں، انہیں کی رہنمائی کے لئے سر پر یہ روشنی دھری ہے!

نہرو، نہایت لطیف انداز میں اپنے بارے میں معذرت کرتے ہیں کہ:

"مجھے پورا اطمینان ہے کہ بہتات عقل سے میرے پھٹ پڑنے کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس لئے مجھے تانبے کی تختیاں باندھنے یا زرہ بکتر پہنے رہنے کی ضرورت نہیں۔"[1]

عقل و فراست کی باتوں کی طرف راغب کرنے کا یہ نہایت شائستہ طریقہ ہی نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور فن کارانہ طریقہ بھی ہے۔ اسے ہم حکیمانہ طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

"گلمپسز" باضابطہ تاریخ نہیں بلکہ تاریخ عالم کے ان عظیم حقائق اور واقعات کے تاثراتی مرقعے ہیں جو مصنّف کے ذہن کو وقتاً فوقتاً متاثر کرتے رہے ہیں۔ بیٹی، باپ کے خطوط کو ظاہر ہے کہ بڑے شوق سے پڑھتی تھیں، لیکن یہ بیٹی بھی ایک عظیم المرتبت باپ کی بیٹی تھی، اُسے بھی فطرتاً شخصی تفصیلات، گھریلو واقعات اور ذاتی دُکھوں اور مسرّتوں سے زیادہ قوموں کے حالات، ان کے عروج اور زوال کی تہہ میں تاریخی جبریت کے جو اشارے مضمر ہیں، اُن سے دلچسپی تھی، ورنہ یہ مہتم بالشان کارنامہ کیسے وجود میں آتا؟ بیٹی کی یہی ذہنی اُفتاد تھی جو باپ کو "اپنی اس دُنیا کے متعلق کچھ اور کہنے" پر مائل کرتی ہے۔

ایک بات جس کو پنڈت جی نے اپنے آدرش کے طور پر لکھا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اپنی بات دوسروں سے منوانے کی کبھی خواہش نہیں رہی۔ جنوبی ہند کے اس عجیب و غریب انسان کے تذکرے کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر میں اپنی عقل میں اس قدر محدود ہوں تو پھر میں اپنے آپ کو ایک عقل مند آدمی کے طور پر کیسے پیش کر سکتا ہوں اور دوسرے لوگوں کو نیک صلاح کس طرح دے سکتا ہوں۔"[2]

---

[1] "Well, I am quite sure that there is no danger of my ever bursting with too much wisdom. And so there is no need for me to wear copper-plates or armour." (P.1)

[2] "If I am so limited in wisdom, how can I pose as a wise man and distribute good advice to others?"

آگے رقم طراز ہیں :-

"میں نے ہمیشہ غور کیا ہے کہ درست کیا ہے اور نادرست کیا ہے، اور کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے معلوم کرنے کا طریقہ وعظ گوئی نہیں ہے بلکہ گفتگو اور بحث ہے اور بحث و مباحثہ ہی سے بعض وقت صداقت کا کوئی جزٗ ہاتھ لگ جاتا ہے۔" [1]

اسی طریقہ پر وہ سیاسی زندگی میں بھی کاربند رہے۔

بعض وقت عظیم الشان کارناموں کی تخلیق کا باعث، کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ سر والٹر اسکاٹ کو یونانی زبان کے امر رزمیہ نگاروں کو پڑھنے کے لئے یونانی زبان کے مطالعے کی بڑی خواہش تھی جو ناتمام رہی اور اس کے سوانح نگاروں کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ناتمامی اس کے لئے آئینۂ رحمت ثابت ہوئی کیونکہ خود اس کی ذاتی صلاحیتیں یونانی رزمیہ نگاروں سے مختلف تھیں۔ اگر یہ انہیں اصلی صورت میں پڑھ سکتا تو اپنے بعض اہم رزمیہ کارناموں کی تخلیق کے قابل نہ رہتا۔ پنڈت نہرو کے بارے میں بھی یہ بات ٹھیک اُترتی ہے۔ اگر وہ کتب خانے میں بیٹھ کر تاریخ عالم لکھتے تو شاید وہ واقعات اور تفصیلات میں ایسے ڈوب جاتے کہ اُن کی اپنی فطری اُپج، بیان اور نقطہ نظر کی تازگی اور اُن کا شخصی عنصر، جو "گلمپسز" میں ہر جگہ نمایاں ہے، اُبھرنے نہیں پاتا۔

"گلمپسز" دراصل ایک آبِ مُقطّر ہے؛ کوزہ میں سمندر اور قطرہ میں دجلہ ہے۔ اس میں واقعات کا ظاہری سلسلہ قائم نہیں ہے لیکن واقعات کی بے ترتیبی کی تہہ میں، ایک جذباتی اور فنی ہم آہنگی موجود ہے۔ اُنیسویں صدی سے تاریخ نگاری کے تصوّر میں بہت دُوررس انقلاب پیدا ہوا۔ تاریخ اب حکمرانوں کے سلسلوں کے عروج و زوال، جنگوں کی تفصیلات اور سنین کا مجموعہ نہیں رہی۔ بلکہ اسے انسانی زندگی کے مظاہر کا مرقع سمجھا جاتا ہے، جس کا کام حال میں ماضی کی تعمیر اور مستقبل کی رہنمائی ہے، وہ ماضی

---

[1] "I have always thought that the best way to find out what is right and what is not right, what should be done and what should not be done, is not by giving a sermon, but by talking and discussing, and out of discussion sometimes a little bit of truth comes out."

جو ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ نئی تاریخ کے بارے میں یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ کتب خانوں میں بیٹھ کر نہیں لکھی جاتی بلکہ سڑکوں، کھیتوں اور انسانوں سے بھرے ہوئے بازاروں، سماجی ارتباط کے درمیان رہ کر لکھی جا سکتی ہے۔

پنڈت نہرو نے نینی جیل میں بیٹھ کر جب اس کارنامہ کا خاکہ اپنے ذہن میں بنایا تو یقیناً تاریخ کا یہی نیا شعور انہیں اُبھار رہا تھا۔ اسی شعور کے تحت وہ ایسی چیز لکھ سکے جو اپنے حدود کے اندر قطعی اُپجی ہے اور اُس کی ساری تجویز، تعمیل اور تکمیل میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

پنڈت جی کی فطرت میں ایک خوش گوار لچک تھی۔ وہ ماضی کے پورے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقی پسند انسان تھے اور تبدیلی کو، جو دراصل ترقی کی بنیاد ہے، زندگی کا ست مانتے تھے۔ ۸ جنوری ۱۹۳۱ء کو انہوں نے لکھا تھا:-

"ہر چیز میں مسلسل تبدیلی ہو رہی ہے اور تاریخ کیا ہے، محض تبدیلی کا مرقع۔"[1]

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ماضی میں اگر بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں تو لکھنے کے لئے بہت کم تاریخ ہوگی۔[2]

انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ تاریخ جو ہم اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں وہ کسی کام کی نہیں۔ ہندوستان اور انگلستان کی تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اُن سے، اُن کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ جو کچھ تاریخ وہ پڑھ سکے ہیں، کالج سے نکلنے کے بعد، اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے جیل کے قیام کو بہت مفید بتایا ہے۔ ان کی ذات کے اعتبار سے یہ قیام مفید ہو یا نہ ہو، لیکن قومی نقطۂ نظر سے یہ قیام، یہ ابتلا یقیناً مفید ثابت ہوا۔ ان کے تاریخی شعور کی صحت مندی، اُن کی معلومات کی وُسعت اور اُن کے استحضار کا اندازہ کتاب کی حدود کی وُسعت سے ہوتا ہے۔ جس میں قدیم و جدید ہند کے علاوہ ہلینز، یونان اور اس کی شہری ریاستیں، چین قدیم و جدید، روم، کارتھیج، قدیم ایرانی شائستگی، روم کا عروج و زوال، ہڑپا اور موہنجوڈارو، خلافتِ عباسیہ کا عروج و زوال، اسلامی اسپین، صلیبی جنگیں، مغلوں کا تسلّط دُنیا پر، یورپ کا احیائے علوم، مشینی عہد کا آغاز اور صنعتی انقلاب، فرانس کا انقلاب، جاپان کی ترقی، ممالک متحدہ امریکہ کا اُبھرنا، عرب اور ترکی کا احیا، روس کا انقلاب اور اشتراکیت کا فروغ جیسے اہم اور ضروری موضوعات اور مسائل پر اپنے خاص نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

پنڈت نہرو کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ انسانیت کا نقطۂ نظر ہے۔ دَبے ہوئے انسانوں اور پچھڑی ہوئی قوموں کے ساتھ ہمدردی کا نقطۂ نظر ہے۔ اس میں سیاست اتنی نہیں جتنی انسانی ہمدردی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں انہیں استحصال کا شائبہ نظر آتا ہے، اُن کا قلم اس کی مذمت کرنے پر کمربستہ ہو جاتا

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

ہے۔ ہند میں، چین میں، عرب میں، عجم میں، امریکہ میں، غرض جہاں بھی اندرونی یا بیرونی محرکات نے یہ صورت پیدا کی ہے، اس کو انہوں نے سراہا نہیں۔ بہمنی حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"بہمنی سلطنت، سارے مہاراشٹر علاقے اور کرناٹک کے کچھ حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر برسوں تک قائم رہی، لیکن اس کا دفتر گندہ ہے۔" [۱]

"یورپ اور ایشیا" کے بیان میں ان کے جذبات اس طرح پھوٹ پڑتے ہیں :۔

"آج یورپ قوی اور طاقت ور ہے اور اس کے رہنے والے اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایشیا اور اس کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ آتے ہیں اور ایشیائی ملکوں سے ہر چیز کا استحصال کرتے ہیں۔" [۲]

پنڈت نہرو سائنس کے ایک وفاشعار طالب علم کی حیثیت سے، اس کے طریقہ کار اور نتائج کے بڑے مداح ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی فکر سائنسی طریقے کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر وہ انسانیت کے بھی ایک پُر جوش پرستار تھے۔ چنانچہ ان کی انسان دوستی، سائنس اور سائنسی طریقے کو بھی قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ "سائنس کے اچھے اور بُرے استعمال" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :۔

"سائنس، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اپنے ساتھ بہت سی اچھی چیزیں لائی۔ لیکن سائنس نے جنگ کی ہولناکیوں میں بھی بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ ریاستوں اور حکومتوں نے نظریاتی اور عملی سائنس کی کئی شاخوں کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن انہوں نے سائنس کے جنگجویانہ پہلوؤں سے بے اعتنائی نہیں برتی۔"

مملکت کی تنظیم کے بنیادی اصولوں کی حیثیت سے وہ مارکس اور لینن کے نظریوں سے مجموعی طور پر

(بقیہ فٹ نوٹ) :

[۱] "Everything changes continously... what is history, indeed, but a record of change." (P.9)

[۲] "And if there had been very few changes in the past, there would have been little of history to write." (P.9)

[۱] صفحہ ۲۰۱

[۲] صفحہ ۹

متفق تھے اور انہیں کی رہنمائی میں بعد کو کانگرس نے سوشلزم کے آدرش کو اختیار کرلیا تھا۔ تاہم وہ لینن کی طرح اس نظام کو تنقید کی کسوٹی پر کسے بغیر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مارکس کے معاشی فلسفے کے یورپ پر اثر کو انہوں نے بڑی تفصیل سے سمجھایا ہے۔ اس کے بعد سوال کرتے ہیں :۔

"یہ مارکسزم پھر ہے کیا؟"

اس کا جواب خود ہی اس طرح دیتے ہیں :۔

"یہ تاریخ اور سیاسیات اور معاشیات اور انسانی زندگی اور انسانی خواہشات کی ترجمانی کا ایک طریقہ ہے۔ وہ ایک نظریہ بھی ہے اور ایک پیغامِ عمل بھی ... ... یہ ایک سعی ہے انسانی تاریخ، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک کڑے منطقی نظام میں تحویل کرنے کی، جس میں تقدیر یا قسمت کی ناگزیریت کا کچھ شائبہ بھی موجود ہے۔ انجام کار، کیا زندگی واقعی اتنی منطقی ہے اور سخت اور کڑے اصولوں اور نظامات کی اتنی تابع ہے، قطعی واضح نہیں۔ اور اکثروں نے اس بارے میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔" [1]

خطوط کا عام انداز سادہ بیانیہ ہے۔ لیکن کہیں واقعات یا ماحول کا اثر، ان کی خوابیدہ اور مضمر ادبی صلاحیتوں پر تازیانے کا کام کرتا ہے، اور اس وقت ان کا انداز گل افشانی گفتار پر تلطف ہو جاتا ہے۔ "چھٹی اور مہینے کا سفر" میں لنکا کے مناظر کا بیان جس انداز سے کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"پھر لنکا آیا اور ایک مہینے تک ہم نے شاندار چھٹیاں منائیں اور اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو بھول جانے کی کوشش کی۔ اس نہایت حسین جزیرے کی حد سے بڑھی ہوئی دل کشی اور قدرت کی ریل پیل پر حیرت کرتے ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ کینڈی، نورا ایلیا، انورادھا پورا

---

1. "What, then is this Marxism? It is a way of interpreting history and politics and economics and human life and human desires. It is a theory as well as call to action... It is an attempt at reducing human history, past, present and future to a rigid logical system with something of the inevitability of fate or "Kismet" about it. ... whether life is so very logical, after all, and so dependent on hard-and-fast rules and systems does not seems very obvious and many have doubted this. (P. 544)

اپنی عظمتِ ماضی کے آثار اور در و دیوارِ شکستہ کے ساتھ۔ جن جن مقامات پر ہم گئے، ان کے بارے میں سوچنا بھی کتنا پُرلُطف ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر مجھے منطقہ حارہ کے خنک جنگل کے خیال میں لُطف آتا ہے، جس پر شادابیٔ حیات پھٹی پڑتی ہے اور جو تمہاری طرف اپنی چشمِ ہزاراں ہزار سے نگراں ہے۔ اور نازک سپاری کے پیڑ، چھریرے اور قد کشیدہ اور راست، اور بے شمار ناریل، اور ناریل کے درختوں کی کناری والا ساحل سمندر جہاں جزیرہ کا زمرّدیں سبزہ زار، سمندر اور آکاش کے لاجورد سے ہم آغوش ہوتا ہے اور سمندر کا پانی جھل مل جھل مل کرتا لہروں سے اٹھکیلیاں کرتا ہے اور ہوا تاڑ کے پتوں میں سے سنکتی ہے۔" [1]

یہ ایک ہندوستانی ادیب کے لئے، انگریزی زبان کا نہایت دل کش ادیبانہ اور قادرانہ استعمال ہے! اچھی تحریر تنقید بھی ہوتی ہے۔ پنڈت نہرو کے بیانیہ میں تشریح اور تنقید ادل بدل ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ مارکس کے نظریہ کی وضاحت کی صورت میں ہم دیکھ آئے ہیں۔

"گلمپسز" کی تجویز کا تناظر حیرت ناک طور پر وسیع ہے، جو کوئی عالم جیل کے اندر بیٹھا ہوا اپنی یادوں کے سہارے اتنی تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔

---

[1] Then came Lanka, and for a month we made glorious holiday and tried to forget our troubles and worries. Up and down that most beautiful of islands we went, wondering at its exceeding loveliness and at the abundance of Nature. Kandy and Nuwara Eliya and Anuradhapura, with ruins and relics of old greatness; how pleasant it is to think of the many places we visited! But above all, I love to think of the cool tropical jungle with its abundant life, looking at you with a thousand eyes; and of the graceful areca tree, slender and straight and true, and the innumerable coconuts, and the palm-fringed sea-shore where the emerald green of the island meets the blue sea and the sky, and the sea-water glistens and plays on the surf and the wind rustles through the palm leaves. (P. 66)

جواہر لال نہرو ـــــ ایَن آٹو بیوگریفی

پنڈت نہرو کی یہ خُود نوشت، ان کی مقبول ترین تصنیف ہے۔ اس کا اندازہ ہم کو اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب یہ پہلی بار شائع ہوئی، سال بھر کے اندر اندر اس کے دس ایڈیشن نکل گئے۔ ۱۹۳۷ء میں اس کے مزید دو ایڈیشن نکلے۔ عوام کی بڑھی ہوئی مانگ کے مدِّ نظر اس کا ایک سستا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں چھاپا گیا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۱ء میں اس کے مزید دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں اس میں ایک باب کا اضافہ کرکے اسے دوبارہ چھاپا گیا۔ اس کے بعد سے اس کتاب کے دس بارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ خُود نوشت جنوری ۱۹۳۶ء میں چھپی تھی، لیکن اس کا آغاز جون ۱۹۳۴ء میں ہو چکا تھا۔ یہ کتاب بھی جیل میں نظربندی کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس کا محرک، جیل کی تنہائی میں اپنے آپ کو معروف رکھنے کی ضرورت تھی۔

سوانح حیات لکھنے کا بڑا مقصد علمی ہوتا ہے۔ لیکن "خُود نوشت" کے کئی محرکات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اپنی ذات کے محاسبے یا توجیہہ یا زندگی کی یادوں کو محفوظ کرنے کا خیال۔ ایک محرک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے ذاتی تجربات سے دوسروں کو استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ کبھی ایسی تحریریں مصنف کے فن کارانہ جذبات کے چھلکاؤ کا بھی نتیجہ ہوتی ہیں۔

پنڈت نہرو نے اس بارے میں اپنے مخصوص رُجحان کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

"ان صفحات کے لکھنے کا ابتدائی مقصد اپنے آپ کو کسی معیّن کام میں معروف رکھنا تھا۔ جس کی جیل کی زندگی کی طویل تنہائی میں ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے گذرے ہوئے واقعات پر تبصرہ بھی مقصود تھا، جن سے میرا تعلق رہ چُکا تھا۔"

پھر وہ لکھتے ہیں کہ میں نے یہ کام ذاتی محاسبے کے مُوڈ میں شروع کیا اور یہ ساری کتاب میں برقرار رہا۔ ان کا یہ اعتراف بھی جاذبِ نظر ہے کہ:۔

"میں قصداً قارئین کے لئے نہیں لکھ رہا تھا۔ اگر مجھے قارئین کا خیال تھا تو وہ میرے دیس کے مرد اور عورتیں تھیں۔ بیرونی قارئین کا خیال ہوتا تو بہت ممکن ہے کہ میں اور طرح پر لکھتا۔"

مُصنّف کی یہ داستانِ حیات دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی، واقعات کے لحاظ سے، واقعات کی ترتیب اور ان کی معنویت کے لحاظ سے، اس کے وطنی اور قومی رُجحان کے لحاظ سے، واقعات کے ارتقائی تسلسل

اور اسلوب ہر اعتبار سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک ہیرو کی داستانِ حیات ہی نہیں، ایک مصروفِ عمل انسان کی زندگی کی کہانی ہے جس کی فکر کا محور، اس کی مطلق ذات نہیں تھی بلکہ ذات پوری قوم کی جدوجہد آزادی کے چوکھٹے میں، جس کی جڑیں بھارت میں پیوست تھیں، لیکن شاخیں بین قومی دنیا میں پھیلی ہوئی۔ اسی لئے اُن کی کنج نشینی میں ہم سیرِ آفاق کر لیتے ہیں۔ "خود نوشت" کی مقبولیت کا بنیادی سبب یہی تھا، اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

موجودہ دور میں سوانح نگاری، ناول کو دعوتِ مبازرت دے رہی ہے۔ سوانح میں واقعات اگر خلوص، صداقت اور سادگی کے ساتھ بیان کئے جائیں تو وہ ناول سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ ناول فرضی ہو سکتا ہے لیکن سوانح حقیقت۔ اور یہ مشہور قول ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ پنڈت نہرو کا "خود نوشت" حقیقتاً افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ پنڈت نہرو کو سہل اور آسان زبان میں، بغیر صناعی اور کوشش کے، اپنے خیالات کو ظاہر کرنے پر جو قدرت حاصل تھی، اس کی وجہ سے، بیان میں بڑا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ پڑھنے والا صفحے کے صفحے پڑھتا چلا جاتا ہے لیکن بیان کا دلچسپ انداز کتاب کو ہاتھ سے رکھنے نہیں دیتا۔

ابتدائی زندگی کے حالات میں کشمیر کے پنڈتوں کے رسم و رواج اور عقائد کی بڑی عمدہ اور اصلی تصویریں اُبھری ہیں۔ بچپن کے واقعات کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اُس سے پنڈت نہرو کی صاف گوئی پر روشنی پڑتی ہے۔ اپنے والد پنڈت موتی لال سے دل و جان سے محبت کرتے ہوئے بھی، وہ "خود نوشت" میں محض ان کی مدح سرائی نہیں کرتے بلکہ اُن کی شخصیت اور ان کی فطرت جیسی تھی، یا جیسی ان کے ذہن میں اُبھری تھی، اسے من و عن پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے غیض و غضب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے والد کا بے حد پرستار رہا۔ لیکن میری پرستاری اور محبت کے باوجود اُن سے ڈرتا بھی تھا۔ میں نے انہیں ملازمین اور دوسروں پر غصّے میں بے قابو ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے بھیانک دکھائی دیتے تھے۔ اور میں خوف سے کانپ اُٹھتا تھا۔ جس میں ملازمین کے ساتھ ان کے برتاؤ پر بعض وقت ناراضی کا شائبہ بھی ہوتا۔" ؎

والد صاحب کی میز سے ایک فونٹین پن اُٹھا لینے کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"I admired my father tremendously ... But much as I admired him and loved him, I feared him also, I had seen him loosing his temper at servants and others and he seemed to me terrible then and I shivered with fright, mixed sometime with resentment at the treatment of a servant." (P. 7)

"میں نے ایک دن ان کے دفتر کی میز پر دو فونٹین پن پائے اور میں نے انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنے دل میں یہ استدلال کیا کہ والد صاحب کو بیک وقت دونوں فونٹین پن کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں نے ایک اُٹھا لیا۔"[1]

یہ بچوں کی نفسیات کا بڑا بلیغ مرقع ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اس کو بیان کرنے کا سادہ انداز۔ یہ مختصر سا واقعہ جیمز جوائز کے نوعمر فنکار سے کتنا مشابہ ہے۔ بیانیہ کے دوران میں جگہ جگہ عام کائناتی حقائق پر بھی چلتے چلتے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً اپنے خاندانی تموّل اور اپنے اکلوتے ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے آغاز ہی میں وہ لکھتے ہیں :-

"متموّل ماں باپ کا اکلوتا لڑکا گمراہ ہو سکتا ہے۔"

ان کے گھر میں کوئی ہم عمر لڑکا یا لڑکی نہیں تھی۔ ایسے بچوں کی نفسیات جس طرح کی ہوتی ہے، اس کے بارے میں عمدہ اشارے دوسرے باب میں ملتے ہیں۔ کچھ ابنِ عم تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے ان سے، انگریزوں کی ہندوستانیوں کے خلاف زیادتیوں کے واقعات سننے میں، ان کو دلچسپی ہوتی تھی۔ بچپن ہی سے ان کا ذہن زندگی کی آنے والی جد و جہد کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ لیکن ایک بات جسے "خود نوشت" میں پنڈت جی نے واضح کر دی ہے۔ وہ یہ کہ انگریزوں سے ان کی مخالفت شخصی اور ذاتی کبھی نہیں رہی بلکہ نظریاتی اور خاص طور پر ہندوستان کے تعلق سے تھی۔ شخصی طور پر بعض انگریزوں سے ان کی دوستی اور گہرے تعلقات بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں کچھ انگریزوں کا قدر دان سا تھا۔"[2]

پنڈت نہرو کا بچپن بھی، ان کے سیانے پن کی زندگی کا خلاصہ تھا۔ مذہب اور خاص طور پر مذہب کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ ان کے ایک یورپی ٹیوٹر (اتالیق) نے تھیوسفی کی طرف ان کی راہ کھولنی چاہی تھی، لیکن اس راہ پر بھی وہ بہت دور تک نہ جا سکے۔ ان کا مذہب دراصل انسانیت کا مذہب تھا۔ اسی کی بھلائی کے لئے انہوں نے آخر وقت تک کوشش کی۔ بچپن کے زمانے میں جہاں گھر کے ملازمین پر اپنے والد کے غیظ و غضب کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی ہمدردی ملازمین کے

---

[1] "I noticed one day two fountain pens on his office table and I looked at them with greed. I argued with myself that father could not require both at the same time and so I helped myself to one of them."

[2] شیرازہ جولائی ۱۹۶۴ء صفحہ ۶۰

ساتھ تھی۔ بوئر جنگ میں غیر شعوری طور پر وہ بوئر کے ساتھ ہمدردی کرنے لگے تھے۔ انگلستان کی جس مشہور اسٹرائیک کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے اُس میں فطرتاً ان کی ہمدردیاں اسٹرائیک کرنے والوں کے حق میں تھیں۔ دوسری دفعہ جب وہ یورپ گئے تھے، اسی زمانے میں برسلز میں "آپریسیڈ نیشنالیٹیز" کی کانگرس منعقد ہورہی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کانگرس سے وابستہ کرلیا اور نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان میں کانگرس کو بھی لکھا کہ وہ اس کانفرنس کا ساتھ دے۔

ابتدائی زندگی کے واقعات کے بعد مصنّف ہر چیز پر چھایا ہوا نہیں دکھائی دیتا بلکہ یہ خود نوشت جدوجہد آزادی کی تاریخ بن جاتی ہے، جس کے بہت سے کرداروں میں مصنّف بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ لیکن مرکزی کردار، تاہم زندگی اس کے اطراف نہیں گھومتی بلکہ پورے اور طویل سیاسی ڈراما کا وہ راوی بھی ہوتا ہے اور خود ایک اہم کردار بھی۔ ایک مرحلے کے بعد مہاتما گاندھی، اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور عمل میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک تصویر نما آلے کی طرح، کسانوں کی جدوجہد، عدم تعاون کی تحریک اپنے پورے خدوخال کے ساتھ "نان وایولنس" "سول نافرمانی، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، سائمن کمیشن کی آمد، ہنگامے، لیپائیاں، غرض بے شمار مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذرتے جاتے ہیں۔ لیکن ان ساری حوصلہ فرسا ہنگامہ آرائیوں کی تفصیلات میں بھی، بیانیہ کی دلچسپی گھٹنے نہیں پاتی بلکہ رزمیہ داستانوں کی طرح قاری ایک مہم کے بعد دوسری مہم کے حالات انہماک کے ساتھ پڑھتا اور بعض وقت سانس روک کر پڑھتا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر، کانگرس نے اس کے خلاف مظاہرہ ترتیب دیا تھا۔ اور ممانعتی احکام کے باوجود سولہ سولہ رضاکاروں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلی ٹکڑی کے قائد پنڈت جواہر لال نہرو تھے، انہیں سوارہ پولیس کے ہاتھوں لاٹھی چارج کا جو سامنا کرنا پڑا تھا اُس کی تفصیل لکھتے ہیں :-

"ہم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا کہ سوارہ پولیس کا ایک گروہ، جس کی تعداد غالباً دو تین درجن ہوگی، تیز رفتار سے ہم پر نازل ہورہا ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سر پر پہنچ گئے اور گھوڑوں کے دباؤ سے ہماری چھوٹی سی قطار ٹوٹ گئی۔ پھر سوار پولیس مین نے ہمارے رضاکاروں کو ایک بھاری بھرکم لٹھ سے پیٹنا شروع کیا۔ اور فطری طور پر رضاکاروں نے پیدل کے راستے پر پناہ لی۔ بعض چھوٹی دکانوں میں بھی گھس گئے۔

ان کا پیچھا کیا گیا اور پیٹا گیا۔ جب میں نے گھوڑوں کو ہم پر حملہ کرتے دیکھا تو میرے سامنے ایک حوصلہ فرسا منظر تھا۔ لیکن غالباً کوئی دوسری قوت نے مجھے اپنی جگہ پر مستحکم رکھا اور پہلے حملے سے، جس میں رضاکار میرے پیچھے سے آکر سینہ سپر ہوگئے، میں جان بر ہوگیا۔ یکایک میں نے سڑک کے درمیان اپنے آپ کو تنہا پایا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر، مختلف سمتوں میں پولیس والے ہمارے رضاکاروں کو پیٹ رہے تھے۔ بغیر سوچے سمجھے، میں کم نمایاں دکھائی دینے کے خیال سے، سڑک کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن معاً میں کھڑا ہوگیا اور دل ہی دل میں استدلال کیا اور طے کرلیا کہ میرے لئے ہٹ جانا مناسب نہیں۔ یہ سب صرف چند ثانیوں کی بات تھی، لیکن اپنے بطون میں اس کش مکش اور اس فیصلہ کی یاد کہ مجھے ایک ڈرپوک کی طرح عمل نہیں کرنا چاہیئے جو غالباً میرے گھمنڈ نے اُبھارا تھا، میرے ذہن میں واضح ہے۔ لیکن ڈرپوک پن اور ہمت کے بیچ کا خط بہت مہین تھا اور بہت ممکن تھا کہ میں اس خط کے دوسری طرف ہوتا۔ مشکل سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ سوارہ پولیس کا ایک سپاہی میری جانب گھوڑا دوڑاتا اور لمبا نیا عصا گھماتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا اور اپنا رخ پھیر لیا۔ اور یہ بھی سر اور منہ کو بچانے کی ایک جبلی سعی تھی۔ اس نے دو زوردار ضربیں میری پیٹھ پر رسید کیں۔ میں چکرا گیا اور میرا سارا جسم تھرا گیا، لیکن مجھے تعجب ہے اور تشفی بھی کہ میں کھڑا تھا۔"

خود نوشت کے یہ بڑے ہی المیہ حادثات میں سے ہے۔ لیکن جس شگفتہ اور معروضی انداز میں، پنڈت نہرو نے اسے سپرد قلم کیا ہے۔ وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اس بیان کی تہہ میں ایک گہرا طنز ہے جس کے سہارے "خود نوشت" کے پڑھنے والے اس دل سوز والے واقعہ کو پڑھ کر گذر جاتے ہیں۔

جیل خانے کے مزاح کے سلسلے میں بعض بڑے دلچسپ واقعات لکھے ہیں جن میں سے ایک واقعہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے کہ اسپنگلر کی کتاب "ڈیکلائن آف دی ویسٹ" (مغرب کا زوال) پڑھنے کی انہیں اجازت نہیں تھی، کیونکہ یہ خطرناک اور بغاوت کو اکسانے والی کتاب سمجھی گئی تھی جیل کے کمرے میں پنڈت جی تنہا نہیں تھے۔ چوہوں، چیونٹیوں پر تو خیر جیل کی روک تھام کا کیا اثر ہو سکتا تھا، کبھی کبھی سانپ سپنولے بھی ہمدردی کرنے کے لئے پہنچ جایا کرتے تھے! ان سے جذباتی برانگیختگی کے مواقع فراہم ہو جاتے تھے جن کی جیل کی سپاٹ زندگی میں بڑی کمی تھی۔

گاندھی جی کی قلمی تصویر پنڈت جی نے ایک جگہ بڑی نفیس کھینچی ہے۔ اس باب کا عنوان انہوں نے "تضادات" تجویز کیا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ لوگ جو گاندھی جی کو ان کی تحریروں کی بدولت جانتے

۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی ایک پروہت[1] قسم کے انسان ہیں جو انتہائی دین دار ہیں۔ مگر یہ ساری نا انصافی ان کی تحریروں کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی تحریروں سے بہت زیادہ بلند انسان ہیں۔ وہ پروہت قسم کے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی مسکراہٹیں جان بخش اور ان کی ہنسی متعدی ہے جس سے مسرت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان میں کوئی ایسی بات ہے جو بچوں جیسی نظر آتی ہے اور بہت خوش کن ہے۔ جس بزم میں وہ ناز سے گفتار میں آتے ہیں، کالبدِ قالب دیوار میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ وہ غیر معمولی قسم کے تضادات کا مجموعہ ہیں۔ پنڈت جی یہ بھی کہتے ہیں کہ سب ہی بڑے آدمی کم و بیش ایسے ہی ہوتے ہیں[2]

اس مجمل بیان سے گاندھی جی کی ذات کے بارے میں جیسا واضح تصور ابھرتا ہے وہ شاید ایک پوری سوانح عمری سے بھی ممکن نہیں تھا۔

"خودنوشت" اپنی دلکش تصویروں کے اعتبار سے چشم اور ذہن کی ایک ضیافت ہے جس کے الوانِ نعمت میں نمکینی بھی ہے اور ترشی بھی۔ یہاں زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ پُر ہجوم جد و جہد کے مناظر، مسکراتے چہرے بسورتے منہ۔ یہ ایسی زندگی ہے جس میں کوئی بھی زندگی سے محبت رکھنے والا بغیر

---

[2] "His smile is delightful, his laughter infectious, and he rediales light heartedness. There is something child-like about him which is full of Charam. When he enters a room he brings a breath of fresh air with him which lightens the atmosphere..." He is an extra ordinary paradox." (P. 516)

[1] ان کے الفاظ ہیں :-
People who do not know Gandhiji Person-
ally and have only read his writings are apt to
think that he is a priestly type, extremely puritanical,
long faced, Calvimistic and a kill-Joy type, some
thing like, "the priest in black gowns walking their
round." (P. 516)

پس و پیش کے اپنے آپ کو جھونک دینا چاہے گا۔ یہ مصنّف کا زندگی کے ساتھ شغف ہے کہ اس کا قلم جس چیز کو چھوتا ہے، اسے زندگی کی مسکراہٹیں بخش دیتا ہے۔ جیسے کسی جادوگر نے اپنی جادو کی چھڑی سے اسے چھو دیا ہو۔

دی ڈسکوری آف انڈیا

اپریل تا ستمبر ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی۔ اس زمانے میں پنڈت نہرو قلعہ احمد نگر کی جیل میں تھے۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا مابعد تھا۔ قلعہ احمد نگر کی جیل میں پنڈت نہرو کے علاوہ کوئی گیارہ کانگرسی قائدین نظر بند تھے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت گووند بلبھ پنت، آچاریہ نریندر دیو اور آصف علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پنڈت نہرو نے لکھا ہے کہ نظر بندوں میں سنسکرت، عربی اور فارسی اور موجودہ ہندوستانی زبانوں میں اردو، ہندی، بنگالی، گجراتی، سندھی، مرہٹی، تیلگو، کنڈی، تامل غرض سبھی زبانوں کے عالم موجود تھے۔ اس کتاب میں سب کے مشورے شامل تھے۔

ڈسکوری "سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں چھپی۔ اس کے دوسرے سال اس کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن شائع ہوا۔ پھر ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۷ء میں اس کی طباعت عمل میں آئی اور ۱۹۶۰ء میں نیا ایڈیشن نکلا۔

ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر، اس سے پہلے خصوصی علما نے اپنی تصانیف شائع کی تھیں۔ اسی لئے پنڈت نہرو، اس کتاب کو شائع کرتے ہوئے اپنے عادتی انکسار سے لکھتے ہیں کہ "نہ جانے دوسرے مصنفین اسے کس نظر سے دیکھیں گے"۔ مگر خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ جب کبھی میں اپنی پچھلی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو ایک عجیب ہیجان پیدا ہو جاتا ہے، خاص طور پر، جب یہ قید خانے کے بند اور غیر معتاد ماحول میں لکھی گئی ہوں"۔ اور یہ عجب اتفاق ہے کہ ان کی ساری یادگار تصانیف جیل کے بند اور غیر معتاد ماحول کی پیداوار ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ میری تصنیف ہے اور مکمل میری نہیں۔ یہ کسی حد تک میری ذاتِ ماضی کی نمائندہ ہے جو دوسروں کی ذات کے طویل سلسلے سے جڑی ہوئی ہے، جو کبھی تھیں اور اب دھندلا گئی ہیں اور ان کی صرف یاد باقی ہے۔

کتاب دس ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے دو باب ابتدائیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسرا باب تلاش کا ہے اور چوتھا دریافتِ ہند کا۔ آخری چھ باب ہندوستان کی تاثراتی تاریخ ہے۔ پہلا باب جس

کا عنوان قلعہ احمد نگر ہے۔ سات ذیلی عنوانات 'بیس مہینے، قحط، جمہوریت کے لئے جنگ، قید خانہ کی زندگی، ماضی اور حال سے اس کا تعلق، زندگی کا فلسفہ، ماضی کا بار' ہیں۔

احمد نگر کا قلعہ، دکن کے نظام شاہی حکمرانوں کی آماجگاہ، بہت سے تاریخی انقلابات کا شاہد ہے۔ اس کی حصاروں نے برہان نظام شاہ، ملک عنبر جیسے مدبّروں اور سپاہیوں کا پرورش کی تھی، چاند بی بی جیسی بہادر حسینہ کو جنم دیا تھا۔ اسی قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہوئے وہ اپنے وطن کی مدافعت میں مغل یلغاروں کا مقابلہ کرتی رہی تھی۔ مغل فوجوں نے جب اس قلعہ کی فصیل کا حصہ سرنگ لگا کر اُڑا دیا، تو راتوں رات اس نے مصنوعی فصیل کھڑی کر دی تھی جسے دیکھ کر صبح مغل سپاہیوں کی حیرت اور مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی تھی۔ اس تاریخی قلعہ میں زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ ہند کے مایہ ناز سپوت اس کے مہمان بنے اور دریافتِ ہند کا سراغ پنڈت جی کو یہیں سے لگا۔ آزاد کے غبارِ خاطر کے انشائیہ نما ادبی خطوط کی داغ بیل یہیں پڑی۔

دوسرا باب شخصی یادوں، بیاہ، رفیقۂ حیات، سوئٹزرلینڈ اور کملا نہرو کی وفات، مسولینی کی واپسی کے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں عظمتِ ماضی، قومیت اور بین قومیت، ہند کی قوت اور کمزوری، تلاشِ ہند، بھارت ماتا، کثرت میں وحدت، ہندوستان میں سفر اور اس کے وسائل، عام انتخابات، عوامی تہذیب اور زندگی کے دو رخ پیش کئے گئے ہیں۔

اگلے باب کی تلاش کا ماحصل، دریافت، چوتھے باب سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بھارت کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کے تاثرات ہیں۔ گذشتہ باب میں وہ اندازِ نظر پیدا ہو چکا تھا جس کا اشارہ ان الفاظ میں ہم کو ملتا ہے:

"فکر اور عمل کے ان برسوں میں میرے ذہن پر ہندوستان چھایا ہوا تھا اور اسے سمجھنے اور اس کے بارے میں اپنے ردّ عمل کی چھان بین کی میں نے کوشش کی۔"

(اصل اگلے صفحہ پر)

دریافت کا آغاز منطقی طور پر وادیٔ سندھ کی موہنجوڈارو اور ہڑپا کی بھولی بسری تہذیبوں سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھارت کی تاریخ کے تینوں عہدوں کے نمایاں خدوخال اُبھرتے ہیں۔ آریوں کی ہند میں آمد، ان کی عظیم الشان الہامی کتابوں کی ترتیب، فلسفیانہ تفکر کا ارتقا، اُپنشد اور بھگوت گیتا کی شکل میں، پھر تاریخی رزمیوں، مہابھارت اور رامائن کی تدوین، گوتم بدھ کا ایک نیا مذہب اور فلسفہ ہند کو عطا کرنا، جسے رفتہ رفتہ ہندومت نے ضم کر لیا، لیکن ہندوستان سے باہر چین، جاپان، تبت،

شیرازہ

وسط ایشیا میں اس کی اشاعت، سنسکرت زبان کی نشو و نما، ہندوستانی علما کی علمی خدمات، غرض سارے پہلوؤں پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

چھٹے باب سے نئے مسائل کا آغاز ہوتا ہے جو عربوں اور مغلوں کے ہندوستان میں آنے سے پیدا ہوئے تھے۔ عرب تہذیب، جو مسلمانوں کے ساتھ بھارت میں پہنچی تھی، اس میں ہند کا بھی حصہ تھا۔ تاہم ان کے مذہبی عقائد اور سماجی نظام نیا تھا۔ ہندوستان انسانیت کی ذاتوں میں تقسیم کے لئے بدنام ہے پنڈت نہرو نے ذات پات کے نظریے اور عمل پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ عرب وحدانیت کا پیغام اور ذات پات سے بری سماجی نظام اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابتدائی تصادم کے بعد ہندو مسلمانوں کے خیالات اور تصورات میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی۔ جس کے نمائندے بھگت کبیر، گورونانک اور امیر خسرو ہیں۔ مغلوں کے ہند کی تہذیب اور شائستگی میں رنگے جانے کا آغاز بابر سے ہو چکا تھا، لیکن اکبر نے اسے انتہا کو پہنچا دیا۔ پھر اورنگ زیب سے ردّ عمل شروع ہوا۔ مرہٹوں کی طاقت ابھری اور مغربی قومیں ہندوستان آئیں۔

بعد کے تین ابواب، آخری رُخ پیش کرتے ہیں۔ جس میں برطانوی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ بھارت کی قومی تحریک بھی ابھرنے لگی۔ آخری باب "پھر احمد نگر" آزادی کی جد و جہد کی تاریخ ہے جس کو ایک شکل دینے میں گاندھی جی کے ساتھ خود مصنّف کا بھی حصہ تھا۔

اپنے عہد کے نامساعد حالات، قحط اور جنگ کے تضادات میں بھی ان کی نظر ہند کی حرکی صلاحیتوں کو بھی تاڑ لیتی ہے جو ان تضادات سے بھی قوت اور قوت پاتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

"فطرت اپنا آپ احیا کرتی رہتی ہے اور کل کے میدان جنگ کو سبزہ زار اور گلزار بنا دیتی ہے اور خون جو بہایا گیا تھا، زمین کی آبیاری کرتا ہے اور نئی زندگی کو قوت اور آب و رنگ بخشتا ہے۔" [۲]

(پچھلے صفحہ سے متعلق)
"During these years of thought and activity, my mind has been full of India, trying to understand her and to analyse my new reactions towards her." (P. 36)

[۲] "Nature renews itself and covers yesterday's battle field with flowers and green grass, and the blood that was shed feeds the soil and gives strenght and colour to new life." (P. 512)

قحط کا ایک فائدہ ہندوستان کے مسئلے کا اُبھر آنا تھا۔

مشرق اور مغرب کا مقابلہ اور موازنہ کرتے ہوئے ایک مابہ الامتیاز خصوصیت کو نمایاں کرتے ہیں کہ مغرب کی فوقیت یہ ہے کہ اسے حرکی نقطۂ نظر حاصل ہے۔ اس کے باوجود اقبال کی طرح وہ مغربی تہذیب کے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں تھے۔ پنڈت نہرو لکھتے ہیں کہ مغرب کی تہذیب اپنی مادّی ترقیوں کے باوجود زندگی کے مسائل کو حل نہ کر سکی۔ اس کی فطرت میں تصادم ہے جو وقتاً فوقتاً بڑے پیمانہ پر اپنی آپ تباہی کے درپے نظر آتی ہے؛ اُس میں کسی ایسی چیز کی کمی نظر آتی ہے جو اُسے استحکام عطا کرے؛ کوئی بُنیادی اصول جو زندگی کو معنی عطا کرے۔[1] تاہم اس تہذیب سے وہ پوری طرح مایوس نہیں تھے۔ کیونکہ وہ حرکی تھی اور زندگی اور استعجاب سے پُر۔

ہندوستان میں ماضی پرستی کا جذبہ ہمیشہ شدید رہا جس سے حال متاثر ہوا۔ اور ترقی کی راہ میں رُکاوٹ بنا رہا۔ پنڈت نہرو پُر زور اپیل کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ماضی سے ناطہ توڑ لینا چاہیئے۔ ماضی کے احترام کا مطلب محض یہ ہے کہ اس سے زمانہ حال کے لئے کام لیا جائے۔ ماضی کا اندھا احترام بُرا ہے۔ اسی طرح اس کی تحقیر بھی بھلی نہیں، کیونکہ ان اقدار کو مستقبل کی بُنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔[2]

ہمارے عصری مسائل میں قومیت، سوشلزم، سرمایہ داری، ہر ایک پر انہوں نے بالغ نظری سے بحث کی ہے۔ قومیت کا تصور، ہندوستان کے لئے بُرا نہیں۔ سوشلزم کو قومیت سے اس لئے کد ہے کہ اس کی نظر میں یہ زوال پذیر متوسط طبقے کے ساتھ ٹکی ہوئی ہے۔ سرمایہ داری بھی ترقی کرتے کرتے بین قومی ہوتی اور قومی سرحدوں کو عبور کرتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے پنڈت نہرو کو گِلہ ہے کہ وہ قومی روایات سے بالکل بیگانہ ہے۔

---

[1] "It seems to lack something to give it stability, some basic principle to give meaning to life, though what these are I cannot say." (P. 519)

[2] "A blind reverence for the past is bad and so also is a contempt for it, for no future can be founded on either of these." (P. 528)

مسائل عظیم تھے، جن کا انہیں سامنا تھا اور مطلع صاف نہیں تھا۔ اس کے باوجود پنڈت نہرو کا خواب یہ تھا کہ ہند ایک مضبوط متحدہ مملکت، آزاد وحدتوں کے ایک وفاق کی حیثیت سے اُبھرے پھر اس خواب کی تعبیر بھی انہیں کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

"اے بینچ آف اولڈ لیٹرز"

ہندوستان اور بیرونِ ہند کے مشاہیر کے خطوط کا یہ مجموعہ، جس میں خود پنڈت جواہر لال نہرو کے لکھے ہوئے (۳۶) خطوط شامل ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پنڈت جی نے اپنے ایک پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ سارے خطوط زیادہ تر کاروباری نوعیت کے ہیں اور اُن سے ہندوستان کی سیاست کے علاوہ سماجی، علمی اور ادبی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خطوط جو پنڈت جی کے نام مختلف لوگوں نے لکھے تھے۔ اور وہ خطوط، جو خود انہوں نے، مشاہیر جیسے مہاتما گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد اور لارڈ لوتھیان، برنارڈ شا وغیرہ کے نام لکھے ہیں، قطع نظر اس امر کے کہ ان خطوط سے ان مشاہیر کے ساتھ پنڈت جی کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے؛ خود پنڈت جی کے خیالات کو بہت سے اہم مسائل سے متعلق سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

خطوط کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دوسری تحریروں کے مقابلے میں لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ نجی خطوط کے بارے میں زیادہ صحیح ہے۔ اس مجموعے کے خطوط عموماً دفتری اور کاروباری نوعیت کے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے پنڈت جی کی شخصیت، ان کی اُفتادِ طبع اور بعض وقت ان کے لاشعور اور تحتِ شعور کے عکس ان میں نظر آتے ہیں۔ پنڈت جی کے یہی سارے خطوط نہیں ہیں۔ یقیناً انہوں نے اپنی مصروف زندگی میں بہت سے نجی خطوط بھی لکھے تھے۔ اپنے والد کے نام صاحبزادی اندرا پریہ درشنی کے نام اپنے مخلص دوستوں اور عزیزوں کے نام۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں اب کوئی نجی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سارے بھارت کی ملک تھے بلکہ ساری مہذب دُنیا کے انسان تھے، غالباً اسی لئے انہوں نے نجی خطوط کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ اہمیت۔ اسی لئے یہ خطوط یا ان کا کوئی خط بھی، ان کے حریمِ حیات تک ہم کو نہیں پہنچاتا۔ صرف چند خطوط، جنہیں وہ نجی سمجھتے تھے اور جو اپنی صاحب زادی کے نام لکھے گئے ہیں وہ بھی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے خطوط میں ایک خط ایم' ایل اوکس پولیس سپرنٹنڈنٹ مسوری کے نام ہے۔ پنڈت جی جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اس میں ایک افغانی وفد بھی مقیم تھا۔ اوکس نہیں چاہتے تھے کہ پنڈت نہرو اس وفد کے لوگوں سے ملیں۔ اس لئے ان سے ایک تحریر بلکہ ایک مچلکا اس مقصد کے لئے لکھ دینے کی خواہش کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اوکس نے پنڈت نہرو کی سرشتِ فولاد کو نہیں آزمایا تھا۔ وہ اوکس کو لکھتے ہیں :۔

"آج صبح ہم میں جو گفتگو ہوئی، اس پر اور حکومت جس طرح چاہتی ہے کہ افغان وفد' جو اس وقت مسوری میں ہے اس سے نہ ملنے یا اس سے مراسلت نہ کرنے کے بارے میں میں اثباتی تحریر دوں، اس سوال پر میں نے غور کیا اور مجھے افسوس ہے کہ اس موضوع کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنے تیار نہیں ہوں۔"

پھر وضاحت کرتے ہیں :۔

"میں بلاشبہ اس وفد سے دلچسپی رکھتا ہوں، جیسا کہ ہر سمجھ دار آدمی کو رکھنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات کبھی میرے حاشیۂ خیال میں تھی اور نہ ہے کہ میں اپنی طرف سے ہو کر ان سے ملوں۔"

مسوری میں پنڈت جی بیوی کی صحت کی خرابی کے باعث آئے تھے۔ اس کے باوجود وہ خط میں لکھتے ہیں کہ اگر حکومت مجھ پر کسی حکم کی تعمیل کرانا چاہے تو میں سفی الحال اس کے لئے تیار ہوں۔

اس مجموعے میں گاندھی جی کے نام پنڈت جی کے سب سے زیادہ خطوط ہیں۔ مہاتما جی کے ساتھ انہیں جو محبت تھی اور احترام تھا، اس کے باوجود وُہ اپنی رائے کی آزادی سے دست کش ہونا نہیں چاہتے۔ برطانوی حکومت کے ایک اعلان کے بارے میں مہاتما گاندھی کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس بیان کو نقصان دِہ سمجھتا ہوں اور لیبر حکومت کے اعلان کا قطعاً ناموزوں جواب ہے۔۔۔ ۔۔۔ میں بیان یا اس کی تہہ میں جو حکمتِ عملی مضمر ہے، اس کی خوبیوں پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم اس مسئلے پر بُنیادی اختلاف رکھتے ہیں اور میں آپ کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتا۔"[1]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

"جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے سول نافرمانی کی تحریک کو واپس لے لیا ہے تو مجھے دُکھ ہوا۔ پہلے مجھے مختصر بیان ملا تھا۔ اس کے بہت بعد میں نے آپ کا بیان پڑھا اور اس سے مجھے ایسا

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر

صدمہ ہوا کہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے واپس لینے کے خیال سے میں سمجھوتہ کر لینے کے لئے تیار تھا، لیکن آپ نے اس کے لئے جو سبب بتلائے ہیں اور آگے کام کے لئے جو تجویزیں پیش کی ہیں، اس سے میں چکرا گیا۔" لے

مسز کملا نہرو کے انتقال کے بعد شانتی نکیتن میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی تقریر کی تھی۔ قرار داد، جو پاس ہوئی تھی، پنڈت نہرو کے یہاں بھیجی گئی تھی۔ پنڈت جی نے گورو دیو کی تقریر اخباروں میں پڑھی تھی۔ اس پر پنڈت نہرو نے گورو دیو کو خط لکھا تھا اور ان کے جذباتِ ہمدردی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ لکھتے ہیں :-

"میں آپ کے بے حد فیاضانہ الفاظ سے بے حد متاثر ہوا۔ اور ممکن ہو تو میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی آشیرواد سے اور اس مثال سے مجھے کس قدر تقویت ہوتی ہے کہ ہم غلط کردہ راہ لوگوں کو سیدھا راستہ بتانے کے لئے آپ موجود ہیں۔"

محمد علی جناح جو کسی زمانے میں ان کے رفیق کار تھے، سیاسی اختلافات کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے کٹ گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں کانگریسی حکومت کے استعفیٰ پر مسٹر جناح نے "یوم نجات اور تشکر" منانے کا انتظام کیا تھا۔ اس خبر کو اخباروں میں پڑھ کر پنڈت نہرو نے انہیں خط لکھا تھا۔ یہ "یومِ نجات" ان کے لئے ایک شخصی پہلو بھی رکھتا تھا۔ کیونکہ ... ...

لیکن خط کے لب و لہجہ سے، جذبات پر ان کے مکمل قابو کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خط کے لب و لہجہ کی سنجیدگی اور ان کا شائستہ اندازِ مخاطبت ان کی عمدہ ذہنی تربیت کی دلیل ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ)

لے

" I shall only say that I believe the statement to have been injurious and a wholly inadequate reply to the Labour Government declaration ... ... I shall not enter into the merits of the statement or the policy underlying it. I am afraid we differ fundamently on the issue and I am not likely to convert you."

(P. 714) Letter No; 63.

لے خط نمبر ۱۰۲

ایسے چند ہی خطوط ہیں جو سیاسی مسائل پر ان قائدین کو لکھے گئے ہیں جن سے پنڈت نہرو کو بنیادی اختلافات تھے، لیکن زیادہ خطوط ایسے حضرات کے نام ہیں جو ان کے سیاسی دوست اور رفیق کار ہیں۔ ان کے نام خطوط میں باہمی دلچسپی کے مسائل پر تبادلہ خیال کئے گئے ہیں۔ ان خطوط میں مسائل تک ان کی رسائی، ان کے حل اور ان کے استدلال کا یقین آفرین انداز، مسائل کی جان کاری کا بہت عمدہ ثبوت ہیں۔

کچھ خط انگریز عہدے داروں کے نام ہیں۔ یہ عہدے دار، گویا ان کی نقل و حرکت کے نگران تھے، اور ذرا سی لغزش سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کو جب کبھی بہ ضرورت خط لکھنا پڑا ہے، وہ اپنی خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ادکسن کے نام ان کے خط کے ایک اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ کچھ انگریز مشاہیر اور زیادہ تر صاحب قلم ایسے بھی تھے جو پنڈت نہرو کے قدرداں تھے انہیں میں سے مشہور فرانسیسی مصنف رومیں رولاں تھا جس نے پنڈت نہرو کے قیام سوئٹزرلینڈ کے زمانے میں ان کی بیوی کملا نہرو کی صحت کی دریافت کے لئے خط لکھا تھا۔ یہ خط فرانسیسی میں ہے۔ ایک اور خط چارلس ٹریویلین کا ہے جس میں لکھا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے اور اس کے مصنف سے ملنے کی مجھے خواہش ہے۔ جارج برنارڈ شا کو پنڈت نہرو نے دو خط لکھے تھے۔ پہلا خط بہت عجیب انداز سے شروع ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"میں قطعی طور پر نہیں جانتا کہ میں آپ کو کیوں لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ ہم دونوں مصروف انسان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کے کام میں اضافہ کروں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ چالیس سال قبل جب میں ۱۸ برس کی عمر کا تھا اور کیمبرج میں انڈر گریجویٹ تھا میں نے آپ کو ایک جلسہ کو مخاطب کرتے سنا تھا...... اپنی نسل کے بہت سے نوجوانوں کی طرح ہماری نشو و نما آپ کی تحریروں اور تصانیف کی معیت میں ہوئی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ میرا ایک جزء، جیسا کہ میں آج ہوں، اسی مطالعے سے تشکیل پایا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کے لئے کوئی امتیاز ہے۔ [1]

"Like many of my generation, we have grown up in company of your writings and books. I suppose a part of myself, such as I am to day, has been moulded by that reading. I do not know if that would do you any credit." (P. 500)

محمدؐ امین کامل

ابدی یاد

یلہِ پگھہک شبنمی خاب وُچھِت
مُتی شوقن ساغٕری ترٚ ہیٚژ یِراوِنی
تعبیر کہِ نجدٕچ دزِہ دُنی وَتھ

یلہِ گلہِ زبٕو گمٕی ژُتین ارمانن
بےباک جگر لرِہ تل تھاوِتھ
گٔنی راوِنی ہیٚژ اِظہارٕچ کل

گمٕی ژامت دِیُت بڈِہ ہٕتہِ آلو
گرٚیزہ نووٕ شہ لولہِ لولہِ کوہسارو
رٔنجی آرس، روہٕ مشہِ، سیٚندِہ نالس
ژھٹہ مارِنہ ہیٚژ اُندرِم نارن
ہنرٕ وتال ہیٚت گرٕہ آب مندُن
وٚوتھ شور گٔنی، طوفان پھیٚرِد
گگرایہ، بُنیِل، نبہ نار بُنیو
یتہِ یور چھیٚر ووہ نی اسہ دور کرن

اَدہ قہرٕچ بالادری شوریٚ
اَدہ نمرودن تُل کان بدس
اعلان سپُد، یَس آسہِ زُوٚن
یتھ میانہِ خودائی، سر نومرِن

کھوتہِ منز موسُوما ماجہ بریٚژھ حال
اکھ کان ترٚ سوکھہِ نبج بب ہُندرٕنی
ووتھ اُدری مانز اَتھن لاگِتھ
کمہ تام کنگ ڈیجہِ ہوٚر، دِرہ پھول
دوہ یہ کانہِ یہ رائیل آدوسِتھ
یتھ مہرِ نہ پٔتھرس بوسہ دِتن

اَدہ تیرن ہُند گتہِ گیوٚرمہ پٔرژھ
اسمانس گوٚ وبہ منذبن گوٹ
افتابس تال پھُٹ لاے اچھن
سنگلاکھ کوہسن تال مُول اَلیہ

○ ○

ژِی اوسک اَدِ ژِی ہےَ اوسک
ژِیٔ چھی نا جواہِر لال وِناں؟
ژِہ تِہ ہےَ چُھک سانی ہتھرِ ہُند گلُ
ژِیٔ تِہ ہےَ چھےُ سونُے خوُن نشاں

ہُیہِ سانِہ ژِیٔ کتِہ تاں راٰوِی نیہٕ
اَدِ لاراں ہتاراں آکھ دَوال
ژِیٔ تِہ دورِ ہتھ کانن سینہ پَینُ
ژِیٔ تِہ لاٰیِتھ کرِ بکھ، سردارٰی ہُند
یَتِہ یور چھُہ یَتِہ کٕھن توُکن حق

کمِہ دوٗپ نِہ جواہر از گُذرِیہِ
تَس آسہِ نِہ اَبدی نوُر اُچھن
نَتِہ سانین سِینن منز دُچھہ ہے
زِندہ پانِہ جواہر ژھوہ ماراں

اکادمی کی تازہ کشمیری کتاب

”دلیلہ“

کشمیری زبان کی اُن بیش بہا لوک کہانیوں کا نادر مجموعہ جو اب تک سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔

قیمت: تین روپے

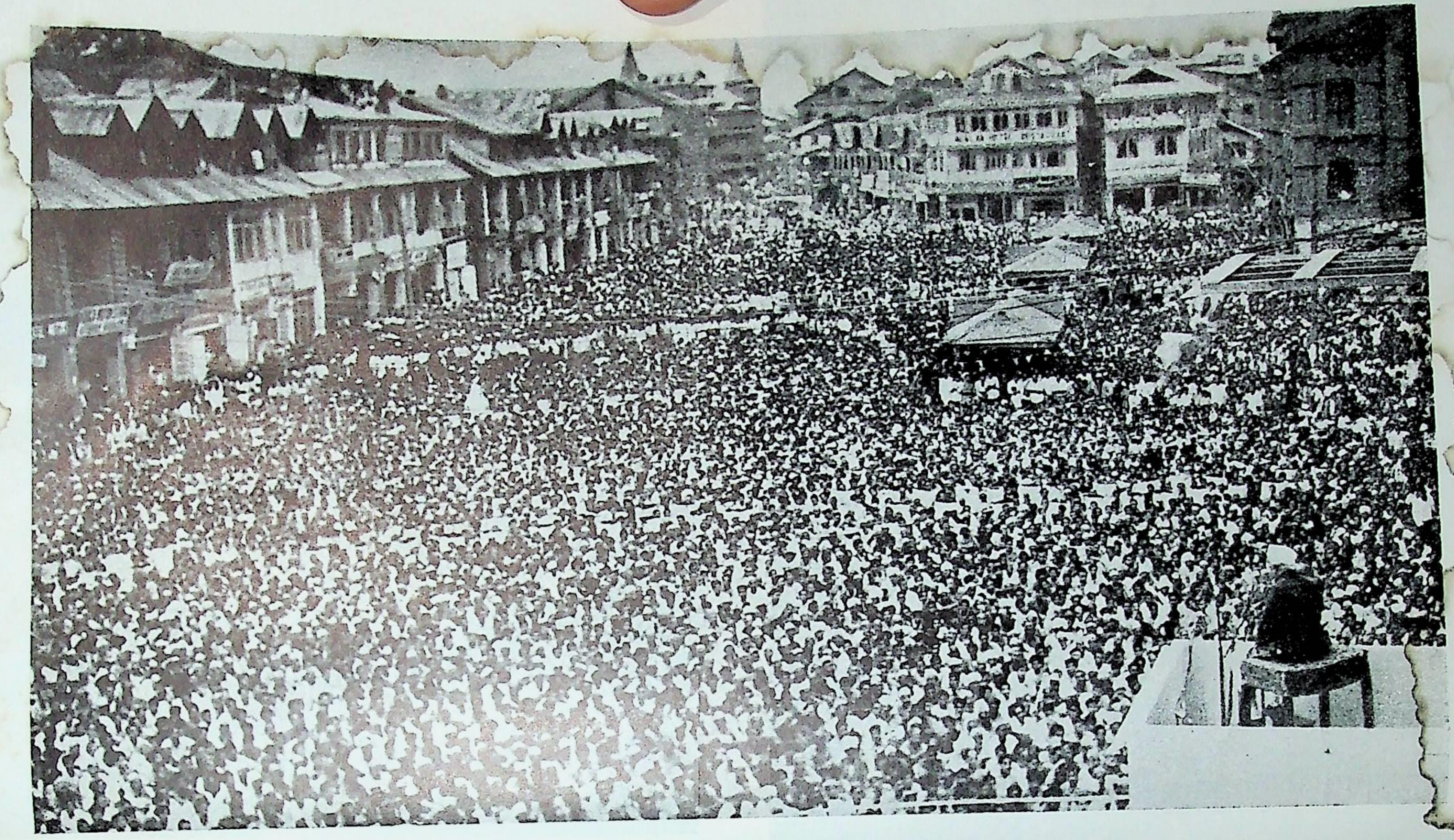
اکادمی سے حاصل کی جا سکتی ھے



مٹن میں پنڈوں کے ذات نامے پر اپنے بزرگوں کے صفحے پر دستخط کرتے ہوئے



پہلگام میں اپنے نواسے کے ساتھ گھوڑے پر سیر کرتے ہوئے



لال چوک میں کشمیری عوام کے اجتماع سے خطاب

(تصویر ایس. پی. ساہنی)

جے لال کول

جواہر لال نہرو ـــــ چند پہلو

جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے اس پُر آشوب دن گاندھی جی کو قتل کیا گیا اور خود جواہر لال نہرو کے الفاظ میں " روشنی گُل ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ " کہا جاتا ہے کہ غیر متزلزل سروجنی نائیڈو برلا ہاؤس کے اُس کمرے میں داخل ہوئی جہاں ماتم کرنے والے لوگ یتیم بنے ہوئے اور غم کے عالم میں ڈوبے ہوئے تھے اور پکاری ـــــ کیا آپ اُس کے لئے کسی اور طرح کی موت چُنتے؟ کیا آپ کی خواہش تھی کہ وہ بستر میں کسی طویل علالت کا شکار ہو کر کروٹیں بدل بدل کر مر جاتے؟ اُس نے ایک شان دار جیون بسر کیا ہے اور ایک شان دار موت پائی ہے ـ " خود پنڈت جی نے اُس دن ہمیں جھڑک دیا ـ " اس میں ماتم کرنے کی کیا بات ہے؟ یقیناً انسانی تاریخ میں بہت کم لوگوں کو اپنی زندگی میں اتنی مُرادیں بھر آتے دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ وہ ہماری ناکامیوں پر اُداس تھے اور اس بات پر ناخوش کہ وہ ہندوستان کو اور بھی زیادہ عروج پر نہ پہنچا سکے۔ "

یہ باتیں آج ہمارے لئے معنی خیز ہیں۔ کیونکہ یہ بات ماننے کے بعد کہ موت اٹل ہے اور اسے آنا ہے جب آنا ہے۔ پھر بھی اس المناک وقت پر ایسی ایک چیز یقیناً ہے جس کے لئے ہمیں شکر گذار رہنا چاہیئے، وُہ یہ کہ ہمارا قدیم اور کئی لحاظ سے عظیم مُلک، جو بعض بدیسی سامراجی قوّتوں کے آگے مجبُور بنا ہوا تھا، جو اپنے تمام حوصلوں اور بھر پُور صلاحیتوں کے باوجود بے بس اور دیا ہوا پڑا تھا، اس انداز سے خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا اور اس نے شیر کی طرح اپنی یال ہلائی اور اپنے دست و بازو کی قوّت کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ دُنیا کا سامنا کرنا شروع کر دیا۔ ایک جوان اور متحرک قوم کی طرح ـ یہ یقیناً فخر کی بات ہے اور یہ کہ یہ چیز ہم ہندوستانیوں اور خاص طور پر

ہم کشمیریوں کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی کہ ہم ایک ایسے آدمی کو جنم دیں جس نے بے مثال قوّت اور یقین سے اس احیائے نو میں حصہ لیا ہو۔ اس بات کے لئے واقعی ہم کو شکر گذار ہونا چاہیئے۔ جارج برنارڈشا کے ایک اقتباس کو پنڈت جی نے بڑی پسندیدگی سے نقل کیا ہے:

"بہت سال گذرے۔" وہ کہتے ہیں۔۔"میں نے جارج برنارڈشا کی ایک تحریر پڑھی جس سے میں سخت متاثر ہوا اور جس کی صدائے بازگشت میرے دل اور ذہن میں پیدا ہوئی۔ اُس نے لکھا تھا۔۔"زندگی کی اصل مسرّت یہ ہے کہ تم نے خود جس مقصد کو بہت بڑا سمجھ لیا ہو، اُس کے لئے استعمال ہو جانا۔ مُرجھانے یا بے کار ہو جانے سے پیشتر مکمل طور تھک کے چُور ہو جانا... ... قدرت کی ایک قوّت ہونا، نہ کہ بیماریوں اور شکایات سے معمور تھرتھراتا ہوا ایک لوتھڑا، جس کے ہونٹوں پر صرف یہ شکایت رہتی ہو کہ دُنیا اُس کو خوش کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف نہیں کرتی۔"

پنڈت جی کو اپنی زندگی میں ایک بڑے مقصد کے لئے استعمال ہو جانے اور موت سے پہلے مکمل طور نڈھال ہو جانے کی یہ مسرّت اس طور حاصل ہوئی کہ گنتی کے اور لوگوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ اُن کا جنم دُنیا کے کسی مُلک کے لئے بھی مایۂ نازش ہو سکتا تھا (اور حقیقت میں دُنیا اُن کے جنم پر اپنی شُکر گذاری کے جذبات کا اظہار کر رہی ہے) لیکن ہمارے لئے یہ اور بھی زیادہ فخر کی بات ہے۔ وہ اپنے مُلک کی آزادی کے لئے ایک جرّی سپاہی تھے اور اس راہ میں اُنہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ لیکن اُن کو امتیاز بخشنے کے لئے اُن کی زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو موجود ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بعض چیزوں پر خاص طور سے زور دیا ہے اور اگر ہم اُن کی یاد کا احترام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان چیزوں کو اپنے دِل میں زندہ رکھنا چاہیئے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے ہماری تحریک آزادی کو دُنیا کے سیاق و سباق میں پیش کیا۔ اُنہوں نے ہمیں اِرد گرد کی دُنیا کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دی، جس میں اس کا حال اور ماضی دونوں شامل تھے۔ اس طرح سے ہماری تحریک آزادی ایک عالمی پس منظر میں پھلی پھُولی اور نوآبادیاتی نظام اور سامراج شاہی کی دشمن قوّتوں اور مصیبت زدہ اور کچلے ہوئے عوام کی بیرونی تسلط کے خلاف ایک تحریک بن گئی۔ اُنہوں نے عالمی واقعات کے درمیان بُنیادی تعلق پر زور دیا

یہ ایک ایسا عطیہ تھا جس پر اُن کی مخصوص چھاپ لگی ہوئی ہے۔

دوسرے اُنہوں نے خود آزادی کے مفہوم کو زیادہ مالامال کیا۔ ایسے حالات میں جو دوسرے لوگوں کو خائف کر دیتے۔ وہ کسی قسم کے خلل کے بغیر صاف اور سیدھے انداز میں سوچتے رہے اور اُنہوں نے کبھی آزادی کی منزل کو نظر سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔ سیاسی آزادی بے شک فلاحی سٹیٹ کا اوّلین اور لابدی ذریعہ تھی، مگر پھر بھی یہ فقط ذریعہ ہی تھی، منزل نہ تھی۔ کسی مُلک کی آزادی، اقتصادی اور سماجی آزادی کے بغیر نامکمل ہوتی ہے۔ ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اُنہوں نے بڑے بڑے دباؤ برداشت کئے لیکن منصوبہ بند اقتصادیات اور ازدواج اور وراثت کے بارے میں عورت کی برابری کے سلسلے میں قوانین کو موجودہ تقاضوں کے قریب لایا۔ اُنہوں نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا کہ بھارت ماتا ایک مابعد الطبعیاتی خیال یا مافوق الفطری اکائی نہیں ہے۔ وہ تم ہو، میں ہوں اور ہم سب ہیں۔ ہم لاکھوں کروڑوں لوگ، جو اس وسیع مُلک کو آباد کئے ہوئے ہیں آزادی صرف چند ایک کے لئے نہیں بلکہ سبوں کے لئے ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں لیکن شاید ایک خاص معنی میں ہم میں سے لاکھوں دبے کچلے ہوئے لوگوں کے لئے اس کی قیمت اور معنی زیادہ ہونے چاہئیں۔ یہ بات لابدی طور سوشلزم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ محتاجی اور استحصال سے آزادی کی طرف، جہالت اور بیماری سے تعلیم، روزگار، کمائی اور سماجی تحفّظ کے حقوق کی طرف۔ یہ لازمی طور سیکولرازم کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے۔ کیونکہ آزادی ناقابلِ تقسیم ہے اور اسے امتیازی نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ ایک مُلک کے تمام شہریوں کے لئے ہونی چاہیئے اور درحقیقت دُنیا کے تمام ممالک کے تمام شہریوں کے لئے ہونی چاہیئے جس میں رنگ، نسل اور طبقے کی کوئی تفریق نہیں ہوسکتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ گو ایک مملکت طاقت کے استعمال کو بالکل ہی ترک نہیں کرسکتی لیکن جمہوری ترغیب اور اپنا مطلق العنانہ جبر اور تشدّد کی نسبت قابلِ ترجیح ہیں۔ اگر دیرپا نتائج کی توقع کرنی ہو تو انسان اور انسان، قوم اور قوم کے درمیان رواداری اور مفاہمت کو فروغ دیا جانا چاہیئے۔ آج کل کے حالات میں امن، ہندوستان اور دُنیا کے لئے ایک بے حد ضروری لازمہ ہے لیکن "امن حملے کے آگے ہتھیار ڈالنے سے برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ باطل اور ناانصافی کے

ساتھ سمجھوتہ کرنے سے برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن جنگ کی باتیں کرنے اور اس کی تیاریاں کرنے سے بھی امن برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔" "باطل اور حملہ آور کی مزاحمت کرتے ہوئے بھی" اُنھوں نے کہا "ہمیں امن کا مزاج برقرار رکھنا ہے اور اُن لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہے جو ہمارے خلاف ہوں ۔۔۔" یہ اُس پنچ شیل اور پُرامن بقائے باہم کی اخلاقی اور عملی بُنیاد ہے جس کی تصنیف میں وہ شریک رہے ہیں۔ اور جس کی وکالت میں پیش پیش!

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ موجودہ ہندوستان کے معمار تھے۔ زیادہ صریح الفاظ میں یہ کہ اُنھوں نے ہندوستان کو نئے دَور کی ترقی کی راہ پر مضبوطی سے ڈالنے کی کوشش کی۔ اُن کا مقصد کیا تھا؟ اُن کا مقصد یہ تھا کہ (اور اُن کے کہنے میں کسی قسم کا ابہام اور عارفانہ نقطۂ نظر شامل نہیں تھا) کہ منظّم مذہب یا کلیسا کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہم مستقبل کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد اور آزاد رہنا چاہتے ہوں تو نسل اور ذات پات، زبان اور علاقائی حیثیت کو ہمارے دِل میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ بات مانتے ہوئے بھی کہ وسیع پیمانے پر روزگار کے لئے دیہاتی صنعتوں کا پھیلاؤ ضروری ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں اُس وقت تک سچّی خوش حالی یا مادّی معیاروں میں پیش قدمی عمل میں نہیں آسکتی جب تک کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور بڑی فیکٹریوں کے رول کی اہمیّت کو تسلیم نہ کیا جائے اور اس بات میں شک نہیں کہ ان لوازمات کے بغیر ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنی آزادی اور خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتے۔

مختصر طور پر یہ ہے اُن کی تحریرات اور تقریروں کا مفہوم۔ لیکن ان چیزوں کا اثر اس قدر نہیں ہوتا اگر وہ انگریزی کے اعلیٰ نثر نگار نہ ہوتے۔ اور یہ بات مُناسب ہوگی کہ اُن کی تحریرات کی بعض خوبیوں کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا جائے۔ یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیئے کہ اپنے ملک اور دُنیا کے لئے اُنھوں نے جو اچھا اور عظیم کام کیا ہے اُس کو الگ چھوڑتے ہوئے بھی، آنے والے زمانے میں اُنھیں وطن اور وطن سے باہر اپنی تحریرات کی بنا پر جانا پہچانا جائے گا۔ یہ فن کاری اُن کے اسلوب اور اندازِ بیان کی جاذبیت ہے جو اُن کی تحریرات کے خیالات اور ذہنی مواد کو دوام اور تاثر عطا کرتے ہیں۔

ہم میں سے وہ لوگ، جو اس صدی کی یا دوسری یا تیسری دہائی میں کسی وقت سکولوں یا کالجوں میں زیرِ تعلیم تھے (خاص طور یُو، پی میں) مُشکل سے ہی تحریک عدم تعاون کے خلل انگیز تاثر سے فرار

اختیار کرسکتے تھے۔ ہم میں سے جو لوگ زیادہ حوصلہ مند تھے وہ جلد ہی اس کے بھنور کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ لیکن جو لوگ ذرا کمزور دل رکھتے تھے اور جنہوں نے اس طوفانی رَو کی طغیانیوں میں کُودنے کی ہمّت نہیں کی۔ وہ حفاظت کے ساتھ اپنی پنشن پانے والی سرکاری مُلازمتوں میں محفوظ رہے۔ لیکن ہم لوگ بھی اپنے اِرد گرد ہونے والے واقعات سے بالکل قطع تعلق نہیں کرسکتے تھے صرف اس وجہ سے ہی نہیں کہ روزانہ اخبارات ہڑتالوں اور لاٹھی چارج کا، قانون کی خلاف ورزی اور عام حراست کا حال بتاتے تھے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اُس زمانے کا سیاسی لٹریچر کتابیں اور کتابچے جو حکومتِ وقت نے ممنوع قرار دی تھیں، وہ ہمیں اپنی لاج رکھنے کے لئے پڑھنا پڑتے تھے اور اس صدی کی تیسری دہائی کی ابتدا میں ہی نہرو خاندان ایک روایت کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ ایک چھریری جسمانی ساخت کا خوبصورت سا نوجوان نہرو، جو کسانوں میں گھوم رہا تھا، طلبا کا محبوب بنتا جا رہا تھا۔ کسی کسی وقت اُس کو الہ آباد میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک کانگرسی والنٹیر کی کھدّر کی وردی پہنے ہوئے، لیکن اس کے وجود میں فخر اور استقلال کا شائبہ تھا۔ اُس کا چہرہ جاذب نظر تھا لیکن یہ تھوڑی سی شدّت سے اُبھرا رہتا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک دُور رس نگاہ ہلکورے لیتی تھی۔

اس شخص اور اس کے مقاصد کی گہری اور زیادہ بھانے والی تفہیم چوتھی دہائی میں پیدا ہوئی جب کہ اُس کی وہ کتابیں چھپ کر آگئیں جو اُس نے اپنی قید کی زندگی میں فرصت کے لمحوں کے دوران لکھیں۔ " ایک باپ کے خط بیٹی کے نام " (۱۹۳۰ء) تاریخ عالم کی جھلکیاں (۳۵-۱۹۳۴) جواہر لال نہرو —— ایک خود نوشت سوانح عمری (۱۹۳۶ء) مضامین کے بہت سے مجموعے جیسے "ہندوستان کی وحدت" - "ہندوستان میں اٹھارہ مہینے" - "جیل کے دریچے سے" - سے جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہی شائع ہوئے اور "ہندوستان کی دریافت" (۱۹۴۵ء)

ان کتابوں سے ایک ایسا آدمی آشکارا ہوا جس میں عمدہ صفات اور ذہن کی گہرائی تھی جس میں جذبات کی نزاکت اور ایک شاعر کی زُود حِسی تھی۔ جس میں نہ تو کوئی مصنوعی اکڑ تھی نہ خود ترسی اور نہ ہی نفرت۔ لیکن جس میں انسانی مہربانی اور گرم جوشی اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سُلجھانے کا جنون موجود تھا۔ اُس کی رنگا رنگ شخصیت کے اس پہلو نے اُسے ہمارے دلوں

میں جگہ دی۔ اور ہم اُس کی لکھی ہوئی تمام چیزوں کو بڑے شوق اور بڑی پسندیدگی سے پڑھتے تھے۔ اس طرح سے ہم اُس کی تحریرات کی جاذبیت سے اُس کے خیالات کا لمس محسوس کرتے رہے اور وہ جن مقاصد کی ترجمانی کرتے تھے اُن کے بارے میں اپنی فکر و ادراک کو سیراب کرتے تھے۔ وہ مقاصد کیا تھے؟ اپنے ملک کے لئے آزادی، اور بے شک اپنے ملک اور دُنیا کے دَبے کچلے اور پس ماندہ عوام کے لئے آزادی۔ رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ہر کسی کے لئے مواقع کی مساوات ــ اور ایک ترقی یافتہ عقلی اور سائنٹفک نقطۂ نظر، جو ایک طرف تو ہمارے ماضی کے قابلِ احترام ورثے کی اہمیّت کا قائل ہے لیکن جسے یہ حوصلہ ہے کہ وہ اُس مستقبل کا سامنا کرے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی عمل داری ہوگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم ابتدا میں سیاسی لیڈروں جیسے سریندر ناتھ بنرجی اور بپن چندر پال کی شان دار، بلند آہنگ تقریر بازی اور گرج دار فصاحت کے عادی بن چکے تھے، لیکن ہم پہلی مرتبہ اُس قسم کی سیاسی تحریر سے رُوشناس ہوئے جو سادہ، راست، تقریباً انجیل کی سی خاصیت کی مالک تھی، جس میں کسی قسم کا ابہام، اُلجھاؤ یا متصوفانہ لب و لہجہ نہیں تھا۔ اظہار کا اختصار اور اُس کی قوّت یہاں موجود تھی۔ ایسا اسلوب، جو نِکھرا ہوا اور شفاف تھا۔ اور لفظ، صفت اور استعارے کا ایسا استعمال، جس پر اُستادانہ فن کاری کی چھاپ تھی۔ یہ ایک ایسا ذہن تھا جو تاریخ کے سارے اُفق پر اور اس کے آگے قبل تاریخ کی دُھندلی فضاؤں پر، آزادی سے محوِ پرواز تھا اور پھر ایسا زُود پرواز کہ ایک دم حال کی دُنیا میں آکر مستقبل کا جائزہ لیتا۔ جو کہ ہر ایک کے لئے بہتر، زیادہ بھرپُور اور زیادہ باثروت ہوگا۔

جواہر لال اپنے قدرتی ماحول کے بارے میں ایک شاعر کی طرح ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ بچوں پھُولوں، پرندوں اور جانوروں کے بارے میں وسیع کھیتوں اور کھُلی فضاؤں کے بارے میں اور اُس "پکار کے بارے میں جو ستاروں سے آتی ہے"، فطرت کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے بارے میں اور اُس کے خاموش دوام کے بارے میں، جو انسانی وجود اور اُس کی کارکردگی کی ناپائداری کے تضاد میں اور زیادہ گہرا ہوجاتا ہے اگر وہ لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں ہیں تو وہ نیلے آسمان اور بادلوں کی طرف تکتے رہتے ہیں اور اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس قدر تعجب انگیز حد تک رنگوں کی خوبصورتی کے یہ نقش بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔

"بادلوں کو تکتے رہنا" ـــــــ

کتنا میٹھا ہے آرام سے ٹیک لینا اور زمانے کی عشرت کے گیت گانا۔"

اُنہوں نے سمندروں اور پہاڑوں پر آفتاب کے طلوع و غروب کے بہت سے رنگین نظارے دیکھے ہیں وہ ان کی خوبصورتی میں نہلائے ہیں اور ان کے شان دار حسن سے اُنہیں فیضان حاصل ہوا ہے۔

"لیکن قید میں طلوعِ آفتاب کا نظارہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اُفق ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا اور صبح بہت دیر سے تُند کرنیں برساتا ہوا ہماری گراں فصیلوں پر اُبھر آتا تھا۔ یہاں رنگ کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ہماری آنکھیں سخت ہوتی گئیں۔ وہ ہمیشہ کیچڑ کے رنگ کی بنی ہوئی دیوار اور بارک کی یک رنگی کو دیکھتے دیکھتے دُھندلا گئیں اور روشنی اور رنگ کے لئے ترستی رہیں۔"

"اور جب مون سون کے بادل اٹھکیلیاں کرتے ہوئے گذر گئے، عجیب عجیب رُوپ بناتے ہوئے رنگ کے ایک تہوار میں مچلتے ہوئے، میں حیرت انگیز لُطف اندوزی کے عالم میں ہانپنے لگا اور ان کو وجد کی حالت میں دیکھنے لگا۔ کسی وقت بادل پھٹ جاتے اور اُن کے درمیان کی جگہ سے مون سون کا وہ خاص مظہر نظر آجاتا۔ ایک حیرت انگیز گہرائی کی شوخ نیلاہٹ، جو لامحدود کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔"

اُن کے قلم کا جوہر اُس وقت کھُلتا ہے جب وہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوں ـــــ

"کشمیر ایک بے پناہ خوبصورت نازنین کی مانند ہے جس کا حُسن تقریباً غیر شخصی (غیر مرئی؟) اور انسانی ہوس کی حدود سے بالاتر ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ سخت پہاڑوں اور عمودی چٹانوں، برف پوش چوٹیوں اور گلیشروں، سفاک اور تیز رَو پہاڑی جھرنوں کا مردانہ حُسن۔ لیکن اصل میں یہ سب فریب کی سی خاصیّت رکھتا ہے۔ خواب کی طرح اور بے حقیقت۔ اُن اُمیدوں اور آرزوؤں کی طرح، جو ہمارے دل میں موجزن رہتے ہیں۔ لیکن شاذ ہی تعبیر سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک معشوق کے چہرۂ زیبا کی سی ادا رکھتا ہے جو خواب میں نظر تو آجاتا ہے لیکن جاگنے پر آنکھوں سے محو ہو جاتا ہے۔"

اُن کی سوانح عمری میں ایک پُورا باب "جیل میں حیوانات" کے موضوع پر موجود ہے جس میں وہ ہمدردی کے ساتھ ان "رینگنے والے" پیٹ کے بل چلنے والے اور اُڑنے والے "کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے ساتھ اُن کی غیر ارادی نوک جھونک بھی رہی لیکن جنہوں

نے اپنے عارضی گھر کی حفاظت کے لئے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور (بعد میں) ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

عام چیزوں اور جانے پہچانے مناظر کی چھوٹی چھوٹی بیانیہ تفصیلات کو وہ فلسفیانہ غور و فکر کی گہری خاصیت اور ایک وسیع اور آفاقی نقطۂ نظر عطا کرتے ہیں۔ مثلاً

"وقت ہمارے لئے ایک عجیب فریبی ساتھی ہے۔ لیکن یاد کے کرشمے اور زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ کب کی بھولی بسری چیزوں کی تعاقب کرتی ہوئی یادیں —— لاشعور کی دُنیا کی ایک اچانک اور طائرانہ جھلک، نسلِ انسانی بلکہ خود انسانیت کے آغاز کی ایک دُھندلی سی تصویر —— ہم کافی بُوڑھے ہیں اور ہوا کی میٹھی سرگوشی اب بھی ہمارے کانوں میں گونج پیدا کرتی ہے۔ باغِ عدن کے خواب اب بھی ہمیں آشفتہ حال بنا دیتے ہیں اور پراچین کال کے غم ناک واقعات اب بھی ہمیں پریشان کرتے ہیں۔"

وہ قلمی تصویریں بنانے میں بھی اسی قدر مشاق ہیں۔ انہوں نے گاندھی جی اور اپنے عظیم باپ کی جو قلمی تصویریں کھینچی ہیں وہ مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح وہ اتنی ہی متاثر کُن زبان میں ظلم و جبر کے اُس دَور کی عکاسی کر سکتے ہیں۔ "جب دو پہیئے والی فوجی گاڑیاں پیرس کی گلیوں کے فرشی پتھروں پر چرمراتی اور گڑگڑاتی رہیں۔ اور گلیوٹین تک روزانہ سفر ہوتے تھے"۔ یا میونخ کے واقعہ سے ذرا پہلے لندن میں اُمید و بیم کی حالت۔ بمبئی میں مون سون کی آمد کا شدید انتظار۔ پہاڑوں کی رعنائی، کوہستانوں کی تنہائی اور خاموشی یا عوام کے جمِ غفیر جو زندگی اور اُمید سے لپک رہے ہوں۔

پنڈت جی کی نثر ہر موقع پر قابلِ تعریف حد تک مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور کملا کی موت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "چند لمحوں کے اندر وہ کومل بدن اور وہ پیارا مکھڑا، جو اتنی کثرت اور اتنی دِلربائی سے مسکراتا تھا، راکھ بن کے رہ گیا۔" چند سادہ سے الفاظ بے پایاں ذاتی حُزن کو بڑی نرمی، لیکن جذباتیت کے بغیر، کچھ تو چھپاتے ہیں، اور کچھ بیان کرتے ہیں۔"

جب بھی وہ گاندھی جی کا ذکر چھیڑتے ہیں، اُن کی نثر ادبِ عالیہ کا نمونہ بن جاتی ہے۔

"ایک چھوٹا سا آدمی آیا۔ جس نے سیدھے اس کی (ہندوستانی کسان کی) آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں

اور اُس کے ٹکڑے ہوئے دِل پر نظریں گاڑ دیں اور اُس کے دیرینہ عذاب کا اندازہ کر لیا اور اُس نگاہ میں جادُو تھا اور اُس کے لمس میں ایک آگ تھی اور اُس کی آواز میں ایک تفہیم تھی اور ایک آرزُو تھی اور بھرپُور محنت اور تادمِ موت وفاداری کی نوید تھی۔"

"اور پھر گاندھی جی آئے۔ وہ تازہ ہوا کے ایک طاقت ور جھونکے کی طرح تھے۔ جس نے ہمیں انگڑائی لینے اور گہری سانسیں لینے پر مجبُور کیا۔ روشنی کی ایک کرن کی طرح جس نے اندھیرے کو چیر کر ہماری آنکھوں کے پردے سرکا لئے۔ ایک مست ... آندھی کی طرح جس نے بہت سی چیزوں، لیکن سب سے زیادہ عوامی ذہنوں کے کام کرنے کی ترتیب کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ اُوپر سے نازل نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان سے اُبھرا تھا۔

"اُس نے ہمیں بتایا —— "ان کسانوں اور محنت کشوں کے شانوں سے نیچے اُتر آؤ۔ تُم سب جو اِن کے استحصال پر زندہ رہتے ہو —— اُس نظام کو ختم کرو جو یہ افلاس اور مصائب پیدا کرتا ہے۔ سیاسی آزادی نے تب نئی شکل اختیار کی اور اس کو نیا مفہوم مِل گیا۔ گاندھی جی کی تعلیم بے خوفی اور سچائی کی تھی اور ان سب کو مِلا کر اس کا عطر یہ تھا کہ ہمیشہ عوام کی بہبودی کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ برطانوی راج کے تحت ہندوستان کا غالب جذبہ خوف کا تھا۔ نفوذ کرنے والے، دم گھُٹا دینے والا اور گلا گھونٹنے والے خوف کا فوج کا خوف، پولیس کا، وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی خفیہ پولیس کا خوف، سرکاری طبقے کا خوف، دبانے والے قوانین اور زندان کا خوف، زمینداروں کے ایجنٹوں کا خوف، ساہوکار کا خوف، بے روزگاری اور بھک مری کا خوف، جو ہمیشہ ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ یہ ان سب کے خلاف تھا۔ خوف سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے گاندھی جی کی دھیمی لیکن پُرعزم آواز بلند ہوئی —— خوف مت کھاؤ —— کیا یہ اتنا ہی آسان کام تھا جتنا لگتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! لیکن پھر بھی خوف اپنے بھوت پریت اس طور تخلیق کرتا ہے کہ وہ اصل حقیقت سے زیادہ ڈراؤنے ہوتے ہیں —— جب اس کا ٹھنڈے دِل و دماغ سے تجزیہ کیا جائے اور اس کے نتائج کو راضی خوشی قبول کر لیا جائے تو اس کی ہیبت میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔"

وہ موقع کی مناسبت سے سادگی کے ساتھ پُرجوش اور شاندار بھی ہو سکتے ہیں۔

"کافی وقت گذرا کہ ہم نے تقدیر کے ساتھ ایک پیمان باندھا تھا۔ اور اب وقت آیا ہے کہ ہم

اپنے عہد کو بامُراد کرلیں۔ مکمل صورت اور پُورے طور پر نہ سہی، لیکن بہت بڑی حد تک، نصف شب کا گھنٹہ بجنے کے ساتھ جب دُنیا محوِ خواب ہوگی، ہندوستان آزادی اور زندگی کی آنکھیں کھولے گا۔ ایک لمحہ وہ آتا ہے۔ اور وہ تاریخ میں بہت ہی شاذ و نادر آتا ہے، جب ہم قدامت سے نکل کر جدّت کے دائرے میں قدم ڈالتے ہیں۔ جب ایک دَور ختم ہوتا ہے اور جب ایک قوم کی رُوح، جو مُدّتوں دبائی گئی ہو، اظہار سے ہم کنار ہوتی ہے۔ مُناسب یہ ہے کہ اس سنجیدہ موقعے پر ہم ہندوستان اور اس کے عوام اور اس سے بھی وسیع تر انسانیت کی خدمت میں وقف رہنے کا عہد کرلیں۔"

"انسان کی رُوح کس قدر حیرت انگیز ہے! بے شمار ناکامیوں کے باوجود، جن کا اُسے پچھلی صدیوں میں سامنا ہوا ہے، اُس نے اپنی زندگی اور اپنی سب سے پیاری متاع، ایک نصب العین، سچائی، اعتقاد، وطن اور عزّت کے لئے قربان کی ہے۔ نصب العین میں تبدیلی آئے تو آئے لیکن بلیدان کی یہ صلاحیت برقرار رہتی ہے اور اس کی وجہ سے اُس کے بہت سے قصور معاف کئے جاسکتے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ اُس کے بارے میں اُمید کو تلانجلی دے دی جائے۔"

"تباہیوں کے درمیان اُس نے اپنی شان نہیں گنوائی اور نہ ہی اُن اصولوں پر اعتقاد کا دامن چھوڑ دیا جو اُسے محبُوب تھے۔ فطرت کی مہیب طاقتوں کا ایک کھلونا اور اس عظیم کائنات میں ایک حقیر ذرّہ ہوتے ہوئے بھی اُس نے ان طاقتوں سے سرکشی کی ہے اور اپنے ذہن، جو تہذیب کا گہوارہ ہے، کی بدولت ان کو قابو کرنا چاہا ہے، کتنے ہی دیوتا موجود ہوں۔ لیکن آدمی کے خمیر میں کوئی شَے دیوتاؤں جیسی ضرور ہے۔ اُسی طرح جس طرح اُس میں شیطان کا ایک عنصر بھی شامل ہے۔"

وہ تاثّر پیدا کرنے کے لئے مزاح، ستم ظریفی بلکہ طنز سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ مثلاً "جیل خانے اور جیل خانے کی دُنیا میں ایک دریچہ" میں ہندوستان کے اعتدال پسندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ---- وہ صرف نفی کرنے میں مضبوط ہیں۔ وہ ہر جگہ غلطی بھانپتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی اُمید یہ ہوتی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ حقیقت کو پالیں گے۔ حقیقت اصل میں ان کے لئے دو انتہاؤں کے درمیان رہی ہے۔ اگر اس بات پر دلیل بازی ہو کہ زمین گول ہے یا چپٹی شاید وہ ان دونوں انتہا پسند نظریوں کی مذمت کریں گے اور سرسری طور پر یہ تجویز پیش کردیں

گئے کہ یہ مربع یا بیضوی شکل کی ہے۔ اس جماعت کی خاص بات اور امتیازی وصف (اگر اسے یہ نام دیا جاسکے) یہ ہے کہ ہر ایک چیز، یہاں تک کہ نیکی اور بدی میں بھی اعتدال پسندی اختیار کی جائے۔

"اعتدال پسندی میں اپنی تمام شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے" جب کہ قدامت پسند مجھے "وِگ" کہیں اور "وِگ" قدامت پسند۔

"خود نوشت سوانح عمری" اور "ہندوستان کی دریافت" میں وہ اس طرح موقع محل کی مناسبت سے شعروں کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ وہ جس نقطے پر زور دینا چاہتے ہیں، اُس پر اس طرح سے روشنی پڑے یا وہ اس طور زیادہ مؤثر بن جائے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا۔ کیونکہ وہ ایک مستند صاحب مطالعہ اور کتابوں کے شیدائی تھے اور اُن کے ساتھ ہمیشہ کتابوں کا ایک بھرا پُرا صندوق رہتا تھا۔ اپنے سفر کے دوران (جیسا وہ خود بیان کرتے ہیں) وہ ہمیشہ اُس سے زیادہ کتابیں ساتھ رکھتے تھے جس قدر پڑھنا ممکن ہوتا۔ کیونکہ "یہ ایک آرام دِہ خیال ہے کہ ہمارے اردگرد کتابیں ہیں، خواہ وہ ہم پڑھ بھی نہ سکتے ہوں۔" وہ شاعری کے عاشق تھے اور کبھی کبھی میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ آج سے بیس برس قبل ہندوستانی یونیورسٹیوں میں کسی امتیازی درجے کے انگریزی کے پروفیسر کے بغیر اور کوئی اُن کی مانند جدید اور ہم عصر شاعری سے پورا پورا واقف نہ تھا۔ پھر بھی اُن میں اتنا انکسار تھا کہ اُنھوں نے ۱۹۴۵ء میں الہ آباد سے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ میں شاعری کی گہرائیوں میں اپنے آپ کو گم پاتا ہوں۔ جن بہت ساری چیزوں سے اُنہیں بے حد دلچسپی تھی اُن میں لائبریریوں کا پھیلاؤ بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے خیال میں لوگوں میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ اُن کے الفاظ میں "یہ کسی ملک کے لئے شرمناک بات ہے کہ وہاں بہت کم لوگ کتابیں پڑھیں۔ کتابیں پڑھنا ایک اعلیٰ درجے کا متاثر کن مشغلہ ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو کہ کیسے پڑھا جائے اور کیا پڑھا جائے۔" اُن کے آغاز سے ہی پنڈت جی ساہتیہ اکیڈیمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کی پالیسیوں کی رہنمائی کرتے رہے اور اُنہیں اُن کے مقاصد یعنی اچھی کتابیں زیادہ تعداد مگر کم قیمت پر شائع کرنے کے سلسلے میں مدد دیتے رہے۔

اُن کے ذہن اور شخصیت کی استعداد، اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ اُن کی تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ اُن کے ذہن کا خمیر اُتنا آزاد ہے کہ وہ زندگی کے مسائل کے بارے میں کوئی

جامد نظریہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ اس قدر زیادہ روادار، معاف کرنے والے اور انسانیت دوست ہیں کہ وہ بے رحم نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ کوئی بیان دے رہے ہوں یا نتیجہ اخذ کر رہے ہوں، وہ اپنے بیان کو حتمی اور فیصلہ کن نہیں بنا دیتے۔ اگر وہ مذہب، جیسے کہ وہ رائج ہے، کی بات کرتے ہیں اور اس کے "توہم آمیز طور طریقوں اور جامد اعتقادات، اس کے جادوئی عنصر اور اس کی غیر تنقیدی ضعیف الاعتقادی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ساتھ ہی ضرور یہ بھی کہیں گے کہ مذہب نے انسانی فطرت کی کسی گہری اور شدید طور پر محسوس کی ہوئی اندرونی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس نے انسانی زندگی کو قدروں کا ایک مجموعہ دیا ہے اور اس نے اچھے آدمیوں اور خواتین کی بہت سی عمدہ قسمیں پیدا کی ہیں۔" (لیکن اس مرحلے پر بھی وہ اپنے اظہار کو ضرور محدود کر دیں گے) "لیکن ساتھ ساتھ ہی اس نے بہت سے تعصب رکھنے والے، تنگ نظر اور سفاک ظالم پیدا کئے۔" ایک طرف اگر سماجی ارتقا کے متعلق مارکس کا عام تجزیہ معرکتہ الآرا حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے"، لیکن اس کے باوجود زندگی اتنی پیچیدہ ہے اور غیر منطقی "جہاں تک ہم اسے سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا موجودہ علم ہے۔ یہ بات بڑی غیر منطقی لگتی ہے کہ اسے ایک مقررہ نظریے کے چوکھٹے میں محدود کر دیا جائے۔" سماجی زندگی اور فرد کے مسائل کو سلجھانے میں، متوازن زندگی کے لئے، ایک فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کو مناسب مقدار میں متناسب بنانے کے لئے افراد اور گروہوں کے باہمی تعلقات کی تطبیق کے لئے، سائنسی طریقہ کی پیروی کی جانی چاہیئے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارے ارد گرد ایک وسیع اور نامعلوم علاقہ ہے اور سائنس اپنے قابل تعریف کارناموں کے باوجود، اس کے بارے میں بہت کم علم رکھتی ہے۔ حالاں کہ یہ اس سمت میں بعض سرسری قسم کے اندازے قائم کر سکتی تھی شاید یہ بھی ایک وجہ ہو کہ سائنس کے عام طریقے، دنیائے ظاہر کے ساتھ اور زندگی کے قوانین کے ساتھ اس کا تعلق نفسیاتی، فنی اور روحانی اور غائبی دنیا کے باقی عناصر سے پوری طرح میل نہ کھاتا تھا۔ زندگی صرف اسی کا نام نہیں ہے جو ہم دیکھتے، سنتے یا محسوس کرتے ہیں۔ صرف وہی ظاہری دنیا نہیں جو زمان اور مکان میں تبدیلی کا شکار ہو رہی ہے۔ یہ مسلسل طور ایک دوسری پوشیدہ دنیا سے بھی کاندھا ملاتی ہے۔"

اور کوئی سوچنے سمجھنے والا آدمی اس پوشیدہ دنیا کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یا مقاصد یا ذرائع کا مسئلہ لے لیجئے:

"مقاصد اور ذرائع۔ کیا یہ ایک دوسرے سے لازم و ملزوم صورت میں پیوست کئے گئے ہیں۔ جو ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور ردِ عمل پیدا کرتے ہیں اور غلط ذرائع کبھی کبھی زیرِ نظر مقاصد کو مسخ

بلکہ تباہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن صحیح ذرائع کمزور اور خود غرض انسانی فطرت کی دسترس سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔

"ان حالات میں کوئی کیا کرتا؟ عمل نہ کرنا ناکامی کا کھلا اعتراف اور باطل کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف تھا۔ عمل کرنا بہت سی صورتوں میں اُسی باطل سے سمجھوتے کے ہم معنی تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سے ناخوش گوار حالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔"

تو پھر کس طرح آدمی اپنی زندگی کے فلسفے کا نچوڑ پیش کرے؟

"مستقبل اندھیرے سے بھرپور اور غیر یقینی ہے لیکن اس طرف رہنمائی کرنے والے راستے کا ایک حصہ دیکھ سکتے ہیں اور اُس پہ مضبوط قدموں سے گامزن ہو سکتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھتے ہوئے کہ نتیجہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، آدمی کی رُوح کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ جو بے شمار مصائب سے سُرخ رُو ہو کر نکلی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھتے ہوئے کہ زندگی اپنے تمام الم کے باوجود حُسن اور مسرت سے معمور ہے اور اگر ہم کو طریقہ معلوم ہو تو ہم فطرت کے طلسم اثر جنگلوں میں ہمیشہ حیرت سے بھرپور رہ سکتے ہیں۔" اور وہ "کورس فرام باچاس آف یو پیڈینز" (گلبرٹ مری کے ترجمے) سے بڑی پسندیدگی کے ساتھ یہ اقتباس نقل کرتے ہیں:

"دانائی اور کیا چیز ہے؟ انسانی کاوشوں کے مقصد اور قدرت کے کرم سے اور کیا مقصود ہے؟
خوف سے آزاد ہو کر کھڑا ہو جانا، سانس لینا اور انتظار کرنا۔
نفرت کے سر سے اُونچا ہاتھ کر لینا۔
تو کیا پھر حُسن سے ہمیشہ محبّت نہیں کی جائے گی؟"

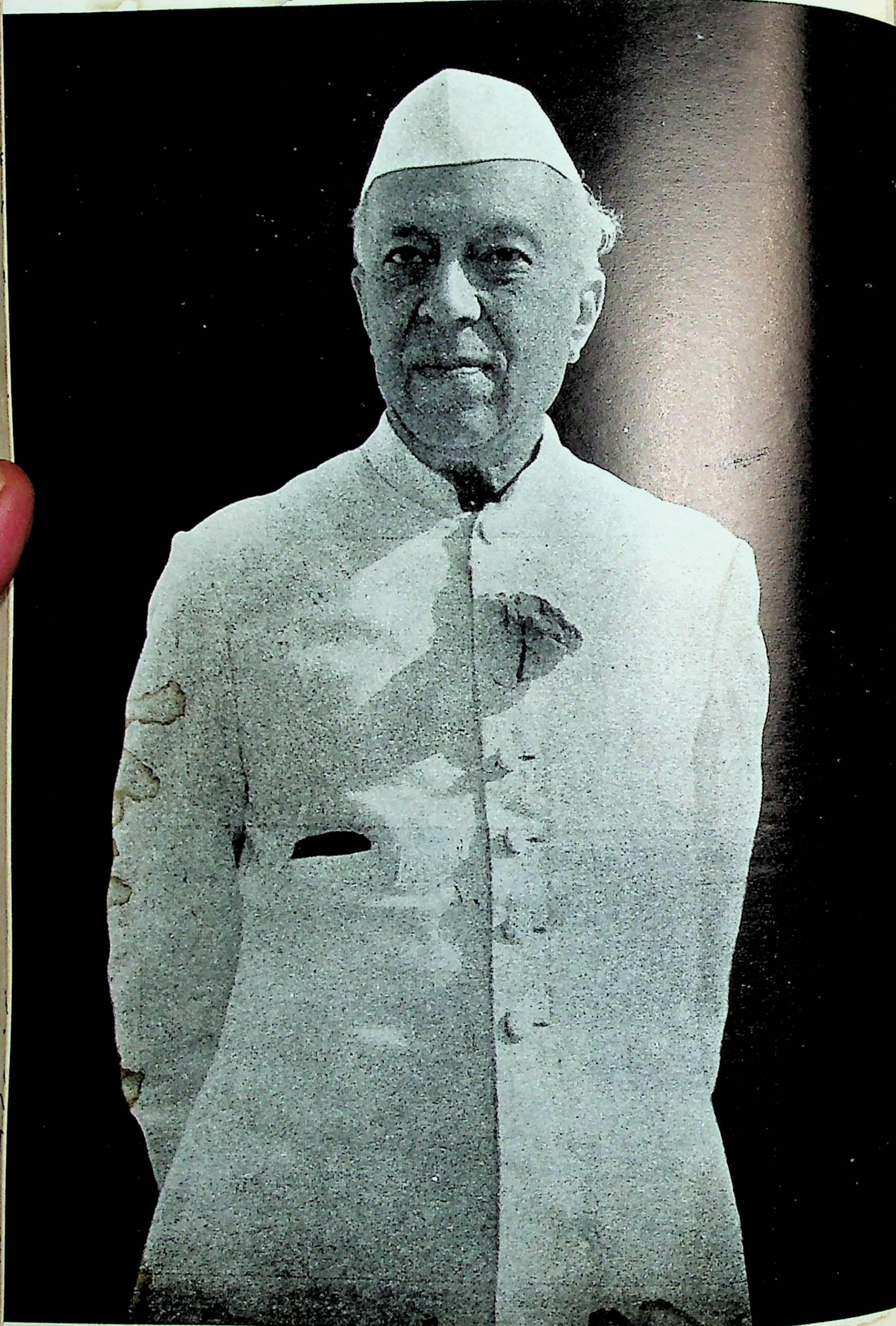
پنڈت جی اس دانش کے مالک تھے۔ وہ منفرد طور آزاد تھے۔ انسانی فطرت کے دو سب سے گھناؤنے قصوروں یعنی نفرت اور خوف سے (جیسا کہ ونسٹن چرچل جس کے پاس پنڈت جی کو محبت کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا) اپنی کتاب "دوسری عالم گیر جنگ" (مختصر ایڈیشن) کے اختتامیہ میں بڑی بے تکلّفی سے اعتراف کرتا ہے:۔

"وہ بہت بڑی ہمّت کے آدمی تھے۔ اُن کا ذہن بے حد لچک دار تھا اور وہ تاریخ کے وسیع منظر کے سیاق و سباق میں زندگی پر ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے۔ ان عظیم اوصاف سے، کئی چھوٹی صفتیں وجود میں نہیں آئیں جو کم تر درجے کے آدمیوں میں پائی جاتی ہیں

مثلاً ایک قسم کی بے رُخی اور فیصلے کی شدّت، جن کے متعلق بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ وزارتِ عظمیٰ کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے سبب ایک منتظم کی حیثیت سے اُنہیں ان اوصاف کا ضرور مالک ہونا چاہیئے تھا وہ اپنی سواری کا نشانہ ستاروں کی منزل میں مقرر کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی وہ یہ بھول جاتے تھے کہ یہ بیل گاڑی ہے، اُڑن کھٹولہ نہیں۔ اسی سبب یہ سواری کبھی کبھی کیچڑ میں دھنس جاتی تھی۔ وہ بے صبر ہو جاتے اور برہمگی کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن وہ لوگ، جو راہ گذر کو ہموار اور کیچڑ سے صاف کرنے پر مامور ہوتے تھے، جانتے تھے کہ اُنہیں معاف کیا جائے گا۔ اور واقعتاً اُنہیں معافی ملتی تھی۔ وہ نہ تو کسی پر بے اعتمادی کرتے اور نہ کسی پر غلط اعتماد کرتے۔ اور بعض لوگوں کی رائے میں اسی سبب یہ بات ممکن ہو سکی کہ پنج شیل کے ایک اور فریق مصنّف نے اُن کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا۔ اور چونکہ اُن میں غیر مسلح کرنے والی صاف باطنی اور اعتراف کرنے کی نادر جرأت موجود تھی، اس لئے اُنہیں اُن کی دُنیائے خیال سے باہر کھینچ لایا۔ یہ کہنا شاید غیر رسمی سا لگے لیکن اس کا اظہار ضرور ہونا چاہیئے کہ گو اُن کے کارنامے بہت سے ہیں لیکن ہمیں آج اُن کو اور اُن کے اکتسابات کو ان کارناموں سے زیادہ اس روشنی میں جانچنا چاہیئے کہ وہ کِن اصولوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ ایک پوری قوم کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا نشان تھے اور اُن کی شخصیّت اور ذہن کتنی اعلےٰ اوصاف کے مالک تھے اور مستقبل کا چاہے جو کچھ بھی فیصلہ ہو، اس میں شک نہیں (اُن کے دِل لبھانے والے لوحِ مزار کو نقل کرتے ہوئے):

"یہ وہ آدمی تھا جس نے اپنے دماغ اور دِل کی ساری طاقتوں سے ہندوستان اور ہندوستانی عوام کو پیار کیا اور اُنہوں نے بھی اس کے جواب میں اُسے اپنی پوری فیاضانہ اور فراخ دِلانہ محبت سے مالامال کر دیا۔"

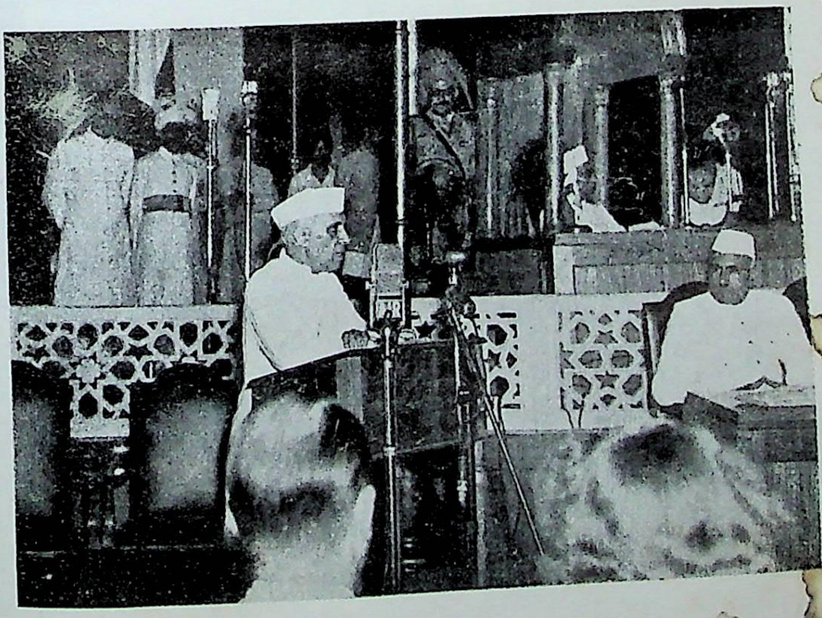
واپسی کے ٹکٹ اور لفافے جب تک مضامین کے ساتھ نہ آئیں، اُنہیں لوٹانے کی ذمّہ داری نہیں لی جاتی!



ہونٹوں پہ تبسم ، کاج میں گُلاب



بیٹی اندرا کے ساتھ چشمہ شاہی کے مہمان خانے میں



۱۴۔ اگست ۴۷ء کو آدھی رات کے وقت دستوریہ سے خطاب

وقارخلیل

فخرِ ایشیا نہرو

(سانیٹ)

وہ فخرِ ایشیا نہرو، جسے ہم سب نے دیکھا تھا
وہ جس کے ذکر پہ اترائے گی یہ سرزمیں برسوں
وہ جس کی روشنی دِکھلائے گی صبحِ یقیں برسوں
غلامی کی شبِ تاریک میں اِک چاند چمکا تھا

نیا ہندوستاں صدیوں رہے گا نام سے روشن
چراغِ مہر و اُلفت، روشنیٔ رہگزر نہرو
پیمبر امن کا، پکھراج و نیلم کا جگر نہرو
اُسی مشرق کے سیارے کی ضو، اُتر سے تا دکھن

جہاں بھی، جب کبھی بھی قافلے ظلمت میں بھٹکیں گے
سویرے کی طرح تو وقت کے سینے میں نِکھرے گا
ترا ذوقِ عمل مہرِ یقیں کی طرح اُبھرے گا
ترے نقشِ کفِ پا گمرہوں کو روشنی دیں گے
اُفق نزادوں پہ سورج ہے کہ نہرو مُسکراتا ہے
نئی راہیں، نئی منزل، نئی دُنیا دِکھاتا ہے

محمد یوسف ٹینگ

گاندھی اور نہرو — چند تصوّرات

جواہر لال کی وفات کے بعد گاندھی جی کا ذکر جس شدّت سے سُننے میں آیا ہے، اُن کے قتل کے فوراً بعد کے چند مہینوں کو چھوڑ کر کبھی اس کثرت سے نہیں سُنا گیا تھا۔ یہ ایک گہرے احساس کا اظہار ہے اور اس کے پیچھے یہ تاثر کارفرما ہے کہ ملک میں "عہدِ گاندھی" کے حیرت انگیز ڈرامے کا شاندار حصہ ختم ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کی چھاؤں میں پرورش پانے والوں، اُن کے ساتھ کام کرنے والوں اور اُن کی جان پہچان کے لوگوں کی ملک میں اب بھی کمی نہیں ہے۔ مگر جواہر لال کے جسدِ خاکی کے نذرِ آتش ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی شانِ دلربائی، اُن کے بزرگانہ قدوقامت اور اُن کی کوہ وقارِ شخصیت کا سُورج غروب ہو گیا ہے۔ اب اس سُورج کی چند واپسیں کرنیں مطلع پر شفق نما انداز میں عکس زن ہیں۔ لیکن تاریکی اور محرومی کا احساس گہرا ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کے سینے سے جب خُون کے پھوارے چھُوٹے تو اُس وقت بھی یہ احساسِ محرومی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ایک ایسی شخصیت اُفق پر موجود تھی جس پر گاندھی کی قبائے عظمت ٹھیک بیٹھتی تھی۔ جس کے وجود میں نُور کی وہی قوسِ قزح موجود تھی جس نے اس سے قبل گاندھی کے علامتی پیکر میں بھارت ورش کے آکاش کو چمکا دیا تھا۔ گاندھی کے اکثر پیروؤں میں اُس منبعِ نُور کی کرنیں کسی نہ کسی رنگ میں سموئی ہوئی ہیں۔ لیکن نہرو کی ذات میں جس شان، جس رعنائی اور جس ارتکاز سے یہ روشنی مجتمع ہو گئی تھی وہ اُن کو گاندھی کے رُوحانی وجود کا تسلسل بنا دیتا تھا۔ گاندھی کی وفات کے بعد جواہر لال نے اپنے اُستاد، مربّی اور رہنما کی یاد میں تعریفوں اور سراہنا کے دریا بہا دئے۔ لیکن اُن کے ان دل گداز مرثیوں کو سُننے والے دل میں ہُوک سی اُٹھتی ہوئی محسوس ضرور کرتے تھے۔ لیکن اُن کے دلوں میں کبھی بے بسی، لاچاری، مجبُوری اور لُٹ جانے

جاننے کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ جواہر لال کی ذات میں گاندھی کا نور جلوہ فگن تھا۔ وہ گاندھی کا "اوتار" تھے۔ وہ وقت کے مہاساگر میں ڈوب گئے تو ہمیں نہرو کے ساتھ ساتھ گاندھی کا اصل ماتم بھی منانا پڑا۔ عظمت اور بڑائی کا وہ زمانہ ختم ہو گیا جو ہندوستان کے دو سب سے بڑے سپوتوں کی چھایا سے اس قدر دلآویز اور اس قدر عظیم بن گیا تھا۔

جواہر لال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک وقت آئے گا جب گاندھی کو جاننے والی پیڑھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن گاندھی کی روشنی سدا چمکتی رہے گی اور اس ملک پر رحمت کے انوار برساتی رہے گی۔" حقیقت یہ ہے کہ آج سے سینکڑوں سال بعد جب ہمارے زمانے کا ذکر آئے گا، جب ماہ و سال کی بسیار گردشوں نے آج کے حال کو "ماضی بعید" بنا دیا ہوگا۔ جب بیسویں صدی کے وسط کا ہندوستان تاریخ اور روایت کی دھند میں لپٹ چکا ہوگا۔ اُس وقت دو آدمی ہمارے دور کے ترجمان بنیں گے۔ . . . اُس وقت روشنی کے دو مینار ہمارے زمانے کا نشان بن کر چمکیں گے . . . اُس وقت صرف گاندھی اور نہرو کے چہروں میں آج کے ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کے چہرے پہچانے جائیں گے . . . اور یہ آنے والی نسلیں دل میں اس حسرت کو چھپائے رکھیں گی کہ انہیں اُس باسعادت زمانے میں جنم لینے کی خوش نصیبی حاصل نہ ہو سکی۔ جب ہندوستان کی دھرتی پر ان دیو قامت شخصیتوں کے قدم پڑتے تھے۔ جب ان فضاؤں میں اُن کی آواز گونجتی تھی اور جب یہ "حقیقتیں" آئینۂ خیال میں نظر آنے کی بجائے "تمثالِ جلوہ عرض" کر رہی تھیں۔ اس قسم کے عظیم انسانوں کی تاریخ میں کمی نہیں ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ زمین پر چلے اور جن کا زمانہ اب صرف اُن ہی کی صورتوں میں تاریخ سے مانوس ہے۔ سقراط اور افلاطون کے ناموں سے کس کو واقفیت حاصل نہیں، اُن کو چھوڑ کر خود اپنے ملک میں آ جائیے۔ کرشن اور ارجن کا تعلق کسے معلوم نہیں۔ اور دونوں روایت اور تاریخ کے تانے بانے میں جس طرح سے جُڑے ہوئے ہیں، اُس سے کون ناواقف ہوگا۔ گاندھی اور جواہر لال کا رشتہ اس تاریخی رشتے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کرشن فلسفے اور نیتی کا سرچشمہ تھے . . . ارجن میدانِ جنگ کے سپاہی . . . .
ارجن کے ذہن میں مہابھارت کی پیچیدگیوں نے تلاطم مچا رکھا تھا . . . کرشن کی آواز نے انہیں راستہ دکھایا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان میں جو "مہابھارت" لڑی گئی، وہاں گاندھی اور نہرو بھی اسی روپ میں نظر آتے ہیں۔ ایک دانش، نیتی اور فلسفے کا سرچشمہ، دوسرا عمل اور تنظیم کا سپاہی۔

ایک گورو اور دوسرا چیلا۔

مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ ایک ہی روایت کے تسلسل یا ایک ہی نور کے دو قالب تھے۔ ایسا تو بار بار ہوا ہے۔ پیغمبروں، اوتاروں، بادشاہوں اور فاتحوں کی ایسی مثالیں کم نہیں ہیں جو ایک دوسرے کے مشن کی تکمیل کرتے رہے اور جن کے روحانی خمیر کے اجزائے ترکیبی ایک سے تھے۔ اور گاندھی اور جواہر لال اس معنی میں ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ گاندھی کا خیال آتا ہے تو کانوں میں گیتا کے شلوک اور قرآن کی آیتیں گونجتی ہیں۔ فضا میں عود و عنبر کی تقدیس آمیز مہک پیدا ہو جاتی ہے۔ "رگھوپتی راگھو راجا رام" کی دھن سنائی دینے لگتی ہے۔ ترکِ دنیا کی سی بے ہوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک کمر خمیدہ لنگوٹ پوش "فقیر" کا ہیولیٰ ابھرنے لگتا ہے جو دنیا کی رعنائیوں کی طرف مائل نہیں ہوتا اور جس کی نگاہیں آسمان پر گڑی ہوئی ہیں۔ نہرو کا ذکر آجاتا ہے تو فضا میں گلاب مہکنے لگتے ہیں۔ لوک سنگیت کی البیلی تانیں سنائی دیتی ہیں۔ "مشینوں" کا ساز بجنے لگتا ہے۔ ایک ایسے خوبصورت آدمی کا پُر رونق چہرہ دمکنے لگتا ہے جو ستّر سال کی عمر میں بچوں کے سے انداز رکھتا تھا۔ دو آدمی اپنی ظاہری شکل و صورت اور پسند، ناپسند میں اس قدر مختلف نہیں ہو سکتے۔ یہ دو آدمی تھے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ سال ہا سال کی رفاقت، اختلاف اور آزمائش کے بعد دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں کھنچتے چلے گئے۔ کانگرس میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ظاہری اور باطنی مشابہت کے لحاظ سے جواہر لال نہرو کی بہ نسبت گاندھی کے زیادہ قریب تھے۔ راجگوپال آچاری ... سردار پٹیل ... راجندر پرشاد ... لیکن گاندھی نے ان لوگوں کو اپنے سے زیادہ قریب مان کر بھی، ان کی وفاداری پر ناز کر کے بھی ایک ایسے شخص کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا جو جسمانی اور ذہنی معیاروں سے اُس کے بہت ہی دور تھا۔ اس کے مقابلے میں جواہر لال کو بھی ایسے لوگ میسّر تھے جو گاندھی سے زیادہ اُس کے تصوّرات کے زیادہ قریب تھے۔ جو اُس کی رائے میں گاندھی سے زیادہ صحیح معاشی نقطہ نظر (اور جواہر لال کی نگاہ میں یہ نقطہ نظر بنیادی اہمیت کا حامل تھا) کے مالک تھے۔ ... سبھاش چندر بوس کی رگوں میں بھی انقلاب کا خون اُسی طرح اُچھلتا تھا جیسے جواہر لال کی رگوں میں۔ لیکن جواہر لال نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اُس شخص کے لئے وقف رہا جس کے ساتھ اُس نے زبردست اختلاف کیا تھا اور جس کے بعض اقدامات کو اُس نے ہندوستان کی تحریک آزادی کا "اینٹی کلائمکس" بتایا تھا۔ حیرت ہے کہ جب

یہ دو ہستیاں سیاست کے سمندر کی طغیانیوں میں ایک دوسرے کی مخالف دھاروں میں بہہ رہے تھے، اُس وقت بھی انھوں نے اپنے "اندر" کی ہم آہنگی کو محسوس کیا۔ گاندھی جی نے کہا۔ "جواہر لال بلور کی طرح شفاف ہے ... اُس کا ظاہر و باطن ایک ہے ... لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھ سے مختلف زبان بولتا ہے ... لیکن زبانوں کا اختلاف دلوں کے اتحاد میں رُکاوٹ نہیں بن سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ جب میں نہ رہوں گا تو وہ میری زبان میں بات کرے گا۔"

کتنی عظیم پیشین گوئی —— صرف گاندھی کے دل گردے اور بصیرت کا آدمی اس کی جرائیت کر سکتا تھا۔ جواہر لال کو اُس وقت بھی لوگ دہریہ، کمیونسٹ، دہشت پسند، ڈکٹیٹر اور اسی قسم کے خطاب دے رہے تھے جو گاندھی ازم کی رُوح کے متضاد تھے اور جواہر لال ان الزامات سے خائف نہیں تھا بلکہ اُس کا خیال تو یہ تھا کہ گاندھی جی کی اہنسا ہم نے ایک پالیسی کے طور اختیار کی ہے ... اعتقاد کے طور پر نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب گاندھی کی ہمہ گیر شخصیت کا سورج غروب ہو گا اور جواہر لال کا زمانہ شروع ہو جائے گا تو یہ شخص سارے گاندھیائی طرزِ عمل کا رُخ ہی موڑ دے گا —— یہ قیاس آرائیاں نہیں تھیں بلکہ جب گاندھی جی نے جواہر لال کو اپنا جانشین بنانے کا اعلان کر دیا تو بہت بڑے بڑے لوگوں کے دل میں یہ شبہات موجود تھے اور وہ گاندھی کی "سب سے شدید" غلطی پر ہاتھ مل رہے تھے۔ لیکن اُس مردِ قلندر کی مجذوبی میں کتنی فراست چھپی ہوئی تھی، اُس کا اندازہ تو اُس وقت ہوا جب گاندھی کے گذر جانے کے بعد جواہر لال کی "باغی رُوح" کی جبین پر گاندھیائی طرزِ عمل کا قشقہ اس طور چڑھا کہ ساری دُنیا کو اصل منبعِ نور کا سراغ ملنے میں کوئی دُشواری نہ ہوئی۔

جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی موت کے بعد اُنہیں جو خراجِ عقیدت پیش کئے ساری دُنیا کی تاریخ اُس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان تعریفوں کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس سے ادب عالیہ کی ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔ جس میں تغزّل کا رس اور رچاؤ نظر آئے گا۔ کون سی ایسی شاعرانہ تشبیہہ ہے جس سے نہرو نے اپنے محسن کو یاد نہیں کیا۔ کونسا ایسا پیرایۂ بیان ہے جس میں اُنھوں نے گاندھی کی بے پناہ شخصیت کا نقش اُتارنے کی کوشش نہیں کی۔ جواہر لال کی موت کے بعد آج کے دم تک اُن کو پیش کیا گیا ایسا کوئی خراجِ عقیدت میری نظر سے نہیں گذرا جس کو پڑھ کر یہ تسکین ہوتی ہو کہ مرنے والے کا حق ادا ہوا ہے، جس کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہو کہ یہ موزون ترین خراجِ عقیدت ہے، جس کو پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ جواہر لال کی بھرپور اور حسین و جمیل زندگی کا عکس اس میں جھلک رہا ہے۔

اُن کے وجود کی خوشبو اس میں مہک رہی ہے۔ اُن کی شخصیت کی عظمت اس میں جھلک رہی ہے۔ شاید ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اُن کے معاصرین میں اُن کے پایئے کی عظمت عنقا ہے۔ اُن کی شخصیت کی صحیح تفہیم مفقود ہے۔ اُن کے رُوحانی وجود کو اُس طور جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جس طور جواہر لال میں گاندھی کی آتما کو جذب کرنے کی تھی۔ لیکن گاندھی کی موت کے بعد جواہر لال نے اُن کی یاد میں الفاظ کے جو آنسو بہائے اُن سے شاعری کا ایک تاج محل تعمیر ہو سکتا ہے۔ اگلی نسلوں کے لئے مہاتما گاندھی کی جو خوبصورت ترین اور سب سے دِلآویز تصویر ہوگی وہ جواہر لال کے وہ خراجِ عقیدت ہوں گے جو اُنہوں نے گاندھی جی کو پیش کئے۔ گاندھی کی سب سے اچھی سمادھی جواہر لال کی اُن کے متعلق تحریریں اور تقریریں ہیں۔ جواہر لال کسانوں کے کسی مجمع میں ہوں یا پارلیمنٹ میں، سائنس دانوں کے سامنے تقریر کر رہے ہوں یا مزدوروں سے خطاب، جب بھی گاندھی کا ذکر آتا ہے اُن کے سادہ سے الفاظ عجیب شعریت کے مظہر بن جاتے ہیں۔ اُن کے لہجے میں موسیقی پیدا ہو جاتی ہے اور الفاظ جیسے رقص کی تانوں پر لہرا لہرا کر نکلتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواہر لال مجمع سے خطاب نہیں کر رہے ہیں... بلکہ وہ اپنے من مندر میں ایک معشوق کو بسا کر اُس کے حُسن کے الگ الگ زاویئے بیان کرتے ہیں... اُس کی پرستش کے لئے سب سے حسین پھول چُنتے ہیں اور اپنے دِل کی تمام سپردگیوں اور جذبۂ عبادت کو سمیٹ کر اُس کے چرنوں میں چڑھا دیتے ہیں۔ جواہر لال نے گاندھی کو مشرقی شاعری کی "شانِ محبوبی" عطا کی۔ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وہ نثر کی تنگ دامانیوں سے گذر کر شعر کی رمزیت کا سہارا لیتے ہیں ـــــ

"اُن کی زندگی، جو مشقت اور سرگرمی سے بھرپور تھی، عجیب عجیب مہم بازیوں اور انوکھے تجربات سے بھی لبریز تھی۔ اُن کی زندگی میں کہیں کوئی بے ہنگم سُر نہیں۔ اُن کی رنگا رنگ سرگرمیاں ایک رُوح فزا نغمہ بن گئیں اور اُنہوں نے جو کوئی حرکت، جو کوئی لفظ ادا کیا وہ اس نغمے کا جزو بنا اور اس طرح غیر شعوری طور وہ مکمل فن کار بن گئے۔ کیونکہ اُنہوں نے زندگی کا فن سیکھ لیا تھا۔ یہ بات آشکارا ہو گئی کہ خیر اور حق کی تلاش زندگی کی اس فن کاری کی راہ سُجھاتے ہیں۔"

"جُوں جُوں وہ بوڑھے ہوتے گئے، ایسا لگتا تھا کہ اُن کا جسم اُن کی عظیم آتما کے لئے ٹیک لینے کی ایک لاٹھی بنتا جا رہا تھا۔ جب اُن پر نظر پڑتی تھی یا اُن کی آواز سُنائی دیتی تھی تو جسم

بھول جاتا تھا۔ اُن کی موت میں بھی ایک نرالی آن بان اور فن کاری موجود تھی۔"

"کمزور جسمانی ساخت کے اس چھوٹے سے آدمی کے اندر فولاد کی سی طاقت تھی۔ اُس کے اندر چٹانوں کا کوئی جزو تھا۔ جو جسمانی طاقت کے آگے سر خم نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لنگوٹ اور ننگے جسم کے باوجود اُس میں ایک شاہانہ آن بان تھی، ایک خسروانہ وقار تھا جو دوسروں کو اطاعت کے لئے مجبور کرتا تھا۔ شعوری طور پر وہ حلیم اور منکسر المزاج تھے۔ لیکن پھر بھی وہ قوت اور تحکم کا مجسمہ تھے اور وہ اس راز سے باخبر تھے۔ کبھی کبھی وہ جلال میں آکر ایسے حکم جاری کرتے تھے جن کی تابع داری لازمی ہوتی تھی۔ اُن کی پُرسکون اور گہری آنکھیں جادو کرتی اور دلوں کو ٹٹولتی تھیں۔ اُن کی صاف اور نتھری ہوئی آواز دلوں میں کھُبتی تھی اور ایک جذباتی سپردگی پیدا کرتی تھی۔ اُن کا سامع ایک ہو یا ہزاروں، اُن کی شخصیت کی دلربائی اور جاذبیت اُن میں رچ بس جاتی تھی اور وہ سب اُن سے رُوحانی قرب محسوس کرتے تھے۔ یہ اس آدمی کا عظیم خلوص تھا جو دوسرے کو گرفت میں لیتا تھا۔"

"وہ حلیم تھے۔ لیکن وہ ایک ہیرے کی طرح سخت اور کاٹ رکھنے والے بھی تھے۔ وہ خوش گوار تھے۔ وہ شیریں بیان تھے لیکن وہ بے لچک بھی تھے اور خوفناک حد تک پُرخلوص۔ اُن کی آنکھیں نرم اور گہری تھیں۔ لیکن پھر بھی اُن کے اندر سے ایک تیز دہکنے والی قوت اور عزم کے شعلے لپکتے تھے۔"

"وہ تازہ ہوا کے ایک طاقت ور جھونکے کی طرح تھے جس نے ہمیں باہیں وا کرنے اور گہری سانسیں لینے پر مجبور کیا۔ وہ روشنی کی کرن کے مانند تھے جس نے اندھیرے کا جگر چاک کیا۔"

اتنا ہی نہیں، یہ شخص، جو اپنے دہری ہونے پر ناز کرتا تھا۔ یہ شخص جو مذہبی اعتقادات کا مذاق اڑاتا تھا — یہ شخص جو سستی جذباتیت پر طنز کرتا تھا، جو مشین کا پجاری تھا... جس نے لینن کے نظریۂ حیات کو دُرست تسلیم کیا تھا، یہی شخص گاندھی کی مورتی کو "دیوتاؤں" کی طرح عقیدت کے سنگھاسن پر رکھتا ہے۔ اشوک نے مہاتما بدھ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن الفاظ سے زیادہ اور کیا کہا ہوگا جو الفاظ جواہر لال نہرو جیسے سائینسی مفکّر کی زبان سے ایک ایسے "سادھو" کی نسبت ادا ہوئے جس کا "معاشی نظریہ" "رجعت پسندانہ تھا۔"

"یہ مردِ خدا جہاں بیٹھا، وہ جگہ مندر کے برابر ہے۔ یہ شخص جن راستوں سے گذرا وہ ارضِ مقدّس کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

جواہر لال نہرو جب جنوری میں بھونیشور میں بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق بستر میں "محبوس" ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ۳۰ جنوری یعنی مہاتما گاندھی کا یومِ شہادت آیا تو گاندھی جی کی سمادھی پر خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں وہ شخص شامل نہیں تھا ـــ جو گاندھی کا اپنا چُنا ہوا جانشین تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ جواہر لال نہرو اس روز اپنے "باپو" کو پھول چڑھانے کے لئے نہیں آسکے اور یہ آنے والے حادثے کا شگونِ بد تھا۔ لیکن کچھ ہی دِنوں بعد جواہر لال نہرو سمادھی پر پھول لے کر آ گئے۔ جہاں سولہ سال قبل اُنہوں نے چِتا کی نذر ہونے سے پہلے گاندھی جی کے چرن چُوم لئے تھے ـــــ جواہر لال کے لئے یہ اس سمادھی پر جانے کا آخری دِن تھا اُنہوں نے سمادھی کی تعمیر کا جائزہ لیا۔ ایک اُونچے چبوترے سے اردگرد کا منظر دیکھا۔ شاید "شانتی ون" کی زمین بھی اُن کی نگاہ میں آ گئی ہو گی۔ جہاں چند مہینوں کے بعد ہی وہ اپنے رہنما کے ساتھ ابد تک محوِ خواب ہو جائیں گے!

گاندھی جی اور جواہر لال کی خط و کتابت بڑی تفصیلی ہے۔ لیکن اُن کا جواہر لال کے نام آخری خط بڑا ہی معنی خیز ہے۔ اُنہوں نے دہلی کے فسادات پر اپنا مرن برت رکھ لیا تھا۔ جواہر لال نے یہ بات سُنی تو خود ہی اس برت کی ہمدردی میں کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس بات کی کسی کو خبر نہ تھی۔ مگر گاندھی کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ جواہر لال سے وہ ان لفظوں میں گویا ہوئے جو جواہر لال کے نام اُن کے آخری الفاظ تھے:۔

"۱۸۔ جنوری

میرے پیارے جواہر لال

اپنا برت توڑ ڈالو ـــ!

... ...

خدا کرے کہ تم لمبی عمر پاؤ اور ہندوستان کے جواہر بنے رہو!"

گاندھی کی نگاہوں کا یہ جواہر سولہ[16] سال کے بعد وطن میں اندھیرا کر کے گُم ہو گیا

مہاتما گاندھی ہند قدیم کے بزرگوں میں رام کے بے حد قائل تھے۔ رام کی سنجیدگی، اُن کی

متانت اور اُن کا تیاگ گاندھی جی کی طبیعت سے موافق تھا۔ اس لئے وہ رام نام کی مالا جپتے رہے اور آخری وقت بھی اُن کے ہونٹوں سے "ہے رام" کی ندا نکلی۔ جواہر لال اوتاروں کے قائل نہیں تھے لیکن ہند قدیم کے بزرگوں کے عاشق تھے۔ لیکن اُن کی پسندیدگی کا میلان کرشن کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "کرشن کا سا رومانی اور دل آویز کردار ساری دُنیا میں کہیں اور نظر نہ آئے گا۔" کرشن کے چنچل پنے اُس کے نٹ کھٹ پنے سے نہرو کی اپنی طبیعت میل کھاتی تھی۔ جب نہرو کرشن کی بنسری کا تصور رادھا اور گوپیوں کے جھرمٹ میں کرتے ہوں گے تو اُن کی شاعرانہ طبیعت مچلتی ہوگی۔ اُن کا احساسِ جمال تسکین پاتا ہوگا۔ کیونکہ وہ خود کرشن کی دلربائیوں کا پیکر اور اُس کی منوہرتا کے مظہر تھے۔

ہم لوگ ان عظیم شخصیتوں کے سایے میں پلے ہیں۔ ہماری ساری عمر ان ہی کرنوں کی رنگینیاں چننے میں صرف ہوگی۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب ہم ماضی کی رنگینیوں کے، جب آسمان اس سورج کی تابانیوں سے منوّر تھا، خواب دیکھتے رہیں گے۔ حال کی بے کیفیوں میں چھوٹے چھوٹے ستارے ہماری نگاہوں میں جچتے نہیں۔ ہندوستان کی خاک میں عظیم شکتی ہے۔ اس نے ہمیشہ بڑے بڑے آدمی پیدا کئے ہیں۔ لیکن گاندھی اور جواہر کے مرتبے کی شخصیتوں کا ظہور تو صدیوں کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ابھار صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جب اس آب و تاب کے گہر سمندر کی تہہ سے اُوپر آکر زمین کو روشن کرتے ہیں۔ بقول غالب ع

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ ای
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

"شیرازہ" میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ اُن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ (ایڈیٹر)

چمن لال چمن

۲۷ مئی

ازچھ ہوٗس کیاہ گوٗمُت وُچھ دم چھُ زن
بے قراری ہِشی چھ زن پھیراں ژٕو پأری
آسمانس پیٹھ ہِنٕ کُنہ اکھ اڈبرہ پیٹھٕ
زٕبو کٔڈِتھ جانا وَراہ وُنی گوو پیأری
باغواں بوٗن کُن وُچھاں لیڈریہ ڈٲوری
شوقہٕ چین یہ چشمن رچھ از ڈل ہوی گمتی
کھر کرِتھ ووتھ موخۃ پھوٗل کھبل ژودٕ ژھوٗر
گُسکلہِ بکرٕ ہوٗٹ تہٕ ہارٕن وزاو ٹوٗپ
باغہٕ چن بیرن دوسن دزہہ لگی ہمن
غأر پاٹھی زن چھ از شُشی مُشی گمتی
شُش گمتی سأری چھ بُتھی وُسی وُسی گمتی
کتھ پنٕنی پرٕبتھ کانسہِ مرکزِ نِش ڈلیتھ
پرٕبتھ طرفہ کاغذ پھرٕنگے زن از صدا
پرٕبتھ کوٗنہٕ سوچن وألی سوچکی کوہ پھران
سنٕگ گوٗمُت گنگایہِ وُچھ از کیاہ دریان
ژکھ کھستھ وہتھ زن چھ ٹھک دی دی یکان

کوٚر قسمہٕ ڈوٗرِبو پھوٚلن گوٚو عاٰب دوٚنی
یُس قدردال اوس سُے گوٚو ڈیٚکہٕ ژٕلتھ
یِیلہِ نہٕ کُنہِ کوٹھس سٕہ کاجی رُودوٚنی
کُس حسر رُوڈے گوٚلا بس، بُلبُل پھوٚلن
کیتہٕ کُیتن سگ دِیُن تھرن، کُس چھاوِہ باغ
دوٚنی وُچھی کُس بالہٕ تبنتا لبن کُنتھ
سِشینہٕ واٗنس تراٗوِہ کُس اچھہٕ شوق ہیتھ
کیاہ خبر ترتیب روزیاہ موسمن
کُس کمِس مِتھہٕ مِتھہٕ دِوال اسناوِہ دوٚنی
کیاہ خبر لوٗس اُچھن منٛز روزِہ سٕریٖہ

کشمیری شاعروں کا انتخاب

اکیڈیمی کی جانب سے کشمیری زبان کے مشہور شاعروں کو اُردو دُنیا سے متعارف کرانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان کتابچوں میں شاعر کی زندگی، اُس کے کلام پر تبصرہ، کلام کا مختصر انتخاب اور اُس کا اُردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اب تک اس سلسلے میں للہ دید، حبہّ خاتون، پرمانند، مقبول کرالہ واری، رسول میر، شمس فقیر، عزیز اللہ حقانی وہاب پرے، عبدالاحد نادم، آزاد اور مہجور کے بارے میں کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیلات اکیڈیمی کے پتے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

موہن لال مصری

نہروکا تصوّرِ منصوبہ بندی

جواہر لال نہرو ہندوستان کی معاشرتی تشکیل کے مسائل کو حل کرنے کے لئے جس طریق کار پر عمل پیرا ہونا چاہتے تھے وہ ہماری سوسائٹی میں کلچر کے تخیّلی پہلوؤں کے امتیازی مقابلے میں سائینٹفک اور تاریخی شعور سے بھرپور تھا۔

ہندوستان نے زمانۂ قدیم سے بہت سے مفکّر پیدا کیے، لیکن جدید ہندوستانی تفکّر کے نزدیک نہرو کی ذات اس کے رُخصت ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہی ہماری اُبھرتی ہوئی قومیت کو نئی وُسعت اور توانائی بخشی۔ جس کو انہوں نے واقعی طرزِ جدید کے سانچے میں ڈھال لیا۔ انگریز کی اس پالیسی کے خلاف کہ ہندوستانیوں کو غلامی اور محکومیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے ذہنی ردِّ عمل اور بغاوت کی ابتدا اُنیسویں صدی کے وسط میں ہوئی جو جواہر لال نہرو کی تحریروں اور تقریروں میں انتہا کو پہنچ گئی۔ نہرو نے تاریخ میں اس سلسلے میں جو رول ادا کیا اس کا بیان کرنا ممکن نہیں جب تک کہ کم از کم ہندوستان میں معاشرتی و اقتصادی خیالات کا جائزہ پیشِ نظر نہ ہو۔

(۱)

انگریزوں کے طرزِ حکومت اور تعلیم نے ایک متوسط طبقہ اور چیدہ لوگوں کے ایک گروہ کو جنم دیا جو رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مغربی وضع قطع اور اقدار میں رنگا گیا اور جس نے تعطل پسند عملی کلچر کی ذہنیت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اُنیسویں صدی کا نیا متوسط طبقہ مُلک کی مادی فلاح و بہبود کا بیحد آرزومند تھا اور اس کے اقتصادی اور سیاسی استحصال کو بُرا سمجھتا تھا۔ اس طرح

ہندوستان کے سرکردہ روشن خیال اصحاب مثل نارو جی۔ رناڈے۔ دت اور گوکھلے کا اقتصادی تصوّر قومیت کے شدید احساسات میں ڈوبا ہوا تھا۔

گاندھی جی نے اس ذہنی تلاطم خیزی کو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء کے دوران آگے بڑھایا۔ وہ ذاتی طور پر ایک خیالی دُنیا کے اشتراکی تھے اور اس کے اقتصادی عقائد کی نہایت امتیازی خصوصیات یہ تھیں (۱) پیداوار کے ذرائع کو مرکز سے الگ رکھنا (۲) تولیت (۳) بجائے خود ضروریات سے بے نیاز گاؤں اور گھریلو دست کاریوں کی ترقی۔ انسانی فلاح و بہبود کا جذبہ گاندھی جی کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اسی نے ان کے اقتصادی تصوّر کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا جو زیادہ تر مشینوں کے ذریعے صنعتی کارخانوں کو فروغ دینے اور اس کے متلازم قباحتوں یعنی مشینری، استیصال غیر منتہی احتیاج، درجہ بندی، تشدّد وغیرہ کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا۔ ان خرابیوں کو ذیل میں مختصر طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے :۔

"معاشرتی مسئلہ اس خاص شکل میں، جو اس نے اب ہر مُلک میں یورپی تہذیب کے ساتھ اختیار کی ہے، کارخانہ (فیکٹری) کے طریق کار کے نتیجے کے طور پر وجود میں آیا۔ افزائش پذیر سرمایہ آبادی کے بیشتر حصے کو اس کوشش کے مقابلے میں جو اس کی پیداوار کے لئے کی گئی ہے، فائدہ بخش معلوم ہونے کے بغیر (آبادی) اور سرمایہ کا بیک وقت بڑھ جانا۔ دو طبقوں کی مخالفت جن میں سے ایک تعداد میں اور دوسرا سرمایہ میں بڑھ جاتا ہے۔ جن میں سے ایک محنت میں اضافہ کرنے سے فقط معاش کی ایک غیر یقینی اُجرت حاصل کرتا ہے اور دوسرا نکھری ہوئی تہذیب سے بار آور ہوتا ہے۔ ان حالات کی ہر جگہ ایک ہی ذہنی تحریک اور احساس سے تقلید کی جاتی ہے۔"

(Montoux, P. "The Industrial Revolution in the Eighteenth Century, P. 28).

گاندھی جی کی اقتصادی تشکیل کا پروگرام سیاسی رہنماؤں کی نئی پود کو، جن میں پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس اور دوسرے حضرات کو مرغوب خاطر نہ ہوا۔ لیڈروں کے اس گروہ کا عقیدہ تھا کہ اقتصادی مسائل جن سے مُلک دوچار ہے، اجتماعی تنظیم میں اداروں اور صنعت و حرفت سے متعلق انتہا پسندانہ تبدیلیوں سے حل کئے جاسکتے تھے۔ لہٰذا آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد (مئی ۱۹۲۷ء)

میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ "ہندوستانیوں کے افلاس اور فلاکت کو دُور کرنے اور عوام کی حالت سُدھارنے کے لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے موجودہ اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے میں انقلاب انگیز تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور فاحش نابرابریوں کا خاتمہ کیا جائے۔" (کراچی کی قرارداد ۱۹۲۹ء) دو قدم اور آگے بڑھی اور اس نے زیادہ زوردار الفاظ میں اعلان کیا کہ "حکومت تمام بُنیادی صنعتوں اور مُلازمتوں، معدنی ذرائع، ریل، جہازرانی اور دیگر ذرائع رسل و رسائل کو اپنے قبضے میں لے لے گی۔"

یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب آزاد دُنیا کے ممالک اس اقتصادی طوفانی بُحران سے سنبھلنے لگے تھے جس نے اُن کو ۳۰-۱۹۲۹ء میں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور جس کے نتیجے میں ان کا ماحصل اور قومی آمدنی پست ترین سطح تک پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ زمانہ بھی تھا جب منصوبہ بندی کے نتیجے میں روس کی صنعت و حرفت اور سائنس کی ترقی سے آشنا ہوئی۔ ان دو عناصر نے ہندوستان میں اقتصادی تفکّر کی تشکیل پر بڑا اثر ڈالا۔ اس کے بعد نہرو اور سبھاش بوس ہندوستان کی منصوبہ بند اقتصادی ترقی کے زبردست حامی بن گئے۔

۱۹۳۸ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے نہرو کی زیرِ صدارت قومی منصوبہ بندی کی ایک کمیٹی قائم کی۔ ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے پلان کا خاکہ تیار کرنے کا کام اس کمیٹی کے سُپرد ہوا۔ دوسری عالمگیر جنگ کا چھڑ جانا اور سیاسی انقلابِ عظیم جس نے ۴۲ ۱۹ء میں ہندوستان کو ہلا دیا، اس کمیٹی کے کام میں خلل انداز ہوا۔ یہاں تک کہ کمیٹی بہت دیر کے بعد یعنی ۴۸ ۱۹ء میں اپنی رپورٹ پیش کر سکی۔

(۲)

حصولِ آزادی کے فوراً بعد ہندوستانی گورنمنٹ نے جواہر لال نہرو کی زیرِ صدارت پلاننگ کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کی کارروائی اور اس کی رپورٹ پر نہرو کی جاذبِ توجہ شخصیت کے ان مٹ نقوش پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی منصوبہ بندی کی بُنیاد معاشرتی فلسفہ اور سراسر اقتصادی صورت کے حقائق پر رکھی گئی۔ پلانوں کی تہہ میں معاشرتی فلسفہ کیا ہے؟ معاشرتی فلسفہ جو ہندوستان کے پلانوں کی تہہ میں کار فرما ہے، وہ اس کے معاشرتی ڈھانچے کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہمارے مُلک کے معاشرتی نظام کا میلان معاشرتی اور اقتصادی سرگرمی اور حیات کی پست سطح کو مداومت بخشنے کی طرف رہا ہے۔ ہمارے

معاشرتی ڈھانچے کے بالائی طبقے پر دولت مند زمین داروں، تاجروں اور سٹہ بازوں کے چند افراد کی جماعت مسلط ہے۔ یہ جماعت نمایاں طور پر اسراف کی زندگی بسر کرنے میں مشہور ہے اور استیصال، فساد اور پیوندکاری کے ذریعے سے اپنی حالت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ معاشرتی درجہ وار ترتیب کے پس پردہ لاکھوں دیہاتی اور شہری کام کرنے والے، کاریگر، دستکار اور دوسری کم آمدنی والی جماعتیں ہیں۔ ان لاکھوں لوگوں کو اپنی حالت بہتر بنانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

ہندوستان کا معاشرتی نظام فرقوں اور ذاتوں کے شاخ در شاخ ہونے کی وجہ سے مزید الجھ گیا ہے۔ یہ تمام گراں باریاں ہیں جو پیش قدمی اور جوشِ عمل اور معاشرتی نقل و حرکت کی صلاحیت کے مانع ہیں۔

یہ امر کہ اس فرسودہ معاشرتی نظام کو ایک نئے اور حیات افزا معاشرتی ڈھانچے سے، جو آزادی اور مفاہمت پر مبنی ہو، بدلنا ہے، پلانوں میں مضمر ہے۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کو خوش گوار طریقے سے بلا جبر و تشدد عمل میں لانا ہے۔ نیا معاشرتی نظام متحرک ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم آہنگ بھی۔ علاوہ ازیں نئے معاشرتی نظام کی بنا جمہوریت پر ہونی چاہیئے جس کا مقصد صریحاً اقتصادی اور معاشرتی ہو۔ نہرو جی نے ۱۹۵۲ء میں پارلیمنٹ کو بتایا۔" جب ہم سیاسی جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اب اس کا خاص مفہوم وہ نہیں جو مثلاً انیسویں صدی میں تھا۔ اگر اس کا کچھ مطلب ہونا چاہیئے تو وہ یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت سے بتدریج یا اگر آپ چاہیں یکایک اقتصادی جمہوریت کی طرف رہبری ہونی چاہیئے۔ اگر ملک میں اقتصادی نابرابری رہے تو سیاسی جمہوریت اور تمام حق رائے دہندگی بالغاں دنیا میں حقیقی جمہوریت پیدا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے تمام افراد کو پیدائش ہی سے استعداد کے مطابق ترقی اور کام کرنے کے یکساں اور مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔"

اس بیان میں انیسویں صدی کے اس بے اعتنا نظریے کی تردید کا اعتقادِ راسخ شاملِ حال تھا۔ جس کی رُو سے ریاست غیر جانب داری سے کام لیتی۔

اقتصادی جمہوریت وہی ریاست حاصل کر سکتی ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کی کفیل ہو۔ لیکن اتنا ہی بجائے خود کافی نہیں۔ حکومت کی کارفرمائی اور دخل اندازی کی کوئی خاص غرض و غایت ہونی چاہیئے لہٰذا اشتراکیت پر زور دیا جاتا ہے۔ جس کی تعریف یہ ہے کہ سماج کا درجہ بلند تر ہو۔ نہرو جی نے

فرمایا۔ "میرے ذہن میں جو نقشہ ہے وہ مطلقاً اور واضح طور پر سماج کا ایک اشتراکی نقشہ ہے جس کا مطلب بطورِ مجموعی یہ ہے کہ ذرائع پیداوار معاشرتی حیثیت سے سماج کے فائدے کے لئے قبضے میں لائے جائیں اور ان کی نگرانی کی جائے۔"

اسی آدرش کی پیروی کرنے میں پلاننگ کمیشن اقتصادی اقتدار کو دُور دُور تک وُسعت دینے اور آمدنی کے عدم مساوات کو ختم کرنے پر زور دیتا رہا ہے۔

جدید معاشرتی نظام اور پلانوں سے ملک میں صنعتی کارخانے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ صنعتی کارخانہ جات کے ساتھ ساتھ عقلیت پسندی، سائنس اور ٹیکنالوجی بھی وجود میں آئیں گے۔ لیکن نہرو جی نے لوگوں کو خبردار کیا کہ ٹیکنالوجی کو بتدریج اختیار کرنا چاہیئے تاکہ سماج کا توازن یکایک درہم برہم نہ ہو اور انسانی تعلق منقطع نہ ہو۔ پنڈت جی ہندوستانی کلچر کی سابقہ روایات سے کلیتاً علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ یعنی "اس بھاری وراثت سے، جو ہماری آج تک رہی ہے اور اب بھی ہے۔" بخلاف اس کے وہ "اس کو زمانۂ حال کے ساتھ مربوط کرنا اور مستقبل کے ساتھ مِلانا چاہتے تھے وہ اُس مقام سے الگ ہونا چاہتے تھے جہاں اس وراثت سے خیال و عمل کے لئے متحرک اور اہتزازی مادہ بھر پیوست نہیں کیا جا سکتا تھا۔" بالفاظ دیگر پلانوں کا مقصد مادّی اور انسانی اقدار کے درمیان توازن قائم کرنا ہے۔ اس زاویۂ نظر کی تہہ میں یہ واقفیت کارفرما ہے کہ مادّی ترقی اگرچہ بہ حیثیتِ موجودہ اچھی ہے، لیکن اکثر غیر انسال دوستی کے معاشرتی تعلقات، تغیرِ عصبی اور روحانی جمود کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

پلان انسانی شخصیّت کی ترقی پر انتہائی زور دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے تیسرے پلان کی رپورٹ میں منصوبہ بند ترقی کے مقاصد بیان کرنے کے دوران لکھا۔۔۔ "لوگوں کی ترقی میں توسیع کی ایک ہم آہنگی ہے اور انہیں حصولِ مُراد کے لئے مستعدی اور کامرانی کا احساس ہو رہا ہے وہ زندگی کے مقصد سے آگاہ ہیں اور تاریخ کے بنانے میں شریک کار ہونے کا بھی احساس رکھتے ہیں۔ بالآخر انسانی شخصیّت ہی اہم ہے۔ اگرچہ منصوبہ بندی میں لاگت آتی ہے، اس سے زیادہ ضروری انسان (کی بہبُودی) کے لئے روپیہ خرچ کرنا ہے۔" انسان کے لئے اس قدر متردّد ہونا واقعی ایک دِل کش خیال ہے۔ اس "تنظیمی انسان" کے لئے جو صنعتی تہذیب میں سراسر "بیگانہ"۔ "الگ

ٹھلگ" اور "بے وقر" ہے۔

پس ہندوستان ہیں منظم کوشش کی رہنمائی کرنے والا معاشرتی فلسفہ ایک نئی معاشرتی تنظیم کا ارتقا ہے جو نئے معاشرتی مقاصد پر مبنی ہے اور جس میں نئے اصلی محرکات اور نئے اقدار و علامات ہیں جن میں انسان اپنی سالم شخصیت کے ذریعہ سے تکمیل پا سکتا ہے۔

پنڈت نہرو علمی معنوں میں اقتصادیات کے ماہر نہ تھے لیکن ان کے وجدانی شعور نے انہیں اس بات کا پکاّ یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کا وجود بہ حیثیت ایک قوم کے صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا تھا جب وہ ایک جدا گانہ اور خود اعتمادی کی اجتماعی تنظیم کو بڑھاوا دے سکتا تھا۔

دُنیا کے تمام کم ترقی یافتہ ممالک، جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، ایک مشترک کام سے دوچار ہیں — یعنی افلاس و جمود کے ناقص دائرے سے نکل کر اجتماعی تنظیم کو بڑھاوا دینا۔ ان تمام مُلکوں میں سے ہندوستان اقتصادی منصوبہ بندی کو ترقی کا خاص میکانکی ذریعہ قبول کرنے میں پہلا مُلک تھا۔ اس کا سہرا پنڈت جواہر لال نہرو کے سر ہے۔

ہندوستان کی اجتماعی تنظیم "کب" کی حالت میں ہے اور نازک کام، جس سے یہ دوچار ہے یہ ہے کہ وقفہ، "جست گاہ" (TAKE-OFF) کو جس قدر جلد ہو سکے، حاصل کیا جائے۔ روستو کے مطابق "جست گاہ" وہ وقفہ ہے جس میں مسلسل ترقی کے خلاف رُکاوٹوں اور موانع پر حتمی طور غلبہ پایا جائے۔ اقتصادی ترقی کو بروئے کار لانے کے لئے جس قدرت و قوت نے (گذشتہ زمانے میں) دھماکے اور جدید کارگزاری کے مملکتِ غیر سے گھیرے ہوئے علاقے بہم پہنچائے، توسیع پاتی ہے اور سوسائٹی پر غالب آجاتی ہے۔ ترقی اس کا معمول بن جاتی ہے۔ "جست گاہ" کے دوران مؤثر طور پر (کسی کام میں) سرمایہ لگانے کی شرح اور بچت قومی آمدنی کی پانچ فی صد سے دس فی صد تک یا اس سے زیادہ بڑھنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ "جست گاہ" کے عرصے میں دوسری لازمی شرطیں یہ ہیں: ایک، یا زیادہ با استعداد مشین سے تیار کرنے والے سیکٹروں کا ظہور میں آنا، جس میں ترقی کی رفتار تیز ہو اور ایک سیاسی، معاشرتی اور کسی ادارے کے ڈھانچے کا موجود ہونا یا جلدی اُبھر آنا جو موجودہ سیکٹر میں محرکات کی وُسعت اور "جست گاہ" کے قوی الاثر بیرونی اثرات سے استفادہ کرتا ہے اور ترقی کو آگے قدم بڑھانے کی خصوصیت بخشتا ہے۔"

(W. W. Rostow: The Stages of Economic Growth - Pages 7-8)

ہندوستان کو انگریز حکمرانوں سے کم مایہ اور فرسودہ اجتماعی تنظیم ورثہ میں ملی۔ ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:۔

سال	ملک	آمدنی فی کس	استعمال سرمایہ بحساب فیصد از قومی آمدنی	زرعی مزدوری برائے کل عملہ مزدوری بحساب فیصد
۱۹۵۳ء	امریکہ	۱۸۵۵٫۵	۱۸٫۹	۱۲٫۲
۱۹۵۳ء	ہندوستان	۵۷٫۱	۳	۷۰٫۶

استعداد فی کس جو کام میں لگایا گیا ہے ۷٫۵۳ (امریکہ) ۱٫۶۷ (ہندوستان)

کس قدر نمایاں فرق ہے! اس نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کو ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ قدم ملانے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ انگریز ہمارے اصلی اقتصادی ارتقا میں مانع ہوئے اور آزاد ہندوستان کو اجتماعی تنظیم کو متوازن بنانے کے لئے سخت محنت کرنا اور قربانیاں دینا ہیں۔

یہ بات پلاننگ کمیشن کے ذہن نشین ہوئی کہ اجتماعی تنظیم کی تجدید کے لئے محنت شاقہ کی ضرورت ہے، لہٰذا اقتصادی منصوبہ بندی کو ایک ذریعہ سمجھا گیا جس کے توسل سے بعض اہم سیکٹروں میں اجتماعی تنظیم کے اندر اس کے ڈھانچے میں تبدیلیاں شکل پذیر بنائی جا سکتی ہیں تاکہ ترقی و اضافہ کی جانب ایک مجموعی تحریک کی ابتدا کی جا سکے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی تصوّر و صورت میں روس اور ایسے ہی ملکوں کی مرکزی منصوبہ بندی سے بالکل مختلف ہونی تھی۔ ہندوستان کی منصوبہ بندی کی بنیاد ایک مخلوط اجتماعی تنظیم پر ہونی تھی جس میں پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں ساتھ ساتھ قائم رہی ہوں۔ ریاست اقتصادی ترقی کے طریقِ کار میں بطور سرچشمۂ تحریک کام کرے گی۔ پرائیویٹ سرمایہ اندوز اور اس کے استعمال میں لائے جانے کی عدم موجودگی اور چاؤ کرنے والے کی ہمت میں کمی ہونے کی وجہ سے ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں صاحب جائداد طبقے جدید صنعتوں، مشینوں اور ان کے متعلقات میں ان کے طویل عرصے تک بار آور نہ ہونے کی وجہ سے اور قلیل وقت میں معاوضہ ادا نہ کرنے کے باعث روپیہ لگانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ یہ صورت حال ہُبسرد نے ذیل کے الفاظ میں اچھی طرح سے بیان کی ہے:۔

"ہندوستان میں صنعتی غرض کے لئے سرمایہ کی قلت ہے اور جزوی طور پر اس کی وجہ سرمایہ کو دوسری صورتوں میں لگائے جانے کے مقابلہ میں ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ کو کاروبار میں لگانے والے لوگوں کا بڑا طبقہ اب بھی صنعت و حرفت کے مقابلے میں اصلی جائداد، زیورات جواہرات، سود خوری، تجارت اور سرکاری ہنڈیوں میں روپیہ لگانے کو ترجیح دیتا ہے۔"

(Hubbard, G.E. Easter Industrialization and its effects on the West, 1936. Page 257).

اس امر کے پیش نظر ریاست کو ذرائع جمع کرنے ہیں اور اقتصادی ترقی کے میدان میں زیادہ بڑے پیمانے پر شرکت کرنی ہے۔ نقّادوں نے پروفیسر ہایک کے زیر اثر اس طرز عمل کو جمود کے ساتھ مشابہ کیا ہے۔ لیکن وہ پس ماندہ اجتماعی تنظیم کی کوتاہیوں کو بالکل بھول جاتے ہیں جیسے اس وسیع خلا کو پُر کرنے کے لئے اقتصادی ترقی کے بعض مرحلوں کو ایک دوسرے میں گھُسا دینا ہے جو دُنیا کے متموّل ممالک سے ان کو جُدا کرتا ہے۔

اقتصادیات کے ماہر عام طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ پہلا پنج سالہ پلان، جس کی ابتدا ۱۹۵۱ء میں ہوئی، درحقیقت آبادکاری کا پروگرام تھا۔ اس سے اس کے واجبی مصارف اور مادّی حدبندی کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اصلی منصوبہ بندی کی ابتدا دوسرے پنج سالہ پلان سے ہوئی مختلف تخمینوں یعنی بچت اور سرمایہ لگانے کے، سرمایہ کے ماحصل کے تناسب، سرمایہ کی کھپت کے تناسب وغیرہ نے پلاننگ کمیشن کو اپنے ذہن میں یہ نقشہ قائم کرنے کے قابل بنایا کہ پانچویں پنج سالہ پلان کے اختتام تک ہندوستان، "جست گاہ" کی منزل کو طے کر چکا ہوگا۔ اگر دوسرے پلان میں مدنظر رکھی ہوئی ترقی کے طریقۂ کار کی آیندہ منصوبوں میں تقلید کی گئی تو اس میں شک نہیں کہ ۱۹۷۵ء تک ہم نازک دَور کو طے کریں گے۔"

دوسرے پلان میں ترقی کا کون سا طریقِ کار شامل کیا گیا تھا؟

دوسرے پلان کا مقصد دوگونہ تھا۔ قومی آمدنی میں پانچ فی صد سالانہ اضافہ اور مُلک کی صنعت و حرفت کو تیزی کے ساتھ چلانا، جس میں خصوصیت سے بھاری اور بُنیادی صنعتوں پر زور ہو۔ ہندوستان اور بیرونی ممالک کے علمی سطح پر اقتصادیات کے ماہر بُنیادی صنعتوں کے سیکٹر کے اجتماع پر ناک بھوں چڑھانے لگے اور وہ اس وجہ سے کہ تناسبِ عناصر کے نظریہ وغیرہ کی رُو سے اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہ تھی۔ لیکن ہمیں ان مایوس کُن آوازوں سے خبردار رہنا ہے۔ "ہمیں ان جانب دارانہ اور غیر مکتفی رُجحانات طبعی اور غیر حقیقی وغیر متعلق خیالی نظریۂ عمل کے موانعات سے اپنے آپ کو آزاد رکھنے کی ضرورت ہے جو ایک بارِ گراں ہیں اور جس کے ہم اپنی علمی روایات کی رُو سے حامل ہیں۔"

(Myrdal, Economic Theory & Underdeveloped Regions. Page 171.)

راس المال کے سیکٹر سے ہمیں فولاد، لوہا اور معدنیات، انجینئرنگ اور ابتدائی مرحلے میں بجلی کی صنعتیں بہم ہوں گی۔ ارتقا کی دوسری منزل میں راس المال کا سیکٹر صرف میں لائے جانے والے مال کے سیکٹر کا سامان بہم پہنچا سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس کافی لوہا ہو، ہم اپنے ٹریکٹر، فصل کاٹنے والی اور چیزوں کو چلانے والی مشینیں تیار کر سکتے ہیں اور میکانکی زراعت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زرخیز بنانے والی فیکٹریوں کو بڑھاوا دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ فولاد ہمیں رسل و رسائل کے ذرائع اور سواری و باربرداری کو مناسب طریقے پر چلانے کے لئے ریلوے انجن، بسیں، سلیپر (پٹڑیاں) بنانے میں مدد دے سکتا ہے۔ ہم غیر ملکی زر مبادلہ بچا سکتے ہیں۔ یہ تمام اقدامات ایسی اجتماعی تنظیم کے لئے کئے جاتے ہیں جو بجائے خود مکتفی ہو۔ اجتماعی تنظیم کی معاشرت سے متعلق بالائی چیزوں اور درمیانی دور میں کاروبار کے چھوٹے چھوٹے اہم معاملوں کی طرف واقعی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ پنڈت نہرو نے ہماری مساعی کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا۔ "ہم کو ایک کم ترقی یافتہ ملک اور صنعتی لحاظ سے پس ماندہ ہونے کی حیثیت میں پس ماندگی کے سدّباب پر عبور حاصل کرنے کی کوشش میں کش مکش کرنا ہے تاکہ ہم کسی قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کے قابل ہوں۔

(۳)

ہندوستان میں معاشرتی و اقتصادی منصوبہ بندی کے میدان میں پنڈت نہرو کے کارہائے نمایاں کا اندازہ لگانا ابھی قبل از وقت ہے۔ بہر حال سرسری رجحانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملک بتدریج مگر یقیناً آگے بڑھ رہا ہے۔ چند منتخب اعداد و شمار نما بیانات پہلے دس سال (۱۹۵۱ — ۱۹۶۱ء) میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی بتدریج منصوبہ بندی کی توسیع ظاہر کرتے ہیں :-

(۱) قومی آمدنی میں تقریباً ۴۲ فی صد کا اضافہ ہوا

(۲) فی کس آمدنی ۱۶ فی صد تک بڑھ گئی

(۳) زرعی پیداوار میں تقریباً ۴۱ فی صد کا اضافہ ہوا

(۴) صنعتی پیداوار میں ۹۴ فی صد کا اضافہ ہوا

(۵) صنعتی پیداوار ۱۵۰ فی صد سے بڑھ گئی اور مشین کے اوزاروں میں تقریباً ۱۵۱۸ فیصد کا اضافہ ہوا (قیمت کروڑوں میں)

ان تمام ترقیات نے ہماری قومی اجتماعی زندگی کو کافی توانائی اور مضبوطی بخشی۔ اتنا تو یقیناً وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اپنے بے جان مرکز سے نقل و حرکت کی دشوار شیرازہ

گزاریوں اور مشکلات کے باوجود الگ ہو رہی ہے۔ اگرچہ ان پر مکمل طور پر قابو پانا باقی ہے۔ اس عرصے میں سائینسی تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مطالعہ کے لیئے نئے میدان سامنے لائے گئے اور ریسرچ (تحقیق و تدقیق) کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایٹمی سائینس تک کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ہماری سوسائیٹی میں نئے چیدہ چیدہ لوگ، جو صنعت و حرفت کے ماہروں، انجینئروں، تجارت کے کار فرماؤں اور ضابطہ پرستوں پر مشتمل ہیں، وجود میں آ رہے ہیں۔ یہ لوگ ترقی کرنے والے ہندوستان کے معیاری نمونے ہیں۔ نئی معاشرتی قدریں، جو سائینس اور صنعت میں کامیابی حاصل کرنے کی کفیل ہیں، آزاد چھوڑ دی گئی ہیں، نئے پہلو اور چلن کے نمونے ظہور میں آئے ہیں۔ ثانوی اور تیسرے درجے کے گروہ ابتدائی گروہوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ رسمی تعلقات ذاتی تعلقات میں مبدّل ہو رہے ہیں۔ گاؤں میں زرعی اصلاحات کے عمل دخل، اجتماعی ترقی کی اسکیموں اور پنچایت راج نے دیہاتی علاقوں میں ایک نئی معاشرتی بیداری کو پروان چڑھایا ہے۔ نئے نئے دباؤ ڈالنے والے گروہوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ سائینس اور ٹیکنالوجی آہستہ آہستہ دبے پاؤں جدید اندازوں کو جنم دے رہے ہیں۔

پنڈت جی کی قوتِ عمل سے مملو شخصیت نے ہندوستان کی تجدید کے درپئے معاشرتی مساعی کو ایک خاص معنی پہنائے۔ اگر ٹائن بی کے Challenge of response کو تاریخی سبب پیدا کرنے والے نظریہ کے ساتھ کوئی مناسبتِ تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی نے آزاد ہندوستان سے قبل اور مابعد ہندوستانی قومیت کے پیش کئے ہوئے چیلنج کا مکمل جواب دیا۔ جیسا کہ ڈی، پی مکرجی نے ظاہر کیا ہے ... "نہرو کی بہترین قابلیت پلان میں جلوہ گر ہے، خواہ کسی صاحب کمال کی نظر میں یہ کتنا ہی مبہم اور غیر اطمینان بخش ہو۔ پلان سے ہندوستان کا کام چل جائے گا، اگرچہ بعض ہندوستانی سرگرمی سے کام نہ کریں گے۔ جو اس سلسلے میں کام کریں گے وہ ہندوستان کے لئے معیاری آدمی پیدا کریں گے۔ یہ انتہائی درجے کی کامیابی ہے یعنی رام راجیہ سے عقیدت مندی کو منصوبہ بند معاشرتی تنظیم میں منتقل کرنا اور اخلاقیات کے محور کو قربانی سے منصوبہ بند مساعی میں بدل دینا۔" (D. P. Mukerji, Diversities - Page 49)

پنڈت جی کی سی شخصیتیں تاریخ شاذ و نادر ہی پیدا کرتی ہے۔ ہندوستان کو ان کے بغیر زندہ رہنا سیکھنا ہے اور آگے اپنا راستہ نکالنا ہے۔ ان کی بہترین یادگار ہمارے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں اشتراکی وسعت کا تعین کرنا ہے۔ ملک میں ایک آزاد اور جامع صنعتی تعمیر کا بنانا معقول معاشرتی نظام کے حصول کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ پنڈت جی نے ہماری پیش روی کے لئے اجمالی طور پر خاکے بنا رکھے ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ان کے خوابوں کو حقائق میں تبدیل کریں۔ (اردو ترجمہ: پروفیسر نند لال طالب)

محمد امین دَاراب

قطعہ تاریخ وفاتِ حسرت آیات

پنڈت جواہر لال نہرو

چہ ناہموار گردش آسیائی چرخ کرد آخر
کہ شد ناگہ شکستہ، وا دریغا، درمیان لعلے

چہ لعلے؟ بے بہا و بے عدیل و بے بدل لعلے
چہ لعلے؟ دلربا و دل کشا و شائیگاں لعلے

چہ لعلے؟ وہ کہ درجے پُر "جواہر لال" رُمانی
چہ لعلے؟ ہند را آرائش روی دُکاں لعلے

بعالم در ثمین لعلے! زِ ہندوستاں بہیں لعلے
فروغِ یک جہاں لعلے، چراغِ دُودماں لعلے

بدریائی سیاست آشنا، چالاک غوّاصے
بہ دربارِ ریاست مسند آرا نشاں لعلے

ہم ہر جا کفِ افسوس سے مالند و مے نالند
تہی تا شد جواہر خانۂ ہند از چناں لعلے

نوشتہ خامۂ دَاراب، ہم دل دوز تاریخے
"شُدہ گُم از "جواہر" خانۂ ہندوستاں لعلے"

۱۹۶۴

پریم ناتھ در

بانگڑھی کا ایک ٹکڑا

رُکمنی کے چولہے پر آج ایک پتیلے میں یُوں ہی پانی اُبل رہا تھا۔ بے مطلب بھاپ اُٹھ رہی تھی اور رُکمنی سوچ رہی تھی کہ آج یہ پانی بھی اسپتال نہیں جائے گا۔ بھاپ کی پھولی پھولی دھاریوں میں اسے ایل، کانشی ناتھ کے گرے گرے ہاتھ پیر دکھائی دے رہے تھے اور بیٹھے بیٹھے اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خود اس کی اپنی زبان کھو سی گئی ہے۔ تالو سُوکھنے لگا ہے، گلے میں گانٹھ سی پڑ گئی ہے اور پیٹ کا بوجھ یُوں ہی بڑھ گیا ہے۔ اس نے اُٹھ کر ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا اور چولہے کے سامنے پھر آ کر بیٹھ گئی۔

رُکمنی کسی سے کچھ پُوچھتی نہیں تھی۔ اس کے سوالوں کا جواب کون دیتا؟ سوال گلے تک اُٹھتا بھی، ایک سُوکھے گھونٹ میں واپس اُترتا۔ لیکن جس دن اسپتال سے ایل، کانشی ناتھ کے لئے کھچڑی منگائی گئی تھی۔ اس کا سوال مُنہ تک آ گیا تھا اور اسے روٹی کے ساتھ سوال کو بھی چبانا پڑا تھا۔ السائے ہوئے دانتوں میں اپنی روٹی سخت سی معلوم دی تھی۔ اس لئے اس نے اُٹھ کر کھچڑی کو کچھ زیادہ نرم بنا دیا تھا۔

اگر واقعی ایل، کانشی ناتھ کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی ہے۔ رُکمنی کے دل میں خیال آیا تو بات نہ معلوم کس حد تک بگڑ جائے گی اور نہ معلوم کون سی نئی مصیبتیں پیدا ہو جائیں گی جن کو وہ سمجھ بھی نہ سکے، اپنی کمر میں باندھ نہ سکے۔

لیکن اس وقت رُکمنی کے گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ گھر کا نوکر تک اسپتال چلا گیا تھا۔ باہر کے کواڑ بند کر کے وہ اپنی رسوئی میں، اپنے چولھے کے ساتھ جو جی چاہے، بات کر سکتی تھی۔ دہکتے انگاروں پر جس تصویر کو جی چاہے، دکھ کر دیکھ سکتی تھی۔ آج سالن کے جل جانے کا ڈر تھا، نہ دودھ

میں اُبال کا۔ چولھے پر ایک پتیلے میں پانی تھا اور ایک دیگچی میں دال۔ دال لگ بھی جاتی، غم نہیں تھا بلکہ لگ جاتی تو ٹھیک تھا۔ کیونکہ ایل، کاشی ناتھ کی بگڑی حالت میں وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ جلنے کی بُو کس کس کو آجائے۔ ویسے تو کس مرے کی ناک تیز نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہلنے بنا کر وہ آتے ہی اور چیزوں کا بھی انتظام کریں گے کہ کوئی کہے گا: "غم سے کلیجہ جل رہا ہے، دہی منگا دو۔" کوئی کہے گا: "جگر کٹ رہا ہے مربہ دلا دو۔" —— کوئی کہے گا: "ہائے رے حلق سے روٹی نہیں اُترتی، اچار ہی دے دو۔" روٹی کے ساتھ پانچ پانچ چیزوں کا چسکا تھا، لگی ہوئی دال کے ساتھ کیا کھاتے؟ یہ رُکمنی ہی تھی جس کے لئے دال کی پوری کٹوری بھی نہیں بچتی تھی۔

سبزی بھاجی کے علاوہ چٹنی کا چمچ، آدھ پون کٹوری دہی نوکر کے لئے بھی بچانی پڑتی تھی۔ نہیں تو جس دن وہ بھاگ جاتا، نوکری چھوڑ کر چلا جاتا۔ اس دن سب کے سب اسی بات کو یاد کرنے بیٹھتے کہ کس شام کو وہ رُوٹھ گیا تھا جب اسے رُوکھا مِلا تھا اور کس شام کو وہ جواب دینے لگا تھا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے کسی کی ناک اُوپر کو اُٹھتی، کوئی بھویں سکوڑتا، کوئی دکھا دکھا کر کھسر پھسر کرتا اور جب کوئی اُونچا اُونچا سُنا بھی دیتا، رُکمنی کی دونوں کن پٹیوں میں آنچ سی سُلگ اُٹھتی اور دہی دودھ کی دو پتلیاں سی اُبلنے لگتیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ گرم گرم دھار آنکھوں میں اُتر آتی، رُکمنی کی ناک سے دُھواں سا لپکتا اور وہ دھوئیں میں ایک جھوٹا سا خواب دیکھنے لگتی کہ ایل، کاشی ناتھ نے نوکر کی خاطر ہی اسے اپنی بیٹھی میں بُلایا ہے اور اسے جی بھر کر گالیاں دے رہے ہیں —— اُس کا نام لے کر۔

لیکن نوکروں کے بھاگ جانے کی بات کے علاوہ سال بھر میں سَو اور باتیں ہو جاتیں۔ ایل، کاشی ناتھ ایک بات بھی ایسی نہ کرتا جس میں رُکمنی کا نام آجاتا۔ نوکر دوکر کی بات تو فوراً ہی ختم ہو جاتی کیونکہ ایل، کاشی ناتھ کے دس انتظام تھے، منشی تھے، مستری تھے، کلرک اور چوکیدار تھے، ایک ٹیلی فون ادھر ہو جاتا ایک اُدھر۔ دس نوکر پھاٹک پر کھڑے ہو جاتے۔ اور کم بخت سالن بھی جل جاتا، دودھ بھی گر جاتا، آنکھ جھپکتے ہی بنی بنائی چیز حاضر ہو جاتی، دِن کی کڑکتی ہوئی دھوپ ہو یا رات کا گھُپ اندھیرا، بس جیب میں سے بٹلے سے ایک نوٹ کے نکلنے کی دیر تھی اور ایل، کاشی ناتھ کے انتظام میں ایسی دیر کبھی نہیں ہوتی تھی۔ رُکمنی کے دِل میں اسی بات کا گہرا روگ تھا کہ

اس نے برسوں انتظار کیا لیکن گھر میں کوئی بات اتنی بگڑی نہیں جس سے ایک بھونچال سا آجاتا۔ ایک آگ سی لگ جاتی۔ دیوان خانہ، مہمان خانہ، دہلیز، رسوئی ایک ہوجاتے۔ بیچ کی زمین پھٹ جاتی اور وہ ایل، کاشی ناتھ کے رُوبرو کھڑی ہوجاتی، چاہے ساری دُنیا اسی ایک کو بھونچال کا دوش دیتی!

مگر ایل کاشی ناتھ، ایل، کاشی ناتھ تھے۔ان کے نام میں وزن تھا۔ اتنا کہ خود بھونچال بھی رُک جاتا۔ دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر تھا، رُکمنی اس پر بھی اسی نام کے ہجے نکالنے بیٹھتی۔ فرش پر بکھرے ہوئے پرچوں کو اُٹھاتی، ان پر بھی وہی ہجے پاتی۔ رسوئی میں جاتو اُٹھاتی تو اس پر بھی وہی نام کھدا ہوا پاتی۔ ساری دُنیا میں اسی نام کا چھاپ تھا اور یہ نام رُکمنی کے دماغ میں اتنا بھاری بیٹھ گیا تھا کہ اس کے اندر یہ ننھی سی یاد اُبھرنے نہ پاتی کہ خود رُکمنی ایل، کاشی ناتھ کی بیوی تھی۔

نہ معلوم یہی یاد آج ان انگاروں پر کیوں چمک اُٹھی۔ اور یہیں آگ پر آتے ہی ایل، کاشی ناتھ کی صورت بدل گئی ... کورا کاشی ... بھُوکا پیاسا لڑکا، چھینتا جھپٹتا، کچّے پکّے پر ہاتھ مارتا ... جب دیکھو مُنہ بھرا ہوا ہے، جب دیکھو دانت چل رہے ہیں ... نہ حیا نہ شرم ... ہنستا ہے تو تھالیاں سی گرنے لگتی ہیں۔ اُچھلتا ہے تو کچھ نہ کچھ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے ... کچھ اور نہ ملے یُوں ہی دیوار کو ٹُھکّے مارتا جارہا ہے ... پردہ کرتی ہوئی رُکمنی کے ہاتھ سے بھی چھین کر کھالیتا تھا۔ تو رُکمنی کی ساس اسے کوسنے دیتی تھی۔ رُکمنی بھی تو ان دِنوں چھوٹی تھی۔ چھوٹی دُلہن کے ناک نقشے کو اتنا کون دیکھتا ہے؟ اور ویسے تو رُکمنی میں کس بات کی کمی تھی؟ رام بچائے، اندھی نہیں تھی، لولی لنگڑی نہیں تھی، قد کی چھوٹی یا بدن کی موٹی نہیں تھی۔ پھر اپنا رنگ بھی صاف تھا۔ اور تب تو تمیز کی بات یہی تھی کہ ڈھکی دبی رہو اور غیروں کی بات کیا، اپنوں سے بھی پردہ کرو —— ان دِنوں رُکمنی کو کسی نے بدتمیز نہیں پکارا تھا، نہ بدصورت نہ بدشگون ——

... ... پھر جب شیلا ہوئی تھی، بڑے لالہ نے کتنا بڑا دِن منایا تھا۔ لڑکی ہوئی تھی تو کیا ہوا؟ کہتے تھے کہ لکشمی آگئی۔ اور لے کے آبھی گئی تھی لکشمی۔ شیلا کے ہوتے ہی اتنی بڑی حویلی چڑھی تھی —— لیکن یہ کم بخت حویلی بھی منحوس تھی۔ یہی حویلی لے گئی رُکمنی کی ساس کو۔ آگ لگے اس کی اُونچی دیواروں کو، دس ہیر پھیر تھے اس میں، دس اندر خانے تھے اور اسی میں وہ رسوئی بھی تھی۔ رسوئی کے ساتھ والا

بڑا کمرہ تھا۔ جہاں ایل، کاشی ناتھ کی سگی بہنیں، چچیرے بھائی بھتیجے اور بھتیجیاں کھانے کے لئے سب جمع ہو جاتے۔ اور اسی کمرے کے کونے پر ایک اور چھوٹا کمرہ تھا۔ جس میں رُکمنی کی کھاٹ تھی اور اس کے دو صندوق تھے۔ ادھر کا صحن چھوٹا تھا اور اس میں لکڑی اور کوئلہ پڑا رہتا تھا۔ اور پھر دیواریں اتنی اُونچی تھیں کہ اگر رُکمنی گلی کی بات کو بھی دیکھنا چاہتی تو اُسے اپنے دھوئیں کے ساتھ اُوپر جانا پڑتا اور چمنی سے سر نکالنا پڑتا ——— !

اب تو خیر اس کی عمر وہ تھی کہ جب بھی اس کا جی کرتا، گلی کے شوالے تک چلی جاتی تھی۔ وہ چاہتی تو شہر کی ہر کھلی سڑک سے گھوم آتی اور اسے یہ بھی غم نہ رہتا کہ رسوئی میں جا کے کام کرنا ہے۔ اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ لیکن اسی بات کا اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ایک ناغہ بھی کرے گی تو اس کی رسوئی میں بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اور اسی راستے میں جو اس کے چھوٹے کمرے سے لے کر بڑے کمرے کے بیچوں بیچ رسوئی کے چولھے تک اس کے لئے کھلا تھا۔ نہ معلوم اسی راستے میں کیا کیا نئی دیواریں چڑھ آئیں گی۔ اسی لئے وہ رسوئی میں تب بھی کم از کم آ کر بیٹھ جاتی، جب اسے زور کا بخار ہو جاتا یا سارے بدن میں درد ہوتا۔

... رُکمنی کے چولھے پر حویلی کی دیواریں بھی آگئیں، لیکن انگاروں پر چمکی نہیں۔ نہ جانے اس وقت چولھے کا دھواں کیوں بڑھ گیا تھا اور دھوئیں میں دیواریں کیا کالے بھوت سے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایل، کاشی ناتھ کو گھر سے نکلتے وقت دیکھنے کے لئے رُکمنی کو انہیں دیواروں سے باہر گلی میں جانا پڑتا تھا اور جب جب اس نے ایسی ہمت کی تھی نہ جانے اندر اندر کیسے پیر چلنے لگتے تھے اور اندر اندر کیسے ایل، کاشی ناتھ ہی غائب ہو گئے تھے۔ پھر رُکمنی ایسے ایسے وقت گلی میں جاتی بھی نہیں تھی ——— وہ کیوں کسی کا راستہ کاٹتی ؟ کیوں کسی پر اپنا سایہ ڈالتی ——— ؟

چولھے پر سب کوئلے دہک رہے تھے۔ لیکن ایک نرم نرم ادھ جلا کوئلہ اور انگاروں کے پیچھے ٹپ ٹپ کرتا چنگاریاں چھوڑتا جا رہا تھا۔ رُکمنی نے سوچا، یہ کوئلہ بھی کیا کوئلہ ہے، پورا چھوٹی بہو ہے۔ ——— کم بخت ابھی تک چھوٹی کے نام سے چلتی تھی۔ آتے ہی حویلی کا ستیاناس کیا اس نے۔ نہ گھر رہا پھر نہ گھر والا۔ رُکمنی کی مٹی ہو گئی۔ کاش وہ دن آیا ہی نہ ہوتا جس دن چڑیل کی ڈولی اتری تھی! گھر میں! جس دن خود رُکمنی نے اس کا گھونگھٹ اُٹھایا تھا، جس دن اس نے اسے دیورانی نہیں بہو پکارا تھا ———

شیرازہ

نرم اور تیز کوئلے میں سے موٹی چنگاری چھوٹ گئی اور سیدھی رُکمنی کی مانگ پر آ گری۔

"ہائے! انیائی تو نے مجھے جلا دیا۔"

رُکمنی نے کوئلے کے دہکتے ذرّے کو اپنی اُنگلی سے نوچ اُٹھایا اور اسے موری میں پھینک کر اس پہ تھوکا ——

"جا تیرا ناس ہو جائے —— !"

مانگ کی جلن میں رُکمنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ چھوٹا کوئلہ اس کے خیالوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لے کے چمٹا اُٹھایا اور اس ادھ جلے کو لال انگاروں کے بیچ میں دبایا۔ عورت تھی کہ ڈائن، آتے ہی رُکمنی کے گھر والے کو اپنی انٹی میں باندھ لیا۔ اور باندھ کر اس پہ منتر پھونکے۔

باپ کے مرتے ہی کاشی لال کاشی ناتھ ہو گیا تھا۔ جب چاندنی آئی تو وہ ایل، کاشی ناتھ ہو گیا۔ دماغ تو لے ہی گئی تھی اس کا، سر پہ سے اس کی پگڑی بھی اُتار دی اس نے۔ پھر کیا کیا رنگ دکھائے ایل، کاشی ناتھ نے۔ کہ سر کے بال موڑ کر یوں رکھے، وہ کہے یوں نہیں یوں رکھو، گھنٹوں کنگھا لے کر بالوں کو موڑتا رہتا۔ عطر ہے تو یہ لگاؤ، کپڑے ہیں تو یہ پہنو، درزی ہے تو وہ بلاؤ۔ بس اور سب تو عقل کے اندھے ہو گئے۔ ایک وہی ستیاناسن بات بات کے نکتے نکالتی رہی۔ بات بات کا ناس پیٹتی رہی۔

—— پھر وہی تھی جس نے دیوان خانہ الگ کروا دیا، بیٹھک کا کمرہ نیا بنوایا۔ ادھر اُدھر دیواریں چڑھوائیں، ادھر اُدھر دروازے کٹوائے۔ اور جب رُکمنی کی آنکھیں کھلیں، اُوپر والا بھگوان بھی اندھا ہو چکا تھا۔ دیواروں کے پیچھے دیکھ نہ سکا تھا۔ پھر انہیں دیواروں کے پیچھے کیا کیا کارنامے ہوئے تھے اور ایل، کاشی ناتھ کی مستی کا وہ دِن بھی آ گیا جب رُکمنی کو اس نے پرانی ہنڈیا کی طرح گلی میں پھینک دیا۔

اُسی دن رُکمنی مر گئی تھی۔ پانچ برس یوں ہی لاش سی پڑی رہی، دُور اپنے مائکے میں۔ اور جب پانچ برس بعد لوٹی، انہیں دیواروں کے بوجھ سہنے، اسی دھوئیں کے گھونٹ پینے، رسوئی کی چتا میں اپنے آپ کو جھونکنے، تو صرف ایک شیلا کے مارے، صرف ایک بیٹی کے مارے ——

اور آج جب یُگ بیت چکے تھے، جب رُکمنی کی بیٹی شیلا بھی بس اس کو رُکمنی سمجھتی تھی، جب خود رُکمنی کو بھی رُکمنی بھول چکی تھی، چولھے کے انگاروں کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ پچھلے جنم کی باتوں کو، راکھ ہوئی تصویروں کو پھر سے چمکانے لگے۔

"ماں — !" دروازے پر دستک کے ساتھ شیلا کی آواز سُنائی دی — "ماں — !" رُکمنی کے کان بیکار سُن رہے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں انگاروں سے پوچھا۔ لیکن دروازے پر شیلا کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی — چولہے کے جادو میں رُکمنی ہِل نہ سکی۔ سامنے انگاروں پر بھی شیلا دِکھائی دی — "ماں — !" دروازے کے باہر شیلا چِلّائی۔ انگاروں پر جو شیلا تھی وہ اس کی طرف آنکھ بھی نہیں اُٹھا رہی تھی۔ لیکن دروازے کو وہی شیلا پیٹتی جا رہی تھی۔

"ماں — ماں — ماں۔" رُکمنی کی سُوکھی گھاس کو دِیے کی لَو سی چھُونے لگی۔ ایک جھرجھری کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو چولہے کی آگ سے کاٹا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھُلتے ہی شیلا اپنی ماں سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رُکمنی کچھ نہ سمجھتی، یوں ہی کھڑے کھڑے کھو جاتی۔ لیکن چولہے کے انگاروں نے نہ جانے اسے کیا کر رکھا تھا کہ حویلی کی انہیں دیواروں میں وہ بھی پھُوٹ پڑی اور بیٹی کا ساتھ دے کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ لیکن شیلا نے اپنے آپ کو چھُڑا کر نہ جانے کیوں اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا — "دیکھو ماں۔ یہ رونے کا وقت نہیں۔ ماں جلدی چل! تیار ہو جا۔ چل پتا جی کی حالت بہت خراب ہے۔" کھوئی کھوئی، رُکی ہوئی رُکمنی نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا اور رونے کو اُونچا اُٹھانا چاہا۔ لیکن اب اندر اندر نہ جانے اسے کیا ہونے لگا، جیسے اندر اندر پانی کی پتیلیوں میں راکھ بھرنے لگی ہو، جیسے ہڈیوں کے اُوپر بوٹیاں بھی پتھرانے لگی ہوں۔

"کیا دیکھ رہی ہو ماں؟ چلو اُٹھو۔"

"کہاں؟"

"اسپتال۔"

"میں؟"

"ہاں ماں تمہاری سخت ضرورت ہے۔"

"حالت خاصی خراب ہو گی۔" رُکمنی نے سوچا

"جو کہو سو کروں گی بیٹی۔ کہو تو سب چولھوں میں آگ بھڑکا دوں۔ جتنے کہو اُتنے گنگال پانی کے گرم کر دوں۔ تم کہو تو —" شیلا نے پھر رُکمنی کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور حویلی کی منحوس دیواروں

میں شیلا کی آواز پھوٹنے لگی ـــ یہ کیسا ڈراؤنا خواب تھا کہ ایل، کاشی ناتھ کا حال اُس کالی حویلی میں اُس کی بیٹی اکیلی رُکمنی کو سُنا رہی تھی۔ رُکمنی کے دماغ میں حویلی کا ایک کنواں بن گیا۔ گہرا، گہرا۔ اور اُسی گہرائی میں سے شیلا کی آواز اُٹھی ـــ

"بس ایک آپریشن کی اُمید ہے ماں! اور ڈاکٹر تب تک آپریشن نہیں کرے گا جب تک تم دستخط نہیں کرو گی!"

"کون؟" رُکمنی کیا رُکمنی کی کائنات نے پوچھا۔

جلدی کرو ماں! ڈاکٹر کہتا ہے مریض کی بیوی کو فوراً لاؤ۔ مریض کی بیوی کہاں ہے؟"

یہ کیسی آواز تھی جو کنوئیں میں سے نکل کر حویلی میں گونجنے لگی۔ ایک دیوار نے اسی آواز کو اُٹھایا، دوسری سے اسی کی گونج آئی۔

"بیوی ـــ!" ایل، کاشی ناتھ کی بیوی صرف وہی ایک تھی اور کوئی نہیں تھی۔ اینٹ اینٹ کی آواز میں رُکمنی کو ایک بھونچال کا احساس ہوا۔ اینٹ اینٹ کے دھماکے میں نہ جانے کون کون رُکمنی کے قدموں میں گرتا دکھائی دیا۔ ہلتی زمین اور گرجتی آوازوں میں اُس نے دونوں صندوقوں کے ڈھکن اُٹھائے۔ ایک آندھی میں کپڑے لتے اُتھل پُتھل ہو گئے۔ ہری ہری دھوتیاں اُچھلتی ہوئی باہر آئیں رکھی پڑی مسی ہوئی ساڑھیاں نکلیں۔ لیکن کسی کے اصلی ریشم پر میل کی تہیں چڑھی تھیں، کسی کے پھوسڑے نکل رہے تھے اور اُس آندھی میں وہ سب کی سب ایک طرف گِرتی گئیں۔ مگر آج رُکمنی کو باہر جانا تھا۔ ایل، کاشی ناتھ کی بیوی کو' ساڑھی وہ چاہیئے تھی جو ایل، کاشی ناتھ کے شایانِ شان ہو۔ اُس نے پھر اُسی ڈھیر میں ہاتھ چلائے، ایک ایک ساڑھی کی تہیں کھول دیں، اُٹھا کے ایک ایک کو جھاڑا، ایک ایک کو ٹیکا۔ کم بخت ایک بھی ایسی نہیں تھی کہ اس وقت کام آجائے۔ اور بس تھی تو وہی ایک، جس میں کچھ آب باقی تھی۔ بائیس برس پُرانی۔ رُکمنی نے اسے بس ایک بار پہنا تھا، جب اُس کا لگن تھا، جب اُس کے پھیرے ہوئے تھے۔ لیکن بائیس سال کی بھی کیا بات تھی۔ اُس آندھی میں رُکمنی سو سال کو بھی ایک جھٹکے سے گرا دیتی۔ نہیں تو لگن کی ساڑھی کو یوں کون پہنتا پھرے ـــ لال لال اور لال پر سُنہری بانکڑی ـــ بانکڑی کو تو خیر اُس نے پہلے ہی اُدھیڑ پھینکا تھا۔ ذرا ایک ٹکڑا ابھی لگا ہوا تھا۔ رُکمنی نے سوچا، کسی تہہ میں چھپ جائے گا۔ اُسے اُدھیڑنے کا وقت کہاں تھا؟

اور جب رُکمنی نے چولھے پر رکھے ہوئے تمام گرم پانی سے اپنے ہاتھ اور اپنے پیر ایسے دھو لئے جیسے حویلی کی ایک ایک دیوار کو دھونا تھا اور جب وہ جلدی کے مارے بانکڑی کے اُس ٹکڑے کو ساڑھی کی کسی تہہ میں چھُپا نہ سکی اور سڑک کی دُھوپ میں ساڑھی کا رنگ بھی کچھ زیادہ لال ہوگیا، شیلا کی آنکھوں میں ایک نئی بے چینی نمودار ہوئی۔

"تو یہ بات ہے!"

رُکمنی نے اسپتال کے میدان میں مردوں، عورتوں کی بھیڑ کو دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ یہ سب تھے ایل، کاشی ناتھ کے لوگ، جو رُکمنی اور اُس کی لال ساڑھی کو دیکھ کر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ عورتیں ایک دوسرے کی بغلوں میں گھُس کر باتیں کرنے لگیں۔ مرد ایک دوسرے کو کوہنیاں مارنے لگے۔ لیکن رُکمنی کی اپنی جائی اُس کے آگے آگے جا رہی تھی۔ وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے چل کر آگے بڑھتی گئی۔ اُس ساری بھیڑ میں وہی ایل، کاشی ناتھ کی بیوی تھی اور ڈاکٹر اُسی ایک کا انتظار کر رہا تھا۔

بھیڑ کے بیچ میں سے شیلا کا چاچا ایک تیر کی مانند باہر نکل آیا اور شیلا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"اسے گھر واپس لے جاؤ، ڈاکٹر نے آپریشن کر لیا ہے۔"

"کِس کے دستخط سے؟"

لگن کی لال ساڑھی میں رُکمنی آگے بڑھی اور پُوری کھُلی آنکھوں سے اپنے جان دار سوال کا جواب طلب کیا۔ شیلا کے چاچا نے رُکمنی کے نئے تیور دیکھے۔ کچھ لمحے حیرانی میں چپ رہا۔ لیکن فوراً ہی اُس کی بھوؤں سے ایسا کالا دھواں اُٹھا کہ رُکمنی کو آسمان تک آگ لگتی دِکھائی دی۔ اور ایسا ڈر محسوس ہوا کہ اسپتال کی وہ بڑی عمارت، جس کے ایک کونے میں ساری حویلی آجاتی، وہ تمام کے تمام مکان رُکمنی کے سر پر گرنے والے ہیں —— بھیڑ بھر کے سامنے رُکمنی کا تماشہ بننے لگا تھا، جب سب کے سب یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ اسی اطلاع پر بے ہوش ہونے لگی ہے کہ آپریشن اُس کے آنے سے پہلے ہی ہوگیا ہے۔

لیکن اُسی وقت ایک اور بات ہوگئی۔ اسپتال کی ایک نرس نے آواز دی۔

"مریض کی بیوی آگیا!"

یہ آواز دُور بادلوں میں گھوم کر لوٹ آئی اور رُکمنی کے دماغ میں بیٹھ گئی۔

"مریض کی بیوی آگیا!"

بھیڑ کی ٹولیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی نے ہونٹ تک نہیں ہلایا۔ لیکن شیلا نے ماں کا بازو کھینچا۔

نرس نے بیوی کو پہچان لیا۔ وہ آگے لپکی ــــ

"بی بی ہمت کا کام کرو۔ چلو اپنے آدمی کے پاس چلو ــــ "

شیلا کا چاچا آگے لپکا۔ اُس کی بیوی آگے آ گئی۔ بھانجے بھتیجیوں کی بھیڑ آ گئی۔ لیکن نرس نے اُن سب کو وہیں روکا۔ ماں کے ساتھ شیلا بھی نہ جا سکی اور اسپتال کے ستھرے برآمدے میں، دوائیوں کی نئی خوشبو میں، دھسک اور دھویں کی ماری ہوئی رُکمنی زندہ سی ہونے لگی۔

اسپتال کے اُس کمرے میں رُکمنی نے تین بڑے پلنگ دیکھے، تینوں پر لال کمبل تھے اور کمبلوں کے نیچے آدمی سے۔ آدمی تو تھے لیکن رُکمنی کا کون سا تھا۔ اسی سوچ میں اُس کے قدم دروازے پر رُک گئے۔ کمرے میں گہری، خاموشی تھی۔ اور تینوں مریض سو رہے تھے۔ اُن کے چہرے بھی تقریباً ڈھکے ہوئے تھے۔ سر کے بال ہی دکھائی دیتے تو رُکمنی پہچان لیتی۔ ہاں! کونے پر جو پلنگ تھا اُس کے سامنے کچھ زیادہ سامان تھا۔ دوائیوں کی کچھ نلیاں سی سر کے پاس بستر کے اندر چلی گئی تھیں۔ زیادہ سامان والا پلنگ ہی ہوگا، ایل، کاشی ناتھ کا۔ اور وہ نرس بھی وہیں رُکی تھی اور سامنے کھڑے ڈاکٹر کے ساتھ کانا پھوسی کرنے لگی تھی۔ پھر ڈاکٹر بھی رُکی ہوئی رُکمنی کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں ہی کچھ لمحے دیکھتا رہا اور نرس کو کچھ کہہ کر دوسرے دروازے سے باہر چلا گیا۔

نرس نے رُکمنی کو اشارہ کیا اور وہ اسی پلنگ کی دوسری طرف سٹول پر بیٹھ گئی ــــ "یہ کہاں آ کر بیٹھ گئی؟" رُکمنی کے دِل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ ایل، کاشی ناتھ ــــ! جو یہاں سے لے کر وہاں تک تھا، ایسا کیسے ہو گیا؟ کہ پلنگ پر کاٹھی بھی نہیں دِکھائی دے رہی تھی ــــ اور اتنا بیمار کر دین دُنیا کی خیر نہیں۔

اسے خیال تھا کہ کم سے کم پیچھے کو ٹیک لگا کر بیٹھا ہوگا کہ اسی کے سامنے ڈاکٹر نے رُکمنی کو بُلوایا ہوگا کہ اب اس کی عقل ٹھکانے لگ گئی ہوگی کہ اب اپنے پرائے کی سمجھ آ گئی ہوگی کہ اندر آتی بیوی کو دیکھ لیگا اور پچھتاوے میں آنکھیں موند لے گا ــــ لیکن اسے خیال آیا کہ آپریشن ابھی ابھی ہوا ہے۔ ابھی ہوش میں نہیں ہوگا۔ پھر یہ خوفناک، سوال دِل میں لوٹا کہ یہ جو پڑا ہوا ہے، خود ایل، کاشی ناتھ ہے کہ اور کوئی ــــ

اسی خاموشی میں دو اور ڈاکٹر آ گئے۔ ایک نے جُھک کر کمبل کے نیچے سے مریض کا ہاتھ نکالا ــــ ایل کاشی ناتھ کا ہاتھ ــــ ہاں یہی ــــ! بانہہ پر کُھدے ہوئے کرشن جی ــــ خود کرشن جی کا رنگ تو گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بانہہ کو کیا ہو گیا تھا جو موسلی سی تھی، چپٹا سا رہ گئی۔ رُکمنی کا دِل دھڑکنے لگا۔ دِل

کی دھڑکن ہیں وہ کمرے کی خاموشی سے ڈری نہیں۔ اس طرف کے سٹول کو چھوڑ کر پلنگ کی دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

ڈاکٹر نے مریض کا ہاتھ دھیرے دھیرے چھوڑ دیا۔ نرس بھی پیچھے ہٹ گئی۔ ایک اور جو پاس کھڑا تھا، اس نے دوائی کی نلی کو بستر سے نکالا۔ تینوں چار دل رُکمنی کی طرف دیکھنے لگے۔ رُکمنی نے اپنی ساڑھی کو سر پر سنبھالا۔ آگے بڑھی اور اس نے اپنے آدمی کے منہ پر سے چادر ہٹائی ـــــ

اسپتال کے ایک کونے سے دوسرے تک ایک چیخ گونجی۔ اندر اندر اسپتال کے مُلازم دوڑے، باہر باہر ایلی، کاشی ناتھ کے لوگ ـــــ لیکن رُکمنی وہیں پلنگ کے ساتھ چمٹ گئی اور اس نے اپنی ساڑھی کا وہ حصہ اپنے آدمی کے مُنہ پر ڈال دیا جس پر بانکڑی کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔

مہِ نو اور مہِ کامل

"مجھے اس زنداں میں آئے ہوئے نو مہینے سے زیادہ گزُر چکے۔ یہ میرے نویں بار جیل میں آنے کا واقعہ ہے۔

ہماری آمد پر نئے، جھلملاتے چاند نے ہمارا خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے بعد ہر مرتبہ ہلالِ نو مجھے یہ یاد دلاتا ہے کہ قید کا ایک اور مہینہ ختم ہوا۔

یہ چاند، اس دُنیا کی خوبصورتی، زندگی کے عروُج زوال، ظلمت کے بعد نوُر، موت کے بعد زندگی کی یاد دِلاتا ہے اور قید خانے میں میرا یہ پُرانا رفیق اپنی قربت کی بنا پر رفاقت کا زیادہ حق ادا کر رہا ہے۔"

ـــــ جواہر لال نہرو

جواہر پارے

اے کہ از طبعِ تو کشتِ گُل دمید!

(اقبال)

راشٹرپتی

(۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں جواہر لال نہرو نے کلکتہ کے "ماڈرن ریویو" میں یہ مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون "چانکیہ" کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔ جواہر لال نے خود اپنی ذات کو موضوع بنایا ہے۔ اس دلچسپ مضمون کے اصل مصنف کا نام کئی برسوں بعد معلوم ہوا۔ اس خاکے کی کئی خصوصیات ایک ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ جواہر لال انگریزی کے ایک صاحبِ طرز فن کار تھے۔ مضمون میں ڈرامائی انداز شروع سے آخر تک موجود ہے۔ شخصیت کا داخلی پہلو اس طرح نمایاں ہوا ہے کہ خارجی نقوش سے اور زیادہ دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ——— مترجم]

راشٹرپتی جواہر لال کی جے!

راشٹرپتی نے فخر سے نگاہیں اُٹھائیں۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ راشٹرپتی نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر پرنام کیا اور ان کے سنجیدہ، زرد اور سخت چہرے پر مُسکراہٹ کی ایک تیز لہر نمودار ہوئی۔ اس مُسکراہٹ میں مخصوص انفرادی شان تھی۔ گرمی تھی، جوش تھا۔ جن لوگوں نے مُسکراہٹ کی یہ لہر دیکھی، اُنھوں نے فوراً اپنی مُسکراہٹوں سے اس کا جواب دیا ——— اور خوش آمدید کہا۔

مُسکراہٹ کے گم ہوتے ہی چہرہ پھر سخت ہوگیا اور وہ غمگین نظر آنے لگے۔ ہجوم میں جو جذبہ بیدار ہوگیا تھا، یہ چہرہ اس جذبے سے دُور تھا۔ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس مُسکراہٹ اور شخصیت کی اس ادا کے پسِ پردہ جیسے کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ مُسکراہٹ ان لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کو کھینچنے کا ایک ذریعہ تھی جن کے وہ محبوب رہنما تھے۔

——— کیا یہی بات تھی؟ کیا ایسا ہی تھا؟

راشٹرپتی کی طرف ایک بار پھر دیکھئے۔ غور سے ——— ان کی شخصیت اور ان کے چہرے کا مطالعہ کیجئے۔ ان کی کار کے چاروں طرف ایک بڑا جلوس ہے۔ ہزاروں آدمی انھیں گھیرے ہوئے

ہیں ـــــ جوش، مسرت، فریفتگی اور وجد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی کار کی نشست پر کھڑے ہیں، اپنے آپ کو اچھی طرح سنبھالے ہوئے، سیدھے ـــــ اونچا قد ہے ـــــ متحرک ہجوم کے درمیان دیوتا کی طرح ـــــ ساکت، خاموش، بے حرکت!

پھر وہی مسکراہٹ چہرے پر کھیلنے لگی ہے! اس مسکراہٹ میں ہنسنے کا انداز ہے۔ لوگوں کے چہرے پر بھی مسکراہٹیں ہیں ـــــ اور یہ مسکراہٹیں ہنسی میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ دراصل عوام کی ہنسی اپنے راشٹرپتی کو دیکھ کر اُبل آئی ہے۔ حالاں کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیوں ہنس رہے ہیں؟

اب وہ دیوتا کا انداز نہیں رہا ـــــ ایک عام آدمی کا انداز ہے۔ اس آدمی کا، جو اپنے چاروں طرف ہزاروں لوگوں کی محبت اور دوستی پر اپنا پورا حق رکھتا ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں خوشی کی لہر ہے جس سے محبت اور دوستی کی خوشبو اُڑ رہی ہے۔ یہ تمام لوگ انہیں اپنے دل کی دھڑکنوں سے قریب محسوس کر رہے ہیں۔

سنجیدہ، زرد اور سخت، چہرہ پھر سامنے ہے!

اداکار کے کرتب

یہ سب فطری عمل ہے ـــــ یا یہ ایک "پبلک مین" کے سوچے سمجھے ہوئے طریقے اور کرتب ہیں؟ شاید دونوں ہے۔ پرانی عادت فطرتِ ثانی بن گئی ہے۔ سب سے پُراثر "پوز" وہ ہے جس میں بہت کم "پوز" ہو اور جواہر لال نے بغیر میک اپ کے اداکاری اچھی طرح سیکھ لی ہے۔ اپنی بے پروائی اور بے تعلقی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ عوام کے اسٹیج پر مکمل فن کاری کا ثبوت دیتے ہیں۔

اس سے ملک کی ترقی اور خود ان کی ترقی ممکن ہے؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ ان کے سامنے کون سی منزلیں ہیں؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ کون سی خواہشیں اور کیسی تمنائیں ہیں؟

یہ سوالات ہر موقع اور ہر حالت میں دلچسپ ہیں۔ اس لئے کہ جواہر لال کی شخصیت مختلف دلچسپیوں کا مرکز ہے۔ لوگوں کی توجہ فوراً اس شخصیت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ ہمارے لئے ان کی شخصیت کافی اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ جواہر لال کی شخصیت ہندوستان کی موجودہ قدروں سے زیادہ ہے، مستقبل سے بھی اس کا رشتہ گہرا ہے۔ جواہر لال کی بے پناہ صلاحیتوں سے ہندوستان کا زیادہ بھلا ہو گا یا زیادہ نقصان ـــــ ہمیں ان تمام سوالوں کا جواب تلاش کرنا چاہیئے۔

وہ ڈیڑھ سالوں سے کانگریس کے صدر رہیں اور کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں

وہ محض Camp-follower ہیں، دبے ہوئے یا دوسروں کی رکاوٹوں کے شکار۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلسل اور مستقل ان کی انفرادی شان بڑھتی جارہی ہے۔ ان کے اثرات عوام پر گہرے ہو رہے ہیں اور ہر طبقہ کے لوگ ان کے خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ کسانوں اور مزدوروں کے قریب بھی ہیں اور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے قریب بھی۔ تاجروں اور پھیری والوں، برہمنوں اور اچھوتوں، مسلمانوں اور سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستانی زندگی کی تشکیل کی ہے۔ وہ قدرے مختلف زبان بولتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں ان تمام لوگوں کے دل و دماغ کی قربت حاصل ہے۔ اس عمر میں ان کی محنت اور ان کے کام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی اس پھیلی ہوئی زمین کے ہر پہلو پر قدم رکھا ہے اور ہر جگہ ان کا نہایت ہی شاندار استقبال ہوا ہے۔ شمال سے جنوب تک انہوں نے فاتح سیزر کی طرح سفر کیا ہے اور ہر قدم پر ایک Legend اور ایک عظیم الشان روایت کی تصویر چھوڑی ہے۔ کیا یہ سب محض معمولی باتیں ہیں، کیا یہ سب محض تیزی سے گزرنے والے واقعات ہیں جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ——— یا کچھ گہری باتیں ہیں، نقش ہو جانے والے واقعات ہیں یا کوئی متحرک قوت ہے، کوئی بڑا کرشمہ ہے۔ کیا جواہر لال خود اس متحرک قوت کے کرشمے سے آگاہ نہیں ہیں ——— ؟ کیا یہ قوتِ اعتماد اور آرزوؤں اور خواہشوں کی طاقت ہے جس کے متعلق انہوں نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے :-

"I drew these tides of men into my hands and wrote my will across the sky in stars."

فاشسطی فینسی

اگر یہ فینسی بدل جائے تو کیا ہوگا؟ جواہر لال جیسی شخصیتیں، جو اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ اچھی قدروں کی تعمیر کرتی رہتی ہیں، جمہوریت میں محفوظ نہیں ہیں؟ وہ خود کو جمہوریت پسند کہتے ہیں، سوشلسٹ کہتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سنجیدہ اور باشعور ہیں اور ان کا ہر قدم نہایت سنجیدگی سے اٹھتا ہے لیکن ماہرینِ نفسیات کو اس کی خبر ہے کہ بالآخر انسانی ذہن دِل کا غلام ہوتا ہے اور تمام بنیادی خواہشوں سے منطقی رشتہ ضروری ہے۔ چند لمحوں میں جواہر لال ایک آمر یا ڈکٹیٹر بن سکتے ہیں۔ وہ جمہوریت اور سوشلزم کی زبان اور جمہوری اور سماجی نعرے لگا سکتے ہیں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ فاشزم کا رشتہ اس لب و لہجہ سے کس حد تک ہے اور کتنی آسانی سے اس لب و لہجہ کو ایک

شیرازہ

طرف کیا جا سکتا ہے۔

جواہر لال یقیناً فاشسٹی نہیں ہیں، ان کا اعتقاد اور ان کے رُجحانات اس نظام سے میل نہیں کھاتے، وہ فاشزم کے ناپاک عناصر سے دُور ہیں، ان کی صورت اور ان کی آواز سے ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے، عوام کے سامنے "پرائیویٹ صورتیں" بہتر ہیں اُن "عوامی صورتوں" سے جو پرائیویٹ جگہوں پر نظر آتی ہیں۔ "جواہر لال کی صورت اور ان کی آواز دونوں "پرائیویٹ" ہیں۔ جلسوں اور عوام کے اجتماع میں ان کی آواز جانی پہچانی آواز معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے افراد سے علیحدہ علیحدہ گھریلو ماحول میں، گھریلو انداز میں باتیں ہو رہی ہیں۔ اس آواز کو سُنتے اور اس تاثر سے پُر اور جذباتی شکل کو دیکھتے ہوئے ہر فرد حیران رہ جاتا ہے۔ کیسے خیالات ہیں، کیسے جذبات اور کیسی آرزوئیں ہیں ——— کتنی عجیب و غریب اُلجھنیں ہیں اور کیسا داخلی دباؤ ہے ——— کون سے جذبات ہیں جو اس طاقت کے پیچھے کام کر رہے ہیں؟ عوامی جلسوں میں ان کے خیالات کا تسلسل متاثر کرتا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کا پیکر خود انہیں چکمہ دے جاتا ہے، اس لئے کہ ان کا ذہن نہ معلوم گھاٹیوں میں گھومنے لگتا ہے۔ نئے تصورات تراشنے لگتا ہے اور ان لمحوں میں وہ اپنے پیکر سے علیحدہ اپنے ذہن کے تراشے ہوئے پیکروں سے گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ کیا وہ ان انسانی رشتوں پر سوچتے ہیں جنہیں اپنی زندگی کے سفر میں کھو چکے ہیں ——— ؟ زندگی کا وہ سفر جو نہایت کٹھن، سخت اور صبر آزما رہا ہے ——— ؟ کیا وہ ان رشتوں کی بازیافت کرنا چاہتے ہیں ؟ ——— یا وُہ مستقبل کے حسین اور دل فریب خواب میں ڈُوب جاتے ہیں جہاں کش مکش ہے، کامیابی ہے اور جذباتی آرزومندی ہے ؟

انہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ انہوں نے جو راہ پسند کی ہے، اس راہ پر آرام حرام ہے۔ کوئی شاہراہ ایسی نہیں جہاں آرام کرنے کی کوئی جگہ ہو۔ مقاصد میں فتح اور کامیابی خود ایک بہت بڑی مصیبت اور ایک بڑا بوجھ ہے۔ لارنس نے عربوں سے کہا تھا:

"There can be no rest-houses for revolt, no divident of joy paid out."

ممکن ہے مسرّت اور خوشی ان کے لئے نہ ہو، لیکن مسرّت اور خوشی سے بڑی چیز انہیں مل سکتی ہے اگر قسمت مہربان ہو جائے ——— "زندگی کا ایک بڑا مقصد حاصل ہو جائے!"

سیزرازم نہیں!

جواہر لال فاشسٹ نہیں بن سکتے۔ اگرچہ ایک ڈکٹیٹر کے تمام عناصر ان میں موجود ہیں۔ ہمہ گیر شہرت، مستحکم یقین و اعتقاد، قوتِ عمل، غرور، جماعت بندی کی صلاحیت، محنت کشی اور مجلسی زندگی سے دلچسپی —— دوسروں کے لئے قوتِ برداشت کی کمی اور کمزوروں اور ناقابل لوگوں کے لئے خفگی —— ان کے غصّے کی کیفیت —— کوندنا، بھڑکنا —— ہم سب ان باتوں سے واقف ہیں اور اس عالم سے بھی ہمیں واقفیت ہے جب ان کا غصّہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہونٹوں کی حرکت اور لہر سے راز کھل جاتا ہے۔ کام کو انجام تک پہنچانے کی ان کی بے پناہ خواہش، ناپسندیدہ عناصر کو فوراً ہٹا دینے کا عمل، اور نئے پسندیدہ عناصر کی تشکیل کا خیال —— یہ باتیں تشکیل پاتی ہوئی جمہوریت کی آہستہ روی کو زیادہ تیزی اور شدّت نہیں بخش سکتیں۔ عام حالتوں میں ان کے عمل اور ردِّ عمل کو دیکھتے ہوئے اہلیت اور کامیابی کی متعدد تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

لیکن انقلابی عمل میں سیزرازم ہمیشہ دروازے کے قریب رہتی ہے۔ پھر کیا —— یہ ممکن نہیں کہ جواہر لال اپنی ذات میں سیزر کا پیکر دیکھتے ہوں؟ اسی منزل پر جواہر لال اور ہندوستان دونوں کے لئے خطرے ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان سیزرازم کے ذریعہ آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ —— ہاں، ہندوستان کی کچھ ترقی ہوگی لیکن پھر جمود پیدا ہو جائے گا۔ ترقی کی اعلیٰ منزلوں کا پتہ نہیں چلے گا اور ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی میں اتنی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی —— کہ سوچنا پڑے گا —— ترقی میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟

جواہر لال مسلسل دو سال سے کانگرس کے صدر ہیں اور ان کی شخصیت کانگرس کے لئے اس حد تک لازمی اور ناگزیر بن چکی ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے انہیں تیسری بار بھی صدر بنایا جائے —— لیکن شاید ہندوستان اور جواہر لال دونوں کے ساتھ اس سے بڑی زیادتی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ انہیں تیسری بار صدر چن کر دراصل ہم کانگرس کی انفرادیت کو صدمہ پہنچائیں گے اور ایک آدمی کو کانگرس کی قیمت پر اوپر اور اونچا اٹھائیں گے۔ لوگ "سیزرازم" پر سوچیں گے۔ اس طرح جواہر لال کے غلط رجحانات کی نشوونما ہوگی، ان کے غرور میں نئی اٹھان آئے گی۔ انہیں اس کا یقین آجائے گا کہ وہی تنہا ہندوستان کے تمام مسائل کو سلجھا سکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ پچھلے سترہ برسوں سے کانگرس کے اہم شعبوں سے ان کا تعلق رہا ہے۔ انہیں یہ ضرور سوچنا چاہیئے کہ ان کی شخصیت لازمی اور ناگزیر ہے، کسی اور کو یہ سوچنے کا قطعی حق نہیں ہے۔ ہندوستان انہیں

کانگریس کا صدر تیسری بار نہیں چن سکتا!

ہم انہیں برباد کیوں کریں؟

اس کی ایک ذاتی وجہ بھی ہے۔ ان کی گفتگو میں ایک بہادر اور دلیر آدمی کا آہنگ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جواہر لال بہت تھک گئے ہیں۔ اگر وہ صدر بنے رہے تو ان کی صحت بہت جلد خراب ہو جائے گی۔ وہ آرام نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جو شیر پر چڑھتا ہے وہ اُتر نہیں سکتا۔ ہم کم از کم اتنا کر سکتے ہیں کہ انہیں گمراہی سے بچائیں، ذہنی اذیّت سے نکالیں، بڑی ذمہ داریوں سے نجات دیں۔ ہمیں مستقبل میں ان سے زیادہ اچھے کام کی توقع رکھنے کا حق ہے۔ ہمیں اس توقع کو ختم نہیں کرنا چاہیئے اور ساتھ ہی ان کی زیادہ تعریف کر کے انہیں برباد بھی نہیں کرنا چاہیئے اگر ان کا کوئی تصوّر ہے تو وہ نہایت ہی مہیب اور ہوش رُبا بن چکا ہے۔ ہمیں اس تصوّد کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہیئے۔ ہم سیزرازم نہیں چاہتے، کوئی سیزر ہمیں نہیں چاہیئے۔"

(اُردو پیکر: ڈاکٹر شکیل الرحمن)

آخری لمحہ تک...

"یہ وہ وقت ہے جب کام کرنے کی ضرورت ہے۔ محنت کی ضرورت ہے۔ امن کی ضرورت ہے۔ باہمی کوششوں کی ضرورت ہے اور اُن تمام مرتکز قوتوں کی ضرورت ہے جو ملک کے پاس ہیں تاکہ یہ ملک کی خدمت میں صرف ہوں۔ ہم کیا کر رہے ہیں۔ بلاشبہ مُلک ترقی کر رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔

لیکن جب میں اپنے آس پاس دیکھتا ہوں تو کام کرنے کا ماحول، خدمت کرنے کی فضا نظر نہیں آتی بلکہ خالی خولی باتیں، صرف نکتہ چینی، عیب جوئی اور تحقیر کی کوشش اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں نظر آتی ہیں۔

اور پھر اپنی عمر کا احساس کر کے مجھ پر ہلکی سی اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بہرحال مجھ کو چند ہی سال جینا ہے اور میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک جم کر کام کروں۔"

(جواہر لال نہرو)

تقدیر کے ساتھ پیمان

(جواہر لال نہرو نے یہ تاریخی تقریر ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو آئین ساز یہ کے اُس اجلاس میں کی جو نصف شب کو بُلایا گیا)

"برسوں پہلے کی بات ہے، ہم نے تقدیر سے ایک عہد باندھا تھا اور اب وہ وقت آیا ہے کہ ہم اپنے عہد کو، مکمل طور پر نہ سہی، لیکن ایک ٹھوس صورت میں پُورا کریں۔ آدھی رات کے قریب، جب کہ دُنیا محوِ خواب ہو گی، ہندوستان حیات اور آزادی کو گلے لگانے کے لئے بیدار ہو گا۔ ایک ایسا لمحہ آرہا ہے جو تاریخ میں شاذونادر ہی آتا ہے، جب قدامت کی بجائے نیاپن ہو گا، جب ایک دَور کا خاتمہ ہو جائے گا، جب ایک دبی ہوئی قوم کی رُوح پر اظہار کے راستے کُھل جائیں گے۔ اس پُرتمکیں لمحے یہ مُناسب ہو گا کہ ہم ہندوستان، اس کے لوگوں بلکہ پُوری انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کا عہد اُٹھائیں۔

تاریخ کے آغاز سے ہندوستان نے مُسلسل تلاش جاری رکھی اور کتنی صدیاں اس کی تلاش اور جستجو کی شاہد ہیں۔ اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی امین ہیں، اچھی یا بُری قسمت جیسی بھی تھی، اس نے تلاش کو کبھی فراموش نہیں کیا اور نہ اُن خوابوں کو بھول ڈالا جو اُسے قوتِ نمو دیتے رہے۔ آج ایک منحوس دَور کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان اپنی بازیافت کر رہا ہے۔ آج جس کارنامے کو ہم منا رہے ہیں وہ آیندہ کی فتح مندیوں اور کارناموں کا پیش خیمہ ہے۔ کیا ہم اتنے بہادر اور عاقل ہیں کہ اس موقع کی نزاکت کو سمجھ لیں اور مستقبل کے چیلنج کو قبول کریں؟

آزادی اور طاقت اپنے ساتھ ذمّہ داریوں کو لے کر آتی ہے۔ ذمّہ داری اسمبلی کی ہے، ایک خود مختار ادارہ، جو لوگوں کی آزاد رائے کی نمایندگی کرتا ہے۔ آزادی کے وجود میں آنے سے پہلے ہم نے ریاضت کی تکلیف برداشت کی ہے۔ ہمارے دِل اس غم سے بوجھل ہیں، کچھ تکلیفیں اب بھی ہیں، تاہم ماضی گُذر گیا اور اب مستقبل ہمیں اپنی سمت بُلا رہا ہے۔

مستقبل راحت اور آرام لے کر نہیں آرہا، بلکہ مُستقل جدوجہد لے کر، تاکہ ہم اپنے وعدوں کو پُورا کریں اور اس وعدے کو پُورا کریں جو ہم آج کر رہے ہیں۔ مُلک کی خدمت کروڑوں ستم رسیدہ انسانوں کی خدمت ہے۔ اس کا مطلب مُفلسی، جہالت بیماری اور غیر مساوی سلوک کا خاتمہ بالخیر ہے۔ ہماری نسل کے سب سے بڑے انسان کی تمنّا یہ رہی ہے کہ ہر آنکھ سے ہر آنسو پونچھ لے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے امکان میں نہ ہو، لیکن جب تک آنسو اور تکلیفیں موجود ہیں، جب تک ہمارا کام پُورا نہیں ہوگا۔

لہٰذا ہمیں محنت اور ریاضت سے کام لینا ہے تاکہ ہم خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کریں۔ وہ خواب ہندوستان کے لئے ہیں، لیکن وہ پُوری دُنیا کے لئے بھی ہیں۔ اس لئے آج تمام لوگ اور قومیں اس طور پر ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں کہ وہ الگ جینے کا تصوّر ہی نہیں کر سکتیں۔ امن کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آزادی بھی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح خوش حالی یا تباہی بھی الگ الگ نہیں کی جاسکتی، خاص کر آج کل کی دُنیا میں، جسے الگ الگ حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔"

(ترجمہ: حامدی کاشمیری)

ہندوستان۔ آج اور کل

جواہر لال نہرو مرحوم نے مولانا آزاد مرحوم کی یاد میں اُن کی پہلی برسی پر آزاد میموریل لکچرس کے سلسلہ کے پہلے لکچر دیئے تھے، جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے۔ مرحوم نے جو موضوع چنا تھا، اُس پر اظہار خیال کرنے کے لئے، وہ نہ صرف دُنیا بھر میں موزوں ترین انسان تھے، بلکہ یہ ان کا محبوب ترین موضوع بھی تھا۔

ذیل میں ان لکچروں کی ایک تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ جو بڑی بصیرت افروزی سے ملک کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میں شروع ہی میں ایک معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ پبلک کے معاملات سے میرا تعلق بہت طویل عرصے سے ہے اور اکثر پبلک جلسوں میں مجھے تقریریں کرنا پڑتی ہیں، مگر آج مجھے جو خطبہ دینا ہے، وہ میرے لئے ایک نئی چیز ہے۔ ایسے خطبے فکر انگیز اور عالمانہ ہونے چاہئیں اور ان کی تیاری میں کافی وقت لگانے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع کا پورا حق ادا کرنے میں میری ناتجربہ کاری کے علاوہ سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ پارلیمنٹ کے بجٹ سشن کی وجہ سے میرا تمام تر وقت روزمرہ کے کاموں میں صرف ہو جاتا تھا۔

آج کے ہندوستان کو سمجھنا اور اس کو بیان کرنا اور کل کے ہندوستان کے بارے میں کچھ کہنا ایک طرح کی جسارت ہے۔ دراصل کسی ملک یا دنیا کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا جتنا مشکل آج ہے اتنا مشکل دنیا کی تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں تھا۔ واقعات حیرت انگیز رفتار سے بدلتے رہتے ہیں اور ایک تبدیلی کے بعد دوسری تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ سیاست کی سطح کے نیچے لاتعداد مسائل چھپے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات وہ کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتے ہیں اور صورت حال کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

موجودہ ہندوستان کے بنانے میں نہ صرف ماضی قریب کا ہاتھ ہے، بلکہ ہمارے ملک کی ہزار ہا سال کی طویل داستان کا بھی حصہ ہے۔ تجربے اور اعمال جو تہہ بہ تہہ ہم پر جمے ہوئے ہیں۔ ان کے خمیر سے ہم بنے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے آج ہماری وہ شکل ہے جو ہم کو نظر آ رہی ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو میرے زمانے کے ہیں۔ واقعات کے ایسے ریلے میں ڈھلے اور بنے ہیں کہ جو غالباً دوبارہ نہیں آئیں گے نہ صرف یہ کہ ہمیں ایک عظیم رہنما کی قیادت کا شرف حاصل ہوا جس نے جھنجھوڑ کر ہمیں خواب غفلت سے جگایا۔ ہماری زندگی میں انقلاب پیدا کیا اور بندھے ٹکے طرز زندگی سے باہر نکالا۔ بلکہ ایسے حالات اور واقعات کے شاہد رہے اور ان میں شرکت کا موقع ملا جن

کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

ہمارے سامنے اور ہمارے دِل و دماغ میں ہمیشہ گاندھی جی کی شخصیت رہی ان کے علاوہ دوسری عظیم شخصیتیں بھی تھیں اور ان بے شمار مردوں اور عورتوں کا ساتھ اور دوستی تھی۔ جن کا حوصلہ اور ہمت اس وجہ سے بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے اپنے کو بڑے مقاصد اور ایک بڑے رہنما کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ مولانا آزاد اِن عظیم شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کی عمر کم تھی مگر وہ بہت ہی پختہ کار اور دانا سمجھے جاتے تھے۔ ہماری تحریک میں ان کی ایک مخصوص جگہ تھی اور ہماری نظروں میں دوسرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس مشترک تہذیب کی نمائندگی کرتے تھے جس کے لئے ہندوستان ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ انہوں نے قومیت کے تنگ دائرے سے نکلنے میں ہماری مدد کی اور ہماری نظر میں وسعت پیدا کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اتنے آدمی جو ایک دوسرے سے مختلف تھے ایک مضبوط مشترک رشتے میں منسلک ہو گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ چالیس پینتالیس برس تک کام کرتے رہے۔

ہندوستان کیا ہے۔

ہندوستان کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو میرے ذہن میں بار بار اُبھرتا ہے۔ میں نے شوقیہ کام کرنے والوں کے طریقے پر اس کے ماضی اور حال کے بارے میں ایک جواب تلاش کیا ہے۔ ہماری قدیم تاریخ کے ابتدائی حالات مجھے حیرت اور استعجاب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں میں مردانگی اور جوش تھا۔ ان کی طبیعتیں جستجو کی طرف مائل تھیں۔ ان کو آزادی کے ساتھ مسائل پر غور کرنے کا شوق تھا اور پرانے دور میں بھی ترقی یافتہ تہذیب کی علامتیں ملتی ہیں جس میں رواداری اور بے تعصبی تھی۔ اگرچہ انھوں نے زندگی کی خوشیوں اور غموں کو قبول کر لیا تھا مگر مختتم ذات اور عالمگیر سچائی کی ہمیشہ تلاش میں رہے اس نسل نے ایک عظیم الشان زبان یعنی سنسکرت کی تعمیر کی۔ اس نے اپنے فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے ذریعہ دِل کے تاروں کو چھیڑنے والا پیغام دور دراز ملکوں تک پہونچایا۔ اسی نسل نے اُپنشد گیتا اور گوتم بدھ کو پیدا کیا۔

دنیا کی زبانوں میں شاید ہی کوئی ایسی زبان ہوگی جس نے کسی نسل کی تاریخ میں اتنا اہم حصّہ لیا ہے۔ جتنا کہ سنسکرت نے اس میں بلند ترین خیالات ظاہر کئے گئے ہیں اور ادبی شاہکاروں کی بعض بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کو متحد کرنے والی طاقت بن گئی۔ اگرچہ ملک میں سیاسی اعتبار سے تفریق تھی۔ رامائن اور مہابھارت کے اثرات کروروں اشخاص کے دلوں میں گھر کر گئے۔ اور یہ اثرات ہزار ہا سال تک قائم رہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ہماری نسل نے مہاتما بدھ اُپنشد اور عظیم الشان رزمیہ نظموں کو فراموش کر دیا تو اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ وہ جڑ سے اکھاڑے ہوئے درخت کی طرح ہو جائے گی جن کی بنا پر اسے صدہا سال تک امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس وقت ہندوستان، ہندوستان نہیں رہے گا۔

انحطاط

بتدریج تنزل اور انحطاط پیدا ہو گیا۔ افکار کی تازگی جاتی رہی اور وہ بے رس ہو گئے۔ جوانی کی قوت اور ولولہ جاتا رہا۔ بڑھاپے

نے خیالات میں پیچ ڈال دیئے۔ تصورات کے میدانوں میں اولوالعزمی کے ساتھ نکل کھڑے ہونے کے بجائے بے جان دستور اختیار کئے گئے۔ دنیا کی وسعت جو شوق کو ابھارتی ہے، بنظر میں نہیں رہی۔ زندگی ذاتوں کی تقسیم اور رسم و رواج کی تفصیلات میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے قید کر دی گئی پھر بھی ہندوستان کے عظیم اور وسیع سمندر میں اتنی گنجائش تھی کہ باہر سے آنے والے دھاروں کو اپنے اندر شامل کر لے اور اس نے ان افکار و خیالات کو بالکل فراموش نہیں کیا جنھوں نے اس کو زمانہ شباب میں جوش اور ولولہ بخشا تھا۔

اس کے بعد ہندوستان، اسلام کے آنے اور مسلمانوں کے حملوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پھر مغربی نوآبادکار طاقتیں آئیں۔ جن کے تسلط اور غلبے کا انداز نیا تھا۔ اس کے ساتھ یورپ کے تازہ تصورات اور وہاں کی بڑھتی ہوئی صنعتی تہذیب سے تصادم ہوا۔ یہ دور ایک طویل کشمکش کے بعد حصول آزادی کے وقت ختم ہوا اور اب ماضی کے اس پورے بوجھ کو کندھے پر رکھے ہوئے اور خواب و خیال کی باتوں اور تعمیر کے کمتاتے ہوئے حوصلوں کو دل میں لئے ہوئے ہم اپنے مستقبل کا سامنا کر رہے ہیں۔ آج کل ہم میں اور ہمارے ملک میں ان تمام گزرے ہوئے زمانوں کا عکس باقی ہے۔ منظم انسانی اور قدرتی طاقت جدید دور کی علامات ہیں۔ ہندوستان میں ایک طرف ایٹمی سائنس اور اٹامک انرجی کو ترقی دی جا رہی ہے۔ دوسری طرف گوبر کا آتشکل بھی جاری ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں ہر صدی کی خصوصیات موجود ہیں۔ مزید برآں بے پناہ تنوع اور رنگارنگی ہے اس رنگارنگی اور تنوع کی پشت پر وہ یک جہتی بھی ہے جس نے ان تمام ادوار میں مصیبتوں اور تباہیوں کے باوجود ہماری قوم کو متحد رکھا

ماضی اور مستقبل

چنانچہ ہم اپنے اس دور کے طوفان اور اضطراب میں ... ... آگے اور پیچھے دونوں طرف نظر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کبھی آگے کی طرف مستقبل کو دیکھتے ہیں، اور کبھی پیچھے کی طرف ماضی کو۔ اور ہمیں آگے اور پیچھے دونوں طرف کھینچا جا رہا ہے۔ ہم اس کشمکش کو ختم کر کے زندگی کا ایک ایسا نظام کیونکر قائم کر سکتے ہیں، جو ہماری مادی ضرورتوں کو پورا کرے اور ساتھ ہی ہمارے ذہن اور ہماری روح کو سنبھالے رکھے۔ ہم اپنی قوم کے سامنے کون سے نئے تصورات یا کون سے پرانے تصورات جن میں نئے حالات کے مطابق رد و بدل کر دیا گیا ہو پیش کر سکتے ہیں اور کس طرح ان میں بجلی کی لہریں دوڑا سکتے ہیں، جو انھیں بیدار اور عمل پر آمادہ کریں۔

ایمان ضروری

ہندوستان کے اپنے مخصوص مسائل ہیں، اس کے علاوہ ہمارے حصے میں ایسی دنیا کے بڑے مسائل بھی آئے ہیں جسے عظیم الشان ترقی کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اوپر اختیار نہیں رہا۔ اس وقت ہم بجا طور پر ہندوستان کی معاشی ترقی، پنج سالہ منصوبے اور جنتا کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لئے انتہائی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کی ترقی کے لئے یہ سب لازمی ہے۔ ان کے بغیر ہم کسی اور طرح سے ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر ہمارے دماغ میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بذات خود کافی ہے یا اس کے ساتھ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ فلاحی ریاست کا نصب العین معقول ہے مگر یہ بے لطف بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے سامنے ان ریاستوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے عام بہبودی کا نصب العین حاصل کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے نئے مسائل اور دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، جن کا حل صرف مادی ترقی اور صنعتی تہذیب کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ مذہب نے

انسانی فطرت کی چند بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ مگر اس قسم کے مذہب کا اثر کم ہوگیا ہے اور وہ سائنس اور عقلیت کے سیلاب کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہم مذہب کو ضروری مانیں یا نہ مانیں ہماری زندگی میں معنی پیدا کرنے اور ہمیں قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم کسی معقول نصب العین پر ایمان رکھیں۔ اس احساس کے بغیر کہ ہماری روزمرہ کی مادی اور جسمانی خواہشوں کو پورا کرنے کے مقصد سے برتر ایک مقصد ہے۔ ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

سوشلزم اور کمیونزم اس مقصد کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خود ان میں حکم لگانے کا میلان پیدا ہوگیا ہے۔ کمیونسٹ ہمارے زمانے میں مابعد الطبیعیات کے معلم بن گئے ہیں۔

ہر سوسائٹی توازن حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی ہے کبھی یہ کش مکش کی شکل میں ہوتی ہے۔ کبھی ہم آہنگی حاصل کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہوتی ہے۔ غیر مہذب سوسائٹی جس میں تبدیلی کم ہوتی ہے ایک لیکھ پر چلتی ہے اور اس کا توازن ادنیٰ سطح پر ہوتا ہے۔ جاندار اور بیدار سوسائٹی افراد میں اور خود اپنے اندر کشاکش پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو دنیا کی موجودہ بے چینی اور کشاکش کے معنی ہیں غیر معمولی قوت ترقی نئے توازن کے لئے جدوجہد اور وجود انسانی کے لئے ایک نیا معیار یہ بہت ہی ہمت افزا بات ہوئی اگر ہمیں ہر وقت اس کا خوف اور خطرہ نہ ہوتا تو نکلیر دور کے ہتھیار پوری نوع انسانی کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

ہماری نگاہ ہمیشہ مستقبل کی طرف ہونی چاہیئے اور کسی مقصد کے لئے اعتقاد اور پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتے رہنا چاہیئے ساتھ ہی ساتھ ماضی کی وراثت کو محفوظ رکھنا اور اس سے تقویت حاصل کرنا چاہیئے۔ تبدیلی ناگزیر ہے مگر تسلسل بھی ضروری ہے۔ یہ گاندھی جی کی خوبی تھی کہ ان کے قدم ہماری سرزمین میں اور قوم کی قیمتی روایات پر مضبوطی سے قائم تھے اور اس کے ساتھ وہ ایک انقلابی قوت بھی تھے کہ وہ فرسودہ معاشی نظریوں کو مانتے تھے یا یہ کہ وہ روایت پرستی کے حامی تھے یا یہ کہ وہ رجعت پرستوں کی ہمت افزائی کرتے تھے پھر بھی جو شخص بھی ان کی وسیع سرگرمیوں کا جائزہ لے وہ ان کے انقلابی نتائج سے حیران رہ جاتا ہے۔ گاندھی جی سے پہلے

تھے۔ بہت سے لوگ اس بات پر اعتراض کرسکتے تھے

کئی ممتاز مصلح منظر عام پر آئے۔ انہیں چھوٹی موٹی تبدیلیاں کرنے یا نیا مذہبی فرقہ بنانے میں کامیابی ہوئی، لیکن گاندھی جی نے رام راج کا ذکر چھیڑ کر کھوکھا خاندانوں میں انقلاب کر دیا۔ بغیر اس کے کہ لوگ محسوس کریں کہ کیا ہو رہا ہے وہ اصولی طور پر ذات پات کی بہت کم برائی کرتے تھے (اگرچہ اپنی زندگی کے آخری دور میں کسی حد تک کیا بھی) لیکن انھوں نے پس ماندہ طبقوں اور اچھوتوں کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے میں زور دے کر ذات پات کے پرانے نظام کی جڑ کھوکھلی کر دی اور یہ انھوں نے جان بوجھ کر اور نتائج سے آگاہ ہوتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص سیاسی طریقِ کار سے کروڑوں آدمیوں میں نئی روح پھونک دی۔ ان کے دل سے خوف نکال دیا اور ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے سچائی اور پرامن طریقے اختیار کرنے پر زور دیا۔ دراصل سچائی ان کے لئے زندگی کی ایک بنیادی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام کی آمد

جب اسلام ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوا تو اپنے ساتھ کشمکش بھی لایا۔ اس کے دہرے اثرات پڑے۔ ایک طرف اس نے ہندو سوسائٹی کے اس میلان کو تقویت پہونچائی کہ وہ اور زیادہ سکڑ کر اپنے محافظ خول کے اندر پناہ لے دوسری طرف وہ تازہ ہوا اور نئے تصورات لایا۔ اس طرح اس نے زندگی کی نئی قوت پیدا کی۔ بودھ مت کے برعکس جو ہندوستانی فکر کی ایک اور عظیم پیداوار ہے۔ ہندو سوسائٹی کا نظام ہر طرف سے بند تھا۔ مسلمان بھی جو باہر سے آئے۔ اپنے ساتھ ایک ایسا نظام لائے جس کے دروازے دوسروں کے لئے بند تھے۔ اس طرح دو نظام ملے جو ایک دوسرے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں تھا کہ دوسرے کو ختم کر دیتا یا اس پر حاوی ہو جاتا۔ سیاسی کامیابی کا نتیجہ یہ نہیں نکلا۔ کہ ذہنی، اخلاقی یا مذہبی فتح بھی حاصل ہو جاتی۔ قدیم ہندوستانی روایات اور عقیدہ اب بھی نئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی طاقتور اور مضبوط تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ اپنا مخصوص موثر پیغام لائے تھے۔ اس لئے آسانی سے جذب نہیں ہوئے۔ جس طرح ان سے پہلے آنے والے گھل مل گئے تھے اور وہ ہندوستانی قوم کے بنیادی کردار کو بدل سکے۔ اس طرح اہم مسئلہ جس سے ہندوستان عہد وسطیٰ میں دوچار تھا۔ یہ تھا کہ دو ایسے نظاموں میں جن کے دروازے غیروں کیلئے بند ہیں اور جن میں سے ہر ایک کی جڑیں کافی گہری اور مضبوط ہیں۔ کس طرح اچھے تعلقات استوار کئے جاتے ہیں۔ امیر اور دوسرے دور اندیش حکمرانوں نے محسوس کیا کہ امید افزا مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی ہم آہنگی قائم کی جائے۔ قدیم ہندوؤں کا فلسفہ اور عالمی نقطہ نظر حیرت انگیز طور پر بے تعصب اور روادارانہ تھا۔ پھر بھی ان میں سے ذات پات کے فرقے اور اعلیٰ طبقے پیدا ہو گئے۔ مسلمان ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوئے وہ یہ کہ دوسروں کے ساتھ مساوات کا اصول کس طرح برتا جائے۔ دوسرے ملکوں میں، جہاں مسلمان گئے تھے ان کو اتنی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی۔ کہ وہاں دراصل یہ سوال اٹھا ہی نہیں۔ عیسائی مذہب سے ان کا تصادم ہوا اور صدہا سال تک، یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں آہستہ آہستہ امتزاج پیدا ہوا مگر اس کی تکمیل سے قبل دوسرے اثرات نے کام شروع کر دیا۔ مغربی قومیں اپنی صنعتی ترقی اور طاقت کی وجہ سے اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھتی تھیں اور اپنے محکوموں کو ذلیل سمجھ کر الگ تھلگ رہتی تھیں، چنانچہ ان میں اور ہندوستانیوں میں اس سے کہیں زیادہ وسیع خلیج حائل تھی۔ جتنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی بھی تھی۔

اس کے باوجود مغرب کے نئے لبرل خیالات اور صنعتی طریقے کے اثرات ہندوستان کی زندگی اور ذہن پر پڑنے شروع ہوگئے۔ ایک نئے قسم کی قومیت وجود میں آئی جو ناگزیر طور پر نوآبادیت کے خلاف تھی اور آزادی چاہتی تھی۔ نئی صنعتی تہذیب، زبان، ادب اور مغربی طرز زندگی سے روز بروز زیادہ متاثر ہو رہی تھیں۔ یہ اثر زیادہ تر قوم کے اعلیٰ طبقہ تک ہی محدود رہا۔ جنتا کی بھاری اکثریت غربت اور افلاس میں اور زیادہ مبتلا ہو گئی۔

رام موہن رائے نے قدیم ہندوستان اور جدید رجحانات میں کسی قسم کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی، دیویکانند نے قدیم ہندوستانی فلسفہ کے جاندار نظریوں کو جدید لباس سے آراستہ کیا۔ سیاسی اور تہذیبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ جن کی تکمیل گاندھی جی اور رابندرناتھ ٹیگور کی شخصیتوں میں ہوئی۔

یورپ میں سائنس اور روائتی مذہب کے درمیان شدید کش مکش ہو چکی تھی۔ اور عیسائیت کا علم کائنات کے سائنسی نظریوں سے تطابق پیدا نہ کر سکا تھا۔ سائنس نے ہندوستان میں کسی قسم کی کش مکش پیدا نہیں کی۔ اور ہندوستانی فلسفہ آسانی کے ساتھ اپنے بنیادی تصورات کو نقصان پہونچائے بغیر اس کو قبول کر سکتا تھا۔ البتہ ہندوستان کے سماجی نظام اور جدید رجحانات کا تضاد روز بروز بڑھتا گیا۔

ہندوستان میں دوسری جگہوں کی طرح دو قوتیں ابھریں۔ قومیت کا نشو ونما اور سماجی انصاف کی خواہش، سوشلزم اور مارکسزم، سماجی انصاف کی اس خواہش کی علامت بن گئے۔ اور اپنے علمی مواد سے قطع نظر عوام کے لئے ان دونوں میں بڑی کشش اور جاذبیت ہے۔ مارکس بنیادی طور پر ان بھیانک حالات سے متاثر ہوا تھا۔ جو مغربی یورپ کی صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں عام تھے۔ اس زمانے میں کسی ریاست کا نظام حقیقی طور پر جمہوری نہیں تھا۔ اور قانونی طریقہ پر کسی قسم کی تبدیلی کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے انقلابی تشدد کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لہٰذا مارکسزم متشددانہ انقلاب کے نقطۂ نظر سے سوچنے پر مجبور تھا۔ یہ طریقہ یورپ کی روایت کے مطابق بھی تھا۔ لیکن اس وقت سے سیاسی جمہوریت کا دور شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے پرامن تبدیلی کے امکانات پیدا ہوگئے

آج کا اصل اختلاف

آج کل بین الاقوامی معاملات پر مغربی ممالک اور کمیونسٹ طاقتوں کی مخالفت چھائی ہوئی ہے۔ اور اس میں امریکہ کی متحدہ ریاستوں اور سوویت یونین کی رقابت خاص طور پر نمایاں ہے۔ تاہم ان بدیہی اختلافات کے باوجود ان دو بڑے ملکوں میں حیرت انگیز مماثلت بھی ہے۔ دونوں نے صنعتی اور مشینی تہذیب کو بہت ترقی دی ہے۔ دونوں کو مشین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پر بھروسہ ہے اور ان میں سے ہر قوم دوستانہ مزاج رکھتی ہے، مہمان نواز ہے۔ اور پرامن زندگی سے لگاؤ رکھتی ہے۔ اس وقت اصل اختلاف ترقی یافتہ ممالک اور ان ممالک میں ہے۔ جنھوں نے ابھی تک ترقی نہیں کی ہے ان کم ترقی یافتہ ملکوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ وہ صرف سائنسی اور صنعتی ترقی کے ذریعہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں یا اپنے شدید مادی امراض سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مقصد سے وہ اپنی جد وجہد میں لگے ہوئے ہیں، جس میں کسی کو کم اور کسی کو زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ بھی تھا۔ جس کی وجہ سے پیداوار میں جتنا بھی اضافہ ہوا سب کا سب صرف میں آتا رہا۔ اور وسائل کو محفوظ رکھنے یا مزید ترقی میں لگانے کے لئے بہت کم گنجائش رہ گئی۔ اس لئے بنیادی سوال یہ تھا کہ کسی غیر ترقی یافتہ یا مفلس ملک میں کاروبار میں لگانے اور پیداوار کو بڑھانے کے لئے کس طرح وسائل پیدا کئے جائیں۔ اس طرح کی ہر کوشش کا مطلب یہ تھا کہ عوام پر مزید بوجھ ڈالا جائے، اور یہی عوام اپنے موجودہ بوجھ کو ہلکا کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

جابرانہ طریقے اختیار کئے جا سکتے تھے۔ مگر معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جبر بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک اس کے ساتھ مستقبل کی امید وابستہ نہ ہو۔ اس لئے بنیادی طور پر زیادہ کوشش کے لئے کسی نہ کسی قسم کے محرک کی ضرورت تھی اور عوام کے سامنے ایسے مقاصد کو پیش کرنا تھا، جو قابل حصول ہوں جن سے ان میں مستقبل کے متعلق کوئی امید پیدا ہو۔ یہ مستقبل نظر سے بہت دور بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ جمہوری نظام میں ہر چیز کا دارو مدار ایسی امیدیں اور محرک پیش کرنے

صلاحیت پیدا ہوتا ہے۔ جس سے لوگ زیادہ محنت کرنے پر آمادہ ہوں اور جس سے ان کی مادی حالت بتدریج بہتر ہوتی رہے۔

ہندوستان

غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہندوستان کی حالت غالباً بہت سے ممالک کے مقابلے میں بہتر ہے۔ پچھلے چند برسوں میں صنعت کاری کی بنیاد کو مستحکم بنانے میں زراعت کو بہتر بنانے اور تعلیم اور صحت کے فروغ میں یقینی طور پر ترقی ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ہندوستان کو ان مقاصد اور منصوبوں اور اس نظم و ضبط سے فائدہ پہونچا۔ جسے آزادی دلانے والی قومی تحریک نے پیدا کیا تھا۔

قومیت کی جڑیں ایشیا میں اب بھی سب سے زیادہ مضبوط اور گہری ہیں۔ ایشیا میں قومیت کی نشوونما بالکل ظاہر ہے۔ مگر یورپ میں بھی یہ زیادہ ظاہر ہوتی رہی ہے۔ فاشزم اور نازیت کے تصور میں مہلک قسم کی قومیت پنہاں تھی۔

کمیونسٹ ملکوں میں بھی قومیت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ سوویت یونین میں بھی ایک بہت طاقتور قومیت کا عنصر موجود ہے۔

قومیت کا جذبہ ان ملکوں میں جو اب بھی غیروں کے ماتحت ہیں، لازمی طور پر جدوجہد کی شکل اختیار کرتا ہے۔ طاقتور اور آزاد ملکوں میں یہ قومیت کسی حد تک اقتدار کی توسیع کی طرف لے جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا زور مخالف رجحانات کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے

قومیت اور اتحاد میں تصادم

اس طرح آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے رجحانات جو یورپ اور دوسرے براعظموں میں نظر آتے ہیں اور جن کا مقصد قومی وحدوں کا اتفاق و اتحاد ہے۔ اور ان انتشار پیدا کرنے والی قوتوں کے درمیان جو قومیت کی روایتی شکل کی مثالیں ہیں۔ ایک تصادم ہو رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی اور بالخصوص وسائل آمد و رفت کی عظیم الشان ترقی، عظیم تر اتحاد پر زیادہ سے زیادہ مجبور کر رہی ہے اور دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی سمجھنا چاہیئے کہ سائنس جو جدید زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پیش کر رہی ہے، آخر میں فتح پائے گی۔ اصل خطرہ ان لڑائی جھگڑوں سے ہے جو قوم پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھیں کا نتیجہ عالمگیر جنگ، ہو سکتی ہے۔

ایسی جنگ کا امکان اس عداوت کی وجہ سے اور بھی بڑھ جاتا ہے جو دنیا کے ممتاز نظامہائے فکر (آئیڈیالوجی) کے درمیان ہے۔ دوسری طرف آئیڈیالوجی کی مفروضہ کشمکش کی تہہ میں دراصل ان بڑی قوموں کی باہمی سیاسی رقابت کام کر رہی ہے جو ایک دوسرے سے ڈرتی ہیں۔ کیمونسٹ اور غیر کیمونسٹ ممالک میں سطح نظر، معاشی نظریہ اور آزادی اور ریاست کے حدود اختیار کے بارے میں بنیادی اختلافات ہیں۔ ان اختلافات میں کسی قدر کمی آگئی ہے اور غالباً یہ کمی قائم رہے گی، اور دونوں کی درمیانی خلیج، جو بظاہر وسیع اور گہری ہوگئی ہے۔ کافی کم ہو جائے گی۔ انسانی زندگی میں محض آئیڈیالوجی کی وجہ سے تبدیلیاں نہیں ہو رہی ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی، سماجی اور معاشی ڈھانچوں کو مسلسل بدل رہی ہے۔ ہر چیز کا صرف اس کی شکل پر اثر پڑتا ہے۔ یہ بات ہمیں فن تعمیر میں نظر آتی ہے بعینہ سماجی زندگی کی تشکیل میں بھی ہوتا ہے۔ مقصد اور کام کی نوعیت کے لحاظ سے ڈھانچے کی ساخت

بدلتی رہتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جماعتی اداروں کے مصرف اور کام کو بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سماج کی شکل و صورت ان ہی کے مطابق بدلتی رہے۔ اس طرح اس دور جدید میں اہم اور انتہائی انقلابی محرک آئیڈیالوجی کوئی مخصوص تصورحیات نہیں ہے۔ بلکہ ٹکنالوجی کی ترقی ہے۔ جہاں ٹکنالوجی کی رفتار ترقی سست ہے۔ وہاں پرانا طرز زندگی قائم ہے۔

جمہوری سوسائٹی میں یعنی اس سوسائٹی میں جہاں بالغوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہے اور کسی نہ کسی قسم کی پارلیمنٹری حکومت قایم ہے مصرف اور کسی حد تک شکل کو بدلنے کے لئے ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم مروجہ طریقے اور اغراض پرست اس وقت تک تبدیلیوں کی مخالفت کرتے ہیں جب تک حالات سے مجبور نہ ہو جائیں "رائج طریقے" ہر قسم کی تبدیلی کا ہمیشہ مقابلہ کرتے ہیں، چاہے وہ مذہبی ہو چاہے معاشی یا سماجی۔

زندگی کیا ہے

زندگی نام ہے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا ہر سیاسی، معاشی اور سماجی نظام اپنا مخصوص ضابطہ رکھتا ہے مذہب کا اور سماجی رسم و رواج کا اپنا اپنا ضابطہ ہوتا ہے، ان سب میں ایک خاص قسم کا اخلاقی اور روحانی ضابطہ شامل ہوتا ہے جب مصرف اور شکل و صورت میں تبدیلی آتی ہے تو پرانے ضابطے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور بتدریج نئے ضابطے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جس تیزی سے ٹیکنالوجی میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ سے سماجی تبدیلی پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگئی ہے۔ اور برابر محسوس ہوتا رہتا ہے کہ حالات اور سماجی نظام کے درمیان مطابقت نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں زندگی نسبتاً سلجھی ہوئی اور قدرت سے زیادہ قریب تھی۔ اور معاملات پر یکسوئی سے غور کرنے کے لئے وقت ہوتا تھا۔ اب زندگی دن بدن پیچیدہ ہوتی جارہی ہے اور اطمینان سے سوچنا کم ہوتا جارہا ہے، اگر کبھی فراغت ہوتی ہے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیونکر استعمال کیا جائے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے اس کا یقینی طور پر امکان پیدا ہوگیا ہے کہ دنیا کے بیشتر معاشی مسائل کو حل کیا جائے۔ اور دنیا کے ہر شخص کو بالخصوص زندگی کی بنیادی ضروریات مہیا کی جائیں۔ یہ ترقی اعلیٰ معیار زندگی اور تہذیبی ترقی کی نئی راہیں نکالنے کی امیدیں پیدا کرتی ہے۔ فلاحی ریاست اور غیر طبقاتی سوسائٹی کا نصب العین آج صرف سوشلزم کے پیش نظر نہیں ہے۔ بلکہ سرمایہ دار ممالک نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔ اگرچہ دونوں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ اس طرح بنیادی مقاصد ایک دوسرے سے قریب آرہے ہیں۔ اور چاہے طریق کار میں اختلاف ہو۔ کوئی حقیقی تبدیلی جبراً پیدا نہیں کی جاسکتی۔ وہ رفتہ رفتہ عمل میں آتی ہے۔ ہر ملک کی زندگی کا خاص طور سے جس ملک کی تہذیب بہت پرانی ہو، اپنے ماضی سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس تعلق کو بالکل منقطع کر دیا جائے تو نقصان ہوتا ہے۔

جب یہ اصول ہماری خارجی دنیا میں کارفرما ہے۔ جس میں ہم اپنی زندگی گذارتے ہیں تو انسان کی داخلی زندگی میں اس کا لحاظ رکھنا اور ضروری ہے۔ یہ عام معلومات کی بات ہے کہ قبائلی اور کسی قدر غیر مہذب سوسائٹی میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ تبدیلی

کرنے سے مہلک نتائج نکلتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ ترقی یافتہ سوسائیٹیوں کو کم نقصان پہونچے لیکن موجودہ جبط دور آنے والے فلک پیمائی کے دور میں کسی کو کیا معلوم کہ کس قسم کی حیاتیاتی اور دوسری قسم کی تبدیلیاں ہوں گی۔

ہم میں سے بہت سے لوگ فرد کی نشوونما اور آزادی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ نظریاتی پس منظر اس عمل میں مددگار یا مزاحم ہوتا ہے۔ لیکن افراد کی قدر وقیمت کو ختم کرنے میں شاید سب سے بڑا عنصر مشینوں کا رواج اور یہ کوشش ہے کہ مشین انسان کے بغیر کام کرے

ٹکنالوجی کے اثرات

ہم کو ٹکنالوجی کی ان تیز رفتار تبدیلیوں کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔ خاص طور پر آج کل کے نوعمر مردوں اور عورتوں پر۔ والدین اور معلم اور سوشل ورکر ان اختلافات کی وجہ سے پریشان ہیں۔ جو نوجوان اور زیادہ عمر کے لوگوں کے مزاج میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ جن آداب کو معیار مانتے تھے۔ اس میں اب تسلیم نہیں کیا جاتا اور پرانے اخلاقی معیار بھی رد کئے جا رہے ہیں۔ اس انحراف کی انتہائی شکلوں میں جرم، نشے، تباہ کاری، شہوانیت کا میلان نظر آتا ہے۔

ممکن ہے کہ موجودہ حالات کے اس تجزیہ کو بہت زیادہ یاس انگیز سمجھا جائے، ہندوستان یا دنیا کے واقعات کے اثر سے میں مایوس نہیں ہو گیا ہوں، اور ایک عقیدہ کی بدولت، جس کا میں تجزیہ یا تشریح نہیں کر سکتا۔ مجھے مستقبل امید افزا نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ وہ کامیابی ہے جو مجھے افراط کے ساتھ نصیب ہوئی۔ سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ مجھے ہندوستانی قوم کی محبت کی عظیم الشان دولت ملی ہے۔ لیکن جب میں ہندوستان سے باہر گیا ہوں تب بھی ہر جگہ لوگوں نے خلوص کا برتاؤ کیا۔ میرا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اسی طرح مجھے اپنی ہندوستانی قوم سے بڑی محبت اور عقیدت ہو گئی ہے اور میں دوسرے ملک کے لوگوں کی عزت کرتا ہوں اور ان سے محبت کرتا ہوں۔

میرے خیال میں خوف غالباً سب سے بڑی برائی ہے۔ کیونکہ خوف سے کشاکش اور تشدد پیدا ہوتا ہے۔ تشدد اور تشدد کی طرح حق کے خلاف باتیں خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ہمارے مقدس کتابوں میں کہا گیا ہے کہ سب سے بڑا دین جو آدمی کو مل سکتی ہے ابھیہ دان یعنی خطرے سے خالی دل ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے دل میں خوف نہیں ہے وہ حالات کو صحیح زاویے سے دیکھتا ہے اور وہ اپنے ذہن اور عمل میں ایک قسم کی دیانت قایم رکھ سکتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ خوف دنیا پر چھایا ہوا ہے یہاں تک کہ سب سے بڑی اور سب سے طاقتور قومیں بھی اس سے متاثر ہیں۔ دولت اور طاقت خوف کو کم کرنے کے بجائے اس کو بڑھاتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بجز ایسے لوگوں کے جنھیں روحانی عظمت حاصل ہے خوف کے احساس سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم اس کو اپنا نصب العین بنا سکتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے عوام کے دلوں میں احساس خوف کو کم کر دیا۔

عالمی امن

بین الاقوامی مسائل میں آج سب سے بڑا مسئلہ عالمی امن کا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ان بڑے مسائل اور اختلاف کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو ہماری زندگی کا روگ بن گئے ہیں۔ ان کا حل کیا ہوگا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیئے، جنھیں اختیار کرنا ہے، اور جس راستے پر چل کر تلاش کرنا ہے، اکثر کہا جاتا ہے کہ یا تو جنگ کا راستہ اختیار کرنا ہے، جس میں قریب قریب مکمل تباہی ہے۔ یا ان مسائل کا کوئی پر امن حل ڈھونڈنا ہے اگر یہی دو صورتیں ہمارے سامنے ہیں تو یہ بات صاف ہے کہ ہمیں کونسا طریقہ اختیار کرنا ہے جب ہم ایک طریقہ اختیار کریں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر اس قول اور فعل سے پرہیز کیا جائے۔ جس سے دنیا کی کش کش بڑھتی ہے۔ ہمیں قطعی طور پر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ جنگ کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے گا۔ اس لئے کہ نہ اس میں کامیابی کی امید ہے اور نہ ان باتوں کی جو کامیابی سے حاصل ہوتی ہیں، جنگ کے خطرے پیدا کرنا اور پھر اس سے بچنے کی مشق کرنا بے عقلی کی دلیل ہے۔ چاہے ہمیں ایک دوسرے سے اختلاف ہو۔ مگر ہمیں غصے کے ساتھ تنقید کرنے اور ایک دوسرے کی مذمت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

عوام میں قوم پرستی کا موجود ہونا ایک صحت مند اور پسندیدہ حالت ہے۔ جب اس کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا رد عمل بہت شدید ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے بہت زیادہ قوت حاصل ہو جائے تو جارحانہ اور خود پرستانہ میلانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے کی قوم پرستی، غیر قوموں کی سامراجیت اور نسل پرستی کے خلاف ایک ردّ عمل ہے۔

نسل پرستی بہت سے ملکوں میں مختلف اعتبار سے اب بھی موجود ہے۔ مگر عام طور پر اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ صرف جنوبی افریقہ میں اسے سیاسی فلسفہ میں شامل کیا گیا ہے یہ ظاہر ہے کہ یہ ہیبت ناک عداوتوں کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ تسلط کی یہ بدترین شکل ہے اور اس سے لازمی طور پر بغض اور کینہ کے جذبات پیدا ہوں گے۔ یہ سمجھا کہ یہ نسلی کش کش تشدد کے طریقوں سے طے ہو جائے گی۔ بے بسی کی تعلیم دینا ہے جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے نتائج بہت مہلک ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی رائے عامہ نسل پرستی کے خلاف اتنی مضبوط ہو جائے کہ کوئی ملک، یا کوئی جماعت اس کی حمایت یا اس پر عمل کرنے کی جرات نہ کر سکے۔

سامراجیت یا استعمار پسندی کے لئے بھی چاہے اس کی جو شکل بھی ہو، آج دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اس سے کش کش پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے مقامات پر اب بھی یہ موجود ہے، اور اس کے فلسفے کا بہت سے ذہنوں پر اثر ہے۔ لیکن اس کی ساکھ اٹھ چکی ہے اور اس کی حیثیت ہر جگہ مدافعانہ ہے۔ اس لئے عالمی پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ نسل پرستی اور سامراجیت کو ختم کیا جائے۔

فوجی معاہدے اور سرد جنگ کی جا ہے پچھلے زمانے میں معقول وجوہ رہے ہوں، مگر آج کل ان سے بے چینی اور جنگ کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ ان سے ملکوں کی فطری ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور ان سے دنیا کی فضا خراب ہوتی ہے جب تک سرد جنگ جاری رہے گی، رواداری پیدا نہیں ہوگی۔ بجائے اس کے کہ پس ماندہ ملکوں کی نشوونما اور ان کے معیار کو بلند کرنے میں مدد کی جائے۔ فوجی مصلحتیں بیچ میں آجاتی ہیں، اور اکثر اوقات ایسے سیاسی نظام کو جو رجعت پرست ہے اور جسے عوام ناپسند کرتے

ہیں، سہارا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

یہ خیال کہ دنیا کی موجودہ تکلیفوں، کش مکش اور مشتعل جذبات کا علاج کسی ٹونے ٹوٹکے سے یا اچھی اچھی باتیں کہہ کر کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ البتہ ایسے اقدام کی ترغیب دلانا، جس سے کش مکش کم ہو اور رفتہ رفتہ جنگ کے امکان کو دور کردے، خالص حقیقت شناسی ہے دراصل اس نئے اقدام کا مطلب یہ ہے کہ معاملات کو نئی نظر سے دیکھا جائے، اور سیاسی اور معاشی پالیسی کو اس کے مطابق ڈھالا جائے۔ پنچ شیل یا پانچ اصول، جس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ اس نئی نظر کی مثال ہے۔ لیکن اس پنچ شیل میں جان اسی وقت آئیگی جب ذہنیت اور مزاج میں تبدیلی ہو اور انھیں ہم محض ایسے الفاظ کا کھیل نہ بنائیں جو اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ امن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ علاً جنگ نہ ہو۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ساری دنیا میں امن کی فضا پیدا کی جائے۔

ہندوستان نے بین الاقوامی معاملات میں اسی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں ہمیشہ کامیابی ہوئی ہے۔ بیرونی پالیسی کا انحصار بالآخر اندرونی حالات اور ترقیوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم عالمی معاملات میں موثر طریقے پر شریک ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اندرونی ترقی لازمی ہے۔ ظاہر ہے ہماری اپنی بہبودی کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔

تعلیم اس ترقی کی بنیاد ہے اور بنیادی تعلیم اور ٹکنیکل تعلیم کی اشاعت کی طرف اب بہت توجہ دی جارہی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ یہ تعداد ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تعداد بہت بڑی ہے۔ اور جب یہ نوجوان اسکول اور کالج سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں تو ان کی زندگی کا مطمح نظر بالکل نیا ہوتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر ہمارے سماجی طور طریقے بدل رہے ہیں۔

آبادی کا مسئلہ

آبادی بڑھنے کا جو مسئلہ ہے، اس کے دو پہلو ہیں جس پہلو کی ہمیں زیادہ فکر ہے، یہ ہے کہ ہماری معاشی زندگی میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ہمارا معیار زندگی کچھ بہتر نہیں ہو پاتا، چاہے ہم دوسرے حساب سے ترقی کررہے ہوں۔ اسی معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کی بے انداز بڑھتی ہوئی آبادی، دنیا کے وسائل اور صنعتی اشیاء کو ہیبت ناک تیزی کے ساتھ صرف کرتی جارہی ہے۔ اگر تمام دنیا وہی کرنے لگے، جو آج امریکہ کی متحدہ ریاستیں کررہی ہیں تو غالباً اس صدی کے اختتام تک دنیا کی تمام ضروری اشیاء جو آج میسر ہیں، صرف میں آجائیں گی۔ غالباً ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی اگر دوسرے ملکوں میں خرچ کی رفتار متحدہ ریاستوں کے مقابلے میں کم رہی تو موجودہ خام اشیاء چند صدیوں سے زیادہ کفایت نہ کرسکیں گی۔

اس طرح دو نتیجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ اضافۂ آبادی کی رفتار کو ضرور روکنا چاہیئے دوسرا یہ کہ کوئلہ پانی، تیل کے علاوہ مکان کی طاقت کے اور ذریعے اور وسائل معلوم کرنے چاہیں، ممکن ہے کہ اٹامک انرجی کی ترقی سے طاقت کے دوسرے وسائل فراہم ہوسکیں۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ فکر اس کی ہے کہ آبادی بے حساب نہ بڑھے، اب یہ مسئلہ صرف اہم نہیں ہے بلکہ اس کو طے کرنا اشد ضروری ہوگیا ہے۔

دو بنیادی باتیں

دو بنیادی باتیں ہیں جنھیں ہمیں اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ بعض قوموں میں صنعتی مال پیدا کرنے کی استعداد اور اس کی وجہ سے ان کی دولت اور طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرا مسئلہ وہ تفاوت ہے، جو ان مال دار اور طاقت ور ملکوں اور پس ماندہ قوموں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تفاوت بڑھ رہی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں اس میں کافی اضافہ ہوا ہے، ان کوششوں کے باوجود، جو پس ماندہ ملکوں میں معیار بڑھانے کے لئے کی گئی ہیں اگر معمولاً معاشی اور دوسرے ذرائع کو کام کرنے کا پورا موقع دیا جائے تو مالدار ملک اور مالدار اور طاقتور ہو جائیں گے اور پس ماندہ ملک خون پسینہ ایک کر کے اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکیں گے۔ کہا گیا ہے کہ جن کے پاس پہلے سے کچھ موجود ہے۔ انھیں کو اور دیا جائے گا۔ مختلف ملکوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ ہر ملک کے اندر، وہ حصے جو ترقی یافتہ ہیں، باقی حصے کے مقابلے میں زیادہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے درمیان کشاکش اور جنگ کے خطرے پیدا ہوتے ہیں، اور پس ماندہ ملکوں میں سماجی بے چینی بڑھتی ہے۔ ایک طرف طاقت اور دولت رقابت اور کشاکش کا سبب ہیں۔ دوسری طرف غربت اور فلاکت بھی الٹ پلٹ اور تصادم کا سبب بنتی ہے۔ دونوں کا نتیجہ خوف اور بے چینی ہے۔

یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ دنیا کی سماجی ترقی کا نقصان کر کے اسلحہ بندی پر بے حساب رقم صرف کی جائے گی، اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خوف اور جہالت کی فضا قایم رہے جبکہ مفاہمت کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ مفاہمت فوج کے ذریعہ پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے صرف خوف اور کھچاؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں کسی مخصوص ملک پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں، کیونکہ کسی نہ کسی حد تک تمام ممالک خوف کے چنگل میں گرفتار ہیں، اور اس گرفت سے اپنے کو بالکل چھڑا نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ دوسرے ملکوں سے ہمارے جو تعلقات ہیں، ان کی کیفیت کو بدل دیں۔

آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصلی ضرورت اس کا علم ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کیسے گزاریں۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فیض کیسے حاصل کریں۔ اب معاشی حکمت عملی کو محض قانون قدرت کی ایک تشریح نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس سے انسانیت کے مسائل اور اخلاقی قدروں کو کوئی تعلق نہیں۔

سرمایہ داری مناسب نہیں

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ وہ نظام جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے اور جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ وسائل پر قبضہ کرنا ہے، ہمارے زمانے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اب سے پہلے کسی دور کے لئے یہ مناسب رہا ہو اور اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری نے بہت فائدے پہونچائے ہیں۔ مگر دنیا اس منزل سے آگے نکل گئی ہے۔ اس دنیا کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں اور اس کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دروازہ سے دروازہ مل گیا ہے۔ اس لئے ہمیں بہتر نظام مرتب کرنا چاہیے جو جدید میلانات اور حالات کے مطابق ہو۔ اور جس میں مقابلہ

کا خیال نہ ہو بلکہ تعاون کے امکانات کو بہت زیادہ بڑھائے۔ اس کا آخری نتیجہ ایک عالمی ریاست ہونا چاہیئے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب آزادی کی ایسی فضا قائم ہو، جس میں ہر قوم کو اپنی مرضی کے مطابق، دوسروں کے معاملات میں مداخلت کئے بغیر ترقی کا موقع حاصل ہو۔

دنیا میں آج سب سے طاقتور جذبہ یہ ہے کہ سماجی انصاف اور مساوات قائم ہو پرانے جاگیردارانہ نظام کی بنیاد اس پر تھی کہ زمین پر صرف چند لوگوں کا قبضہ ہو اور بقیہ تعداد فوت ثابت پر زندگی بسر کرے آج اس نظام کا کوئی بھی حامی نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے اور نظام بھی آج رائج ہیں مگر جن کا دلوں پر اثر نہیں ہے اور جو لوگوں کے خیالات اور سائنس کی ترقی سے مناسبت نہیں رکھتے۔

جو مقصد ہم نے اپنے لئے مقرر کیا ہے اس کی وجہ سے لازمی ہو گیا ہے کہ ہم پلان بنا کر سائنٹیفک طریقہ پر کام کریں۔ تاکہ موجودہ وسائل کو بہترین طریقے پر استعمال کیا جائے۔ اور قومی محنت کو نصب العین حاصل کرنے میں لگایا جاسکے۔ یہ عجیب بات ہے سائنس کے اس دور میں اب بھی کچھ لوگ ہیں جو نجی کاروبار کے طریقے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں جس میں انفرادی نفع اندوزی کا مقصد حاوی ہو۔

میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہماری دیہاتی آبادی کے لئے امدادِ باہمی کے سوا اور کوئی ترقی کا راستہ نہیں ہے۔ ان کے لئے ملٹی پرپز سوسائٹیاں لازمی ہیں اور اسی کے ذریعہ سہکاری کھیتی کا سلسلہ قائم ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے لئے اجتماعی کھیتی موزوں نہیں ہوگی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ہمارے کسان ایک مشین کے گمنام پرزے ہو جائیں۔ جو حقیقت ہمیں نظر میں رکھنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ اس ملک کی آبادی بہت بڑی ہے اور اس نسبت سے زمین کم - ان مسائل پر جو بحثیں کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی ہو رہی ہے اور ہم صدیوں کے پرانے معاشی دستور کو چھوڑ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تصویر

ہندوستان آج ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں امید اور غم کے جذبات ملے جلے ہیں، جس میں ایک طرف نمایاں ترقی ہے اور اسی کے ساتھ جمود نظر آتا ہے ایک طرف ایک نئی روح ہے اور دوسری طرف ماضی کا اور مخصوص حقوق کا مردہ بوجھ، ہم گیر اور بڑھتا ہوا اتحاد اور بہت سے انتشار پسند رجحانات نیز عوام کے ذہن اور ان کی سرگرمیوں میں بڑی جان اور جوش ہے۔ ہم لوگ جو ان بدلتے ہوئے حالات میں گھرے ہوئے ہیں - جو کچھ ہو رہا ہے اس کی پوری پوری اہمیت محسوس نہیں کر رہے ہیں بسا اوقات باہر کے لوگ اس صورتِ حال کا بہتر اندازہ کر سکتے ہیں

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک ملک اور قدم جو اپنے ماضی کے تصورات کو مضبوط پکڑے ہوئے تھی اور جس نے اب تک تبدیلی کی اتنی سخت مخالفت کی ہے آج تیزی اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہی ہے چاہے ہمیں اس کا احساس نہ ہو - مگر ہم آج جو کچھ کر رہے ہیں، وہ یادگار رہے گا۔

موجودہ نسل کی اس محنت و مشقت اور جوش و ولولہ کا نتیجہ کس شکل میں نمودار ہوگا؟ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کل ہندوستان کی کیا صورت ہوگی میں صرف اپنی امیدوں اور خواہشات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ قدرتی طور پر میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان مادی سطح پر آگے بڑھے اپنے پنج سالہ منصوبے پورے کرے اور اپنی وسیع آبادی کا معیارِ زندگی بلند کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ مذہب یا ذات پات زبان اور صوبوں کے حقیر اختلافات

دن رہوں۔ اب ایسی سوسائیٹی کی تعمیر ہو، جس میں طبقوں اور ذات پات کی تفریق نہ ہو اور صلاحیت کے مطابق ترقی کرنے کا پورا موقع حاصل ہو خاص طور پر میں توقع کرتا ہوں کہ ذات پات کی لعنت دور ہو۔ کیوں کہ ذات پات کی بنیاد پر نہ تو جمہوریت کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ سوشلزم چار بڑے مذاہب نے ہندوستان کو متاثر کیا ہے۔ دو خود اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ ہندو مت اور بودھ مت اور دو باہر سے آئے۔ لیکن ہندوستان میں انھوں نے مضبوطی سے اپنے قدم جمالئے، یعنی عیسائیت اور اسلام ۔ سائنس آج مذہب کے پرانے تصور کو چیلنج کر رہی ہے لیکن اگر مذہب اپنے آپ کو عقائد اور رسم رواج تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان کا واسطہ زندگی کے اعلیٰ مسائل سے ہو تو نہ مذہب کا سائنس سے اختلاف ہوگا۔ اور نہ آپس میں جھگڑا ممکن ہے کہ ہندوستان کو یہ عزت حاصل ہو کہ امتزاج پیدا کرے۔ یہ ہندوستان کی اس قدیم روایت کے مطابق ہوگا۔ جو اشوک کے فرمانوں میں درج ہے، اشوک کے اس پیغام کو یاد رکھنا چاہیے۔

"روحانی طاقت کو بڑھانے کے مختلف طریقے ہیں۔ لیکن بنیاد یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان کی نگہداشت کرے تاکہ اپنے مذہب کی بہت زیادہ تعریف اور دوسرے کے مذہب کی مذمت سے بچے لاابالی پن سے بے موقع یا بے ضرورت اس کے متعلق بات نہ کرے"

"جب مناسب مواقع ہوں دوسرے مذاہب کے لوگوں کی بھی مناسب عزت کرنی چاہیئے ایسا کرنے میں انسان خود اپنے مذہب کی آبرو بڑھاتا اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کی مدد کرتا ہے اس کے برخلاف کرنے میں خود اپنے مذہب کو نقصان پہونچاتا ہے۔ اور دوسرے کے مذہب کے ساتھ بھی بدسلوکی کرتا ہے"

"وہ شخص جو اپنے مذہب کی عزت کرتا ہے اور اپنے مذہب سے محبت رکھنے کی وجہ سے اور دوسرے مذہبوں پر اس کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے دوسرے کے مذہبوں کی مذمت کرتا ہے وہ بے شک اپنے مذہب کو نقصان پہونچاتا ہے"

اشوک کے عہد میں مذہب ہر قسم کے عقیدے اور فرائض پر حاوی تھا۔ آج ہم مذہب پر اس قدر نہیں جھگڑتے جتنا سیاسی اور معاشی... معاملات اور مختلف نظام تصورات پر اختلاف کرتے ہیں، لیکن یہ مناسب ہوگا اگر ہم ان لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں جو سیاسیات یا معاشیات میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، اشوک کی نصیحت کے مطابق عمل کریں۔ اشوک کے ذہن میں سرد جنگ کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، کیا وجہ ہے کہ ہمارے ذہن بھی اس چیز سے پاک نہ ہوں۔

کل کا ہندوستان وہ ہوگا۔ جو آج کی محنت مشقت سے ہم اس کو بنائیں گے۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں صنعت اور دوسری چیزوں کو ترقی ہوگی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھے گا۔ ہمارے عوام کا معیار بلند ہوگا، تعلیم پھیلے گی صحت بہتر ہوگی اور آرٹ اور تہذیب سے عوام کی زندگیاں مالا مال ہوں گی۔ ہم اس راہ پر محکم عزم اور بلند ہمت کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں اور ہم منزل مقصود پر پہونچیں گے، چاہے اس میں جتنا بھی وقت لگے

لیکن جس چیز کی مجھے فکر ہے وہ صرف مادی ترقی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ملک کے لوگوں کی خوبی اور ان کی طبیعتوں کی گہرائی ہے۔ کیا اس وقت جب وہ صنعتی ترقی کے ذریعہ طاقت حاصل کریں گے تو کیا وہ انفرادی دولت اور عیش و آرام میں اپنے آپ کو بھول جائیں گے؟۔ یہ افسوسناک

بات ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے اِن قدروں کی تردید ہوگی، جن کی ہندوستان نے ماضی میں حمایت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں بھی گاندھی جی نے ایک مثال پیش کی ہے۔ طاقت ضروری ہے۔ لیکن معرفت اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ سچی بھلائی اسی طاقت میں ہے جس کے ساتھ معرفت بھی ہو۔

ہم میں سے ہر ایک حقوق اور رعایتوں کی باتیں اور مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن پرانے دھرم کی تعلیم فرائض اور ذمہ داریوں کی تعلیم بھی تھی فرائض انجام پا جانے کے بعد حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

کیا ہم سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے اور ذہن اور اخلاق کی ترقی کو ایک ساتھ حاصل کر سکتے ہیں؟ ہم سائنس سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ کیونکہ آجکل زندگی کی بنیادی حقیقت وہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ غلط ان بنیادی اصولوں سے منہ پھیرنا ہوگا، جن کی ہندوستان نے صدیوں سے اب تک نمائندگی کی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی تمام قوتوں اور جوش و ولولہ کے ساتھ صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہیئے کہ ایسی مادّی دولت جو بردباری اور دردمندی اور معرفت سے محروم ہو، وہ جل کر خاک ہو سکتی ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ "سعادت ان کا حصّہ ہے جو دل کو دل سے ملاتے ہیں"

سازوں کا شعور

"مجھے بتایا گیا ہے کہ اکثر ہندوستانی فلمیں "فن کاری" کی طرف غلطی سے بھی مائل نہیں ہوتیں۔ وہ یا تو مبہم قسم کے غنائیے ہوتے ہیں ورنہ میلو ڈراما۔ جو عام طور پر ہندوستانی تاریخ یا اساطیر کی کسی پرانی روایت سے اپنا تھیم چنتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وہ وہی کچھ بہم کرتی ہیں جو شہروں کے باشندوں کو زیادہ بھاتا ہے۔ ان بھونڈے اور تکلیف دِہ تماشوں اور اب تک زندہ لوک گیتوں، لوک ناچ بلکہ دیہاتی ڈراموں کی فن کاری کا تضاد بڑا نمایاں ہے۔ بنگال، گجرات اور جنوبی ہند میں آدمی پر کبھی کبھی بڑی حیرت سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ گاؤں کے رہنے والے بنیادی مگر غیر شعوری طور پر کتنے فن کار انہ ہیں۔ درمیانہ طبقے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں۔ اور اُن کے پاس ایسی کوئی جمالیاتی روایت نہیں جس سے وہ وابستہ ہو سکیں۔ وہ جرمنی اور آسٹریا میں بنائے ہوئے سستے اور گھناؤنے پرنٹوں کا چٹخارہ لیتے ہیں۔ ہارمونیم اُن کا من پسند ساز ہے۔ میں اس اُمید پر زندہ ہوں کہ سوراجی حکومت کے سب سے پہلے کاموں میں اس نفرت انگیز ساز پر پابندی لگانا بھی شامل ہوگا۔"

(خود نوشت سوانح عمری: ۱۹۴۴ء)

پریوں کی کہانی

پیارے بچو!

میں بچوں کے ساتھ رہنے، اُن کے ساتھ باتیں کرنے اور اس سے زیادہ ان کے ساتھ کھیلنے کو بڑا پسند کرتا ہوں، ایک لمحے کے لئے میں بھول جاتا ہوں کہ میں خطرناک حد تک بوڑھا ہو چکا ہوں، بڑی مدت گزر گئی ہے جب کہ میں خود بچہ تھا۔ لیکن جب میں تمہیں لکھنے بیٹھ جاتا ہوں، میں اپنی عمر کو نہیں بھول سکتا اور اُس فاصلے کو بھی نہیں جو مجھے تم سے الگ کئے ہوئے ہے۔ بوڑھوں کو عادت ہے کہ وہ نوجوانوں کو وعظ اور نصیحت پلاتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بہت پہلے جب میں ایک بچہ تھا تو اس بات کو بڑا ناپسند کرتا تھا۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ تم بھی اسے زیادہ پسند نہیں کرتے۔ بوڑھے لوگوں کو دانا بننے کی بھی بڑی عادت ہے۔ حالانکہ اُن میں بہت کم دانائی کے مالک ہوتے ہیں، ابھی اپنے بارے میں، میں کوئی صاف بات طے نہیں کر سکا ہوں۔ میں دانا ہوں یا نہیں ۔۔۔ کبھی کبھی، جب دوسروں کی باتیں سُنتا ہوں، تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بڑا اہم آدمی ہوں گا۔ لیکن جب اپنے آپ پر نظر پڑتی ہے۔ تو مجھے اس میں شک پیدا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ دانا ہوں وہ اپنی دانائی کا چرچا نہیں کرتے اور نہ اس طرح رہتے ہیں، جیسے وہ بڑے اہم لوگ ہوں۔

اس لئے مجھے تمہیں کوئی نصیحت اس بارے میں نہیں کرنی چاہیئے کہ تمہیں کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی بہت سی باتیں تمہارے اُستادوں اور دوسروں نے تمہیں بتائی ہیں، تو پھر میں کس چیز کے متعلق لکھوں؟ اگر تم میرے پاس ہوتے، تو میں تمہارے ساتھ اس سنسار کے بارے میں پیار سے باتیں کرتا۔ پھولوں، درختوں، پرندوں، جانوروں، ستاروں، پہاڑوں، گلیشروں اور تمام حیرت انگیز چیزوں کے متعلق جو اس دُنیا میں ہمارے ارد گرد پھیلی ہوتی ہیں، یہ تمام خوبصورتی ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے اور ہم لوگ، جو اپنے آپ کو بالغ کہتے ہیں، اس کو فراموش کر ڈالتے ہیں۔ اپنے دفتروں میں گم ہو جاتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ تم زیادہ عقلمند ہو گے اور ارد گرد کی زندگی۔ اس کے حسن کو آنکھوں سے دیکھو گے۔ کانوں سے سنو گے۔ کیا تم پھولوں کی پہچان اُن کے نام سے اور پرندوں کی پہچان اُن کی آواز سے کرتے ہو۔ ان کے ساتھ اور فطرت کی ہر چیز کے ساتھ دوستی کرنا کتنا آسان ہے۔ شرط یہ ہے کہ تم اُن کے پاس محبت اور دوستی کا جذبہ لے کر جاؤ۔ تم نے پرانے زمانے کے بہت سے قصے اور پریوں کی کہانیاں سُنی ہوں گی۔ لیکن ہماری یہ دُنیا تو خود پریوں کی سب کہانیوں کی سرتاج ہے۔ اور یہ مہم بازی کی سب سے بڑی داستان ہے جو لکھی گئی ہے

صرف ہماری آنکھوں میں دیکھنے اور کانوں میں سُننے کی حس ہونی چاہیئے، اور ایک ایسا دل ہونا چاہیئے جو دُنیا کی زندگی اور خوبصورتی کو جی بھر کے پیار کر سکے۔ ہم بڑی عمر کے لوگوں میں اپنے آپ کو خانوں اور گروہوں میں چھانٹی کرنے کی عجیب طاقت موجود ہے۔ وہ رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، اور پھر سمجھتے ہیں کہ اُن کی خاص رکاوٹ سے باہر جو لوگ ہیں۔ وہ اجنبی ہیں اور اُن سے نفرت کرنی چاہیئے۔ یہ چھانٹیاں مذہب کی ہیں، نسل کی ہیں، رنگ کی ہیں، جماعتوں کی ہیں، قوم کی ہیں، صوبے کی ہیں، زبان کی ہیں، رسم و رواج کی ہیں، امیری اور غریبی کی ہیں۔ اس طرح وہ اُن جیل خانوں میں رہتے ہیں، جو اُن کے اپنے بنائے ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے بچے چھانٹی کرنیوالی ان رکاوٹوں کے بارے میں کم ہی جانتے ہیں۔ وہ آپس میں کھیلتے یا کام کاج کرتے ہیں۔ اور جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں، تب اپنے بزرگوں سے ان رکاوٹوں کے بارے میں واقفیت پاتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس قسم کا بڑا بننے میں تمہیں بہت سا وقت لگے گا۔

ابھی حال ہی میں، میں امریکہ، کینیڈا اور ولائیت گیا تھا۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ دنیا کے دوسرے کنارے تک۔ میں نے وہاں کے بچوں کو اپنے یہاں کے بچوں جیسا ہی پایا اور اسی لئے اُن سے میں نے آسانی سے دوستی کی، اور جب بھی مجھے موقع ملتا، میں اُن کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے کھیلتا۔ یہ چیز مجھے بڑے بڑے لوگوں سے باتیں کرنے سے زیادہ دلچسپ لگی۔ کیونکہ بچے ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تو بڑے بوڑھے ہوتے ہیں، جنہیں بڑا ہونے کا خبط ہوتا ہے اور وہ بڑی کوشش سے اُس طرح رہتے ہیں۔

کچھ مہینے پہلے جاپان کے بچوں نے مجھے چٹھی لکھی اور ایک ہاتھی بھیجنے کے لئے کہا، میں نے اُنہیں بھارتی بچوں کی طرف سے ایک سندر سا ہاتھی بھیج دیا۔ یہ ہاتھی میسور سے آیا اور سمندر کے راستے جاپان پہونچ گیا۔ جب یہ ٹوکیو پہونچا تو ہزاروں بچے اِسے دیکھنے کے لئے آئے۔ اُن میں سے بہتوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ شاندار حیوان اس طرح سے اُن کے لئے ہندوستان کا ایک نشان بن گیا اور اُن کے اور ہندوستانی بچوں کے درمیان ایک ملانے والی کڑی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے اس تحفے سے جاپانی بچے کھلکھلا اُٹھے۔ اور اُنہیں ہندوستان کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اسی طرح ہمیں بھی دُنیا کے بارے میں بہت سے اور ملکوں کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر جگہ تمہاری طرح کے بچے سکول جاتے ہیں۔ کھیلتے ہیں۔ کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ لیکن ہمیشہ پھر دوست بن جاتے ہیں۔ تم اِن ملکوں کی کتھا اپنی کتابوں میں پڑھ سکتے ہو اور جب تم بڑے ہو جاؤ گے، تو تم میں سے بہت لوگ اُن کی سیر کریں گے۔ تم وہاں دوست بن کے جانا۔ اور تم دیکھو گے کہ دوست تمہارے استقبال کے لئے موجود ہیں۔

تم جانتے ہو کہ ہم میں ایک بہت بڑا آدمی تھا۔ اُس کا نام مہاتما گاندھی تھا۔ مگر ہم اُسکو پیار سے باپوجی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بڑے سمجھدار تھے۔ لیکن وہ اپنی سمجھداری کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے تھے۔ وہ بڑے سادہ اور بچوں جیسے گُن رکھتے تھے اور بچوں سے پیار کرتے تھے۔ وہ ہر آدمی کے مِتر تھے اور ہر آدمی، کسان، مزدور، امیر، غریب اُس کے پاس آتا اور وہاں دوستانہ خیر مقدم پاتا تھا۔ وہ ہندوستان کے سبھی لوگوں کے ہی دوست نہیں تھے، بلکہ باقی دُنیا کے لوگوں کے دوست بھی تھے۔ اُس نے ہمیں سکھایا کہ کسی سے نفرت نہ کرنی چاہیئے۔ ایک دوسرے سے لڑنا نہیں چاہیئے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنا چاہیئے اور اپنے ملک کی سیوا کے لئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملانا چاہیئے۔ اُس نے ہمیں

بھی سکھایا کہ کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیئے، اور دنیا کا سامنا سکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کرنا چاہیئے۔

ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور ہم سب لوگوں کو بہت سے کام کرنا ہے۔ اگر اُن میں سے ہر ایک اپنے حصّے کا کام کر ڈالے تو پھر بہت بڑی بات ہوگی اور ملک پھلے پھولے گا، آگے کی طرف تیزی سے جائیگا۔

میں نے اس چھٹی میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے کہ تم میرے سامنے تھے، اور میں نے اتنا لکھ ڈالا ہے۔ جتنا میرا ارادہ نہیں تھا۔

۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء

(ترجمہ: محمد یوسف ٹینگ)

میرا اعتقاد

ہم انسان میں اعتماد نہیں کھو سکتے۔ خدا سے ہم منکر ہو جائیں، تو ہو جائیں، لیکن انسان سے منکر ہو جانے کی صورت میں کیا اُمید باقی رہے گی۔ پھر کسی بات میں اعتقاد رکھنا اور یہ یقین رکھنا کہ بالآخر سچائی کی فتح ہوگی، مشکل ہے

جواہر لال نہرو

(دریافتِ ہند)

جواہر ریزے

(جواہر لال کی تحریروں اور تقریروں کا مختصر انتخاب)

۱۹۲۱ء

"سیاسیات میں مذہبی عناصر کے پیدا ہونے سے مجھے اکثر پریشانی ہوتی تھی، میں اذیت کا شکار رہتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے سیاست میں مذہبی عناصر کو جب بھی شامل کرنے کی کوشش ہوئی، مجھے یہ عمل اچھا نہیں لگا۔ میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ مولوی اور مولانا یا سوامی یا اس قسم کے دوسرے لوگ اپنے عام جلسوں میں جو کچھ کہتے، میں ان باتوں کو ملک کی بدنصیبی سے تعبیر کرتا۔ ان کے تمدن، قومی تاریخ اور ملکی اقتصادیات کا مطالعہ انتہائی گمراہ کن تھا، وہ تمدنی، تاریخی اور اقتصادی فکر میں مذہبی رنگ شامل کرتے تھے اور اس طرح فکر میں صفائی نہیں رہتی تھی۔ گاندھی جی جب یہ کہتے تھے کہ "رام راج کے سنہری دَور کو واپس آنا ہے" تو میں تلملا جاتا تھا۔ میں مخالفت نہیں کر سکتا تھا، لیکن مجھے اس بات سے تسکین ہوتی تھی کہ گاندھی جی کے ایسے اقوال اور الفاظ عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہیں، عوام ان الفاظ کے مفہوم سے واقف ہیں۔ گاندھی جی کی عظمت یہ تھی کہ وہ نہایت آسانی سے لوگوں کے مزاج اور دل تک پہنچ جاتے تھے۔

میں تحریک اور ستیہ گرہ کے اخلاقی پہلو کا دل دادہ تھا۔ عدم تشدد کا میں کبھی فرماں بردار نہ رہا اور نہ کبھی اسے ہمیشہ کے لئے تسلیم کیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عدم تشدد کے تصوّر میں آہستہ آہستہ مجھے بہت کشش محسوس ہونے لگی اور یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ ہم ہندوستانیوں کے لئے، اپنے مخصوص سماجی پس منظر اور روایتی رشتوں کے پیش نظر، عدم تشدد کی پالیسی سب سے عمدہ پالیسی ہے۔ سیاست کو رُوحانی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کا خیال مجھے بہت اچھا لگا۔ ایک عمدہ اختتام کے لئے ایک عمدہ ذریعہ بھی تو چاہیئے۔ رفتہ رفتہ میرے لئے یہ صرف ایک اہم اخلاقی نظریہ نہیں رہا بلکہ عملی سیاست کو

متحرک اور مستحکم بنانے کا ایک خوبصورت ذریعہ بن گیا۔ صرف اس لئے کہ عمدہ ذرائع نہ ہونے کا مطلب ہے کہ نہ صرف ایک غلط اختتام بلکہ اور بہت سی نئی اُلجھنوں اور مُشکلوں کا وجود۔ ایک قوم یا فرد کے لئے نہایت نامُناسب اور باعثِ شرم بات ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے ذرائع سامنے ہوں، یہ کیچڑ میں چلنے کے مترادف ہے۔ پھر کیسے کیچڑ میں لت پت ہونے سے بچایا جا سکتا ہے؟ ہم کس طرح تیز رفتار ہو سکتے ہیں اور وقار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں جب سر جُھکے ہوں یا رینگ رینگ کر چلنے کے عادی ہوں؟"

۱۹۲۷ء

"ایک لمحہ کے لئے کوئی اس فریب میں مُبتلا نہیں ہو سکتا کہ تنظیم برطانیہ کا کیا ہوگا۔ اگر ہند پر اس کا تسلّط قائم نہ رہے؟ پھر تو برطانیہ کی شہنشاہیت ختم ہو جائے گی۔ "British Empire - World" کی اصطلاح ٹوٹ جائے گی۔ مستقبل میں کیا ہوگا، اگر ہندوستان ایک بار آزاد ہو جائے؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ تو یقینی ہے کہ برطانیہ کی شہنشاہیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ اپنے مخصوص سرمایہ دارانہ اور شاہی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر، ہندوستان پر قابض رہنے کے لئے برطانوی حکومت سب کچھ کرتی ہے۔ اپنی ہر طاقت کا استعمال کرتی ہے۔ اس حکومت کی تمام خارجی پالیسیوں میں یہی بُنیادی حقیقت پوشیدہ ہے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا جذبہ ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ ہر پالیسی کا تعلق اس بُنیادی جذبے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حکومت ہندوستان پر اپنا تسلّط قائم رکھنے کے لئے ہر طرف سے کوشاں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کو نقصان ہوا ہے اور نقصان ہو رہا ہے۔ بات اسی منزل پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا اثر دوسروں پر بھی ہو رہا ہے۔ دوسرے ممالک بھی، ہندوستان کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں، اذیّت برداشت کر رہے ہیں۔ برطانوی حکومت کی آمرانہ حرکت کی یہ مثال آپ کے سامنے ہے کہ ہندوستانی فوجیوں کو چین بھیج دیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اس کی سخت مخالفت کی۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ہم سبھوں کے لئے شرم کی بات ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانی فوجیں دوسروں کو کُچلنے کے لئے اکثر استعمال کی گئی ہیں۔ میں بہت سے ممالک کے نام بتاؤں گا جہاں انگریزوں نے ہندوستانی فوجوں کو اس مقصد کے لئے بھیجا ہے۔ سب سے پہلے ہندوستانی فوج ۱۸۴۰ء میں چین بھیجی گئی اور اب ۱۹۲۷ء تک وہ بھیجی جا رہی ہیں۔ اتنے عرصے میں تین بار ہندوستانی فوجیوں کو استعمال کیا گیا اور ان کی تعداد اَن گنت

ہے۔ مصر، ابی سینیا، میسوپوٹامیا، عرب، اسرائیل، جورجیا، تبت، افغانستان اور برما میں ہندوستانی فوجیں جاتی رہی ہیں۔ یہ ایک دہشت ناک فہرست ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا عمل ہندوستان کے لئے ناقابل برداشت ہے، یہ صرف اس لئے نہیں کہ آزادی اچھی چیز ہے اور غلامی لعنت ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ ہمارے ملک اور ہماری قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے ...... ہندوستان کی آزادی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

۱۹۲۷ء

"میں صحت مند ذہن اور صحت مند جسم کے ساتھ یورپ سے لوٹ رہا تھا۔ میرے نظریوں میں وسعتیں تھیں اور نیشنل ازم ایک محدود اور غیر تشفی بخش عقیدہ نظر آ رہا تھا۔

سیاسی آزادی اور غلامی سے نجات بلاشبہ ضروری تھی۔ لیکن یہ صرف صحیح راستے کی جانب قدم تھے، سماجی آزادی اور ملک کے ایک سوشلسٹ ڈھانچے کے بغیر ملک اور فرد کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہ میرا بنیادی نظریہ تھا۔ میں نے امریکہ اور یورپ میں سیاسی اقتصادی اور ثقافتی تبدیلیوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا۔ یہ تیزی سے بدلتی ہوئی قدریں مجھے شدید طور پر متاثر کر رہی تھیں۔ سوویت روس ساری دنیا کے لئے امید کا ایک پیغام تھا۔ یورپ میں بھی بڑی حد تک استحکام پیدا ہو گیا تھا لیکن ایک اہم اور بڑے زوال کی امید بھی تھی۔ میں اس عقیدے کے ساتھ واپس آیا کہ یہ استحکام مصنوعی ہے اور عظیم اور اہم تبدیلیاں ہوں گی؛ یورپ اور ساری دنیا میں اس کا رنگ روپ نظر آئے گا۔

اپنے ملک کو ان بنیادی حادثات کے لئے تیار رکھنے اور جس حد تک ممکن ہو ان کا مقابلہ کے لئے مضبوط بنانے کی ضرورت تھی۔ یہ پہلا اہم کام تھا۔ یہ تیاری بڑی حد تک نظریاتی تھی۔ سب سے پہلے سیاسی آزادی کے مقاصد کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ سیاسی آزادی منزل ہے اور سیاسی آزادی حاصل کرنا مقصد۔ یہ چیز Dominion Status سے مختلف ہے۔ پھر ایک سماجی منزل ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت، کانگرس سے اس منزل کی طرف جانے کی زیادہ توقع رکھنا مناسب نہیں ہے۔ کانگرس ایک مکمل سیاسی اور قومی جماعت ہے جو اس منزل کے بارے میں زیادہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ اس جماعت کے ذریعہ سماجی منزل کے راستوں کو دکھایا جا سکتا ہے۔ کانگرس سے باہر مزدوروں کے طبقہ اور جوانوں کے طبقہ میں اس خیال کو کافی فروغ دیا جا سکتا ہے۔"

۱۹۲۹ء

"آج ساری دُنیا ایک عظیم سوالیہ نشان بن گئی ہے اور ہر فرد اور ہر مُلک گُھٹن کا شکار ہے۔ یقین اور اعتماد کا دورِ ماضی بن چکا ہے اور تشکیک نے جنم لے لیا ہے۔ ہر بات کے لئے معلوم نہیں کتنے سوالات سامنے ہیں۔ وہ قدریں، جو بزرگوں کے لئے مُستقل اور مقدّس تھیں، آج سوالات کا نشانہ بن رہی ہیں۔ ہر طرف تشکیک کی لہریں ہیں اور ایک بے اطمینانی ہے جو پھیلی ہوئی ہے۔ سماجی زندگی اور مُلک کی قومی زندگی میں تغیرات ہو رہے ہیں۔ قدیم آزادی، انصاف، وراثت اور خاندان کے مُستقل نظریات بدل رہے ہیں۔ ان کی جگہ نئے خیالات آرہے ہیں۔ پُرانے نظریوں پر شدید ضرب پڑ رہی ہے۔

یُورپی تسلّط کی بُنیادیں ہل رہی ہیں۔ یُوروپی حکومت اپنی آخری منزل پر ہے۔ یُورپ، جو عمل اور دلچسپی کا مرکز تھا، آہستہ آہستہ مرکزی حیثیت کو کھو رہا ہے۔ اب امریکہ اور ایشیا کا مستقبل روشن ہے۔ انسان کا مستقبل امریکہ اور ایشیا میں روشن نظر آ رہا ہے۔ غلط اور بے بُنیاد تاریخوں کو پڑھ کر ہم میں سے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یُورپ نے ساری دُنیا پر ہمیشہ حکومت کی ہے اور ایشیا نے مغربی فوجوں کو اپنے راستوں سے ہمیشہ گزرنے دیا ہے اور خُود اپنے خیالات اور افکار میں ڈُوبا رہا۔ ہم یہ بھول گئے کہ ایشیا کی فوجوں نے ہزاروں سال تک یُورپ کو اپنے قبضے میں رکھا اور جدید یُورپ میں ایشیائی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ وہ لوگ، جن کے آباؤ اجداد نے یُورپ پر حکومت کی ہے۔ ہم یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ وہ ہندوستان ہی تھا جس نے سکندر کی فوجی طاقت کو ختم کیا تھا۔ تفکّر بلاشبہ ایشیا اور خاص طور پر ہندوستان کی رُوح ہے۔ ہندوستان اور ایشیا کی عظمت کی یہ پہچان ہے کہ فکر اور تفکّر نے ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، لیکن عملی زندگی میں بھی ایشیا ہمیشہ عظیم رہا ہے اس کے باوجود ہم میں سے کسی کی بھی یہ خواہش نہیں ہے کہ ایشیا یا یُورپ کی فوجیں برّاعظموں کو روندیں۔ ان میں سے کافی ہمارے پاس ہیں۔ ہندوستان آج دُنیا کی تحریک کا ایک حصّہ ہے، صرف چین، ترکی، فارس اور مصر ہی نہیں بلکہ روس اور مغربی ممالک اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں اور ہندوستان اپنے آپ کو اس تحریک سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔

آج کی تہذیب کسی فرد یا قوم کی پیدا کردہ یا اس کی وراثت نہیں ہے، یہ ایک مکمل علامت ہے، سارے ممالک کی عملی جد و جہد اور پائندہ قدروں کی۔ ہر مُلک نے تہذیب کی تشکیل میں نُمایاں حصہ لیا ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق اسے اپنایا ہے۔ آج جب کہ ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں،

تغیرات ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کے تسلسل اور لمبے سفر کو بھی یاد رکھنا ہوگا۔"

۱۹۵۵ء

"ہم کچھ ایسے رسم و رواج کے پھندے میں پھنس گئے جن سے دوسرے ممالک کے لوگ نہ آگاہ ہیں اور نہ آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ذات پات کا بھید ہندوستان کی عجیب و غریب پیداوار ہے۔ چھوت چھات دوسروں کے ساتھ کھانے پر اعتراض یا دوسروں کے ہاں شادی نہ کرنا ——— یہ باتیں غیر ممالک کے لوگوں کے لئے عجیب ہیں۔ وہ ان تنگ اور محدود نظریات کو نہیں سمجھ سکتے۔ آج بھی ہندوستانی دوسروں کے ساتھ گھُل مل نہیں سکتے۔ گھُلتے مِلتے ہوئے انہیں مُشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ہر ذات کے لوگ دوسرے مُلکوں میں جا کر بھی الگ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے نظریات کتنے تنگ اور محدود ہیں۔ دوسرے مُلکوں کے لوگ ایسی باتیں حیرت سے سُنتے اور ایسے عمل کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔

اس طرح ہندوستان میں ہم نے خیالات اور نظریات کو محدود کر لیا ہے۔ ہم تنگ قسم کے سماجی برتاؤ کے عادی بن گئے ہیں۔ یہ گندی چیز ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ ہم آج بھی اس کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں عجیب بات ہے کہ ہم اپنی ناکامیوں اور تنگ نظریوں اور رسم و رواج اور عادتوں کو آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم عموماً ان کے لئے اپنے بزرگوں کے اعلیٰ اور مقدّس خیالات کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ ان اعلیٰ اور مقدّس خیالوں اور ہماری کمزوریوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہم جب تک ان عناصر کے خلاف جدوجہد نہیں کریں گے، تباہی جاری رہے گی۔

جیسے جیسے سیاست اور اقتصادیات نے کروٹیں لی ہیں، یہ جھگڑے اور زیادہ نمایاں ہوتے گئے ہیں ہم ایٹمی دَور کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ہمیں اس خانگی جھگڑے کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس میں ناکامی کا مطلب ہے پوری قوم کی ناکامی اور اُن مواقع کا نقصان، جو ہم نے حاصل کئے ہیں۔

ہندوستان میں جہاں دوسری سیاسی اور اقتصادی مُشکلوں کا مقابلہ کرنا ہے وہاں اس کمزوری کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ صنعتی انقلاب ہندوستان میں تیزی سے آ رہا ہے اور ہمیں تبدیلیوں کا احساس ہو رہا ہے۔ کئی پہلوؤں کو دیکھنا ہوگا۔ اس انقلاب سے ہماری زندگی کا ہر پہلو متاثر ہو رہا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی انقلاب کا انجام اچھا ہوگا۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم ایک قوم بن کر رہیں تو

کونسا مذہب؟

فرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کسی اور چیز سے پہلے ایک مذہبی ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ اپنے مذاہب پر ناز کرتے ہیں، اور ان کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنے سر پھوڑتے ہیں.... جس چیز کو مذہب یا منظم اعتقاد کا نام دیا جاتا ہے ہندوستان میں اس کے نظارے دیکھ کر مجھے دہشت ہوتی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی مذمت کی ہے اور چاہا ہے کہ اس کا صفایا کر ڈالوں۔ تقریباً ہمیشہ یہ اندھے یقین اور رجعت پسندی کے جامد تصورات اور تعصب، توہم اور استحصال، اور مفادِ خصوصی کے استحکام کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ اس میں کوئی اور چیز بھی شامل تھی، ایک ایسی چیز جو انسانی دل کی کسی اندرونی پیاس کو تسکین بخشتی تھی، اور کس حیثیت سے اس پائے کی طاقت ور سے بن سکتی تھی یا اور کس طرح سے یہ بے شمار گھائل روحوں کے لئے آشتی اور آرام کا باعث بن سکتی تھی؟.... مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس طریقے سے کوئی جائے پناہ نہیں ڈھونڈھ سکتا.... میں کھلے سمندر کو اس کے تمام طوفانوں اور طغیانیوں کے سمیت ترجیح دیتا ہوں۔ میں زندگی بعد موت میں بھی زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا.... میرے خیال میں اس زندگی کے مسائل اس قدر جاذب توجہ ہیں کہ کسی اور چیز کی طرف راغب ہونے کی فرصت نہیں ہے۔

(خود نوشت سوانح عمری: ۱۹۳۳ء)

میں اور میرے لوگ

ایک ہیرو کی حیثیت سے میری شہرت بالکل بے بنیاد ہے۔ مصنوعی طور پر ہیرو بننے کی کوشش کرنا، اور ڈرامائی قسم کی حرکات مجھے بڑی بُری لگتی ہیں۔ جہاں تک رومانس کا تعلق ہے۔ میں اپنے آپ کو انسانوں میں سب سے کم رومانٹک سمجھتا ہوں، یہ صحیح ہے کہ میں کسی قدر ذہنی اور جسمانی حوصلہ رکھتا ہوں۔ لیکن شاید اس کا پس منظر جذبۂ افتخار ہے۔ ذاتی، اجتماعی یا قومی جذبۂ حمیت۔ جس میں کسی جبر کے آگے سر خم نہ کرنے کا جذبہ بھی شامل ہے"....

کل ملا کر دیکھا جائے تو عوامی اجتماعات نے میرے اندر کسی چیز کو تسکین دی تھی —— اس احساس نے کہ میں انہیں متاثر کر سکتا ہوں اور انہیں عمل پر ابھار سکتا ہوں، ان کے دل و دماغ پر ایک طاقت بخشی۔ اور کسی حد تک اس سے میرے جذبۂ اقتدار کو تسلی ہوئی۔ جہاں تک ان کے اثر کا تعلق ہے، مجھ پر ان کا بڑا ہی عجیب تاثر حاوی رہا۔ اس لئے کہ ان کے اعتماد اور محبت نے میری روح کی گہرائیوں کو مرتعش کیا اور میری طرف سے جذباتی ردِ عمل پیدا کیا۔

"خود نوشت سرگذشت"

شیرازہ جولائی ۱۹۶۴ء

حقیقتِ انقلاب

"ذاتی طور پر میں افلاس اور مصیبتوں کی سراہنا سخت ناپسند کرتا ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں اور انہیں ختم کرنا چاہیئے۔ میں تپسیا کی زندگی کو ایک سماجی نصب العین کی حیثیت سے ناپسند کرتا ہوں، گو ممکن ہے کہ یہ کسی خاص فرد کو راس آئے۔ میں جن چیزوں کو سمجھتا اور پسند کرتا ہوں، وہ ہیں، سادگی، برابری، خود ضبطی، لیکن خود آزاری نہیں۔

میں کسان کی سادہ زندگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا بھی دلدادہ نہیں ہوں اس بے چارے آدمی کو منزل بنلنے کی تک کیا ہے۔ بے شمار صدیوں سے اسے کچلا اور لوٹا گیا ہے۔ اور اُن جانوروں سے بہت کم اچھی حالت میں ہے۔ جن کے ساتھ اُس کی رفاقت ہے موجودہ ذہن سے قدیم حالت کی طرف عود کرنے کی آرزو مجھے بڑی بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اُن ہی چیزوں کی حقارت اور حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ جو انسان کی شان اور اُسکی کامرانیاں ہیں۔ اور اُس مادی فضا کی توصیف کی جاتی ہے۔ جو ذہن کا دم گھٹا دے اور اس کی نشو و نما کو روک دے... موجودہ تہذیب، علتوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ اچھائیوں سے بھی بھرپور ہے اور اس میں علتوں سے چھٹکارا پانے کی صلاحیت ضرور موجود ہے۔ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے اکھاڑ پھینکنے کے معنی اس صلاحیت کو ختم کرنے اور ایک بے کیف، سورج کی روشنی سے محروم اور المناک زندگی کی طرف لوٹنے کے ہیں۔ لیکن مان لیجیے کہ ایسا ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ناممکن ہے۔ ہم انقلاب کے دریا کو روک نہیں سکتے اور نہ اپنے آپ کو اس کے دھارے سے الگ کر سکتے ہیں اور نفسیاتی طور ہم جنہوں نے باغِ عدن کے سیب کو چکھا ہے۔ اُس کے ذائقے کو بھول نہیں سکتے۔ اور رجعت کی طرف نہیں جا سکتے

(خود نوشت سوانح عمری)

سوشلزم کیوں؟

میں اس بات کا پوری طرح قائل ہوں کہ دُنیا اور ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے کی کلید سوشلزم میں پوشیدہ ہے، اور جب میں اس اصطلاح کو استعمال کرتا ہوں تو میں اسے ایک مبہم انسانیت نواز مفہوم میں استعمال نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ سائینسی اور اقتصادی معنوں میں سوشلزم صرف ایک اقتصادی نظریے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ زندگی کا ایک فلسفہ ہے اور اس حیثیت سے مجھے بھاتا ہے۔ میں ہندوستانی عوام کی غربت، وسیع بے روزگاری، ذلت اور غلامی کے خاتمے کے لئے سوشلزم کے علاوہ اور کسی بہتر نتیجے کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمارے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے میں وسیع اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے — صنعتوں اور زمینداری میں مفادِ خصوصی کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی راجواڑہ شاہی کے جاگیرداری اور شخصی نظام کو

ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب شخصی جائیداد کا خاتمہ (کچھ محدود صورتوں کے بغیر) اور نفع اندوزی کے موجودہ نظام کو امداد باہمی کے اونچے آدرش سے بدلنے کی ضرورت ہے"۔

(لکھنؤ کانگریس سیشن کا صدارتی خطبہ)

... ہندوستان ہمارا

ہم کسی ادنیٰ ملک کے شہری نہیں ہیں۔ اور ہم اپنی جنم بھومی اپنے عوام، اپنے تمدن اور اپنی روایات پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ فخر ایک روحانی انا نہیں ہونی چاہیئے۔ جس کو ہم سینے سے لگائے بیٹھے رہیں۔ نہ اس سے علیحدگی پر ہماری راہ سے مختلف راہوں کے متعلق غلط فہمی کے رجحانات کو ترویج ملنی چاہیئے۔ اس کی بنا پر ہمیں اپنی بہت سی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بھولنا نہیں چاہیئے اور نہ ان سے چھٹکارا پانے کی خواہش کو ترک کرنا چاہیئے۔ اس سے قبل کہ ہم انسانی تہذیب اور ترقی کی گاڑی میں دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر پیش قدمی کریں۔ ہمیں بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں۔ اور ہمیں جلدی کرنا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس بہت کم وقت ہے اور دنیا کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ماضی میں دوسرے تمدنوں کا خیر مقدم کرنا اور انہیں جذب کرنا ہندوستان کا شعار تھا۔ آج اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم ایک ایسی دنیا کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں۔ جہاں قومی تمدن نوعِ آدم کے بین الاقوامی تمدن کے دھارے میں مل کر ایک ہو جائیں گے"

(دریافت ہند ۱۹۴۵ء)

فرقہ دارانہ رواداری

اگر ہم ہوشیار نہ رہے اور ہم نے بروقت اقدام نہ کئے، تو فرقہ داری کا زہر، جس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے، ہماری آزادی کو لے ڈوبے گا۔ اسی خطرے کا الارم دینے کے لئے گاندھی جی نے اپنا آخری برت رکھا۔ ان کی خود تقلیبی نے قوم کے ضمیر کو جگایا اور ہم نے ان کے آگے یہ عہد کیا کہ ہم اب اپنے طور طریقے سدھاریں گے۔

جمہوریت ضبط و نظم، تحمل اور باہمی احترام کا تقاضہ کرتی ہے۔ آزادی دوسروں کی آزادی کی عزت کی مانگ کرتی ہے۔ جمہوریت میں تبدیلیاں، بحث و مباحثے اور ایک دوسرے کو قائل کر لینے سے ممکن ہوتی ہیں۔ تشدد کے طریقوں سے نہیں۔ اگر کسی حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں، تو دوسری حکومت قائم ہوتی ہے۔ جس کو عوام کی تائید حاصل ہو۔ یہ صرف بعض چھوٹے چھوٹے گروہ ہوتے ہیں۔ جو تشدد کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انہیں عوام کی حمایت نہیں ملے گی۔ انہیں یہ خبط ہو جاتا ہے کہ ایسے طریقے استعمال کر کے وہ اپنے مقصد پا لیں گے۔ یہ صرف بالکل غلط ہی نہیں بلکہ بالکل احمقانہ بھی ہے

یہ بڑا المیہ اس لئے ہوا ہے، کہ بعض لوگوں، جن میں سے چند ایک بڑی بڑی جگہوں پر فائز ہیں نے ہمارے اس ملک کی فضا زہر آلود کردی ہے۔ ہماری حکومت اور عوام دونوں کا فرض ہے کہ وہ اس زہر کو ختم کریں۔ ہمیں یہ سبق بڑی ڈراؤنی قیمت دیکر ملا ہے۔ کیا ہم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے۔ جو گاندھی جی کی موت کے بعد اس مشن کو پورا کرنے کے لئے پیمان نہ باندھے گا۔ ایک ایسا مشن جس کے لئے ہمارے ملک کے سب سے بڑے آدمی، دنیا کے سب سے بڑے آدمی نے اپنی جان نچھاور کردی۔

(فروری ۱۹۴۸ء)

دُنیا ایک ہے!

تاریخ، جیسا کہ ایک مشہور مصنف نے اس کی تعریف کی ہے، انسان کی شہادت کی تفصیل ہے، شاید ایسا ہی ہو، لیکن یہ ہر تقلیب کے بعد ایک نیا رستہ خیز بھی ہے۔ اور اسی لئے ان اوراق میں آدمی کی شہادت اور تقلیب اور پھر ایک نئے ہنگامہ نشور کا مسلسل عمل دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ "تاریخ" کو انسانیت کی پیش رفت اور انسانی روح کی پرواز سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ہم یہ دیکھ کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ پیش قدمی کس طرح اچانک روک دی جاتی ہے اور پیچھے کی طرف دھکیلی جاتی ہے۔

اور ہاں! ہر زمانہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ تبدیلی کا عارضی زمانہ ہے۔ لیکن یہ کہنا حقیقت سے بہت قریب ہے کہ جس زمانے میں ہم زندہ ہیں۔ وہ خاص طور تغیر اور انقلاب کا زمانہ ہے۔ کم سے کم جن مسائل کا ہمیں سامنا ہے وہ اور مسائل کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑے اور شدید معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ ان مسائل کی نوعیت اب بہت وسیع ہے، بلکہ یہ بھی کہ ہر مسئلہ اب عالمی مسئلہ بن جاتا ہے۔ ان دنوں یہ سوچنا بالکل ناممکن ہے کہ رونما ہونے والے واقعات اور حالیہ تاریخ کو صرف کسی ایک قوم یا خطے کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے۔ آج تو لازمی طور پر دنیا کو ایک اکائی سمجھ کر کام کرنا ہے۔

(دسمبر ۱۹۴۸ء)

لوگوں کے درمیان رہیئے!

جو شخص ایک دفتر میں اونگھتے بیٹھتا ہے۔ وہ غیر متحرک اور ایک بے جان چیز بن جاتا ہے۔ میں یہ اعتراف کروں کہ میں کیوں ہمیشہ نئی دہلی سے بھاگ کر ادھر اُدھر پھرتا رہتا ہوں۔ میں کاغذوں، فائلوں اور روشنائی کی بے جان فضا سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں جس میں بیٹھ کر آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ ہندوستان میں انسان بھی رہتے ہیں۔ ہم اعداد و شمار پر غور کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اعداد و شمار انسان نہیں ہیں۔ وہ تو صرف اس بات کا ایک اشارہ ہیں کہ انسان کیا ہیں۔ لوصاحب اسی لئے میں باہر جاتا ہوں اور اپنے لوگوں کے چہرے دیکھتا

ہوں اور اُن سے فیضان حاصل کرتا ہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ حرکت اور نشو و نما کا عجیب احساس میں اُن کے ساتھ بڑھتا ہوں اور اُن کے انداز میں ڈھل جاتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ میں کسی حد تک اُن کی زندگی کے طریقے پر بھی تھوڑا اثر ڈالتا ہوں۔ آپ کسی بھی حیثیت سے کام کرتے ہوں، میرا خیال ہے کہ جب تک آپ لوگوں کے درمیان نہیں رہیں گے۔ آپ زوال پذیر ہو جائیں گے۔

(۱۷ نومبر ۱۹۵۲ء)

مُلکی ایکتا

ہندوستان میں سب سے پہلی لازمی بات یہ ہے کہ ملک کی وحدت کو برقرار رکھا جائے۔ صرف اس کی سیاسی وحدت کو نہیں بلکہ دل اور دماغ کی وحدت کو جو ناچاقی کے تنگ نظریوں پر حاوی ہو۔ مذہب، زبان یا صوبہ پرستی کے نام پر کھڑا کی جانیوالی رکاوٹوں کو نظرانداز کر کے یہ وحدت قائم ہو سکتی ہے۔ ہمارا اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ اب بڑا فرسودہ ہو گیا ہے۔ اور ضروری بن گیا ہے۔ کہ اسے نئے سرے سے تشکیل دی جائے تاکہ وہ مادی اور روحانی سمتوں میں ہمارے لوگوں کی مسرت کا باعث بنے۔ ہمیں ارادہ کر کے ایک ایسے سماجی فلسفے کو تعمیر کرنا ہے۔ جو اس ڈھانچے کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ ایک ایسا سماج تعمیر کرے۔ جس میں ذاتی نفع کا لالچ بالادستی حاصل نہ کرے۔ اور جس میں اقتصادی اور سیاسی اقتدار کی منصفانہ تقسیم ہو۔ اِن مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں جمہوری طریقے سے پُرامن ذرائع کو استعمال میں لانا ہے

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

بھاڑ میں جائیں ایسے لوگ

وہ آدمی بھاڑ میں جائے جو تیز تیز نہ چل سکے۔ اگر وہ پیچھے رہ جاتا اور روندا جاتا ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ ہم کاہل اور سست لوگ نہیں چاہتے۔ ہم وُہ پست ذہنیت رکھنے والے لوگ نہیں چاہتے جو اپنی ملازمتوں کو بہتر بنانے اور تبادلے وغیرہ کی بات کرتے رہتے ہیں۔ میں ایسی شکایات سے عاجز آگیا ہوں۔ نوکری کے مسائل، تنخواہ اور درجہ ممکن ہے اہم ہوں، لیکن میں کام۔ کام اور کام کا طلب گار ہوں۔ میں کارنامے چاہتا ہوں، میں ایسے لوگ چاہتا ہوں جو مجاہدوں کی طرح کام کریں۔ میں ایسے لوگ چاہتا ہوں جو اُس مقصد کے لئے لڑنا جانتے ہوں، جو اُنہیں محبوب ہو اور عاجزی سے غلط بات کے آگے گردن نہ جھکا سکتے ہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ بڑے کام کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہندوستان تعمیر کریں۔ کیا آپ اس وسیع ملک کو تعمیر کرنے کے علاوہ اور کسی بڑی چیز کا تصوّر کر سکتے ہیں؟ اسی سپرٹ میں کام کرنا ہے۔ سست۔ کاہل اور کمزور لوگ جہنم میں جائیں۔ اُن کے لئے کسی قسم

کا ترس نہیں ہونا چاہیئے۔

۱۹۵۴ء

ادب نوازی!

"کیا میں اس منصب (ساہتیہ اکادمی کی صدارت) کے قابل ہوں یا نہیں - وہ مجھے نہیں معلوم، لیکن میں اس مقام پر فائز ہونے پر نازاں ہوں، کیونکہ ایک ایسی انجمن کا صدر ہونا جس کے دائرے میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بڑے بڑے ادیب ہوں، بڑی عزت کی بات ہے۔ اس اکادمی کے صدر کی حیثیت سے میں آپ کو بڑی بے تکلفی سے بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ وزیر اعظم میرے کام میں دخل انداز ہو۔ یہ درست ہے کہ یہ بات ہمیشہ آسان نہیں کہ وزیر اعظم اور ساہتیہ اکادمی کے صدر کے درمیان لکیر کھینچی جائے۔ مگر وہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تخلیقی فنون کو کم سے کم مداخلت کے بغیر پھلنے پھولنے کی اجازت اور حوصلہ افزائی حاصل ہونی چاہیئے۔ حکومت کو تب ہی حرکت میں آنا چاہیئے جب یہ بالکل نمایاں صورت میں ایک سماجی بدعت یا سماجی خطرہ بن جائیں۔

(نئی دہلی: ۲۷ فروری ۱۹۵۵ء)

زبانوں کے بارے میں!

"ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں، جن کا آئین میں تذکرہ کیا گیا ہے، کو فروغ دینا ہے۔ میں ایک قدم آگے جا کر یہ کہوں گا، شمال مشرقی سرحدی علاقے اور دوسری جگہوں پر بولنے والی زبانیں بھی ترقی کرنی چاہئیں۔ دوسری بات یہ کہ ایک زبان کی ترقی دوسری زبان کی قیمت پر نہیں ہونی چاہیئے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہندوستان کی کسی بڑی زبان کی ترقی سے باقی زبانوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔"

(۲۱ دسمبر ۱۹۵۵ء۔ لوک سبھا، نئی دہلی)

زندگی کا کیف!

ہم اپنے دوسرے پانچسالہ منصوبے کے سلسلے میں مصروف ہیں اور ملک کی اقتصادی ترقی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ساری زندگی کو نہیں سمیٹتا، فن اور ادب اور گیت اور رقص کے بغیر زندگی بے کیف اور بے رنگ بن کر رہ جائیگی۔ فنون اور ادب کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ ان میں ایک قوم عام طور پر اپنی گہری محسوسات کا اظہار کرتی ہے۔

(۱۷ اپریل ۱۹۵۶ء۔ بھارت کی شاعری۔ تعارف)

(ترجمہ: [illegible])

جواہر لال نہرو

وصیّت نامہ

چند اقتباسات

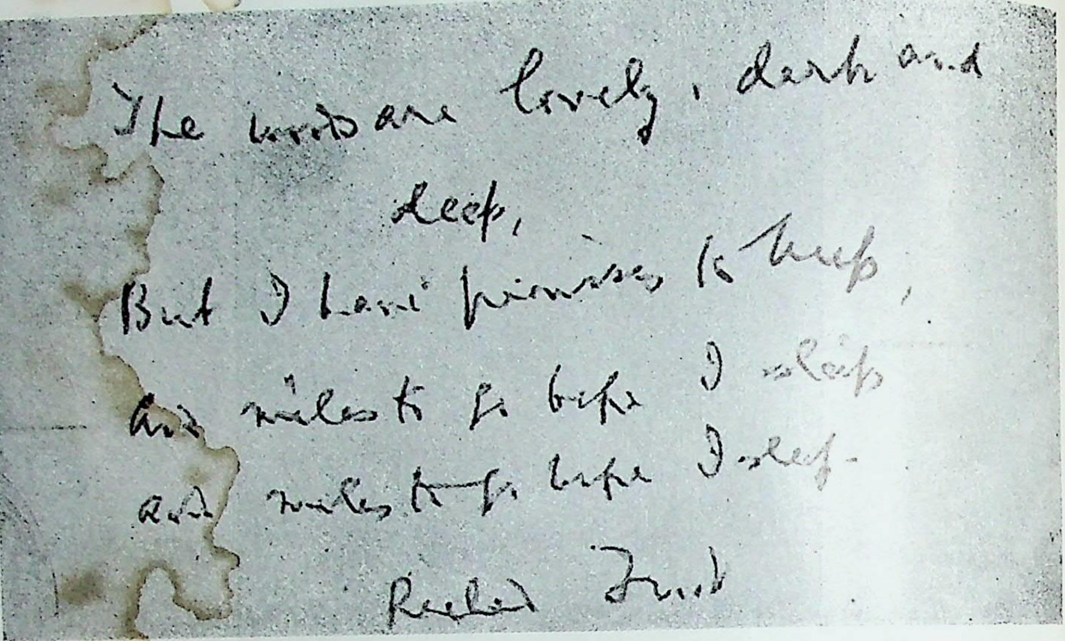
ہندوستانی عوام کی طرف سے مجھے جو بے پناہ پیار، عزت اور احترام ملا ہے، میں کسی طور بھی اس کے عوض میں کچھ نہیں دے سکتا۔ گو کچھ لوگ میرے نظریات کے مخالف بھی ہیں۔ لیکن میں نے اپنے ہموطنوں سے جو پیار پایا ہے وہ اُس قدر عظیم ہے کہ اس کے بدلے میں اپنی طرف سے کچھ بھی دینے کے قابل نہیں ہوں، میری استھیوں کا بیشتر حصہ گنگا میں جل پرواہ کیا جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد کوئی مذہبی رسومات ادا کی جائیں۔ کیونکہ ان رسومات پر میرا اعتقاد نہیں ہے۔

مجھے فخر ہے کہ دیش واسیوں نے مجھے بے حد پیار کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ باقی جتنی مدت میں زندہ ہوں، اسی طرح اپنے دیش واسیوں کی خدمت کے قابل رہوں اور اسی سپرٹ سے خدمت کرتا رہوں، مجھ پر میرے دوستوں اور بہی خواہوں کے بے حد احسانات ہیں، مل جل کر ہم نے اہم کام کیا ہے۔ میرے ساتھی مجھ سے جو تعاون کر رہے ہیں۔ اس کے لئے میں اُن سب کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد کوئی دھارمک رسومات ادا نہ کی جائیں، کیونکہ ان پر میرا اعتقاد نہیں ہے اور محض رسم کے طور پر یہ رسومات ادا کرنا فریب اور کپٹ ہے اور ایسی ایک ایسی کوشش کہا جائے گا۔ جس کا مقصد دوسروں کو دھوکا دینا ہوگا۔

میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش جلادی جائے، میں چاہتا ہوں کہ اگر میں کسی دوسرے ملک میں مر جاؤں تو وہیں پر میرے جسم کو اگنی کے سپرد کر دیا جائے اور میری استھیاں الہ آباد لائی جائیں، اس راکھ کا کچھ حصہ دریائے گنگا میں ڈال دیا جائے۔ اور باقی ماندہ حصہ حسب ذیل طریق پہ بروئے کار لایا جائے۔

میری یہ خواہش کہ میری راکھ کا کچھ الہ آباد میں گنگا میں ڈالا جائے، اس میں کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے۔ اس معاملہ میں میرے کوئی مذہبی جذبات نہیں ہیں۔ الہ آباد میں گنگا اور جمنا کے دریاؤں سے میرا بچپن سے ہی تعلق رہا ہے۔ اور اب جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس لگاؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ میں ان دریاؤں کی موسم کی تبدیلی پر مختلف رنگوں کو دیکھتا رہا ہوں، اور اکثر و بیشتر مرتبہ ان کی تاریخ روایات، کہانیاں، نغمات وغیرہ جن کا ان سے مدتوں تعلق رہا ہے۔ اُن کے بہتے ہوئے پانی کا حصہ بن چکی ہیں۔ بالخصوص گنگا ہندوستان کا ایک ایسا دریا ہے جو یہاں کے لوگوں کا محبوب ہے، پیارا ہے اور جس کے گرد ان کی نسلی یادیں، اُن کی امیدیں، ان کی فتوحات ان کی کامیابی کے نغمات اور ان کی شکستوں کی یادیں بندھی ہوئی ہیں۔ گنگا ہندوستان کے قدیم تمدن اور تہذیب کا نشان

رہی ہے۔ گنگا ایک ایسا دریا ہے جو ہمیشہ بہتا رہا ہے اور پھر اسی طرح اپنی چال پر قائم ہے۔ گنگا مجھے ان ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں اور گہری وادیوں کی یاد دلاتی ہے۔ گنگا مجھے ان زرخیز اور پھیلے ہوئے میدانوں کی یاد دلاتی ہے۔ جہاں میں نے زندگی کا وقت صرف کیا ہے۔ صبح کے سورج کی روشنی مسکراتی اور ناچتی ہوئی دھوپ اور شام ڈھلتے ہی تاریک اور پیچیدہ سائے میں نے دیکھے ہیں۔ موسم گرما میں وہ تنگ اور دھیمی رفتار اور شان سے چلنے والی ندیاں اور مون سون کے ایام میں گرجتی اور بڑھتی ہوئی گنگا، جس کا سینہ سمندر کی طرح چوڑا ہے اور پھر اس میں سمندر کی سی طاقت ہے، یہ گنگا مجھے ہندوستان کے ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ حال میں بہتی جاتی ہے اور مستقبل کے وسیع سمندر کی طرف گامزن ہے اور اگرچہ میں بہت سی پرانی روایات اور رواج ترک کر چکا ہوں اور میں بہت چاہتا ہوں کہ ہندوستان وہ تمام بیڑیاں اتار پھینکے جو اسے باندھے ہوئے ہیں اور اس کی حرکت میں رکاوٹ بنتی ہیں جو اس کے عوام میں پھوٹ پیدا کرتی اور ان کی بہت بڑی تعداد کو دبائے ہوئے ہے اور ان کی آزادانہ جسمانی اور روحانی ترقی میں سدِ راہ ہیں۔ اگرچہ میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں۔ مگر میں اپنے آپ کو ماضی سے قطعی طور پر قطع نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ہم ایک عظیم وراثت کے مالک ہیں۔ اور ہم سب کی طرح مجھے بھی اس بات کا احساس ہے کہ میں ایک اٹوٹ زنجیر کی ایک کڑی ہوں۔ جس کا پچھلا سرا ہندوستان کے زمانہ قدیم کی تاریخ کی صبح تک پہنچتا ہے۔ یہ زنجیر میں کبھی توڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ یہ ایک عظیم اور بیش قیمت خزانہ ہے اور مجھے اس سے پریرنا ملتی ہے۔ اور اپنی اس خواہش کی شہادت کے طور پر نیز ہندوستان کی سنسکرتی کی وراثت کے تئیں اپنی شردھانجلی کے طور پر میں یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری بھسم الہ آباد میں گنگا میں ڈال دی جائے جو تاکہ یہ راکھ سمندر میں پہونچ کر ہندوستان کے دائیں ساحل کو دھوتا ہے۔ میری بھسم کا بیشتر حصہ کسی اور طریقے سے ٹھکانے لگایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے اوپر ہوائی جہاز میں لے جا کر بڑی بلندی سے کھیتوں پر بکھیر دیا جائے، جہاں بھارت کے کسان محنت کرتے ہیں، تاکہ یہ ہندوستان کی مٹی میں مل جائے، اور ہندوستان کا ایک حصہ بن جائے اور اس کی علیحدہ شناخت نہ ہو سکے۔


The woods are lovely, dark and
deep,
But I have promises to keep,
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep.
Robert Frost

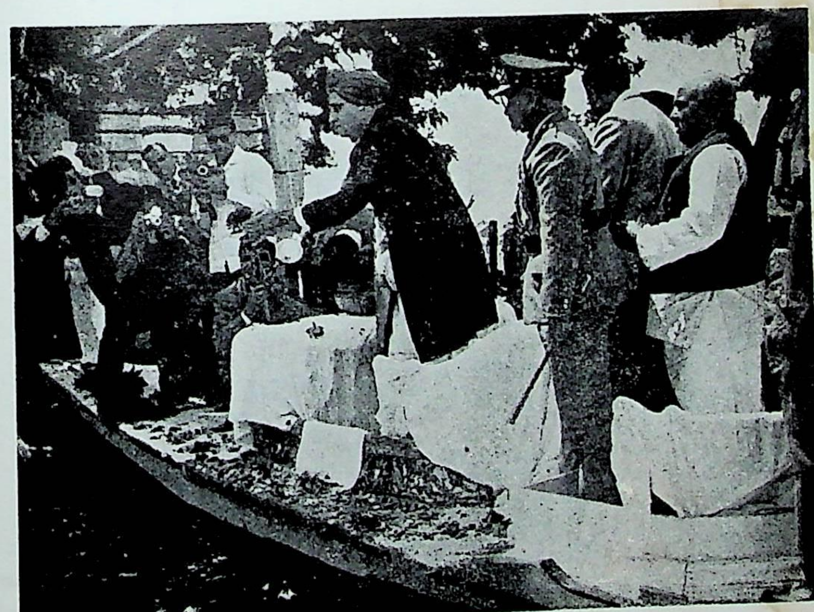
رابرٹ فراسٹ کی نظم کا ایک بند
جواہر لال نہرو کی تحریر میں۔

حسیں ہیں یہ جنگل بہت خوبصورت
بہت ہی اتھاہ اور بہت ہی گھنے ہیں
مگر مجھ کو وعدے نبھانا بہت ہیں
مجھے دور جانا بہت، دور جانا بہت ہے
نگاہوں کو آرام دینے سے پہلے
مجھے دور جانا ہے سونے سے پہلے

ترجمہ محمد یوسف ٹینگ



خوابِ ابد میں



شادی پور سنگم پر ڈاکٹر کرن سنگھ کے ہاتھوں
استھیوں کا جل پرواہ

خراجِ عقیدت

بزم میں جو تیرا ظہور نہیں
شمعِ روشن کے مُنہ پہ نُور نہیں
(میرؔ)

راشٹرپتی ڈاکٹر ایس' رادھا کرشنن

ہمیں جو دکھ پہنچا ہے وہ مہاتما گاندھی کی وفات کے بعد سب سے بڑا دکھ ہے۔ وہ ان تمام آدرشوں کو عمل میں لانے کے لئے کوشش کر رہے تھے جو ہمیں مہاتما گاندھی نے سکھائے ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ مہاتما جی نے کہا تھا۔ "میں ہر انسان کی آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں۔" جواہر لال اس قول کو بار بار دہراتے تھے اور ہمارے سماجی نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے انہوں نے ہمارے عام انسانوں کے دُکھ درد کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس بات کی کوشش کی کہ ہمارے عوام محسوس کریں کہ وہ ہمارے سماج کے مکمل طور پر اوّل درجہ کے شہری تسلیم کئے جا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ بڑی شدّت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ افراد کی طرح قوموں کو بھی اخلاقی اصولوں کو ماننا چاہیئے۔ انہیں اخلاقی ذمّہ داریوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ وہ تمام قاعدوں سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔ انہیں خود کو قوانین کے تحت سمجھنا چاہیئے۔

خود جواہر لال نے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی دِن کے موقعہ پر کہا تھا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک ہم لوگ کچھ خاص اصولوں کو نہ اپنائیں، ہم اپنی قدیم عظمت دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔

انہوں نے کہا تھا کہ اپنے ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قوم اور انسانیت کے مفاد کو بالاتر رکھنا ہے۔ ہمیں آج اس عہد کا اعادہ کرنا ہے۔ یہی ایک واحد طریقہ ہے جس سے ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ جواہر لال نہرو کو اپنا خراجِ عقیدت ہی پیش نہیں کریں گے۔ ان کے لئے کسی خراجِ عقیدت کی ضرورت نہیں ہے۔ جدید بھارت جس کی انہوں نے ایک ایک اینٹ چُنی، خود ان کے لئے عظیم الشان اور پائیدار یادگار ہے۔

ہم ان عظیم آدرشوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے جن کے حصول کے لئے انہوں نے آرام حرام کر دیا تھا اور ہمیں نئے بھارت کی تعمیر میں آگے بڑھنا ہے۔"

(رام لیلا گراؤنڈ نئی دہلی میں تقریر ۲۹ مئی ۱۹۶۴ء)

نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین

آپ اور ہم سب یہاں اکٹھا ہیں۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں بہت دفعہ بڑے بڑے جلسے ہوئے ہیں۔ اس منچ سے لوگوں نے بڑی بڑی تقریریں کی ہیں۔ بھاشن دئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا آپ یہاں ہزاروں کی تعداد میں ان جلسوں میں آتے تھے اور ایک آدمی یہاں اونچی میز پر بیٹھ کر آپ سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا۔ آپ کو بتاتا تھا کہ دیش میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ سے کہتا تھا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کچھ سمجھتے تھے اور کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو دیکھ کر آپ کو طاقت پہنچتی تھی۔ اس کو دیکھ لینے سے آپ یہ سمجھتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کرلے گا۔ جو یہ کہتا ہے اُس پہ چلنا چاہیئے۔ آج آپ کی آنکھیں اس کو یہاں ڈھونڈتی ہوں گی۔ وہ تو چلا گیا۔ آپ اسے کبھی یہاں نہیں دیکھ سکیں گے۔ کل ہم نے اس کے بدن کو شعلوں کے سپرد کر دیا۔ وہ خاک ہو گیا لیکن ان تین دنوں میں ہمارے دیش میں کوئی آنکھ نہیں ہوگی جس نے آنسو نہیں روئے ہوں گے کوئی دِل نہیں ہوگا جو سِسکا نہیں ہوگا۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا باپ مرگیا، کسی کو ایسا لگتا ہے کہ بھائی چلا گیا۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ دوست چلا گیا اور سب کو ایسا لگتا ہے کہ ان کا پیارا، ان کا محبوب چلا گیا۔ اس لئے کہ جو آدمی چلا گیا ہے، اس نے اپنی ذات میں ایسی اچھائیاں جمع کرلی تھیں ایسی خوبیاں اکٹھی کرلی تھیں کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب کا محبوب ہے۔ ہم سب کا پیارا ہے۔ اس پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرلیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارا بھلا چاہنے والا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی اچھی چیز کے پاس بیٹھے ہیں۔ اس سے دِل کو تقویت ملتی تھی۔

وہ چیز تو چلی گئی۔ اب نہیں مِل سکے گی۔ لیکن ایک چیز ہے جو نہیں گئی۔ اور وہ چیز ہے جس نے پنڈت نہرو کو ہمارا محبوب بنایا تھا اور جن کی وجہ سے ہمارا دِل ان پر آیا تھا، جن کی وجہ سے ہم ان کو دیکھنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ وہ چیز اس دیش کی سیوا تھی۔ اس کو بڑا بنانا تھا۔ اس میں ایکا پیدا کرتا تھا۔ اس کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑ کر جگاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو جو برا مانے

ڈھنگ سے اپنی روزی کمانا چاہتے تھے، ان کو نئے ڈھنگ پر چلانا چاہتا تھا۔ نئے طریقوں سے چیزیں پیدا کرنا سکھاتا تھا۔ کھیتی کے نئے طریقے بتاتا تھا۔ نئی یوجنائیں بنانی تھیں اور اس دیش کی کایا پلٹ دینی تھی۔

ایسا آدمی چلا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ سنّاٹا ہو گیا ہے۔ اس دِلّی کا ایک شاعر تھا غالب۔ اس نے کہا تھا ؎

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

تو آج ہی یہ اُداسی ہم پر چھائی ہے۔ مانا کہ یہ اُداسی صحیح ہے اور ہم اس سے بھاگ نہیں سکتے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے دِلوں میں زندہ رکھنا ہے۔ ان کو امر بنانا ہے۔ کل جب ان کی ارتھی اُٹھ رہی تھی تو ہمارے بچّے، اسکولوں میں پڑھنے والے بچّے پُکار رہے تھے "چاچا نہرو امر ہیں۔" تو ہم سب کی پُکار ہونی چاہیئے کہ وہ کیسے امر ہوں گے۔ وہ ہمارے دِلوں میں امر ہوں گے۔ ہمارے جیون میں امر ہوں گے۔ ہمارے کام سے امر ہوں گے۔ ہمارے دیش کی ترقی سے امر ہوں گے۔ اور اگر ہم یہ نہ کر سکیں گے تو ایسا ہوگا کہ ہم نے ان کو مار ڈالا۔ آپ میں سے کون ان کو مارنا چاہے گا۔ وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ امر رہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ آپ کے دِلوں میں ہو سکتے ہیں۔ آپ کی محبّت اور محنت سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اب آنسو بہانے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ آنسو سوکھ بھی جاتے ہیں۔ بہتے ہیں اور بہتے ہیں اور پھر سوکھ جاتے ہیں۔ ہمارے آپ کے آنسو بھی سوکھ جائیں گے، لیکن دِل کی گرمی کو بجھنے نہیں دینا چاہیئے۔ ارادے کو مضبوط رکھنا چاہیئے اور آگے زندگی کو اچھی طرح چلانا چاہیئے۔ ہم سب کو آپ کو جاننا چاہیئے کہ سب سے بڑی بات آپ کا اتحاد ہے۔ پنڈت نہرو نے اور ان سے پہلے ان کے گورو مہاتما گاندھی نے ہمارے جیون کی جڑ کو اس طرح بویا تھا کہ جب تک ہم میں ایکا نہیں ہوگا، ہم اچھی زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ اس ایکتا کے لئے آپ اپنے دِل میں فیصلہ کر لیجیئے کہ کسی ہندوستانی کا ہاتھ، چاہے وہ ہندو کا ہو، مسلمان کا ہو، چاہے وہ سِکھ کا ہو یا پارسی کا ہو، کسی دوسرے ہندوستانی پر نہیں اُٹھے گا۔ اگر اُٹھے گا تو اسے روکنا ہوگا۔ پنڈت نہرو کے نام پر روکنا ہوگا۔ مہاتما گاندھی کے نام پر روکنا ہوگا۔ اس دیش کے ہر باسی کو عزّت کے ساتھ، آبرو کے ساتھ، سچائی کے ساتھ دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیئے اور اس کی ذمّہ داری ہم پر، آپ پر، سب پر ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو پنڈت نہرو مر جائیں گے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو گاندھی جی بھلا دئے جائیں گے۔ ہمیں تو اس دیش کو

شیرازہ

ایک بنانا ہے۔ اس کے دیش باسیوں کو بھائی بھائی بنانا، ان میں محبت اور پریم پیدا کرنا ہے۔ ان میں جو نفرت ہے اس نفرت کی آگ کبھی کبھی الگ جاتی ہے یا لگادی جاتی ہے۔ اس کو ہر طرح سے بجھانا ہے۔ یہ آپ کر لیں گے تو سب کام ہوتے رہیں گے اور حکومت کا کام ٹھیک چلے گا۔ یوجنائیں بنیں گی، بڑے بڑے کارخانے بنیں گے۔ لیکن یہ سب ناکارہ ہو جائیں گے، بے کار ہو جائیں گے۔ اگر ہم میں ایکتا نہیں ہوگی۔ اگر ہم مل جل کر کام نہیں کریں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کے نام پر، ان کے گورو مہاتما گاندھی کے نام پر آپ اپنے دلوں کو مضبوط کریں گے۔

عقیدت کے دو پھول میں بھی چڑھاتا ہوں۔ آپ نے بھی چڑھائے ہیں اور میں کیا چڑھا سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم یہ عہد کر لیں، پکی نیت کر لیں تو ہم کھوئی ہوئی ہمت حاصل کر لیں گے۔ زندگی میں ایک کمی ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

"جواہرلال"

اپنوں اور بیگانوں کی نظر میں!

"جواہرلال میرا جانشین ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا اور وہ ایک ایسی زبان بولتا ہے جو میرے لئے اجنبی ہے۔ یہ ٹھیک ہو یا غلط، لیکن زبان دِلوں کے ملاپ میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب میں نہ ہوں گا وہ میری زبان میں بات کرے گا۔ بہادری اور حوصلہ میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اگر اس میں ایک سپاہی کی تیزی اور جرأت ہے تو ایک سیاست دان کی دُور اندیشی والی صفت بھی ہے۔ نظم وضبط کو پسند کرنے میں وہ شدید تکلیف دِہ پابندیاں بھی بخوشی گوارا کرلیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ انتہا پسند ہے مگر وہ منکسر مزاج بھی ہے اور اتنا عملی بھی کہ حدِ انتہا تک نہیں جائے گا۔ وہ بلّور کی طرح شفاف اور شک وشُبہ سے بالاتر۔ سچائی کا مالک ہے۔ اس کو نہ صلہ کی پروا ہے نہ ستائش کی تمنّا۔ ملک اس کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔"

[مہاتما گاندھی]

"ایک انسان کی حیثیت سے نہرو کی ذات میں ذہن کی مہذّب نفاست، احساسات کی اچھوتی نزاکت اور فراخ دِلی اور وسیع النظری کی صفات کا گوناگوں سنگم تھی۔ کمزور اور شکستہ دِل آدمی کے لئے اُن کے دِل میں گہری ہمدردی کے جذبات موجیں مارتے تھے۔ وہ ایک ممتاز مصنف تھے۔ اُن کی خود نوشت سوانح عمری، جس میں وہ اپنی جیون کتھا اور جدوجہد کا حال کسی احساسِ برتری یا خود ترسی کے جذبات کے بغیر بیان کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے کی سب سے زیادہ معرکتہ آلارا کتابوں میں سے ایک ہے۔

"جواہر لال نہرو ہماری نسل کے عظیم ترین فرزندوں میں سے تھے۔ وہ ایک عظیم مدبّر تھے اور انسانی آزادی کے مقصد کی اُنہوں نے جو خدمت کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ آزادیٔ وطن کے ایک مجاہد کی حیثیت سے وہ آن بان کے مالک تھے۔ جدید ہندوستان کے معمار کی حیثیت سے اُن کی خدمات بے نظیر ہیں۔ اُن کی زندگی اور کارناموں کا ہماری ذہنی تشکیل، سماجی تنظیم اور فکری ارتقا پر بڑا زبردست اثر پڑا ہے۔ ہمیں ایک ایسے ہندوستان کی تصویر سے جس میں نہرو کی متحرک اور ہمہ گیر زندگی غائب ہو، مانوس ہونے میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔ ہماری تاریخ میں ایک دَور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔"

[صدر رادھا کرشنن — ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء]

"جواہر لال جی سچے جمہوریت پرست تھے۔ وہ آزادی کے مجاہد اور ہندوستان کے عاشق تھے۔ وہ غریبوں کے مونس اور بے کسوں کے غم خوار تھے۔ اُنہوں نے سیاسیات کے گندے کھیل کو شرافت کے آداب سکھائے۔"

[وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری]

"مسٹر نہرو کی موت سے ہندوستان کی جدید تاریخ کا سب سے شاندار دَور ختم ہو گیا ہے۔ میری پیڑھی کے لوگوں نے مسٹر نہرو کے فلسفے سے فیضان حاصل کیا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند دانشور، سیکولرازم کے پُر جوش ترجمان اور جمہوری طرزِ عمل کے پُر عزم وکیل تھے۔ اُن کی ذات ہندوستان کی پراچین سنسکرتی اور جدید ارتقا کا ایک مثالی پیکر تھی۔ دُنیا کے ترقی پسند دانشور اُن کی موت سے اپنے آپ کو یتیم محسوس کریں گے اور اُن کے کروڑوں دیش واسی اُنہیں بُدھ، اشوک اور گاندھی کے ہم مرتبہ جانیں گے۔"

[گجندر گڈکر — چیف جسٹس سپریم کورٹ]

"رہنما اپنی قوم کو بے یار و مددگار اور مجبور چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

[جے پرکاش نارائن]

"وزیرِ اعظم چلے گئے ہیں ... ... مُلک کی ہی نہیں، دُنیا کی روشنی بجھ گئی ہے ... ... وہ اُن عظیم ترین شخصیتوں میں سے تھے جو آج زندہ ہیں۔ بہت دنوں سے ہمیں اس کا

کھٹکا لگا ہوا تھا اور ہم اس خیال سے کانپ اُٹھتے تھے۔ لیکن وہی کچھ پیش آگیا ہے۔"

[کرشنا مینن]

"جواہر لال نہرو ایک ایسے مدبّر تھے جن کی یاد نسلیں گذر جانے کے بعد بھی دُھند لی نہیں پڑے گی۔"

[راجر سیڈوکس : سلامتی کونسل میں فرانسیسی مندوب]

"نہرو کی موت سے افسردگی، اضطراب کی لہر پھیل گئی ہے اور انہیں شردھانجلی پیش کی جارہی ہے۔ وہ ساری انسانیت کا جزُ بن گئے تھے... اُن کا نام انسانیت کے رُوحانی نصب العین کے ہم معنی بن گیا تھا۔"

[ایڈلائی سٹیونسن]

ساری دُنیا ایک ایسے زبردست مجاہدِ امن سے محروم ہوگئی جو بین الاقوامی حالات سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور جس نے بنی نوع انسان کو تباہی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

[مارشل ٹیٹو صدر یوگوسلاویہ]

"وہ مصری عوام اور اُن کے مسائل اور آرزوؤں کے سچّے ہمدرد تھے۔ اُن کی موت ہندوستان کے لیئے بڑا زبردست سانحہ ہے۔ اُن کی زندگی ایسی مشعل تھی جس نے ساری دُنیا کو روشنی بخشی۔ اُن کی وفات درحقیقت ساری انسانیت کا نقصان ہے۔"

[صدر جمال ناصر]

"پیارے جواہر لال!

میں نے ابھی تمہاری عظیم کتاب پڑھ کر ختم کی ہے اور میں تمہارے اس کارنامے سے بہت ہی متاثر ہوا ہوں اور فخر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی تمام تفصیلات میں انسان دوستی کی ایک لہر جاری ہے جو حقائق کی سطح سے آدمی کو نکال کر اُس انسان کے دِل کے قریب پہنچا دیتی ہے جو اپنے کارناموں سے زیادہ عظیم اور اپنے ماحول سے زیادہ صادق ہے۔"

[رابندرناتھ ٹیگور (خود نوشت سوانح کے بارے میں)]

"نہرو ایک ایسے ادیب تھے جو اپنی ذات میں ایک عظیم عوام دوست رہنما کی صفات رکھتے تھے اور اس صف میں ٹالسٹائی اور گاندھی جی کے قریب تھے۔"

[ایلیا ایرن برگ]

"یہ ہے وہ شخص، جس سے ملتا جلتا آدمی زمین پر شاذونادر اور ایک بحران کی حالت میں ہی نمودار ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کی نازک گھڑی میں پیدا ہوا اور نازک گھڑی میں باجی رہا ہے۔ لیکن اُس نے اپنا پارٹ شان اور خوبی سے ادا کیا ہے۔"

[ڈاکٹر راجندر پرشاد]

"مہاتما گاندھی نے پنڈت نہرو کو اپنے سیاسی جانشین کے طور چُنا تھا اور یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ دُرست آدمی کا انتخاب ہوا۔"

[سردار ولبھ بھائی پٹیل]

"میں محسوس کرتی ہوں کہ تمہیں ایک چیتاونی دی گئی ہے اور ساتھ ہی ایک شردھانجلی پیش کی گئی ہے۔ اور یہ چیتاونی ہے جو تمہاری سب سے اچھی صفات کو متحرک قوت، جرأت، دُور اندیشی اور فراست میں تبدیلی کرے گی۔ مجھے اپنے اس یقین میں کسی قسم کا شُبہ نہیں۔"

[سروجنی نائیڈو]

"شاید دُنیا کے اور کسی لیڈر سے زیادہ اُنہوں نے امن کے لئے انسان کی تمنّاؤں کو جامۂ اظہار پہنایا ہے ... جنگ سے خالی دُنیا کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے بڑی جرأت دکھائی ہے اور اس طرح تمام انسانیت کی خدمت کی ہے جنگ سے خالی دُنیا سے بڑی یادگار اُن کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

[لِنڈن جانسن۔ صدر امریکہ]

"جواہر لال نہرو کے نام کی سوویت یونین میں بڑی قدر کی جاتی تھی اور اُن سے بے حد پیار کیا جاتا تھا۔ جو اُنہیں ہندوستان کی تحریک آزادی اور اس کے احیائے نو کے آزمودہ کار لیڈر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ جواہر لال نہرو موجودہ دَور کے ممتاز ترین مدبّروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ امن کے ایک اَن تھک مجاہد تھے۔"

[نکیتا کروسچیف وزیر اعظم روس]

"میں نے نہایت ہی دُکھ کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کی خبر سُنی۔ وہ ایک ایسے مدبّر تھے جن کی اعلیٰ صفات نے جمہوری اور سماجی ترقی اور امن کے فروغ

کے لئے کام کیا اور جن کی وجہ سے پہلے تو ہندوستان کا مقدر بدل گیا اور بعد میں دُنیا کی تقدیر متاثر ہو گئی۔"

[چارلس ڈیگال - صدر فرانس]

"ہندوستان کا نقصان حقیقی معنوں میں تمام انسانیت کا نقصان ہے۔"

[ڈین رسک - امریکی وزیر خارجہ]

"گاندھی کی وراثت کے علم بردار کی حیثیت سے، عالمی سیاست دان کی حیثیت سے اور عالمی امن کے مجاہد کی حیثیت سے مرنے والے نے عظیم کارنامے انجام دئیے۔

[کونارڈ ایڈناور - مغربی جرمنی کے سابق چانسلر]

"وہ بُنیادی طور پر امن کے علمبردار تھے... وہ سکیولرازم کے عظیم معتقد اور سب سے بڑے ستون تھے۔ اُن کے دِل میں فرقہ پرستی یا کسی اور قسم کا کوئی تعصب نہ تھا۔"

[خان عبدالغفار خان]

"وہ متحدہ عرب جمہوریہ کے محبوب دوست اور امن کے پیرووں کے سردار تھے۔"

[علی صابری - وزیر اعظم متحدہ عرب جمہوریہ]

"وہ امن اور آشتی کے علم بردار تھے... جب سویز پر تین طاقتی حملہ ہوا تو شری نہرو نے جس شدت سے اُس کی مخالفت کی، ہم وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے

[انور سادات - مصر کی قومی اسمبلی کے سپیکر]

"نہرو ہمیشہ اُس مشعل کی طرح رہیں گے جو ظلمت میں راہ دِکھاتی ہو اور اُن کی یاد اُتنی ہی بلند رہے گی جتنا ہمالیہ ـــــ"

[اخبار "الصباح" ٹیونس]

"جواہر لال نہرو ایک عظیم دیش بھگت اور اپنے عوام کے ایسے محبوب تھے جنہوں نے سچے معنوں میں قوم کی خدمت کی تھی۔ وہ گہری نظر رکھنے والے عالمی مدبر بھی تھے۔ جنہوں نے امن اور عالمی تفہیم کے مقصد کی خدمت کی... اُن کی وفات ہندوستان کے ساتھ ساتھ تمام دُنیا کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

[جنرل نے وِن - برما کی انقلابی کونسل کے چیئرمین]

"یہ دُنیا اور انسانیت کی المناک بدقسمتی ہے کہ اُنہوں نے اس نازک لمحے ایشیا کے

عظیم عالمی امن کے علم بردار جواہر لال نہرو سے ہاتھ دھویا ہے۔"

[حیاتو ایکیڈا۔ وزیر اعظم جاپان]

"جواہر لال نہرو کا نام تب تک کبھی دُھندلا نہیں پڑ سکتا، جب تک دُنیا میں امن کے خواب دیکھنے والے اور تدبر و عقل کی فتح پر یقین رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ جواہر لال نہرو کی موت سے ایشیا اپنے صفِ اوّل کے مدبر اور عقل، اعتدال اور امن کے سب سے مؤثر وکیل سے محروم ہوگیا ہے۔"

[ڈیاس ڈیڈو میکا پاگال: فلپائنی صدر]

"عرب قوم نے دُنیا میں اپنے سب سے عظیم دوستوں میں سے ایک کو کھو دیا ہے۔"

[عبدالخالق حسونا۔ عرب لیگ سیکرٹری جنرل]

"یہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہے جو ہمارے دَور کے ممتاز ترین انسانوں میں سے تھا۔"

[رابرٹ مین زیز — آسٹریلیا کے وزیر اعظم]

"ہندوستان کا عظیم ترین انسان اُٹھ گیا ہے... جس نے معاصر تاریخ پر زبردست اثر چھوڑا ہے۔"

[ذوالفقار علی بھٹو: پاکستانی وزیر خارجہ]

"میرے محبوب دوست جواہر لال نہرو سارے انڈونیشیا میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ اُنہوں نے ہماری تحریک آزادی میں اپنا حصہ ادا کیا تھا — تمام دُنیا کے لوگ اُن کا ماتم کریں گے۔ کیونکہ ایک بہتر دُنیا کے قیام کی جدوجہد میں جواہر لال نہرو موجود نہیں ہوں گے۔"

[عبدالرحیم سوکارنو — انڈونیشی صدر]

"جواہر لال نہرو ایک ایسی رُوح تھے جو رنگا رنگ جلوؤں کا شعلہ تھی۔ یہ تمام جلوے روشن تھے۔ اُن کی موت ہندوستان کے لئے اُسی طرح کا اثر رکھتی ہے جیسے برقی رَو کا رُک جانا اور تمام روشنیوں کا بُجھ جانا۔"

[چکرورتی راج گوپال آچاریہ]

"میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں بہت سے لوگوں کے لئے یہ اندازہ کرنا مُشکل ہوگا

کہ دُنیا کے لئے نہرو کی اہمیت کتنی زیادہ اور کتنی گہری ہے۔ اور میں اُس کے سیاسی اثر کا ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس سے کسی عظیم تر اثر کی بات کر رہا ہوں جسے بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ میرے خیال میں اُن کی عالمی اہمیت کا کوئی رشتہ اُن کی عظیم اور سریع الاثر اخلاقی حس کے ساتھ تھا۔ جو سیاسیات سے بالاتر تھی اور جس کی وجہ سے دُنیا کے تمام حصوں کے عام لوگ اُس کی بات پر کان دھرنے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے...

نہرو نے ایک دفعہ کچھ اس مفہوم کی بات کہی کہ وہ مشرق و مغرب کا ایک ناہموار امتزاج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے صدق دِلی سے ایسا محسوس کیا ہو۔ لیکن ہم مغربیوں کے لئے یہ ایک پریشان کُن بیان ہے۔ ہمیں تو وہ ہمیشہ ایک قابلِ توصیف سنگم معلوم ہوئے ہیں۔ مغربی ذہن کی تفہیم رکھنے والے، اس کی پیچیدگیوں اور مسائل سے واقف اور یورپی کلچر اور تواریخ سے بے حد اُنس رکھنے والے۔ ایک نیا محاورہ گھڑا جائے تو ایک دِل و دماغ کے اندر دو ذہنوں کی یہ "شادی" نہرو کو اُسی طرح مغربی دُنیا میں ایک عظیم ہستی بنا دیتی ہے۔ جس طرح وہ ہندوستان کے ہیرو تھے اور ہیں۔

"نہرو اُس نادر اور تیزی سے غائب ہونے والی ممتاز صف سے تعلق رکھتے تھے جنہیں مُصنّف مدبّر کہا جاتا ہے۔ اُن کی کتابیں اصل میں تواریخی اور سیاسی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ اگر مُقدّر نے اُسے اس عظیم قوم کا رہنما بننے کے لئے چُنا نہ ہوتا تو اُنہوں نے دوسرے میدانوں میں اپنے جینئس کا اظہار کیا ہوتا اور زیادہ ممکن یہ ہے کہ وہ ایک عظیم تخلیقی مُصنّف بن جاتے۔ لٹریچر اور شاعری کے لئے اُن کا شوق بڑا گہرا اور بڑا ہمہ گیر تھا۔

میں نے حال ہی میں اٹھارہویں صدی کے ایک مُصنّف الیگزینڈر پوپ کے کچھ لفظ پڑھے ہیں جو اُس نے ایک دوسرے زمانے میں کسی دوسرے آدمی کے بارے میں لکھے تھے۔ لیکن جنہیں ہم آج، جب کہ ہم نہرو کا ماتم کر رہے ہیں اور اُن کی یاد کر رہے ہیں، اُن کے متعلق دُہرا سکتے ہیں ؏

"مدبّر، لیکن پھر بھی حق پسند، کھری روح اور پُر خلوص ضمیر کا مالک! عمل میں وفادار اور عزّت کے بارے میں باصفا۔ جس نے پیمان شکنی نہیں کی، کسی ذاتی فائدے کو پروان نہیں چڑھایا۔ جس نے کسی منصب کی تمنا نہیں کی اور کسی دوست کو دغا نہیں دی۔"

[آر، این، آئی۔ لندن]

ادیب اور ادب نواز

دُنیا کے اکثر عظیم آدمیوں پر اُن کی سرکاری حیثیت عظمت ٹھونس دیتی ہے۔ لیکن ایسی عظیم ہستیاں معدودے چند ہوتی ہیں جو اپنے سرکاری منصب کو عظمت عطا کرتے ہیں ایسی ہی نادر ہستیوں میں سری جواہر لال نہرو بھی تھے۔

وزرائے اعظم آتے اور جاتے رہیں گے لیکن نسل ہا نسل تک کسی نہرو کو نہیں دیکھا جا سکے گا۔ کیونکہ جواہر لال نہرو ایک وزیر اعظم سے بھی بہت زیادہ تھے۔ وہ جدید ہندوستان کے معمار تھے۔ ہماری قومی زندگی کا مشکل سے ہی کوئی ایسا پہلو ہے جس کی رفتار اُنہوں نے تیز نہ کردی ہو اور جس پر اُن کی چھاپ نہ رہ گئی ہو۔

بےساختہ اور متاثر کُن خراج عقیدت اُنہیں زندگی کے ہر طبقے اور نسل سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے پیش کئے گئے وہ اُن کی آفاقی اپیل کی شہادت ہیں۔ یہ کہنا مُشکل ہے کہ اُن کی جُدائی کس کو زیادہ شاق گذر رہی ہے۔ نوجوانوں کو یا بُوڑھوں کو، سیاست دانوں کو، یا سائنس دانوں کو، دانش وروں کو یا محنت کشوں کو، شہر کے طبقۂ شرفا کو، یا گاؤں کے گُم نام عوام کو۔

نہرو ایک عالمی مدبر اور امن کے علم بردار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھے وہ تمام اقوام کے عاشق تھے۔ انسانی قبیلے کے ایک مست شیدائی اور اُن کی نظر میں رنگ، نسل اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ وہ انسانیت کا ضمیر تھے۔

اُن کی غیر فانی یاد کو ہمارا اسلام!

سری جواہر لال نہرو، ساہتیہ اکادمی کی ابتدا یعنی ۱۹۵۴ء سے اس کے صدر تھے۔ اُن کو اس منصب کے جنرل کونسل نے چُنا اور دوبارہ چُنا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اتفاق سے

ہندوستان کے وزیر اعظم تھے بلکہ اُن کی فکری عظمت کے لئے۔ اُن کی حیران کُن زُود حسی کے لئے اور اُن کی لبریز انسانیت کے لئے۔ ہندوستان کے مصنّف اُن کو کُرسیٔ صدارت پر دیکھ کر فخر محسوس کرتے تھے۔ کسی اور چیز سے زیادہ اُن کا وجود مصنفین کو اس بات کا قائل کرتا تھا کہ ہندوستانی ادب بُنیادی طور ایک ہے۔ اگرچہ اسے مختلف زبانوں میں قلم بند کیا جاتا ہے۔ وہ وجدانی طور یہ پہچان گئے تھے کہ اُن کی ہر بات اور ہر قدم تخلیقی تھا اور وہ دِل سے شاعر تھے اگرچہ اُنہوں نے شعر لکھے نہیں۔

اپنے دفتر کے صبر آزما فرائض کے باوجود اور اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود وہ اُس وقت تک ساہتیہ اکادمی کی میٹنگ سے غیر حاضر نہ رہے۔ جب کہ اُن کے ڈاکٹروں نے اُن کی مصروفیات پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس کے باوجود ڈیڑھ دو دن جانے سے پہلے اُنہوں نے ساہتیہ اکادمی کے ایگزیکٹو بورڈ، جس کی میٹنگ ۳۰ مئی کو ہونے والی تھی، کی صدارت کرنا منظور کر لیا تھا۔ یہ میٹنگ ہوئی لیکن روشنی چلی گئی تھی۔ "

[ساہتیہ اکادمی کے خبرنامے سے]

"مجھ پر اس کا جو تاثر ہوا ہے وہ مجھے مجبُور کر رہا ہے کہ میں چند لمحوں کے لئے اپنے معمول کے ضبط سے کنارہ کش ہو کر آپ کی قدرِ اوّل کی دانشوری اور ممتاز صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کروں۔ انگریزی پر آپ کا عبور اُن حدود سے بھی بہت زیادہ ہے جن کا مجھے اب تک اندازہ تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے کچھ انتہائی قابل لوگ بھی اس نوعیّت کا کام کئی دِنوں میں سرانجام دینے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ آپ کو اس کام کے لئے صرف چند گھنٹے صرف کرنا پڑے اور وہ بھی اس عالم میں کہ کسی خاص کوشش کا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔

ایک لحاظ سے ترجمہ طبعزاد لکھنے سے زیادہ مُشکل کام ہے۔ اصل تحریر کا ادبی مفہوم برقرار رکھنا اور ساتھ ہی ترجمے کے ذریعے مصنّف کے ادبی اسلوب کی ترجمانی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کو وہی شخص نِبھا سکتا ہے، جسے دونوں زبانوں پر برابر کا عبور حاصل ہو۔ آپ کے ترجمے میں جو خاص بات مجھے بھائی ہے وہ یہ ہے کہ

اصل کی کسی خصوصیت پر آنچ نہیں آئی ہے اور آپ نے میرے اُردو اسلوب کو انگریزی میں اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ مجھے یہ سُن کر کوئی حیرت نہ ہوگی اگر کوئی قاری سمجھ لے کہ اصل چیز اُردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھی گئی تھی۔"

[ابوالکلام آزاد (جواہر لال کے نام ایک خط سے اقتباس]

جواہر لال نہرو

اس کرۂ ارض پر نسل انسانی کی تاریخ کے ہر صد سالہ دور میں چند ایک ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں جو ہم سب لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ جواہر لال نہرو ایک ایسی ہی ہستی تھے جنہوں نے گذشتہ برسوں میں مشرق و مغرب کے ملکوں کے سبھی باشندوں کو جس قدر متاثر کیا ہے اور جس طرح ہمیشہ ہماری بھلائی کے لئے ہم پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، اس کی دوسری کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔

حتیٰ کہ بعض اوقات جن لوگوں نے ان جانے میں ان پر بے جا نکتہ چینی کی ہے وہ برابر حسب دستور انہیں بھی متاثر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ان کی آزاد روی کے پیش نظر آج دنیا بھر میں ان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے اور اپنی دیانت داری اور شخصیت کی بدولت آج وہ محبوبِ عالم بنے ہوئے ہیں۔

وہ ایک پیدائشی قائد تھے اور انہوں نے ہمیشہ ہی قیادت کی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے لئے میری شیفتگی کا آغاز اُن دنوں سے ہوتا ہے جن دِنوں وہ گاندھی جی کے ایک نوجوان پیروکار تھے۔

بعض اوقات میرے مُلک کے لیڈروں نے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے تئیں عدمِ مفاہمت کا اظہار کیا اور مجھے اس پر ازحد افسوس بھی ہوا۔ لیکن اس کے برعکس مجھے اُن کی عظمت کا اور بھی قائل ہونا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے نہ تو کسی انتقامی کارروائی نہ ہی کسی قسم کی تلخی کا اظہار کیا۔ مزید برآں وقت نے ان کے سیاسی موقف پر دُرست ہونے کی مہر ثبت کر دی ہے۔

ان کی سرکردگی میں ہندوستان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک محدود کام دیتا رہا۔ اور ہندوستان کے عوام دونوں اطراف کو یکساں طور پر سمجھتے رہے۔ تاریخ انسانی کے اس

ہندوستان کے وزیرِ اعظم تھے بلکہ اُن کی فکری عظمت کے لئے۔ اُن کی حیران کُن زُود حِسی کے لئے اور اُن کی لبریز انسانیت کے لئے۔ ہندوستان کے مصنّف اُن کو کرسیٔ صدارت پر دیکھ کر فخر محسوس کرتے تھے۔ کسی اور چیز سے زیادہ اُن کا وجود مصنفین کو اس بات کا قائل کرتا تھا کہ ہندوستانی ادب بُنیادی طور ایک ہے۔ اگرچہ اسے مختلف زبانوں میں قلم بند کیا جاتا ہے۔ وہ وجدانی طور یہ پہچان گئے تھے کہ اُن کی ہر بات اور ہر قدم تخلیقی تھا اور وہ دل سے شاعر تھے، اگرچہ اُنھوں نے شعر لکھے نہیں۔

اپنے دفتر کے صبر آزما فرائض کے باوجود اور اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود وہ اُس وقت تک ساہتیہ اکادمی کی میٹنگ سے غیر حاضر نہ رہے۔ جب کہ اُن کے ڈاکٹروں نے اُن کی مصروفیات پر پابندیاں عائد کردیں۔ اس کے باوجود ڈیڑھ دن جانے سے پہلے اُنھوں نے ساہتیہ اکادمی کے ایگزیکٹو بورڈ، جس کی میٹنگ ۳۰ مئی کو ہونے والی تھی، کی صدارت کرنا منظور کرلیا تھا۔ یہ میٹنگ ہوئی لیکن روشنی چلی گئی تھی۔ "

[ساہتیہ اکادمی کے خبرنامے سے]

"مجھ پر اس کا جو تاثر ہوا ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں چند لمحوں کے لئے اپنے معمول کے ضبط سے کنارہ کش ہو کر آپ کی قدرِ اوّل کی دانشوری اور ممتاز صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کروں۔ انگریزی پر آپ کا عبور اُن حدود سے بھی بہت زیادہ ہے جن کا مجھے اب تک اندازہ تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے کچھ انتہائی قابل لوگ بھی اس نوعیّت کا کام کئی برسوں میں سرانجام دینے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ آپ کو اس کام کے لئے صرف چند گھنٹے صرف کرنا پڑے اور وہ بھی اس عالم میں کہ کسی خاص کوشش کا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔

ایک لحاظ سے ترجمہ طبعزاد لکھنے سے زیادہ مُشکل کام ہے۔ اصل تحریر کا ادبی مفہوم برقرار رکھنا اور ساتھ ہی ترجمے کے ذریعے مصنّف کے ادبی اسلوب کی ترجمانی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کو وہی شخص نبھا سکتا ہے، جسے دونوں زبانوں پر برابر کا عبور حاصل ہو۔ آپ کے ترجمے میں جو خاص بات مجھے بھائی ہے وہ یہ ہے کہ

اصل کی کسی خصوصیت پر آنچ نہیں آئی ہے اور آپ نے میرے اُردو اسلوب کو انگریزی میں اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ مجھے یہ سُن کر کوئی حیرت نہ ہوگی اگر کوئی قاری سمجھ لے کہ اصل چیز اُردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھی گئی تھی۔"

[ابوالکلام آزاد (جواہر لال کے نام ایک خط سے اقتباس]

جواہر لال نہرو

اس کرۂ ارض پر نسل انسانی کی تاریخ کے ہر صد سالہ دور میں چند ایک ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں جو ہم سب لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ جواہر لال نہرو ایک ایسی ہی ہستی تھے جنہوں نے گذشتہ برسوں میں مشرق و مغرب کے ملکوں کے سبھی باشندوں کو جس قدر متاثر کیا ہے اور جس طرح ہمیشہ ہماری بھلائی کے لئے ہم پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، اس کی دوسری کوئی مثال نہیں دی جاسکتی۔

حتیٰ کہ بعض اوقات جن لوگوں نے ان جانے میں ان پر بے جا نکتہ چینی کی ہے وہ برابر حسبِ دستور انہیں بھی متاثر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ان کی آزادروی کے پیش نظر آج دُنیا بھر میں ان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے اور اپنی دیانت داری اور شخصیّت کی بدولت آج وہ محبوبِ عالم بنے ہوئے ہیں۔

وہ ایک پیدائشی قائد تھے اور انہوں نے ہمیشہ ہی قیادت کی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے لئے میری شیفتگی کا آغاز اُن دِنوں سے ہوتا ہے جن دِنوں وہ گاندھی جی کے ایک نوجوان پیرو کار تھے۔

بعض اوقات میرے مُلک کے لیڈروں نے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے تئیں عدمِ مفاہمت کا اظہار کیا اور مجھے اس پر انتہا افسوس بھی ہوا۔ لیکن اس کے برعکس مجھے اُن کی عظمت کا اور بھی قائل ہونا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے نہ تو کسی انتقامی کارروائی نہ ہی کسی قسم کی تلخی کا اظہار کیا۔ مزید برآں وقت نے ان کے سیاسی موقف پر دُرست ہونے کی مہر ثبت کردی ہے۔

ان کی سرکردگی میں ہندوستان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک محدود کام دیتا رہا۔ اور ہندوستان کے عوام دونوں اطراف کو یکساں طور پر سمجھتے رہے۔ تاریخ انسانی کے اس

انتہائی نازک دور میں جواہر لال نہرو نے اپنے عوام کے درمیان یگانگی اور یکسانیت پیدا کرکے انہیں ایک اس قدر مضبوط اور طاقتور قوم اور مُلک بنا دیا ہے کہ آنے والی صدیوں میں اس کا استحکام برابر قائم رہے گا۔

میں جواہر لال کی شخصیّت کے دیگر پہلوؤں، ان کی جاذب و پُرکشش شخصیت، فہم و ادراک، شان و شوکت اور آداب وغیرہ کو فراموش نہیں کر سکتی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اگر ہمارا یہ زمانہ قدرے مزید امن و امان کا دَور ہوتا تو وہ ایک مصنّف کے طور پر دُنیا کے سامنے آتے، کیونکہ ان کا اسلوب بیان منفرد تھا اور ان کے تخیّل کی پرواز اعلیٰ و ارفع تھی۔

مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ اگر انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں اپنی صلاحیتیں اپنے مُلک کے لئے وقف نہ کی ہوتیں تو ان کے قلم سے جو کتابیں عالمِ ظہور میں آتیں، آج دُنیا ان کتابوں سے محروم ہو گئی ہے۔ تاہم انہوں نے جو چند ایک کتابیں لکھی ہیں۔ مجھے ان سے بے حد تسکین ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کی سبھی تصانیف بُنیادی اہمیّت کی حامل ہیں۔ مگر یہ محسوس کرتی ہوں کہ ہندوستان کو کتابوں کی نسبت ان کی روزانہ اور عملی قیادت کی زیادہ ضرورت تھی۔

جواہر لال نہرو کو کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے گاندھی جی کے زیرِ سایہ اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے طور پر مطلعِ اُفق پر پُورے جلال کے ساتھ اُبھرے اور وہ جدید ہندوستان کی عظیم شخصیّت کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ساری دُنیا کے چند ایک ایسے عظیم افراد میں سے تھے جو ہمیشہ زندہ رہے ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شری نہرو اگرچہ ہندوستان کے لیڈر تھے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کی اکثر اقوام اُس کو اپنا ہی قائد تصوّر کرتے تھے۔

[پرل ایس بک]

تبلوۂ صد رنگ!

ہندوستان کا یہ عظیم رہنما اور چوٹی کا مدبّر اور لیڈر کیسی دلآویز شخصیّت رکھتا تھا، اس

کا وُہ تبسّم جو گرد و پیش کی ہر کثافت اور دِلوں کے ہر غُبار کو دُور کر سکتا تھا۔ جس سے پتھر بھی پگھل جاتے تھے، جس میں چاندنی کی سی لطافت اور دِلاسائی تھی اور نسیم سحری کی سی تازگی اور رحمت، و رافت، اُس کی بچوّں سے گہری دِلچسپی، جس کے پیچھے انسانیت کی معصومیت اور اُس کے مستقبل کے امکانات سے لگن پوشیدہ تھی۔ اُس کی حُسن اور حُسن کاری کے ہر جلوے اور ہر ادا سے محبّت، بڑے سے بڑے بیرونی مہمان کی موجودگی میں بھی ادبی مجلسوں میں شرکت کے لئے وقت نِکالنا، پالم سے سیدھے ساہتیہ اکادمی کے جلسے کے لئے دوڑنا، سیاست کے پیچ و خم سُلجھاتے ہوئے، کسی ادیب کی مدد، کسی شاعر کی ہمّت افزائی، کسی مصوّر کی سرپرستی، کسی فن کار کی دیکھ بھال کے لئے وقت نِکالنا، سب کے دُکھ درد میں شریک ہونا، سب کا دِل رکھنے کی کوشش کرنا، غریب طالب علموں کی مدد کرنا اور ان کی زندگی سنوارنا، اُن پُرانے ساتھیوں کے بال بچوں تک کی سرپرستی کرنا جن سے سیاسی اختلاف تھا۔ ہر ظُلم اور زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہونا، ہر تعصّب اور تنگ نظری کا مقابلہ کرنا، خطروں سے کھیلنا، فسادیوں کے مشتعل ہجوم میں کُود پڑنا اور اُن کی خبر لینا۔ اس کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ہر کرشمہ دامنِ دِل کو کھینچتا ہے کہ تیری جگہ یہیں ہے۔"

[آل احمد سرور]

پنڈت جواہر لال نہرو صرف ہندوستان کے وزیر اعظم ہی نہیں تھے، وہ ہندوستان کی سب سے محبوب شخصیت بھی تھے۔ انہوں نے نہ صرف گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان کو آزاد کرایا بلکہ آزادی کے بعد ہماری نئی جمہوریت کی تعمیر کی اور اسے استحکام بخشا۔ انہوں نے غیر مذہبی ریاست کے تصوّر کو دِلوں میں راسخ کیا اور سوشلزم کی منزل کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ انہوں نے ہندوستان کو عالمی مسائل کا احساس دلایا اور دُنیا میں امن اور انسانیت کا پرچار کر کے ہندوستان کو اقوامِ عالم میں سر بلند کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی دلآویز شخصیت، ان کی پچاس سال تک ہندوستان اور انسانیت کی خدمت، ان کی بے مثل ادبی اور علمی خدمات، ان کی نظر کی بلندی، دِل کی وُسعت، اخلاق کی پاکیزگی اور ان کی مظلوم اور ستم رسیدہ انسانیت سے گہری ہمدردی انہیں انسانوں کے محسنوں اور قائدوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی ساری تاریخ سے ان کی محبّت، مُشترک تہذیب سے ان کا عشق، یک جہتی

اور اتفاق و اتحاد کے لئے ان کی پیہم کوشش، تمام قومی زبانوں کی ترقی کے لئے ان کی مساعی، اُردو کے ساتھ انصاف کے لئے ان کی مسلسل کاوش رہتی دُنیا تک ہمیں اُن کی یاد دِلائے گی۔"

[انجمن ترقی اُردو ہند کی قرار داد]

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک پُورا جگ آج ختم ہو گیا۔ اس کے بعد نیا جگ کیسا ہو گا؟ خدا کرے بہتر ہو۔ مگر جواہر لال جیسے لوگ روز نہیں پیدا ہوتے۔ وہ صرف ایک ذات نہیں تھے۔ وہ ایک علامت تھے، مُلک کے ترقی پذیر رُجحان اور خوب سے خوب تر مستقبل کی ایک حوصلہ انگیز اور اُمید افزا علامت۔ وہ آج کی ساری دُنیا میں ہندوستان کی آبرو تھے۔"

[مجنوں گورکھپوری]

"گاندھی جی کے بعد بس وہی ایک نام ہے... جو ہندوستان کی ترجمانی کرتا ہے... جو خود ہندوستان ہے... میں نے زندگی میں کسی ایسے سیاست دان کو نہیں دیکھا جو اُن کی طرح نفرت اور عداوت سے دُور ہو۔ میں اُن کی آتما کو پرنام کرتا ہوں۔"

[آچاریہ ونوبا بھاوے]

"ہندوستان کے عظیم ترین سپوتوں میں سے ایک گذر گیا ہے۔ نیکی اور عظمت کی ایک بہت ہی نادر زندگی کا اچانک خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہ صرف ایک انفرادی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ اس قوم کی زندگی میں ایک دَور کا خاتمہ ہے۔ اس دَور کی روشنی آنے والی نسلوں کے راستے پر اُجالا کرے گی۔ سترہ طویل برسوں تک اکیلے ہندوستان کی آزادی کی مشعل جلائے رکھی۔ اور اپنی زندگی کا ہر ایک لمحہ، ہر ایک دِن مُلک اور انسانیت کی خدمت میں وقف کیا۔ قوم کی زندگی کے ان برسوں پر اُن کی عظیم اور شاندار شخصیت کے نقوش ثبت ہیں۔ اُن کی عظمت اور شان ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گی۔"

[گلزاری لال نندہ]

"جواہر لال نہرو ایک عظیم عالمی شخصیت تھے اور اُنہیں شاید دُنیا کے مدبّروں کا سرگروہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اُن کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کو آسانی

سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ناقابلِ یقین حد تک نفرت کے جذبات سے مُبرّا تھے۔ ہم انگریزوں نے اُنھیں کئی بار جیل میں ٹھونسا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی تلخی نہیں دِکھائی۔ ان دو اقوام کا میل ملاپ بڑھانے کے لئے جو کچھ اُن سے ہو سکتا تھا وہ اُنہوں نے کیا۔ وہ مہاتما گاندھی کے آدرشوں کے وارث تھے۔ "

[لارڈ کلیمنٹ ایٹلی سابق وزیر اعظم برطانیہ]

" انسانیت کے جنگل میں ایک عظیم طویل القامت درخت گر گیا ہے ... ... ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر کھو گیا ہے اور عالمی امن، انصاف اور بھائی چارے کا ایک مؤثر ترین وکیل گُم ہو گیا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے عظیم کارناموں کو زیادہ بہتر سمجھا جائے گا۔ "

[چیسٹر باؤلز امریکی سفیر برائے ہند]

" ہندوستان ایک ایسے آدمی سے محروم ہوا ہے جو اس کے عظیم ترین فرزندوں میں سے تھا۔ اور دُنیا کے بزرگ ترین سیاست دانوں میں سے ایک کھو گیا ہے۔ تمام ایشیا اور دُنیا میں اُن کا نام آزادی اور نو آبادیاتی راج کے خلاف جدوجہد کی علامت بن گیا تھا۔ "

[ٹنکو عبدالرحمٰن وزیر اعظم ملائشیا]

جواہر ریزے

(صفحہ ۱۶۰ سے آگے)

سماجی تبدیلی بھی ضرور آنی چاہیئے۔ اگر ہم یہ سوچتے ہیں کہ سوشل مرکز میں تبدیل ہوئے بغیر ہم سانس لے سکتے ہیں تو ہم کبھی بھی سیاسی اور صنعتی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ کھینچاؤ اور دباؤ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ ہمیں جدوجہد اور عمل کو تیز کرنا ہے، آگے بڑھنا ہے۔ ہم امن اور عدم تشدّد کی بات کرتے ہیں، لیکن ہمارا عمل ان کے برعکس ہے۔ ہم قوتِ برداشت کی باتیں کرتے ہیں لیکن عمل بالکل مختلف ہے۔ "

[ترجمہ: شکیل الرحمٰن]

سونِ ادب

کشمیری زبان میں لکھی گئی ۱۹۵۹ء کی بہترین ادبی تخلیقات کا حسین مُرقع، جس میں اس سال کے منتخب افسانے، ڈرامے، مضامین، غزلیات، منظومات اور مزاحیہ خاکے شامل ہیں۔

قیمت: چار روپے

ہمارا ادب ۵۹ء

سالِ مذکورہ میں تخلیق شدہ اُردو کی نمایندہ نگارشات کا انتخاب، جس میں سرزمینِ کشمیر کے چیدہ چیدہ اُردو مصنّفین کے فن پارے جمع کیے گئے ہیں۔

قیمت: چار روپے

مِلنے کا پتہ

جموّں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

دوماهی # شیرازہ سرینگر

ستمبر ۱۹۶۴ء

جلد ۳ ——— شمارہ ۵

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

شیرازہ میں

کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی
کی منظومات شائع ہوتی ہیں بشرطیکہ اُن
کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔

(ایڈیٹر)

ہمارے مصور ________ نثار عزیز

مضمون : صفحہ : ۱۰۳



اُف صبح ہوئی





میسور ٹروپ اکادمی کے صدر جناب صادق کے ساتھ



حرفِ آغاز

"شیرازہ" کی حدود کو اور زیادہ ہمہ گیر بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اکادمی کی سنٹرل کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ اب "شیرازہ" ڈوگری، ہندی اور کشمیری زبانوں میں بھی شائع ہوا کرے گا۔ ان زبانوں میں فی الحال سال میں دو دو بار "شیرازہ" چھپا کرے گا اور اس کی ابتدا اسی سال سے ہو رہی ہے۔ اُردو "شیرازہ" کے معمول میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان تمام زبانوں میں ایک ہی جیسے مضامین چھپا کریں۔ یہ دُرست ہے کہ مشترکہ اہمیت کے معیاری مضامین کو تمام زبانوں میں پیش کرنے پر اکادمی کو مسرّت ہوگی۔ مگر بُنیادی طور پر ہر رسالہ اپنی زبان کے مخصوص مسائل اور اُس کے خاص مزاج کا ترجمان ہوا کرے گا۔

اس سال بھی حسبِ معمول اکادمی ریاست کی زبانوں میں تخلیق کی گئی بہترین نگارشات کو انتخابی مجموعوں کی صورت میں چھاپنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لئے مصنفین سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اپنی نگارشات اکادمی کو بھیج کر انتخاب کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ اُمید ہے کہ اس سال بھی اہم قلم کار خاطر خواہ تعاون سے نوازیں گے!

محمد یوسف ٹینگ

شبیر احمد خان غوری

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

اور اُن کے رسالہ "الدرۃ الثمینہ" کا تعارف

"علماء کا مرتبہ شعرا اور فن کاروں سے کم نہیں ہے۔ پھر علامہ سیالکوٹی، جیسا کہ میں سابق عریضہ میں عرض کر چکا ہوں، کشمیری الاصل ہی تھے اور کشمیری اساتذہ کے قابلِ فخر شاگرد۔ اُنہیں تو کشمیر کے مخصوص "علمی مکتب" کے نمایندے کی حیثیت سے بجا طور سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ بجا طور پر اس بات کے مستحق ہیں کہ آپ کی اکادمی اُن کے احوال و آثار نیز افکار پر مستقل تصنیف بلکہ تصانیف شائع کرے۔

اس کے ساتھ وہ ہندوستان کے قابلِ فخر و مباہات عبقری ہیں جنھوں نے اپنے شاہکار "الدرۃ الثمینہ" کے ذریعے ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کو ایران کے مقابلے میں بحال کیا۔ کشمیری عبقریت کا یہ شاہکار اکادمی کے اشاعتی پروگرام میں اوّلین توجہ و اہتمام کا مستحق ہے۔ واضح رہے کہ البیرونی ہندوستانی نہیں تھا۔ بایں ہمہ اُس کی "القانون المسعودی" کو جو ہندوستانی عبقریت کا کسی طور سے نتیجہ نہیں کہی جاسکتی مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے ایما سے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے خصوصی طور پر شائع کیا اور اس سے زیادہ یہ کہ یہ اشاعت مسز وجے لکشمی پنڈت صاحبہ کے نام نامی کے ساتھ معنون ہوئی۔ کیا کشمیر میں آج کوئی ایسا دانش مند نہیں ہے جو اپنی توجہ سے اس خطۂ بے نظیر کے عبقری اعظم کی کاوش کو منظرِ عام پر لے آئے اور اس کے صلے میں اس لافانی شاہکار کے ساتھ ساتھ بقائے دوام حاصل کرے۔"

نیاز مند: شبیر احمد خان غوری

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی قرونِ وسطیٰ کے اُن فضلا میں سے ہیں جن پر ہندوستان بجا طور پر فخر

کر سکتا ہے۔ علمائے ہند میں سے کم باکمالوں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ دیگر ممالک اسلامیہ میں اُن کی مصنفات کو قبولِ عام نصیب ہوا ہو۔ "تفسیر بیضاوی" پہ علامہ کا حاشیہ ہندوستان میں نہیں بلکہ اپنی ضخامت کے باوجود مصر میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اسی طرح "شرح المواقف" پر جو دو تین حاشیے شائع ہوئے ہیں اُن میں سے ایک علامہ کا حاشیہ ہے اور جس طرح اُن کا "حاشیہ تفسیر بیضاوی" "بیضاویات" کی "کلاسکس" میں محسوب ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ "حاشیہ شرح المواقف" اپنے فن کی ادبیات عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان سے زیادہ اہم علامہ کا رسالہ "الدرۃ الثمینہ" ہے۔ علامہ کا یہ شاہکار اُس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی ہے جس کا آغاز امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں کیا تھا اور جسے سُلطان محمد فاتح کے عہد میں مولیٰ علاؤ الدین طوسی نے "کتاب الذخیرہ" میں اور مولیٰ خواجہ زادہ نے اپنے "تہافت الفلاسفہ" میں پروان چڑھایا تھا۔ اسی طرح سیالکوٹی عبقریت کا یہ "گوہرِ بے بہا" (الدرۃ الثمینہ) اُس علمی تحریک کا مفتتح بنا جو بعد میں عرصہ تک "مسئلہ علم واجب" کے عنوان سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں رونق ہنگامہ بنی رہی (تفصیل اپنے اپنے مقام پہ آ رہی ہے)

اس اجمالی تعارف سے سیالکوٹ کے اس باکمال کی عبقریت کا جو اصلاً کشمیری ذہانت و فطانت کا مظہر جمیل تھا، اندازہ ہو گیا ہو گا۔ لیکن ہر چند کہ علامہ سیالکوٹی اپنے عہد کے آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے مگر اس صدی کے آغاز سے علمی جمود و بے حسی اور پاستان فراموشی کی جو گھنگھور گھٹا ہمارے قومی حافظہ پر چھانا شروع ہوئی ہے، اُس کی تاریکی میں ماضی کے دوسرے درخشاں ستاروں کی طرح یہ آفتاب علم و فضل بھی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔

اس مختصر یادداشت میں اس عبقریٔ عہد کو متعارف کرایا جا رہا ہے جس نے اپنے زمانہ میں روم اور ایران کے اندر بھی ہندوستان کی علمی عظمت کا سکّہ بٹھا دیا تھا۔

الف: مختصر حالاتِ زندگی

نام و نسب: عبدالحکیم نام تھا۔ پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا۔ چنانچہ خود رسالہ "الدرۃ الثمینہ" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"یقول العبد المسکین عبدالحکیم ابن شمس الدین"

خاندان اور ابتدائی زندگی: دیگر باکمالوں کی طرح علامہ عبدالحکیم کے خاندان اور ابتدائی

زندگی کے حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ اُن کے والدِ ماجد کشمیر کے ایک علمی خاندان کے فرد تھے جنہوں نے دسویں صدی کے آخر میں اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح سیالکوٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہیں عہدِ شاہجہانی کا یہ فاضلِ بے عدیل گیارہویں صدی کے آغاز کے قریب پیدا ہوا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں: "مولد و منشا او سیالکوٹ از توابع لاہور است"[1]

اعلیٰ تعلیم اور سلسلۂ تلمذ

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی نشو و نما سیالکوٹ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی تفصیلات معلوم نہیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے ملّا کمال الدین کشمیری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ چنانچہ عبدالحمید نے "بادشاہ نامہ" کے اندر علامہ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"اکثر علوم نزد ملّا کمال کشمیری کہ در سیالکوٹ مسکن داشت و با نوادر ریاضت باطنی روشن، تلمذ نمودہ است۔"[2]

ملّا کمال الدین اپنے چھوٹے بھائی مولانا جمال الدین کی طرح کشمیر کے مشہور نیک نفس عالم و شیخ بابا فتح اللہ کے شاگرد اور داماد تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دونوں بھائیوں نے علیحدہ علیحدہ سمتیں اختیار کیں۔ مولانا جمال الدین نے رشد و ہدایت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اور ملّا کمال الدین نے درس و تدریس کے لئے۔ چنانچہ مصنّف "واقعات کشمیر" موخر الذکر کی علمی صلاحیتوں اور فیض رسانیوں کے باب میں رطب اللسان ہیں:

"مطلع الانوار لایزال ملّا کمال برادر مولانا جمال است۔ حلّال دقائق و کشّاف حقایق بود۔ نسبت علمی غالب داشت۔ چنانچہ برادر عالی قدرش را جہت تقوی راجح بود.... در سیالکوٹ و لاہور مسند افادۂ علوم بیار است۔"[3]

[1] تذکرہ مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴ - غالباً آزاد بلگرامی کا ماخذ عبدالحمید لاہوری کا بادشاہ نامہ ہے۔ چنانچہ موخر الذکر نے علامہ سیالکوٹی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"مولد و منشأ او قصبۂ سیالکوٹ است۔" (بادشاہ نامہ جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۰۴)

[2] بادشاہ نامہ جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۰ - ۳۴۱

[3] "واقعات کشمیر" صفحہ ۱۵۵ ب

ملّا کمال الدین غالباً ۹۷۱ھ میں کشمیر سے سیالکوٹ آئے تھے۔ ۱۰۱۷ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور لاہور میں دفن ہوئے۔

ایسے باکمال اُستاد کے فیضِ تربیت نے اگر وقت کے عظیم دانش ور پیدا کئے ہوں تو اس میں کیا تعجب ہوسکتا ہے۔ ان دانش وروں میں دو شخصیّتیں قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور حضرت مجدّد الف ثانی رح چنانچہ "واقعاتِ کشمیر" کے مصنف ملّا کمال کشمیری کی فیض رسانیوں کے باب میں لکھتے ہیں:

"عالمے از فیضِ خدمتش بصاحب کمالی برخاست ... ... حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی ہم اوائل حال کسب علوم صوریہ در صحبتِ او کردہ۔ علمائے بسیار مثل مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی از خدمتش مستفید گردیدند۔"[۵]

اس شفیق اُستاد کے آغوشِ تربیت میں علامہ سیالکوٹی نے علم و فضل کے مراحل طے کئے اور جلد ہی اُن کے فیضِ تلمّذ کے یمن و برکت سے علم و فضل کے آسمان پر بدرِ کامل بن کر چمکنے لگے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"در عنفوانِ سن تمیز ہمت بہ علم برزد۔ بیشتر نزد مُلّا کمال الدین کشمیری کہ متوطن بلدۂ سیالکوٹ بود بلند پرواز عالم ملکوت بُود، تلمّذ نمود۔ در فرصت کمی ہلال استعدادش بدرِ کامل گشت۔"

(مآثر الکرام ـــ صفحہ ۲۰۴)

حضرت مجدّد الف ثانی رح سے دوستانہ تعلقات کا آغاز

اسی زمانہ میں شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدّد الف ثانی رح) کے ساتھ جو ملّا کمال کشمیری کے شاگردِ رشید تھے، علامہ کے دوستانہ تعلقات اُستوار ہونا شروع ہوئے۔ اس وقت "توحید وجودی" (یا عقیدۂ ہمہ اوست) کا بڑا چرچا تھا اور یہ دونوں باکمال اس نظریے کے بڑے زبردست علمبردار تھے۔ مگر بعد میں شیخ احمد سرہندی رح نے اس سے رجوع فرمالیا اور اس کے متبادل "توحید شہودی" (یا ہمہ از وست) کا نظریہ وضع کیا۔ لیکن علامہ عبدالحکیم آخر تک شیخ ابن عربی کے عقیدت مند اور نظریہ وحدت الوجود کے قائل رہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

غالباً اسی زمانہ میں علامہ سیالکوٹی نے شیخ احمد سرہندی رح کو اُن کے تبحرِ علمی اور قوّتِ مناظرہ کی بنا پر "اسد العلماء" کے نام سے موسوم کیا۔

درس و تدریس کا آغاز: تعلیم سے فراغت کے بعد دونوں دوستوں نے اپنے اپنے لئے مختلف

[۵] واقعاتِ کشمیر صفحہ ۱۵۵ باب ۹

شاہراہیں اختیار کیں۔ شیخ احمد سرہندی رح نے رشد و اصلاح کا کام اپنے ذمہ لیا اور اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے نتیجہ میں آخر کار "مجدد الف ثانی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ علامہ عبدالحکیم رح نے مسندِ درس و افادہ کو رونق بخشی اور جلد ہی اُن کے فیضِ تلمذ نے بے شمار فضلا پیدا کئے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :

"عرصۂ جہاں را بلوامع فیض مملو ساخت" [1]

درباد میں مقبولیت

اپنے معاصرین کی اکثریت کی طرح علامہ عبدالحکیم بھی اوائل حال میں، بالخصوص عہد جہانگیری (۱۰۱۴ — ۱۰۳۷ھ) کے اندر درباری زندگی سے الگ تھلگ درس و افادہ میں مشغول رہے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :- "درعہد جہانگیری بہ معاش ضروری ساختہ در وطنِ مالوف بسر می برد۔" [2]

آزاد بلگرامی کا ماخذ عبدالحمید لاہوری کا "بادشاہ نامہ" ہے۔ چنانچہ موخر الذکر نے لکھا ہے :

"در ایّام سعادت فرجام حضرت جنّت مکانی بضروایات معیشت درساختہ عزلت گزین بود۔" [3]

لیکن اس بے تعلقی کے باوجود ان کے علم و فضل کی شہرت سیالکوٹ اور لاہور کے علمی حلقوں سے نکل کر شاہی دربار تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ معتمد خان بخشی نے جو عہد جہانگیری کا سرکاری مؤرخ ہے "اقبال نامہ" جہانگیری کے آخر میں فضلائے عہد کی جو فہرست دی ہے اُس میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام بھی شامل ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "اقبال نامہ" کی اس فہرست میں جو صرف سترہ[1] علما کے ناموں پر مشتمل ہے علامہ سیال کوٹی کے متاخر معاصرین (جن کا تذکرہ عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں کیا ہے باستثنائے علامی افضل خان) میں سے کسی باکمال کا نام نہیں ہے۔[4] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی اُن

---

[1] تذکرۂ مأثر الکرام صفحہ ۲۰۴ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۴

[3] "بادشاہ نامہ" عبدالحمید لاہوری جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۱

[4] معتمد خان بخشی نے "اقبال نامہ" کے آخر میں "ذکرِ فضلاً کہ معاصر زمان اشرف بودند" کے عنوان سے عہدِ جہانگیری کے منتخب روزگار علما کی فہرست دی ہے وہ حسب ذیل ہے : ملّا روز بہان شیرازی، ملّا شکر اللہ شیرازی، ملّا تقیائے شیرازی، میر ابوالقاسم گیلانی، اعمیٰ عمری، ملّا باقر کشمیری، ملّا باقر نہتی، ملّا مقصود علی، قاضی نور اللہ، ملّا فاضل کابلی، ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملّا عبداللطیف سلطان پوری، ملّا عبدالرحمٰن بھورہ گجراتی، ملّا حسن فراغی گجراتی، ملّا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، ملّا محمد جونپوری۔" (اقبال نامہ صفحہ ۲۰۸) شیرازہ

کی علمی زندگی کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ فضلائے عہد کے درمیان اُنہوں نے اپنا مقام پیدا کرلیا۔

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اُسے علما و فضلا کی تربیت خاص طور سے منظور تھی۔ علامہ عبدالحکیم جیسے باکمال اُس کی جوہر شناس نگاہوں سے کس طرح اوجھل رہ سکتے تھے۔ لہٰذا ئے بادشاہ نے اُن کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :۔

"چوں نوبت دارائی ہندوستان بہ صاحب قران شاہ جہاں انار اللہ برہانہ رسید، طائفہ علما و شعرا را رواجے دیگر پدید آمد ملا دریں عہد بارہا خود را بدرگاہ خلافت رسانید۔ ہر گاہ وارد حضور می گردید، بہ رعایت نقود نامحدود مخصوص می گشت و دوبار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ بر رسم سیورغال انعام شد۔ ملا بحضور خاطر و فراغ بال در وطن مالوف اقامت داشت و تخم علم و فضل در سرزمین سینہ ہا و سفینہ ہا می کاشت۔"

(مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴ - ۲۰۵)

اسی طرح عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا ہے :

"دریں دولت خداداد کہ بازار دانش رواج دیگر گرفتہ است و کار دانش وراں از سر اسباب رفاہیت حال و فراغت بال ہم دارد۔ چندے در لبت برسم سیورغال بدو مرحمت شدہ۔ و ہر گاہ بدرگاہ عرش اشتباہ آمدہ کامیاب حضوری گردد۔ از دریا بار افضال شاہنشاہ بیہمال مبالغ گراں مند نقد نیز می یابد و بے تفرقۂ خاطر بوظائف دُعائے کامروائی اولیائے سلطنت جاوید طراز و افادۂ طلبہ می پردازد و در فنونِ علوم بنام بادشاہ دانش نواز تصانیف رائقہ دارد۔"

("بادشاہ نامہ" عبدالحمید لاہوری جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۱)

لیکن ۱۰۵۵ھ میں علامی سعد اللہ خان کے عہدۂ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد [جو علامہ عبدالحکیم سے نسبت تلمّذ بھی رکھتے تھے] بادشاہی انعام و اکرام میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ علامہ جب کبھی دربار میں تشریف لاتے تو انعامات جسیمہ سے بہرہ ور ہوکر واپس جاتے اور اُن کی یہ آمد باقاعدہ وقائع دربار میں قلم بند کی جاتی۔ چنانچہ عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس قسم کی دو تقریبات کا ذکر کیا ہے :

(۱) گیارہویں سال جلوس (۱۰۵۵ھ) کے واقعات میں رقمطراز ہیں :۔

"یازدہم صفر ... ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی بمرحمت خلعت شال وانعام دو لیست مہر سرافراز گشتہ بوطن سرخص گردید۔"[۵۱]

(۲) اگلے سال (۱۰۵۶ھ) جب کہ بادشاہ لاہور سے کابل جا رہے تھے اور جہانگیر آباد میں ٹھرے ہوئے تھے، علامہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہاں سے شاہی انعام کے ساتھ رُخصت ہوئے۔ مصنّف "بادشاہ نامہ" کا کہنا ہے :-

"بست وچہارم صفر ... ملّا عبدالحکیم را خلعت و دو لیست مہر عنایت نمودہ بہ سیالکوٹ بوطن اور رُخصت فرمودند۔"[۵۲]

اس کے علاوہ جب کبھی دربار میں کوئی بڑا علمی مناظرہ ہوتا [جو اُس عہد کا بڑا دلچسپ علمی مشغلہ تھا] تو علاّمہ کو خاص طور سے زحمتِ تشریف آوری دی جاتی۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

علمی ماحول و معاصرین

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے عہد کے آسمان علم و فضل کے ماہتاب تھے، آفتاب نہ تھے۔ اس تشبیہہ سے مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ علامہ اپنے زمانہ کے اُفق علمی کے واحد ستارے نہیں تھے بلکہ لاتعداد تاروں کے جھرمٹ میں روشن ترین کوکب درخشاں اور سہیل تاباں تھے جس کی روشنی میں وہ سہا بن کر ماند ہو گئے تھے۔

ہندوستان ہمیشہ سے علم و حکمت کا گہوارہ رہا ہے مگر مُغل تاجداروں کی قدر شناسی سے ایران و ماوراء النہر کے ارباب فضل و دانش کھینچے چلے آ رہے تھے اور شہر تو شہر قصبات و مواضعات بھی فراوانی علم و ادب سے رشک شیراز و اصفہان اور رشک سمرقند و بُخارا بن گئے تھے۔

اس زمانہ میں ایران علم و حکمت کا مرکز تھا۔ مگر یہ "مکتب خانۂ ہندوستان" کا کام دے رہا تھا۔[۵۳] علمائے ذی استعداد وہاں کسب حیثیات کرتے اور تبحر و تمہر حاصل کرنے کے بعد ہندوستان چلے آتے اور یہاں پہنچ کر اُسے اپنے "لوامع فیض" سے طبقہ یونان بنا دیتے جیسے مولانا شکراللہ شیرازی شاگرد میر ابراہیم ہمدانی و میر تقی الدین محمد نسابۂ شیرازی جو ترقی کر کے آخر کار شاہِ جہاں کے وزیر اعظم بن گئے۔[۵۴]

---

[۵۱] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۴۱۶ [۵۲] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۵۰۱

[۵۳] "چوں در دارالارشاد مذکور بافادہ و استفادہ مشغول بُود۔ ایں معنی بگوششش رسید کہ ایران مکتب خانۂ ہندوستان است و مستعدان کسب حیثیات در آنجا می نمایند کہ در ہندوستان در مجلس سامی ایں سپہ سالار بکار بیرند۔" (مآثر رحیمی جلد سوم حصہ اوّل صفحہ ۴۶)

ملا مرشد شیرازی جنہیں آخر میں شاہ جہاں نے مکرمت خان کا خطاب دیا[1]۔ قاضی نور اللہ شوستری کے صاحب زادے مولانا علاء الملک مرعشی جنہیں شاہ جہاں نے شاہزادہ محمد شجاع کا معلم مقرر کیا۔ مرزا احمد الدین شیرازی جو شیخ بہاء الدین عاملی کے شاگرد تھے اور جن کی حذاقت طبی سے متاثر ہو کر جہانگیر نے مسیح الزماں کا خطاب دیا تھا اور بھی فضلائے نامور، مکتب خانہ ایران سے آئے جیسے شیخ ابو تراب لاہوری[2]، حکیم فتح اللہ شیرازی[3]، میر محمد ہاشم گیلانی[4] موخر الذکر کو شاہجہاں نے عالم گیر کی معلمی پر مامور کیا تھا۔

شیراز کے علاوہ ایران میں علم و ادب کے اور بھی گہوارے تھے جیسے یزد جہاں سے سلطان حسین یزدی تشریف لائے[5]۔ شوستر جہاں سے حکیم محمد معصوم تستری (مصنف قرابا دین معصومی) آئے تھے۔

ہرات جہاں سے ملا فرخ حسین ہروی، قاضی محمد اسلم اور میرک شیخ ہروی آئے تھے۔ اول الذکر شاہزادہ محمد شجاع کی سرکار سے وابستہ ہو کر ڈھاکہ چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ قاضی محمد اسلم مولانا فاضل بدخشی اور شیخ بہلول لاہوری کے شاگرد تھے۔ جہانگیر نے انہیں کابل کا قاضی بنایا تھا اور وہ اس عہدے

پچھلے صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ[4]: افضل خان۔ نامش ملا شکر اللہ است ورزاد و بومش شیراز۔ ہمگی مراتب دانش و کمال نزد میر ابراہیم ہمدانی و میر تقی الدین نسابہ شیرازی اندوختہ بہ ہندوستان بہشت نشان آمدہ در سلک بندگاں حضرت جنت مکانی منسلک گشت ... ... وپس از انکہ اورنگ خلافت بجلوس مقدس آرائش پذیرفت ... ... از جوہر شناسی و قدر دانی حضرت خاقانی ... ... سال دوم سریر آرائی از تغیر ارادت خاں ... ... بپایۂ جلیل وزارت کل ممالک محروسہ رسید۔"

("بادشاہ نامہ" جلد اول صفحہ ۳۳۹۔۳۴۰)

[1] "در تذکرہ مہندسی مذکور است کہ در سنہ یک ہزار و پنجاہ و منہ وفات یافت مولانا مرشد شیرازی مخاطب بمکرمت خان۔ یکے از علمائے شیعہ امامیہ است۔ در شیراز و دیگر بلاد آں قطر تحصیل کرد پیش برادر کلان خود مولانا روزبہان شیرازی و دیگر افاضل روزگار تا آنکہ ماہر شد در فنون حکمی تخصیص ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب۔ بعدہ عزیمت ہند کرد و بشرف ملازمت صاحب قران ثانی مشرف گشت و عز امتیاز یافت۔ مدتے خان سامان بادشاہ بود و باوجود این مشغلہ درس می گفت و علوم حکمی و فنون ریاضی تعلیم می فرمود۔"

(تذکرہ باغستان از امام الدین الریاضی مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی ورق ۱۶۸)

[2] شیراز سے گجرات آئے جہاں شیخ وجیہہ الدین گجراتی سے خرقۂ خلافت لیا۔ پھر لاہور چلے گئے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پر عہدِ شاہجہانی تک مامور تھے۔[۶] ملّا میرک شیخ ہروی پہلے داراشکوہ کے اور بعد میں شاہزادہ مُراد کے معلّم مقرر ہوئے[۷]

بقیہ فُٹ نوٹ: جہاں قاضی محمد افضل وغیرہ سے پڑھا۔ وہیں ۱۰۷۱ھ میں وفات پائی۔ علومِ حکمیہ میں ماہر تھے۔

۳؎ امیر فتح اللہ شیرازی کے پوتے تھے۔ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پہلے امام قلی بن اللہ وردی خاں کی مُلازمت کی۔ اُس کی وفات کے بعد ہندوستان چلے آئے جہاں شاہ جہاں کے اطبا میں داخل ہوئے۔ طبّ میں حذاقت کے علاوہ علومِ حکمیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

۴؎ میر محمد ہاشم معروف بہ حکیم ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی است۔ مدّت دوازدہ سال در حرمین شریفین بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم حیاتی و ملّا علی نبیرہ ملّا عصام الدین مشہور و معقولات را از میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور و مرزا ابراہیم ہمدانی فرا گرفتہ بہندوستان آمد و طبّ و ریاضی نزد سر آمد اطبا حکیم علی گیلانی ورزیدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود . . . . پس از انقضائے مدّتے ملزم عبودیت سدّہ سینہ گشتہ بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج سعادت پادشاہزادہ محمد اورنگ زیب بہادر یافت . . . . . . بر تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ بنام نامی حضرت شاہنشاہی۔"

("بادشاہ نامہ" جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۵ - ۳۴۶)

۵؎ عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے اور عالمگیر کے زمانہ میں درجۂ امارت تک پہنچے۔ ہیئت و ہندسہ اور حساب وغیرہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ وفات ۱۰۹۲ھ

۶؎ "قاضی محمد اسلم در بلدۂ فاخرہ ہرات متولد گردید و در دار الملک کابل توطن بر گزید . . . . . . در اوائل سلطنت جہانگیری بہ ارادۂ تحصیل علم جانب لاہور شتافت و در حلقۂ درس شیخ بہلول کہ از صنادید علمائے آں مکان بود تلمذ نمود و بعد از تکمیل تحصیل بہ مستقر الخلافہ اکبر آباد رفتہ باریاب محفل جہانگیری گردید . . . . و منصب قضائے کابل تفویض یافت . . . . . . (زاں بعد) جہانگیر بادشاہ اورا در حضور طلبیدہ قضائے عسکر ارزانی داشت و چوں صاحب قران شاہجہان سریر سلطنت را آرایش داد قاضی را بہماں عہدہ بحال داشت۔"

(مآثر الکرام صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۸)

۷؎ "ملّا میرک شیخ ہروی در عنفوان شباب از ہرات بہندوستان آمدہ بیشتر متداولات نزد ملّا عبدالسلام لاہوری اکتساب نمودہ و در ایّام برنائی بزیارت حرمین محترمین موفق گشتہ پیش اکابر محدثین آں اماکن بعض مواطن کُتب احادیث بسند رسانید و از انجا برگشتہ در زمرۂ بندگان ایں آستان عرش مکان در آمد۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایران کے علاوہ ماوراء النہر کے فضلا نے بھی ہندوستان کا رُخ کیا۔ ان کے اسلاف بابر و ہمایوں کے ساتھ آئے تھے مگر اکبر اور اُس کے جانشینوں کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اکبری عہد کے ان نو وارد علما میں غازی خان بدخشی، قاضی عبدالسمیع اندجانی، قاضی خوش حال تاشقندی زیادہ مشہور تھے۔ اسی زمانہ میں شیراز کے ایک باکمال مرزا جان شیرازی جو محقق دوانی کے شاگرد خواجہ جمال الدین محمود کے تلمیذِ رشید تھے[۵] صفوی حکمرانوں کے تعصب سے بچنے کے لئے ماوراء النہر چلے گئے۔ وہاں جن لوگوں نے اُن سے کسب کمال کیا اُن میں دو بزرگ بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ مولانا یوسف کوسج قراباغی اور ملّا فاضل بدخشی۔ مولانا یوسف کوسج تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے بلخ اور پھر سیفدون سمرقند گئے اُن کی تصانیف میں شرح عقائدِ عضدی کا حاشیہ اور تلامذہ میں مولانا عوض وجیہہ بلخی مشہور ہیں[۶]۔ مولانا فاضل بدخشی نے پہلے کابل میں ملّا صادق حلوائی سے پڑھا۔ پھر توران (ماوراء النہر) پہنچے جہاں پہلے مرزا جان شیرازی سے کسب کمال کیا اور اُن کے بعد فنونِ حکمیہ کی تکمیل اُن کے شاگرد مولانا یوسف کوسج سے کی۔ پھر لاہور آئے جہاں ملّا جمال لاہوری سے تفسیر و اصول کی تکمیل کی۔ عہد جہانگیری میں میرِ عدل[۳] تھے۔ تلامذہ میں میر زاہد ہروی (پسر قاضی محمد اسلم ہروی) مشہور ہیں جو "زواہد ثلاثہ" کے مصنف ہیں۔

بقیہ فٹ نوٹ: نخست بدولت تعلیم مہین کوکب اقبال پادشاہزادۂ کامگار محمد داراشکوہ تارک اعتبار برافراخت۔ والحال بخدمت معلّمی ثمرۂ شجرہ سلطنت پادشاہزادہ مُراد بخش سرافراز است۔"

("بادشاہ نامہ" جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۴)

[۵] "مولانا مرزا جان شیرازی در سنہ نہصد و نود و پنج وفات یافت۔ شاگرد خواجہ جمال الدین محمود است و او شاگرد مولانا جلال الدین دوانی است۔" (باغستان ورق ۶۸ ا)

[۶] "شیخ معمر مولانا یوسف کوسہ ابن محمد خان قراباغی ... یکے از اعیان مشہورین و فضلائے مذکورین بودہ شاگرد امام علامہ مولانا مرزا جان شیرازی است۔ بعد از کسب کمال بہ بلخ آمد۔ بعدہ بہ سمرقند رفت و در سفیدون ... سمرقند اقامت ورزید مدتے درس می گفت و ہمانجا وفات یافت ... و از جملہ تلامذہ او مولانا میر عوض کاشانی است و مولانا کمال الدین فرایفی و مولانا صالح بدخشی و مولانا حاجی عوض زرد اندجانی و مولانا عوض وجیہ بلخی و از مصنفات اوست حاشیہ بر شرح عقائد جلالی و حاشیہ بر شرح چغمنی و شرح اثبات واجب قدیم دوانی۔" (باغستان ورق ۶۸۰ب - ۶۸۱ ا)

۱۰۵۶ھ میں بلخ فتح ہوا۔ لہٰذا یہاں کے اکثر علماء بھی ہندوستان چلے آئے۔ ان میں سب سے ممتاز مولانا عوض وجیہ تھے جنہوں نے میر عوض تاشقندی اور مولانا یوسف کوسج سے پڑھا تھا۔ شاہ جہاں نے اُنھیں مُفتی لشکر مقرر کیا تھا۔ بعد میں عالم گیر کے زمانہ میں محتسب مقرر ہوئے۔ مولانا عوض وجیہ بلخی سے علامہ کی دلچسپ مُلاقات کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ان نو وارد علما کے علاوہ خود ہندوستان اساطینِ فضلا سے معمور تھا:۔

دہلی میں شیخ عبدالحق محدّث دہلوی اور اُن کا خاندان بالخصوص اُن کے صاحبزادے مفتی نورالحق حدیث کی نشر و اشاعت میں سرگرم تھے۔ دوسرا مشہور خاندان خواجہ باقی باللہ رح کا تھا۔ اُن کے صاحبزادے عبداللہ اپنے عہد کے مشہور عالم تھے۔ دوسرے خاندانی علماء مفتی حسام الدین اور مفتی رکن الدین تھے۔ اوّل الذکر مفتی جمال کے اور ثانی الذکر قاضی سماء الدین مُلتانی کی اولاد میں تھے۔ ان کے علاوہ مولانا یعقوب بنانی لاہوری تھے جنھیں شاہ جہاں نے میر عدل مقرر کیا تھا۔ وہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حریفوں میں سے تھے۔

علمائے لاہور میں ملّا عبدالسلام لاہوری (شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی) مفتی عبدالسلام دیوی (شاگرد ملّا عبدالسلام لاہوری) مولانا یوسف کپاہی، مولانا جمال الدین تلوی، مولانا اللہ داد لاہوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

سندھ میں مولانا حبیب اللہ سندھی، مولانا صالح سندھی، مفتی عبدالرحیم، مولانا عبدالرشید تتوی (مصنّف فرہنگ رشیدی) مشہور علما میں تھے۔

جون پور میں مفتی ابوالبقا اور مولانا عبدالباقی (مصنّف الآداب الباقیہ) مشہور عالم تھے لیکن

۲؎ (پچھلے صفحہ کا فٹ نوٹ) ملّا محمد فاضل: مولدش بدخشاں است۔ در ابتدائی جوانی نخست بہ کابل رسیدہ نزد ملّا صادق حلوائی تلمذ نمود و بعد ازاں بتوران رفتہ فیض صحبت حلّال معاقد منقول و کشاف غوامض معقول ملّا مرزا جان شیرازی دریافت و فنون حکمت را از ملّا یوسف کوسہ کہ ارشد تلامذہ آں سر آمد اساتذہ زمان بود کسب نمودہ بدار السلطنۃ لاہور وارد گردید و تفسیر و اصول را پیش ملّا جمال لاہوری ... خواندہ حاوی علوم عقلیہ و نقلیہ گشت، در عہد سلطنت جنّت مکانی بمنصبِ عدالت اردوئے گیہاں نورد عز امتیاز داشت ... اکنوں در دار السلطنت بافاضۂ علوم اشتغال دارد۔"

(بادشاہ نامہ جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۳۴۰)

سب سے زیادہ شہرت مولانا محمد افضل اور اُن کے دو شاگردوں مُلّا محمود جونپوری (مصنف شمس بازغہ) اور شیخ عبدالرشید جونپوری (مصنّف مناظرۂ رشیدیہ) کو ہوئی۔ مولانا محمد افضل اپنے دونوں شاگردوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ سعدالدین تفتازانی اور میر سیّد شریف کے بعد سے آج تک ایک شہر میں ایسے دو عالم جمع نہیں ہوئے[1]

اسی طرح گجرات[2]، دکن، پُورب ہر جگہ علمائے تحریر تھے جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

اس کے علاوہ کشمیر تھا جس کی اپنی ثقافتی تاریخ اور مستقل علمی روایات تھیں۔ دسویں صدی ہجری میں یہاں کے فحول علما میں شیخ جوہر نانت، مولانا حاجی محمد کشمیری، شیخ یعقوب بن حسن صرفی اور مفتی فیروز تھے رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین!

شیخ جوہر نانت نے پہلے سلطان قطب الدین کشمیری کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ ازاں بعد حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں ابن حجر ہیتمی اور ملّا علی قاری سے حدیث کی تکمیل کی۔ جب واپس آئے تو خانہ نشین ہوگئے اور باقی عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ یہاں تک کہ ۱۰۲۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُن کے شاگردِ رشید مفتی حیدر بن فیروز چرخی تھے۔

مولانا حاجی محمد کشمیری ہمدانی الاصل تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میر سید علی ہمدانی رح کے ہمراہ آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مولانا حاجی محمد کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی تشریف لائے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شیخ باقی باللہ نقشبندی کی خدمت میں منازلِ سلوک طے کیں۔ بعد ازاں کشمیر واپس آئے جہاں باقی عمر درس و افادہ میں گزار دی۔ ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی۔ حدیث سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ "شمائل ترمذی" کی شرح لکھی تھی اس کے علاوہ "حصن حصین" کی شرح اور فضائل قرآن پر بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔

---

[1] "شیخ محمد افضل اُستاد علامہ فرمود: از وقتے کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع دو فاضل بایں فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ، یعنی ملّا محمود و شیخ عبدالرشید۔" (مآثر الکرام صفحہ ۲۰۳)

[2] گجرات کے مشہور فاضل قاضی عبدالوہاب گجراتی تھے جو عہدِ عالم گیری میں "قاضی القضاۃ" کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علامہ سیالکوٹی سے اُن کے مناظرے کا ذکر آگے آرہا ہے۔ علامہ نے اس مناظرہ میں اُنہیں بُری طرح ڈانٹا۔ حالانکہ قاضی عبدالوہاب کی جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ امراء بھی اُن سے ڈرتے تھے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیر کے ایک قدیم اور باوجاہت خاندان کے فرد تھے۔ ۹۲۸ھ ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن مجید کے بعد مولانا آنی کے سامنے جو ملّا جامی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ اور صرف و نحو میں یہ درک بہم پہنچایا کہ "صوفی" کہلائے۔ ازاں بعد مولانا رضی الدین کشمیری سے صرف و نحو اور فقہ کی اور مولانا نصیر الدین اعمیٰ سے معقولات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ماوراءُ النہر کا سفر کیا۔ جہاں شیخ حسین خوارزمی رحؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر زیارتِ حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں ابن حجر مکی رحؒ سے حدیث پڑھی۔ صاحب "دبستان المذاہب" نے اُن کے اساتذہ میں حکیم کامراں کو بھی محسوب کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو غالباً اُس عہد کی بات ہو گی جب صرفی آزاد خیال اور وارستہ مزاج تھے۔ خمسۂ نظامی اور دیگر اصنافِ سُخن کے علاوہ "ثلاثیاتِ بُخاری" کی شرح اور توضیح تلویح" کا حاشیہ مشہور ہے۔ "تفسیر کبیر" امام رازی کی نہج پر قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی مگر اتمام سے پہلے ہی ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ کو وفات پائی۔ اُن کے ارشدِ تلامذہ میں محسن فانی مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت مجدّد الف ثانی رحؒ نے بھی اُن کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا تھا۔

شیخ یعقوب صرفی کے اُستاد شیخ رضی الدین کشمیری تھے۔ اُن کے دوسرے تلامذہ میں شیخ داؤد بنِ الحسن خاکی اور شیخ شمس الدین پال زیادہ مشہور ہیں۔

شیخ داؤد کے شاگرد شیخ نصیب الدین کشمیری تھے۔ اُنہوں نے شیخ داؤد کے علاوہ شیخ جمال الدین بنِ موسیٰ رحؒ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جو شیخ کمال الدین بن موسیٰ رحؒ (اُستاد علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی) کے برادرِ عزیز تھے۔ شیخ جمال الدین کے دوسرے شاگرد اُن کے صاحب زادے قاضی ابوالقاسم تھے جنہوں نے اپنے والدِ ماجد کے علاوہ اپنے عمِ محترم ملّا کمال الدین رحؒ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مولانا ابوالقاسم کے شاگرد مولانا عبدالغنی کشمیری تھے۔ اُنہوں نے مولانا حیدر بنِ فیروز اور ملّا باقر سے بھی پڑھا تھا۔

مفتی فیروز عباقرۂ کشمیر میں نُمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ صغر سنی ہی میں طلبِ علم کے لئے حجاز تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر بدایوں گئے۔ جہاں مختلف علوم میں تبحّر حاصل کیا۔ اُن کے علم و فضل کی شہرت اکبر کے کانوں تک بھی پہنچی، اور اُس نے اُنہیں کشمیر کا مُفتیٔ اعظم مقرر کیا۔ لیکن وہاں ۹۷۳ھ میں وہ فرقہ وارانہ عصبیت کے اندر شہید ہو گئے۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے ــ مولانا عبدالوہاب اور مولانا حیدر۔ اوّل

لہ "و ہمچنیں مُلّا یعقوب نزد او (حکیم کامراں) تحریرِ اُقلیدس و شرح تذکرہ خواندہ" (دبستان المذاہب صفحہ ۳۶۹)

شیرازہ

الذکر کو علومِ حکمیہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے "شرحِ شمسیہ" اور "شرح مواقف" پر حواشی لکھے۔ موخر الذکر اعاجیب زمان میں سے تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کیا۔ اس کے بعد ابتدائی تعلیم شیخ نصیب الدین کشمیری سے اور سندِ فراغ مولانا جوہر ناتھ محدث سے حاصل کیں۔ زاں بعد دہلی تشریف لے گئے جہاں شیخ عبد الحق محدّث دہلوی سے حدیث کی تکمیل کی۔ واپس آئے تو پوری زندگی درس و افادہ کے لئے وقف کر دی اور ۱۰۵۷ھ میں وفات پائی۔ اُن کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور مولانا داؤد کشمیری ہوئے جو "مشکواۃ شریف" کے حافظ تھے اور اسی لئے "مشکاتی" کہلاتے تھے[1]۔ مفتی حیدر بن فیروز کے دوسرے شاگردوں میں اُن کے صاحبزادے مولانا محمد افضل کشمیری اور مولانا محمد طاہر کشمیری تھے۔

کشمیر کے دیگر علما میں ملّا باقر صباغ اور اُن کے شاگرد ملّا باقر زادہ تھے۔ اوّل الذکر اعلیٰ تعلیم کے لئے ایران تشریف لے گئے تھے جہاں میر باقر داماد سے علوم حکمیہ کی تکمیل کی تھی[2]۔ ان کے علاوہ اساتذۂ کشمیر میں ملّا فاضل اور ملّا ابو الحسن (معروف بہ شاہم بابا) بھی اس حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں کہ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی رح کے حریف اور نقّاد تھے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

مناظرے

علامہ عبد الحکیم رح فطرتاً بڑے سنجیدہ مزاج اور خاموشی پسند تھے۔ مگر علمی بحث و مناظرہ اُس عہد کا بڑا مقبول مشغلہ تھا۔ لہٰذا شاہی دربار میں جب کبھی اس قسم کی کوئی مجلس منعقد ہوتی تو اُنھیں طلب کیا جاتا۔ چنانچہ جب ملّا شفیق ایران سے ہندوستان آئے اور اُن کے معقولات میں تبحر و تمہر کی بنا پر شاہجہان نے اُنھیں "دانش مند خان" کا خطاب دیا تو اُن سے مناظرے کے لئے علامہ ہی کو سیالکوٹ سے بُلایا گیا۔ علامہ تشریف لائے۔ دربار میں علما و فضلا کا اجتماع منعقد ہوا اور دانش مند خان (ملّا شفیق) کے ساتھ مناظرہ شروع ہوا۔ مسئلہ زیرِ بحث "اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِین" کے

---

[1] "خواجہ داؤد مشکواتی کشمیری قدس سرہٗ در علوم حکمت و معانی و فقہ و حدیث و تفسیر شاگرد و خواجہ حیدر رح چرخی بود چوں کتاب مشکواۃ المصابیح را متناً و اسناداً بحفظ خود داشت بداؤ و مشکواتی مخاطب شد و بعد حصول علوم ظاہر بمراد کسب رموز باطن اول بخدمت بابا نصیب الدین حاضر شد ... و من بعد بحضور خواجہ خاوند محمود نقشبندی مرید شد و بہ تکمیل رسید و در سال یک ہزار نود و ہفت وفات یافت۔" (خزینۃ الاصفیا جلد اوّل صفحہ ۶۴۵-۶۴۶)

[2] "ملّا باقر صباغ برائے تحصیل علوم بہ ایران دیار رفتہ از فضلائے آنجا بہرہ اندوختہ۔ شاگرد میر باقر داماد شدہ در معقولات بے نظیر وقت بودہ۔ در محلہ کلاش پورہ سکونت داشت۔" ("واقعات کشمیر" صفحہ ۱۲۶ ب)

مفہوم و مراد کا تعین تھا۔ گفتگو نے طول کھینچا مگر آخر کار علامہ ہی کے قول کی صحت و درستی کو بادشاہ اور امرا نے تسلیم کیا۔[1]

لیکن علامہ اس اکھاڑے کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھے۔ لہذا یا تو فراخ دلی سے فریقِ مخالف کی برتری کا اعتراف کر لیتے جیسا کہ ملا محمود جونپوری کے ساتھ مناظرے میں واقع ہوا۔ ہوا یہ کہ علامہ اور فاضل جونپوری (ملا محمود) کے درمیان مسئلہ وحدت الوجود میں مناظرہ ہوا اور علامہ نے باوجود اپنے کمال کے فاضل جونپوری کی افضلیت کا اعتراف کیا۔ چنانچہ امام الدین ریاضی نے ملا محمود جونپوری کے تذکرے میں لکھا ہے :۔

"ملا محمود جونپوری در فروغ و اصول و معقول و منقول بکمال رسیدہ بود و در تفسیر و حدیث و حکمت مہارت تمام داشت۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی باوجود کمال خود بکمال جامعیت او اقرار و اعتراف بفضل و دانش او می نمود۔ فاضل محقق و کامل مدقق بود و عالم متوحد و عارف وحید مولوی عبدالحکیم در مناظرۂ علم توحید با وے مقاومت نداشت۔ می فرمود کہ مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ منقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمصداق و ان اوہن البیوت لبیت العنکبوت، سست تر از نسج عنکبوت است۔"

(تذکرۂ باغستان ورق ۶۸۴ ب۔ ۶۸۵ ا)

اسی طرح کا ایک واقعہ ملا عوض وجیہ سمرقندی کے ساتھ پیش آیا۔ ملا عوض وجیہ جو شاہ جہاں بادشاہ کی طلب پر بلخ سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک دن بے خبری میں سپاہیانہ وضع کے اندر علامہ کے مدرسہ میں پہنچ گئے۔ درس ہو رہا تھا۔ ملا عوض وجیہ بھی بیٹھ گئے اور اتنے شدید اور ناقابل تردید ایرادات وارد کئے کہ علامہ کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اس کے بعد وہ تو چلے گئے مگر علامہ اُن کی زیرکی و دراکی پر عش عش کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد سعد اللہ خان علامی سے ملاقات ہوئی تو علامہ نے پورا قصہ سنایا کہ ایک شخص سپاہیانہ وضع میں مدرسہ کے اندر آیا تھا اور اس قسم کے ایرادات کئے تھے مگر معلوم نہ ہو سکا کہ کون تھا۔ سعد اللہ خان سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو وہ ملا عوض وجیہ سمرقندی ہوں گے۔ علامہ کو معلوم ہوا تو جو کچھ فرمایا اُن کے کمال صدق و فراخ حوصلگی کا شاہد عدل ہے۔ بڑی حسرت سے فرماتے تھے :

---

[1] "آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشان را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیق کہ تازہ از ولایت آمدہ بود و خطاب دانش مند خان یافتہ، طلبید۔ ایشان آمدند و اجلاس علماء و فضلاء و حکماء شد۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر) شیرازہ

"از آمدنش اگر خبر داشتمے در رہ گذرش گل و یاسمن کاشتمے"[۱]

لیکن اگر فریقِ مخالف مناظرہ بازی کے ہتھکنڈے استعمال کرتا تو علامہ بہت جلد مشتعل ہوجاتے چنانچہ ایک دن قاضی عبدالوہاب گجراتی سے مناظرہ ہوا۔ اثنائے گفتگو میں کہیں قاضی عبدالوہاب نے کہدیا — "مرد آدمی! سخن آہستہ آہستہ بگو"

پھر کیا تھا، علامہ مشتعل ہوگئے۔ اور قاضی صاحب سے، جن کے آگے اُمرائے عالی منزلت بھی دم نہیں مار سکتے تھے، برجستہ فرمایا:۔

"تُو مردِ آدمی۔ مردِ آدمی در چنیں مقام ہا خر را می گویند۔ سخن را فہمیدہ بگو۔"

مگر مناظرہ بازی کا اُس زمانہ میں عام دستور تھا اور اسی کے ذریعہ فضلائے وقت ایک دوسرے پر اپنے تفوق و برتری کو ثابت کیا کرتے تھے۔ اگر بالمشافہ مناظرہ کی نوبت نہ آسکتی تو کسی سمجھدار شاگرد کو سکھا پڑھا کر حریف کے پاس بھیجتے اور وہ اُس کے درس میں شریک ہوکر ایرادات کی بھرمار کرتا۔

علامہ جب آخر عمر میں سیالکوٹ سے لاہور آئے تو وہاں علمائے جہابذہ کی مجالس درس قائم تھیں جن میں سے ہر ایک "کوس انا و لاغیری" بلند کر رہا تھا۔ علامہ کی آمد کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا، ظاہر تھا۔ خود علامہ کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس لئے اگر کوئی نیا شاگرد آتا اور کوئی لاینحل شک پیش کرتا تو

(بقیہ فٹ نوٹ) چوں نوبت سخن بمولوی عبدالحکیم رسید و با دانشمنداں مناظرہ واقع شد بمراد ایاک نعبد و ایاک نستعین، گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول و راستی سخن ایشاں بر بادشاہ و سائر اُمرا و علمائے عالی شان بوضوح انجامید۔" (تذکرہ باغستان ورق ۶۸۴ ب۔ ۶۸۵ ا)

[۱] "مولانا عوض وجیہ بلخی وقتے کہ از ولایت بلخ حسب الطلب بادشاہی بدارالسرور لاہور رسید برسم لشکریاں بمدرسہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی در آمد و بتقریب دخل ہائے بے جا کرد۔ مولانا... جز آنکہ سبابۂ تسلیم بر چشم قبول گزارد، دید کہ علاجے نیست و از زیرکی طبع و رسائی تشادراک مولوی متعجب ماند۔ بعد ازیں مولانا برخاست و برفت۔ بعد از زمانے سعد اللہ خان پیش مولوی آمد۔ مولوی فرمود کہ دریں ولد شخصے بچنیں ہیئت و قیافت در کسوت لشکریاں بکمال فراست و کیاست در مدرسہ ما آمد و بحث ہائے می کرد۔ معلوم نشد کہ کیست۔ خان مشار الیہ بفراست دریافت کہ مولانا عوض وجیہ بود کہ مولوی فرمودند از آمدنش اگر خبر داشتمے در رہ گذرش گل و یاسمن کاشتمے۔" (باغستان امام الدین ریاضی ورق ۶۸۳ ب۔ ۶۸۴ ا)

[۲] (اگلے صفحہ پر)

کھٹک جاتے کہ کسی حریف نے تو در پردہ زور آزمائی کے لئے نہیں بھیجا۔ اُس وقت لاہور میں مُلّا عبدالسلام دیوی کا دَور دورہ تھا[4]۔ وہ مُلّا عبدالسلام لاہوری کے شاگرد تھے جو امیر فتح اللہ شیرازی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مُلّا عبدالسلام دیوی کے شاگرد میر سید اسمٰعیل بلگرامی تھے۔ اُنہوں نے اکثر کُتب درسیہ اُن کے یہاں پڑھی تھیں۔ بعد میں علامہ عبدالحکیم کی خدمت میں پہنچے اور سبق مقرر کرنے کی درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا۔ طلبا کی کثرت ہے، مُستقل سبق کی تو گنجائش نہیں ہے البتہ اگر چاہو تو فلاں شخص کے سبق میں شریک ہو جایا کرو۔ میر سید اسمٰعیل تیار ہو گئے مگر درس میں جاتے تو خاموش رہتے۔ ایک دن علامہ نے فرمایا۔ تم کچھ دریافت نہیں کرتے۔ سید اسمٰعیل نے کہا دوسرے کے سبق میں مجھے بولنے کا کیا حق ہے۔ ہاں اگر مستقل سبق ہوتا تو میں بھی کچھ دریافت کرتا۔ علامہ نے فرمایا۔ آج کل عصر مغرب کے درمیان کا وقت خالی ہے، ہم تمہارے سبق کے لئے اُسے مقرر کرتے ہیں۔ جب دوسرے دن مستقل سبق شروع ہوا تو میر سید اسمٰعیل نے بحث شروع کی جس نے اتنا طول کھینچا کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ علامہ نے نماز پڑھی اور پھر سبق شروع ہوا۔ مگر بحث ختم نہ ہوئی اور عشا

---

[3] (بقیہ فٹ نوٹ) شیخ محمد طاہر پٹنی مصنف "مجمع البحار" کی اولاد میں سے تھے۔ شاہجہاں نے مونگی پٹن کا قاضی مقرر کیا تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں ممالک محروسہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ خافی خاں نے "منتخب اللباب" میں اور شاہنواز خان نے "مآثر الامرا" میں اُن کی جلالت قدر کی تعریف کی ہے کہ اُمرا تک اُن سے خائف تھے۔ ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی۔

[4] مُلّا عبدالسلام ساکن دیوہ از مضافات اودھ اصناف علوم را سیما عربیت در سرزمین مولد خود تحصیل نمود۔ قائد قسمت او را بہ لاہور آورد و در ظلّ رافت مُلّا عبدالسلام لاہوری رسانید۔ ہر چہ خواندہ بود بخدمت ملا تصحیح نمود و قدم بر قدم اُستاد گزاشت و چنانچہ اتحاد اسمی متحقق بود نسبت فضیلت نیز رتبہ مساوات بہم رسانید۔ چندے بدانش آموزی مستفیداں گزرانید۔ آخر مُلازمت صاحب قِران شاہ جہاں دریافت و چندے بہ منصب افتاء عسکر مامور گردید و در کبرِ سن دست ازیں منصب باز داشتہ در دارالسلطنت لاہور زنگ انزوا ریخت و تشنہ کامان علوم را بہ کوثر افادہ سیراب می ساخت و حاشیہ بر تفسیر بیضاوی در سلک تحریر کشید۔" (مآثر الکرام صفحہ ۲۳۵ - ۲۳۶)

مُلّا عبدالسلام لاہوری (المتوفی ۱۰۳۷ھ) امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے۔

کا وقت ہو گیا۔ علامہ نے فرمایا۔ کل دوسرے اسباق ملتوی رہیں گے، صبح یہی سبق ہو گا۔ دوسرے دن سب طالب علم حاضر ہوئے اور ظہر کے وقت تک بحث ہوتی رہی۔ مگر ختم نہ ہو سکی۔ تین دن تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ آخر علاّمہ نے فرمایا۔ تم نے بھی اس اشکال کا کوئی حل سوچا ہے۔ میر سید اسمٰعیل نے فرمایا ایک محشی نے ایسا ایسا حاشیہ لکھا ہے۔ اس کے بعد اسے پیش کیا (جو در اصل انہیں کا اپنا طبع زاد تھا) علامہ نے بڑی تحسین و آفرین کی۔ اس کے بعد پوچھا۔ تم نے تعلیم کہاں حاصل کی ہے۔ میر سید اسمٰعیل نے کہا۔ ملاّ عبد السلام دیوی کے یہاں۔ اب علامہ کو اندیشہ ہوا کہ ہو نہ ہو مفتی عبد السلام دیوی نے میرے امتحان اور استخفاف کے لئے اپنے شاگرد کو بھیجا ہے۔ میر سید اسمٰعیل نے قسمیں کھائیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو محض استفادہ اور شرفِ تلمّذ کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ تب کہیں جا کر بڑی مشکل سے علامہ کو یقین آیا۔[1]

عقیدۂ وحدت الوجود کی علم برداری

علامہ سیالکوٹی اور فاضل جونپوری (ملاّ محمود مصنّف شمس بازغہ) کے مابین مسئلہ توحید کے باب میں مناظرہ کا اشارہ اُوپر ہو چکا ہے۔ علامہ اور حضرت مجدّد الف ثانی رح دونوں کسی زمانہ میں عقیدۂ وحدت الوجود کے بڑے سرگرم علم بردار تھے۔ بعد میں حضرت مجدّد صاحب رح نے تو اس نظریہ سے رجوع کر کے وحدت الشہود کا قول وضع کیا۔ مگر علاّمہ آخر تک اس عقیدے پر قائم اور شیخ ابن عربی کے عقیدت مند رہے۔

غالباً مجدّد صاحب رح کی نکیر و گرفت سے عقیدۂ وحدت الوجود اور اس کے قائلین بالخصوص اس کے بانی شیخ ابن عربی اس زمانہ میں قیل و قال کا موضوع بنے ہوئے تھے اور یہ بحثیں بادشاہ شاہجہان کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ چنانچہ اُس نے ایک دن علاّمہ سے شیخ ابن عربی کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ کس قسم کے انسان تھے۔ علاّمہ نے جواب دیا کہ عربوں کے سامنے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات تھے جیسے شقِ قمر، کلام جمادات اور سایہ کا نہ ہونا، جو آپ کے جسمِ اطہر کی نورانیت

---

[1] مولوی استفسار کرد کہ تحصیل شما از کجاست۔ عرض کرد کہ از خدمت مولوی عبد السلام دیوہ۔ مولوی توہم کرد کہ مبادا ملاّ عبد السلام برائے الزام من شاگرد خود را فرستادہ باشد۔ سید قسم یاد کرد کہ ایں امر را اصلے دخلے نیست و محض بارادہ استفادہ در جناب عالی رسیدہ ام و بقیہ کتب بخدمت مولوی خواندہ۔" (مآثر الکرام صفحہ ۲۳۴)

کا نتیجہ تھا۔ مگر ہمارے سامنے اس قسم کا کوئی عینی معجزہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو یہ ہے کہ شیخ ابن عربی باوجود اپنے کمال و تبحر علمی کے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں ہیں، حالانکہ وہ اس پایہ کے عالم تھے کہ اگر خود دعویٰ نبوّت کر بیٹھتے تو کوئی اُن سے مناظرہ میں عہدہ برآ ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نبی آخر الزمان صلعم کے اُمتی ہیں تو ہمیں حضورؐ کی رسالت میں کوئی شک نہیں رہتا[1]۔

مسئلہ وحدت الوجود کے سلسلے میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی ایک خاص تقریر تھی جسے عالمگیر نے بعد میں اُن کے صاحبزادے مولانا عبداللہ سے سُنا تھا اور اُس کے ایما سے اُنہوں نے اسے قلم بند کیا تھا اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حریف اور نقّاد

علامہ کی شہرت کمال نے ان کے بہت سے حریف پیدا کر دیئے تھے جو اُن کی تقاریر پر ایرادات وارد کیا کرتے تھے۔

ان حریفوں میں سب سے زیادہ سخت گیر ملّا باقر للو (نارہ) کشمیری تھے۔ وہ اپنے ہم نام ملّا باقر صباغ کشمیری کے شاگرد تھے (جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے)

مصنفِ "واقعات کشمیر" نے لکھا ہے:-

"ملّا باقر نارہ للو: در معقولات شاگرد ملّا باقر صباغ بودہ و در ہندوستان با ملّا عبدالحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ کردہ و آنہا را ملزم می ساخت۔" (واقعات کشمیر صفحہ ۲۶ ا)

دوسرے حریف ملّا فاضل تھے۔ وہ بھی کشمیر ہی کے عالم تھے۔ مصنف "واقعات کشمیر" نے لکھا ہے:

"ملّا فاضل: مجرد دانش مند و مدقق بود و بجدل و محجاتی اشتہار یافتہ، اکثر حواشی ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی را رد می نوشت[2]۔"

---

[1] "آوردہ اند کہ بادشاہ مغفور مذکور از مولوی پرسید کہ شیخ ابن عربی چہ طور کسے بود۔ فرمود: عرب را معجزات آنحضرت از شقِ قمر و کلام جمادات و عدم ظل کہ لازمہ نورانیت جسم لطیف مبارک اوست و امثال آں بسیار بود و ما را ایں معجزہ می تواند بود کہ ابن عربی در دینِ محمد عربی ہست والا نہ اگر می خواست دعویٰ نبوّت می کرد و باثبات می رسانید و کسے را با او یارائے تاب مناظرہ نہ بود۔" (باغستان، ورق ۶۸۵ ا)

[2] واقعات کشمیر صفحہ ۱۲۳ ا

کشمیر ہی کے ایک اور نازک دماغ عالم ابوالحسن تھے جو شاہم بابا کے نام سے مشہور تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ تفسیر بیضاوی اور ملّا عصام کے حواشی کی عبارتیں فر فر پڑھ دیتے تھے۔ مگر معاصرین میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان معاصرین میں سرآمد فضلائے روزگار علامہ عبدالحکیم تھے۔ لہٰذا قطرتاً اُن کی تقاریر کو خصوصیت سے موردِ ایرادات بناتے تھے۔ مصنّف "واقعات کشمیر" لکھتے ہیں:

"ملّا ابوالحسن معروف بشاہم بابا در علوم مستعد و مجد بود۔ اخوند ملّا یوسف کنائی می فرمود کہ در مجلس بعض ناظمان خطہ لاہور مباحثہ می شد او عبارت تفسیر قاضی بیضاوی و حاشیہ عصام الدین بخشی مثل قرآن بید رنگ می خواند و اکثر مذکورات ملّا عبدالحکیم دا ادو می کرد و گاہے التفات بجانب علمائے حاضر نمی کرد۔[1]"

علامہ کی جلالت قدر نے دارالسلطنت دہلی تک میں اپنے حریف پیدا کر لئے تھے۔ چنانچہ مولانا یعقوب بنانی جو بادشاہی لشکر میں میرِ عدل تھے اور مدرسہ شاہجہانی میں پڑھایا کرتے تھے۔ حسب تصریح رزق اللہ اثنائے درس میں فاضل سیالکوٹی پر تعقیب فرمایا کرتے تھے۔[2]

جلالت قدر

ایسے علمائے جہاندہ کی حریفانہ چشمک بجائے خود علامہ سیالکوٹی کی علو منزلت کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی اُن کے تبحر علمی کو سراہا ہے۔ عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں: "نشیب و فراز کمالات پیمودہ و در مضمائے فضائل از ہمسراں قصب السبق ربودہ۔"[3]

اسی طرح "بادشاہ نامہ" کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں:

"بہ فضائل و کمالات یادگارے است از پیشیناں"[4]

اسی طرح میر غلام علی آزاد نے "مأثر الکرام" میں لکھا ہے:

"علامہ زمان و افتخار زمانیان است۔ الحق در جمیع فنون درسی مثل او از زمین ہند برنہ خاست۔

---

[1] "واقعات کشمیر" صفحہ ۱۲۳

[2] الافق المبین فی اخبار المقربین طبقہ تاسعہ بحوالہ نزہتہ الخواطر جلد خامس صفحہ ۰۴۴

[3] "بادشاہ نامہ" جلد اول حصہ دوم صفحہ ۳۴۰

[4] "بادشاہ نامہ" جلد دوم صفحہ ۷۵۵

و آثار دانشش باین کیفیت و کمیت و حُسن قبول بر صفحۂ روزگار نہ گزاشت"۔ [1]

اسی طرح وہ "سبحۃ المرجان" میں لکھتے ہیں:

"ھو عمدۃ العلماء الفناجبۃ والبدر دانھم فی الشھب الثاقبۃ"

[علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی علمائے پنجاب کے گل سرسبد تھے اور وہاں کے مشاہیر علما میں جو شہاب ثاقب بن کر چمکے بدرِ کامل کی حیثیت رکھتے تھے]

ہندوستان سے باہر محمد بن فضل اللہ المحبی نے "خلاصہ الاثر" میں لکھا ہے:

"کان من کبار العلماء وخیارھم مستقیم العقیدۃ صحیح الطریقۃ صادعاً بالحق مجاھراً بہ الامراء والاعیان ... لم یبلغ احد من علماء الھند ما بلغ من الشان والرفعۃ ولا انتھی واحد منھم الی ما انتھی الیہ۔ جمع الفضائل عن ید وحاز العلوم وانفرد وافنی کھولتہ وشیخوختہ فی الانھماک علی العلوم وحلّ دقائقھا ونفی من حلمھا وغامضھا علی حقائقھا۔" [2] (خلاصہ الاثر بحوالہ نزہتہ الخواطر جلد خامس صفحہ ۲۱۱)

مولانا عبدالحی ندوی "نزہتہ الخواطر" میں لکھتے ہیں:

"الشیخ العلامہ الکبیر الفاضل صاحب التصانیف الفائقۃ والتالیف الرائقۃ ... اتفق علی فضلہ علماء الآفاق وسارت بمصنفاتہ الرفاق۔" [3]

(نزہتہ الخواطر جلد خامس صفحہ ۲۱۰)

وفات

لیکن موت کا آہنی ہاتھ نہ کسی کی جلالت قدر کی پروا کرتا ہے نہ فرومائگی کی ؎

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید۔ زجام دہر مے کُل من علیھا فان

[1] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴

[2] علمائے کبار میں سے اور اخیار اہل فیض میں سے تھے۔ اُن کا عقیدہ صراط مستقیم کے مطابق تھا اور طریقہ صحیح تھا۔ امرا و داعیان حکومت کے درمیان علانیہ اعلان حق کرنے میں اُنہیں باک نہ تھا.... جو شان اعلیٰ اور مرتبہ بلند اُنہوں نے حاصل کیا۔ علمائے ہند میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ مختلف علوم و فنون میں تبحر و تمہر حاصل کیا اور اپنے عہد کے فردِ فرید ثابت ہوئے۔ ساری زندگی علمی انہماک اور مختلف فنون کے دقائق و غوامض حل کرنے میں گزار دی۔

[3] شیخ، علامہ کبیر و فاضل جلیل، بہترین تصانیف اور خوب ترین تالیفات کے مصنف تھے.... علمائے آفاق اُن کے فضل وکمال پر متفق ہیں اور اُن کی مصنفات ساری دُنیا میں پھیل گئی ہیں۔

علامہ نے بڑی اعتدال کی زندگی بسر کی تھی اور عمر طبعی کو پہنچے۔ آخر ۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو وفات پائی اور اپنے شہر سیالکوٹ ہی میں دفن ہوئے۔ میر غلام علی آزاد نے "ماثر الکرام" (صفحہ ۲۰۵) میں لکھا ہے: "دوازدہم ربیع الاول سنہ سبع وستین والف طومار حیات پیچید و در سیالکوٹ مدفون گردید۔"

اولادِ امجاد

علامہ کی اولاد امجاد میں سے تاریخ نے صرف اُن کے ایک صاحبزادے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا تذکرہ محفوظ رکھا ہے۔ اُنہوں نے اپنے والدِ ماجد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ازاں بعد دہلی تشریف لے گئے جہاں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے مفتی نورالحق سے حدیث کی تکمیل کی۔ واپس آکر ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ عالمگیر اُن کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۰۸۶ھ میں لاہور کے اندر ملاقات ہوئی اور بادشاہ بہت زیادہ محظوظ ہوا[1]۔ وہ اُن کے علم و تقویٰ سے اس درجہ متاثر تھا کہ صدارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اُس نے بختاور خان کو حکم دیا کہ مولانا کو راضی کر کے اس عہدہ کے قبول کرنے پر آمادہ کریں۔ بختاور خان نے مولانا عبداللہ کو لکھا جس کے جواب میں اُنہوں نے تحریر کیا کہ "سلطان وقت کا حکم ہے، میں ضرور حاضر ہوں گا۔ مگر قبولِ منصب سے معذور ہوں۔ بہرحال وہ اجمیر شریف تشریف لائے جہاں عالمگیر کے دربار میں باریاب ہوئے۔ بڑی پُر لطف صحبت رہی۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے عطر خاصہ لگایا۔[2]

[1] مستعد خان ساقی نے مآثر عالمگیری کے اندر ۱۰۸۶ھ کے واقعات میں لکھا ہے: قدوۃ الافاضل مولوی عبداللہ سیالکوٹی پسر ملا عبدالحکیم مرحوم کہ فقر را با فضل ہم نشیں دارد و مکارم اخلاق را با محامد آداب قرین تاحال بملاقات تمام حسنات خلاصہ مکونات خردمندی نیندوختہ بود، از حسن ابدال احکام شوق پیام بنام آں اعزانام رفتہ بود کہ بعد تشریف شریف بلاہور از وطن بدانجا بیاید۔ مولوی پیش از ورود لشکر دو سہ روز بلاہور رسید و چند مرتبہ بادراک صحبت فیض خاصیت احتظاظ اندوز گردید۔ خلعت و دو صد مہر و مادہ فیل یافتہ باعزاز و احترام تمام بمسکن خود مرخص شد۔" (مآثر عالمگیری صفحہ ۱۴۸-۱۴۹) مستعد خان مولانا عبداللہ کے متعلق

[2] آوردہ اند چوں اول ملاقات واقع شد بادشاہ از رہگذر اکرام و احترام بدست حضرت عطر خاصہ بر پیراہن آں فضیلت مآب مالیدند۔ در اثنائے مالیدن ایں حدیث خواندند: ضیف طیب و ضیافۃ طیبۃ۔ و بادشاہ ایشان را تکلیف خدمت صدارت کل میکرد و اختیار نفر مودند و فرمودند کہ ایں منصب علما نیست۔" (باغستان ورق ۶۸۶ ا-ب)

اسی صحبت میں بادشاہ عالم گیر نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے والدِ ماجد نے آپ کو مسئلہ وحدت الوجود کی کس طرح تلقین کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی زبان سے اسے سُنوں۔ اس طرح میں سمجھوں گا گویا میں نے علامہ مرحوم ہی کی زبان سے اسے سُنا۔ مولانا عبداللہؒ نے مختصر طور سے تقریر کی اور فرمایا چونکہ مسئلہ شرح و ایضاح چاہتا ہے لہٰذا اگر حکم عالی ہو تو اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر خدمت عالی میں پیش کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا بہتر ہے۔ زاں بعد مولانا عبداللہؒ نے مسئلہ وحدت الوجود کے حل میں ایک خوب ترین رسالہ لکھ کر پیش کیا۔[1]

اجمیر سے واپس آکر مولانا عبداللہ خانہ نشین ہو گئے اور ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ تصانیف میں مذکورۃ الصدر رسالہ وحدت الوجود کے علاوہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور تلویح توضیح کا حاشیہ ہے جس کا نام "تصریح" ہے۔ یہ حاشیہ علامہ عبدالحکیم کے حاشیہ تلویح توضیح کے ساتھ دیوبند سے شائع ہو چکا ہے۔

مولانا عبداللہ ۱۰۹۳ھ میں رہ سپار عالم باقی ہوئے۔

علامہ کے تلامذہ

علامہ کی فیض رسانی کے بارے میں اوپر میر غلام علی آزاد کا قول نقل ہو چکا ہے کہ

"عرصہ جہاں را بلوامع فیض مملو ساخت"[2]

ان استفادہ کرنے والوں میں سے بعض مشاہیر کے نام امام الدین ریاضی نے تذکرہ "باغستان" میں دئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"و بالجملہ از رایات جلال او شاگردان صاحب کمال انداز انجملہ است: ملا سعد اللہ مخاطب

---

[1] آوردہ اند کہ بادشاہ بدیشان گفت کہ والد شما مسئلہ وحدت وجود چہ طور تلقین بشما کردہ اند۔ آنرا می خواہیم از زبان شما شنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشاں خود دراں وقت بجواب اجمالی کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است اگر امر شود بزودی رسالہ موجزے در حل ایں امر شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رساند۔ فرمودند: بہتر۔ چنانچہ آخوند در اندک فرصتے رسالہ بسیار خوب درحل مسئلہ وحدت وجود تصنیف کردہ بعرض رسانیدند و فقیر ایشاں را ہم دراں ایام دریافتہ آں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ در آمدہ۔"

(باغستان ورق ۶۸۶ ب)

[2] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴

بسعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ صاحب قرآن کہ نشان مذکور از فضل او نشان می دہد ..... و از انجملہ است ملا عبد العزیز عزت کہ در زمان خلافت عالم گیر خدمت عرض مکرر داشت۔[1] ... و از انجملہ است ملا عصمت اللہ سہارنپوری کہ بر خلاصۃ الحساب و تشریح الافلاک شیخ بہاء الدین محمد عاملی شرح نوشتہ اند و از رایات کمال او فرزند صاحب حال است مولوی عبد اللہ"[2]

(باغستان ورق ۶۸۶ ا)

علامہ کے ایک اور شاگرد مولوی عبد الرحیم مُراد آبادی تھے جن سے قاضی شہاب الدین نے جو اپنے وقت کے علمائے اعلام میں سے تھے استفادہ کیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اُن کے صاحبزادے مولوی قطب الدین گوپاموی نے پڑھا تھا۔ آزاد بلگرامی نے موخر الذکر کے تذکرہ میں لکھا ہے :-

"مولوی قطب الدین گوپاموی .... پدرش قاضی شہاب الدین از علمائے اعلام وقت بود کسب کمال از خدمت مولوی عبد الرحیم مُراد آبادی تلمیذ مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی نمود۔"

(مآثر الکرام صفحہ ۳۰۰)

علامہ کے شاگرد میر سید اسمٰعیل بلگرامی کا تذکرہ اُوپر آچکا ہے۔

غالباً علامہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے فضل و کمال حاصل کرنے والے اور علمائے کبار بھی ہوں گے مگر اولادِ امجاد اور تلامذۂ کرام سے زیادہ علامہ کے نامِ نامی کو قبولِ عام و بقائے دوام اُن کی تصانیف رائقہ و تالیفِ فائقہ نے بخشا۔ ان کا مفصل تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

---

[1] "نہم ذی حجہ ۱۰۸۰ھ ملا عبد العزیز عزت پسر ملا عبد الرشید اکبر آبادی بوساطت ہمت خان و بختار خان در مسجد سعادت اندوز ملازمت شد۔ او بعد از تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ و عروج بمعارج جامعیت در اکثر فنون بسہ روپیہ یومیہ قناعت گزین و گوشہ نشین در وطن بسر می برد و سرش بالتجائے ارباب دول فرو نمی آمد۔ چوں در طالع او شہرتے و پیش آمدی مثبت بود بلندی فطرت ... و متانت وضع او ذریعہ منظور نظر تربیت شدن و مورد مرحمت گشتن در پیش گاہ قدر دانی خدیو رتبہ سنج پایہ شناس گردید۔ اول وہلہ بہ منصب چہار صدی ہفتاد سوار و مکرمت خلعت ... اعزاز اندوخت و روز چہارم کہ برائے عرض مکرر از تغیر لطف اللہ خان افتخار اندوز شد، و بامتیاز مراتب پیش بر آمد بودن و در بارہ خاصہ راہ یافتن و با ہیچ کس دست بسر نشدن و بسلام علیک اکتفا نمودن فرق عزت بر افراخت۔" (مآثر عالمگیری صفحہ ۹۸-۹۹)

[2] مولانا عبد اللہ لبیب کا تذکرہ اولادِ امجاد کے سلسلے میں اُوپر مذکور ہو چکا ہے۔ علامہ سیالکوٹی نے انہیں کے واسطے

غلام ربانی تاباںؔ

غزل

مونس نہ کوئی دوست تیری یاد کی طرح
ہے دِل کے ساتھ درد خداداد کی طرح

آوارگی میں جادہ و منزل کی قید کیا
اپنا سفر بھی ہے سفرِ باد کی طرح

آئے چمن میں صورتِ موجِ نسیم ہم
نکلے چمن سے نکہتِ برباد کی طرح

دورِ ہوس میں جنس وفا رائیگاں سہی
دل کو عزیز ہے تیری بیداد کی طرح

فصلِ نمو کی زخم فروشی نہ پوچھئے
ہر شاخِ گل ہے ناوکِ صیاد کی طرح

محرومئ دوام کا ساماں کئے ہوئے
جیتے ہیں ایک کوششِ برباد کی طرح

اے دشمنِ خلوص، وفا کا معاملہ
نازک بہت ہے خاطرِ ناشاد کی طرح

تاباںؔ فروغِ بزم کا ساماں کہاں سے لائیں
دل ہے چراغِ رہ گزرِ باد کی طرح

وسیم اختر

گوجری زبان و ادب

ریاست میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں ایک گوجری زبان بھی ہے جس کے مختلف اصنافِ ادب پر الگ الگ مضامین لکھے جا سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے گوجری زبان و ادب کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا جب کہ یہ زبان بھی علما، شعرا، ادبا اور اصحابِ ذوق کی ذہنی کاوشوں سے مالا مال ہے۔ گوجری زبان کے ادب پاروں کی نشر و اشاعت کی طرف بھی غالباً بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس مضمون میں میری کوشش یہی رہی ہے کہ گوجری زبان و ادب کا مختصر لیکن مربوط جائزہ لوں۔

گوجری زبان کا اپنا کوئی علیحدہ رسم الخط نہیں ہے۔ (بہت ممکن ہے کہ قدیم گوجری زبان کا کوئی رسم الخط رہا ہو، لیکن یہ بات بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی) اُردو جاننے والے اسے فارسی رسم الخط میں لکھتے ہیں جس سے اُردو کا رسم الخط عالمِ وجود میں آیا۔ اسی طرح ہندی دان گوجر طبقہ اسے سنسکرت رسم الخط میں لکھتا ہے جو ہندی رسم الخط کا ماخذ ہے۔ ویسے برج بھاشا کو گوجری زبان کا ماخذ کہا جاتا ہے اور یہ بات بڑی حد تک ٹھیک بھی ہے۔

مُلک کے دیگر علاقوں سے قطع نظر مجھے اس مضمون میں صرف اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ گوجری زبان جموں و کشمیر میں کب سے بولی جانے لگی اور اس کا ادبی سرمایہ کس نوعیت کا ہے۔ تاریخ کے بعض محققین کا کہنا ہے کہ ۱۵۷۶ء اور ۱۵۷۷ء میں ہلدی گھاٹ کی علی الترتیب جنگوں میں مہارانا پرتاپ کے خلاف اکبر اعظم نے مُغل لشکر روانہ کیا تھا جس نے مہارانا پرتاپ کو پسپا کیا اور وہ اپنے جان نثار سسودیہ گلوٹ اور باگڑی گوجر ساتھیوں سمیت کوبل میر کی پہاڑیوں میں رُو پوش ہو گئے۔ یہاں بھی مغل فوجوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مغلوں کے پے در پے حملوں اور جنگل کی زندگی کی صعوبتوں سے تنگ آ کر مہارانا پرتاپ نے اپنے ساتھیوں کو منتشر ہو جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سسودیہ گوجر مُلک کے مغربی

علاقوں کی طرف کوچ کر گئے اور باگڑی اور گلوٹ گوجر شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے۔ بہت ممکن ہے کہ اُس زمانے میں شمالی ہند کی طرف کوچ کرنے والے گلوٹ اور باگڑی گوجروں کی کچھ تعداد جموں و کشمیر میں بھی داخل ہوئی ہو۔ یہ اندازہ اس لئے بھی دُرست معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے گوجروں میں گلوٹ اور باگڑی گوجر خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

"رانا علی حسن چوہان" کی "تاریخ گوجر" اور جتیندر دیو کی ہندی "تاریخ گوجر اتہاس" اس قسم کے تاریخی حوالوں سے بھری پڑی ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ پُورا برِّصغیر ایک زمانے میں گوجر راجاؤں کی چھوٹی بڑی راجدھانیوں میں منقسم تھا۔ ان راجدھانیوں پر محمود غزنوی سے لے کر اکبر اعظم تک کے حملے ہوتے رہے۔ تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک گوجر راجاؤں اور بیرونی حملہ آوروں میں جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا اور ان ہی جنگوں کے دوران گوجر مسلسل پسپائی اور نقلِ وطن پر مجبور ہوتے رہے۔

الغرض مختلف محقّقین کے پیش کردہ حوالوں میں زیادہ مُستند بات یہ نظر آتی ہے کہ گجرات پر، جو کسی زمانے میں گوجروں کا مرکز و مسکن تھا، اکبر اعظم کے حملے نے گوجروں کو زبردست تباہی و بربادی سے دوچار کر دیا اور اسی زمانے میں گوجروں کی کثیر تعداد شمالی ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ لوگ جموں و کشمیر میں بھی داخل ہوئے۔

رانا علی حسن چوہان "تاریخ گوجر" کی جلد پنجم کے صفحہ ۴۵۵ اور ۴۵۶ پر یُوں رقم طراز ہیں کہ

"گوجروں کا آخری عروج آٹھویں صدی عیسوی میں منڈور اور بھیمال (راجستھان) سے شروع ہوتا ہے جب کہ ان کی حکومت کی حدود کابل سے بنگال اور نیپال سے کرناٹک تک پہنچ گئی تھیں۔ اُس وقت گوجر زبان کچھ اس قسم کی تھی :-

تھارو سیس بگڑیہ ناریل — اے محبوب تیرا سر حسین گول ناریل کی مانند ہے

تھاری آنکھ لمبو کی پھانک — تیری آنکھیں لیمو کی پھانکوں جیسی ہیں

تھاری ناک سواں کی چونچ — تیری ناک سوئی کی نوک کی مانند ہے

تھارا ہتھ چمپا کی ڈال — اور تیرا ہاتھ چمپا کی ڈال کی طرح (نرم و نازک) ہے

دسویں سے بارہویں صدی تک جب گوجر حکومتوں کے دارالخلافے دِلّی اور قنوج ہوئے تو اس زبان میں نکھار آیا۔ یہ کسی حد تک صاف سُتھری اور نرم ہوئی۔ مثلاً

او گوجر — مہارو مندر دیکھن آؤیو — اے گوجر — ہمارا مندر دیکھنے آنا

او دیوی جی ــــ تھارا مندر کو کاہیں دیکھنا (اے دیوی جی ــــ تمہارے مندر کا کیا دیکھنا ہے)

جُوں جُوں وقت گزُرتا گیا، گوجری زبان میں نرمی اور سُتھرے پن کے ساتھ ساتھ مُشکل پسندی بھی آتی گئی۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں جو گوجری زبان بولی جاتی ہے اُس کی مندرجہ ذیل مثال زبان کے سُتھرے پن اور مُشکل پسندی دونوں کو واضح کر دے گی:۔

جیڑو قوم فروش ہووُے اُس نگو کوئی مذہب دین نئیں ہوتو

ترجمہ: جو قوم فروش ہوتا ہے اُس کا کوئی دین و مذہب نہیں ہوتا۔

گوجری زبان کے بارے میں سری جے چند ودّیا لنکار لکھتے ہیں کہ (ملاحظہ ہو "بھارت بھومی" صفحہ ۲۴۹)

"راجستھانی کی ایک شکل گوجری ہے جو راجستھان کے باہر دُور دُور تک جہاں کہیں گوجروں کی آبادی ہے، بولی جاتی ہے۔ ان آبادیوں کا سلسلہ میوات (الور) سے شمال کی طرف جمنا کے دونوں طرف سے ہوتا ہوا ہمالیہ کی ترائی تک چلا گیا ہے اور وہاں سے پہاڑیوں کے اطراف کے علاقوں کی بولی کا مُرکّب ہے اور سبھی گوجر ہر جگہ یہی بولی بولتے ہیں۔ سوات اور کشمیر کے علاقوں میں بھی یہی بولی تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہے۔"

کشمیر، ہزارہ اور سوات (پاکستان) کے علاقوں میں گوجری زبان پشتو اور فارسی کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہی اور ان علاقوں میں آج بھی یہ زبان بڑی فصاحت سے بولی جاتی ہے۔ اس زبان میں شاعری اور نثر کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جسے ترتیب دینے پر کئی ایک ضخیم کتابیں مرتّب ہو سکتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ ریاست میں گوجری زبان بولنے والے زیادہ تر پس ماندہ اور اَن پڑھ ہیں۔ یہ زبان شعر و ادب کے اعتبار سے کسی دوسری مقامی زبان سے کم نہیں ہے۔ اس زبان میں کہانیاں لکھی گئی ہیں اور ڈرامے موجود ہیں۔ اس کے شعری ادب میں غزل، نظم، گیت، قطعات، سی حرفی، مثنوی، حمد اور نعت غرض مختلف اصنافِ سخن کا وُہ پُورا سالہ موجود ہے جو کسی زبان کے شعری ادب کو ممتاز مقام بخش سکتا ہے۔

گوجری زبان کے شعری ادب کو اپنی اَن تھک ذہنی کاوشوں سے مالامال کرنے والوں میں یُوں تو اَن گنت نام ہیں لیکن ان میں سے مہر علی نون مرحوم، سائیں قادر بخش مرحوم، محمد اسماعیل ذبیح، مہجور راجوروی، اقبال عظیم سجرانؔ، حضرت بن باسی، مہر دین قمر، سید حاکم شاہ، چونی لال شعلہ راجوروی

اور چودھری حسن، دین حسن پونچھی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

گوجری زبان کی شاعری میں جذبات کی وہی فراوانی اور اچھوتا پن نمایاں ہے جو فارسی اور اُردو شاعری کا خاصا رہا ہے۔ حسن کی بے التفاتی، تغافل شعاری اور سرد مہری سے عشق نے ہمیشہ گلہ کیا۔ اپنے محبوب کے دیدار کے لیئے تڑپتا ہوا عاشق شعر کی زبان میں محبوب سے یوں مخاطب ہوتا ہے ؎

صبح شام ہے تیری اڈیک مناں موقعو ملے تے مِل اِک وار آ نغے
گھابر گئی ہے میری اج جان ڈھڈی میرے نال کر گل دو چار آ نغے
مرا دِل ماں رہ ارمان تیرو کدے منہ تے دس اُڈار آ نغے
فرصت نئیں مھجر۔ اج ملن نغی تاں مھیں بیلا ماں سامنے چار آ نغے

ترجمہ:۔ فرصت نکال کر ایک بار مجھ سے مِل، مجھے شام و سحر تیرا انتظار ہے
آ۔ اور میرے ساتھ دو چار باتیں کرلے، میں آج اپنے آپ سے گھبرا گیا ہوں
میرے دِل میں تجھے دیکھنے کی خواہش تڑپ رہی ہے
اس پار آ۔ اور مجھے اپنے رُخِ روشن کا جلوہ کر لینے دے
اگر نہیں آسکتی تو سامنے جو چراگاہ ہے اس میں بھینسیں چرا (تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں)

گوجری زبان میں بے شمار مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں جن کی انفرادیت اپنی جگہ مقدم ہے۔ ایک مثنوی کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

جل قلم کرنے نام ربّ نو یاد	اے قلم خدا کا نام یاد کر اور چل
جس نِی قدرت تے ہے جہاں آباد	جس کی قدرت سے جہاں آباد ہے
سارو ہی جگ جہاں ہے اس نو	ساری دُنیا جہاں اُسی کی ہے
یاہ زمین یوہ آسمان ہے اس نو	یہ زمین وہ آسمان اُسی کا ہے
اس نا ہتھ ماں ہے زندگی مھاری	اس کے ہاتھ میں ہماری زندگی ہے
اُس نے اگے ہے بندگی مھاری	اور اُسی کے آگے ہماری بندگی ہے

سی حرفی کے معاملے میں بھی گوجری زبان کسی اور زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ مرحوم سائیں قادر بخش پونچھی کی سہ حرفی کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیے:

الف اِسو بے ترس نہ کو ڈٹھو جسو توں سجنا میرے نال ہویو
سر لبل گئی سینو ساڑ سٹیو سارو یوک پچھئے یوں کہ حال ہویو

بھلا کہ دسو کیہڑ و روگ مناں اندروں بھکھ پھُر نوا تو لال ہو یو
قادر بخش اِک وار تے گھل پھیرو دیکھ درد میرو کس تال ہو یو

ترجمہ :۔ میرے محبوب — میں نے کوئی اتنا بے رحم نہیں دیکھا جتنا کہ تو ہے
تیرے عشق نے میرے سینے میں آگ لگا دی ہے اور سب لوگ میرے پیچھے ہو گئے
ہیں (دیکھ میرا یہ کیا حال ہو گیا)
بھلا میں کسی کو کیا بتاؤں مجھے کون سا روگ لگ چکا ہے۔ میرا دل انگارہ بن گیا ہے،
قادر بخش ایک بار تو میرے پاس آ اور دیکھ کہ میرا درد کتنا بڑھ گیا ہے
(کس حد کو پہنچ چکا ہے)

سائیں قادر بخش کی یہ سی حرفی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں محبت کی تمام تشنہ آرزوئیں اور محبوب کو پانے کی ازلی اور ابدی خواہش اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس سی حرفی میں استعاروں اور تشبیہات کا خوبصورت استعمال، احساس کی کیف سامانی، تخیل کی ندرت اور جذبہ کی گہرائی و گیرائی ذہن پر ایک غمناک تاثر چھوڑتی ہے۔

گوجری زبان لوک گیتوں کی دولت سے بھی مالامال ہے۔ جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں میں گوجری زبان کے اَن گنت لوک گیت بڑے ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں۔ یہ گیت گوجروں کے جذبات و احساسات کے ترجمان، اور ان کے مخصوص تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ صرف جموں و کشمیر کے گوجری لوک گیتوں کو جمع کرنا ہی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ دوسری زبانوں کے لوک گیتوں کی طرح گوجری لوک گیت بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے ہیں۔ ان لوک گیتوں میں وقت کے ساتھ ساتھ تراش خراش بھی ہوتی رہی اور یہ ارتقائی تبدیلیوں سے بھی دوچار ہوتے رہے۔ چند مشہور گوجری لوک گیتوں کے نام یہ ہیں (۱) مقدم نورا (۲) میرو چن (۳) اُچی ماہلی تے ڈھول (۴) سپاہیا جی (۵) اُچو نکو تے سپاہیا جی (۶) اُڈ تو کاگ تے پردیسی (۷) سجنا بہلو مڑیئے (۸) گوجری ماہیا (۹) او بسیاکھا (۱۰) مقدم تاجبہ (۱۱) برسیا گوجر غو راج وغیرہ وغیرہ

"میرو چن" لوک گیت کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

چٹو کو ٹھو تے، پیہر ٹے ہے داکھ — میرے سفید مکان کے صحن میں داکھ[1] کو پھل لگ گئے ہیں

[1] ایک پھل دار بیل کا نام جو پہاڑی علاقوں میں پائی جاتی ہے

گیو سیال تے آیو بیساکھ	سردیاں گزر چکیں، اب بہار آگئی ہے
میرو روون نہ اجاں تھاٹیو	لیکن میں اب بھی رو رہی ہوں
میرو چن کیوں اج نئیں آئیو	میرا چاند آج کیوں نہیں آیا
جیٹو کوٹھو تے سوہنو پسار	میں اپنے گھر کے دالان میں کھڑی ہوں
دیگر بیلو تے دیوں ہوں تار	اور شام ڈھلتے تار دے رہی ہوں
ڈھڈو دِل میرو گھبرائیو	میرا دِل گھبرا رہا ہے
میرو چن کیوں اج نئیں آئیو	میرا چاند آج کیوں نہیں آیا؟

گوجری زبان میں محاورات، روزمرہ اور ضرب الامثال کی بھی کمی نہیں ہے۔ کسی بھی زبان کا مطالعہ کرنے اور اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس زبان کی ضرب الامثال اور محاورات کو سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہی زبان کے ایسے اجزا ہوتے ہیں جن سے اس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ماہرینِ لسانیات اس بات کو ایک "کلیہ" مانتے ہیں کہ جس زبان میں جس قدر عمدہ محاورے اور ضرب المثلیں پائی جائیں گی اسی قدر اس زبان کا فصاحت و بلاغت کا معیار بلند تر سمجھا جائے گا۔ گوجری زبان بھی ضرب الامثال اور محاورات کے لحاظ سے اپنا ایک مخصوص ادبی معیار رکھتی ہے۔ گوجری ضرب الامثال کا نعم البدل فارسی میں بھی مِل جاتا ہے۔ اسی طرح یہی ضرب الامثال اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر فارسی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے:

"من تُرا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

اسی کو گوجری میں یُوں کہا گیا ہے "ہوں تیرو میوں تے توں میرو میوں"

اسی طرح اُردو کی ضرب المثل "اُونچی دُکان اور پھیکا پکوان" گوجری زبان میں اس طرح ہے کہ "ناں بڑو تے گراں اُجاڑ"

میں نے ذیل میں گوجری کی چند ضرب المثلیں اور محاورے دئے ہیں۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمے کے طور پر فارسی اور اُردو کی وہ ضرب المثلیں اور محاورے پیش کروں جو گوجری محاوروں اور ضرب المثلوں سے بڑی حد تک مِلتے جُلتے ہوں یا معنوی اعتبار سے بھرپور مماثلت رکھتے ہوں:۔

(۱) راگوں کھونجی ڈومنی گاوے ساری رات	مُنہ لگائی ڈومنی گائے آل پتال
(۲) سیخ بھی نہ سڑے تے کباب بھی پک جائے	سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

(۳) کوڑنی دوڑ تھوڑی — جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے

(۴) جیو تیر ولون پانی ایسو میرو کم جانی — جیسا کرنا ویسا بھرنا

(۵) اُونٹ نہ کدیا بورا کدُیا — اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

(٦) نال میرو تے گراں تیرو — حلوائی کی دُکان پہ نانا جی کا خاتمہ

(۷) سُتّاں غاکٹّا تے جاگناں نی کٹّیں — خفتگاں را بہرہ از انعام نیست

(۸) جیسو نُور واسیو پیرو — سگ برادرِ خراست یا (جیسی رُوح ویسے فرشتے)

(۹) گٹّی تنگھے کِلہ نے زور — پاس کچھ ہو تو جراُت بھی ہوتی ہے

عبد الاحد آزاد مرحوم

کی

"کشمیری زبان اور شاعری"

کا تیسرا اور آخری حصّہ چھپ کر

آگیا ھے

اس معرکتہ الآرا کتاب میں کشمیری زبان کے عظیم ارکانِ ثلاثہ

پرمانند ، مقبول اور مہجور

کی سوانح اور کلام پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے!

محمد یوسف ٹینگ کی ترتیب اور دیباچے کے ساتھ

تفصیلات اکادمی کے پتے سے دریافت کی جاسکتی ھیں

سیّد حرمت الاکرام

ظفرؔ کی غزل گوئی اور اس کا پس منظر

ہندوستان میں سلاطینِ مغلیہ کی خوش مذاقی نے اپنی زرفشاں چھاؤں میں مختلف علوم و فنون کی نشوونما اور ترویج و ترقی کے جو مواقع دیئے، ہماری تاریخ ان کی اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ان میں سے بیشتر سلاطین کا ادبی مذاق بڑی پاکیزگی، نفاست اور بلندی رکھتا تھا۔ خود اُردو کا وجود انہیں سلاطین کے عہدِ حکمرانی کا ایک نقشِ جمیل ہے۔ اُردو کا آغاز لشکر سے ضرور ہوا، لیکن اس کی جمال آرائی قلعۂ معلیٰ ہی میں ہوئی۔ اس نے اپنے عشووں کے لئے جادو اور اداؤں کے لئے بانکپن اسی فضا میں پایا۔ نیز طفلی سے شباب کی فسوں طراز منزل کی طرف قدم بڑھانے کی راہ اس کو یہیں سے ملی۔ بہادر شاہ ظفر بھی اسی خاندان کے ایک تہی نصیب اور ستم رسیدہ تاجدار تھے جنھیں یہ حسرت رہی کہ

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ظفر اُردو کے زبردست فدائی تھے۔ انھوں نے اپنی زوال سامانیوں کے باوجود اُردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور اپنے دَور کی سیاسی تاریخ کو شاعری کی آغوش میں سمو کر حیاتِ دوام سے ہم کنار کر دیا۔ وہ قریباً ۶۳ سال کے سِن میں تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے۔ گو کہ ان کی قلمرو کا حلقۂ اثر محض لال قلعہ کی چار دیواریوں تک محدود تھا لیکن ان کی وضع دارانہ حوصلہ مندی اپنے اجداد کے روایتی، تہذیبی اور منصبی وقار کی ظاہری دل کشیوں کو برقرار رکھنے میں مصروف رہی۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود لال قلعہ کی فضا میں سخن وروں کے نغمات گونجا کرتے تھے، اگرچہ ان میں زندگی کی حرارت مفقود تھی۔ ظفرؔ کے پیشروں نے ہندوستانی میلوں اور تہواروں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ انھیں اپنی تہذیبی زندگی کا جزو بنا کر اس روشن خیالی، بیدار مغزی اور فراخ دلی کا ثبوت دیا جو رنگ و نسل اور مذہب و ملّت کے مہلک رُجحانات سے بالاتر ہوتی ہے۔ ظفرؔ نے بھی اس روایت کو گلے سے لگایا۔ نیز اس کو اپنی فطری و ذاتی بے تعصبی و اخوّت

شیرازہ

پسندی کا سوز دے کر زیادہ تابناک بنایا تاکہ اُس ہندوستانی کلچر کا عکس نمایاں تر ہو سکے جس کی تشکیل اور تعمیر میں بتدریج وحسبِ توفیق ہر مغل حکمران نے ایک عظیم مثالی کردار ادا کیا ہے۔ وہ کردار جو ظفر کو تاجِ شاہی سے زیادہ عزیز تھا۔

علم دوستی اور سخن سنجی سے قطع نظر وہ اپنے سینہ میں ایک دردمند انسان کا دل رکھتے تھے جس پر گردشِ ایّام نے پے بہ پے چرکے لگائے۔ جس کو زخموں اور داغوں نے اپنا مسکن بنالیا۔ اس انسان نے جہاں اپنے دیگر تاج دارانہ فرائض کی تکمیل میں بڑی بے غرضی، ذمہ داری، ایثار پسندی اور وسیع النظری سے کام لیا وہاں اُن سازشوں کا بھی گلا گھونٹ دیا جن کی ضرب ہندو مُسلم اتحاد پر پڑتی تھی اور جن کی پُشت پر فرنگیوں کی عیّارانہ سیاست کارفرما تھی۔ چنانچہ ظفر نے ایک بار عیدِ قرباں کے موقعہ پر فساد کے اندیشہ کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے گائے کی قربانی پر سخت پابندی عائد کردی۔ ان کا یہ مقولہ نہایت مشہور ہے کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں مجھے اپنی دو آنکھوں کی مانند عزیز ہیں۔ جس کا ثبوت انہوں نے ہر موقعہ پر کردار کا غازی بن کر دیا۔ ظفر ہندوؤں کے تمام تہوار اس نہج سے مناتے جیسے وہ ان کے اپنے مذہبی تہوار ہوں جس کے نتیجہ میں ہندوؤں نے بھی انہیں اُسی قدر قابلِ احترام و اعتماد تصوّر کیا جس قدر مُسلمان کرسکتے تھے اور یہی جذبہ تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی قیادت کے لئے ہندوستانی عوام کو ان کی دہلیز پر لایا۔ اندرونی چپقلش، معاونین کی نااہلی وخود غرضی نیز مالی وسائل کی حوصلہ شکن کمی کے باوجود بہادر شاہ ظفر اس آگ میں بے خطر کُود پڑے۔ انہوں نے اپنے فریضہ کو کتنی خوش اسلوبی، دیانت داری اور بے جگری سے نبایا، اس کے شواہد تاریخ کے اوراق دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کی دانشمندانہ تدابیر کو خُود ہندوستانیوں کے باہمی نفاق اور اہلِ فرنگ کی مکاریوں نے بیکار کردیا۔

اس کا خمیازہ جہاں ہندوستان کے باشندوں کو ایک مسلسل محکومی کی شکل میں بھگتنا پڑا وہاں ظفر کو انگریزوں کے انتقامی جذبات کی درندگی کا ہدف بننا پڑا۔ ان کے بیٹوں کو نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ نیز ظفر کو جلاوطنی کی سزا دے کر رنگون پہنچا دیا گیا جہاں انہوں نے انتہائی کس مپرسی، بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں قیدِ فرنگ سے ابدی نجات حاصل کرلی۔

ظفر صبر و تحمل، خودداری و بے لوثی، ایثار وانکسار کا سراپا تھے، ان کی نیک نفسی اور بے نفسی

کے لئے یہ بتا دینا کافی ہے کہ جنگ آزادی کے دوران انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد وہ اپنے لئے کوئی منصب نہیں چاہتے بلکہ ان کی دلی خواہش ہے کہ اہلِ ہند اتفاق رائے سے کسی اور کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت دے دیں۔ انہیں افسر و اورنگ خسروی سے نہیں بلکہ ہندوستان کی دھرتی سے پیار تھا۔ انہوں نے تحریک آزادی پر اپنی زندگی اس غرض سے نہیں واری تھی کہ خزینۂ سلطانی میں زر و جواہر کا انبار لگائیں اور بزمِ نشاط آراستہ کرکے دادِ عیش دیں بلکہ ان کی نگاہ عوام کے دکھ درد پر تھی جسے وہ دیکھ نہیں سکتے تھے اور ان کے دل میں یہ آرزو موجزن تھی کہ ہندوستان کے پاؤں سے جبر کی بیڑیاں کٹ جائیں۔

ظفر کی زندگی ابتدا ہی سے ایسے حالات کی اسیر رہی جن پر غم و کرب کی چھاپ بڑی گہری تھی۔ ان کی راہ میں قدم قدم پہ اتنے پیچ و خم، اس قدر نشیب و فراز تھے کہ منزل رسی کی آس موہوم تر ہوتی گئی اگرچہ خود ان کی اولوالعزمی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے پیش رووں کی غلط کاریوں اور بداندیشیوں نے تیموری حکومت کی اساس بالکل کھوکھلی کر دی تھی۔ ظفر کو شروع ہی میں ولی عہدی سے محرومی کی دل شکن واردات سے دوچار ہونا پڑا جس کا دور رس اثر ان کی زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑا اور پڑنا ہی چاہیئے تھا۔

ظفر اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے مگر جشنِ تاج پوشی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ان کے پاؤں تھک چکے تھے اور چہرہ غبارِ راہ سے اٹ چکا تھا۔ کامرانی کا یہ موقعہ بھی ان کے حق میں نئی بلاؤں، نئی آفتوں اور نئے حادثوں کا نقیب تھا۔ ان کے ذہن میں عہدِ رفتہ کی شوکت و سطوت نیز حشمت و عظمت کے سہانے خاکے تھے اور نگاہ میں قلعہ معلیٰ کی سرنگوں و محزوں فصیلیں جن کی اوٹ سے سال ہا سال کا جاہ و جلال جھانک رہا تھا۔ ان فصیلوں کے تاریخی نقوش دھندلاہٹوں میں گم ہوئے جارہے تھے اور آنے والے دور کی تلون انگیزیوں کا احساس ان کو اور دھندلائے دے رہا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ ظفر کی روشنئ طبع ہی ان کے لئے بلا بن گئی ہو۔ وہ بیک وقت متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اردو، ہندی، فارسی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی اردو اور ہندی تخلیقات کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ وہ زبان و فن کے نکات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ نیز محاوروں اور روزمرہ پر انہیں پوری قدرت تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خوش نویسی، موسیقی اور نجوم میں کامل دستگاہ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ سپہ گری کے جملہ اوصاف بھی ان میں موجود تھے۔ ممکن ہے کہ ظفر کی یہ خصوصیات و صفات ان

کے حق میں اس لیئے بھی وجہ آزار رہی ہوں کہ وہ دورِ انحطاط کے دوسرے حکمرانوں کی طرح عیش کوش، خود غرض اور بندۂ حرص و آز نہیں تھے بلکہ ان کے کردار میں بھی وہی پاکیزگی تھی جو ان کی شاعری میں ہے اور وہ ایک سچے شاعر کی طرح اچھے اور عالی ظرف انسان بھی تھے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ ان کے دِل کا تمام سوز و درد ان کی شاعری میں سمٹ آیا ہے۔

وہ کہتے ہیں :

اے ظفرؔ دیکھئے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا۔ چین دُنیا میں تو اِک دم نہ ہوا پر نہ ہوا

ان کی دِل گیری و غم گینی کے کئی پہلو ہیں۔ ان کے دِل پر جو داغ اور زخم ہیں وہ غمِ جاناں کے بھی ہیں اور غمِ دوراں کے بھی، جنہیں حوادث کے تواتر نے ناسور بنا دیا ہے ورنہ جس ماحول نے انہیں پروان چڑھایا تھا، اگر اس کی اپنی خصوصیات علیٰ حالہ برقرار ہوتیں تو ظفرؔ کی شاعری کو داغؔ کی شاعری سے قریب تر ورنہ مشابہ ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ خود بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد ذوقؔ دہلوی کے یہاں حزن والم کا پرتو بڑا ہلکا اور ایک حد تک محض روایتی ہے۔ کیونکہ ان کی ذاتی زندگی ایک طرف ان آلام و حوادث سے ناآشنا تھی جن کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ظفرؔ کو جلنا پڑا تو دوسری جانب ان کے شب و روز اس منصبی و نفسیاتی گراں باری سے بیگانہ تھے جو ظفرؔ جیسے برائے نام شہنشاہ کی تقدیر بن چکی تھی اور ان کو ہمہ وقت

جن کے رُتبے ہیں سِوا ان کو سِوا مُشکل ہے

کا آئینہ دکھاتی رہتی تھی۔ ان کے نحیف و نزار شانوں پر کتنوں کا بوجھ تھا لیکن ان کو سہارا دینے والا کوئی ایک بھی نہ تھا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ قدم قدم پر لڑکھڑاتے تھے۔ لیکن روشنی کی ایک کِرن بھی ایسی نہ تھی جو راہ میں اُجالا کرتی اور ایک بھی ہم سفر ایسا نہ تھا جو کسی نازک موڑ پر ان کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے سکتا بلکہ اس کے بجائے ان کے ہمراہیوں اور ہم رکابوں نے ان کے سفر کو دشوار تر بنایا اور راستے میں گڑھے کھود دے۔ ظفرؔ کی محرومیوں کی زنجیر کو پے بہ پے نئی کڑیاں ملتی رہیں جو تختِ شاہی سے باضابطہ وابستگی کے بعد مضبوط تر ہو گئیں اور ان کا غم ایک ایسا گورکھ دھندا بن گیا جو بعض اوقات سُلجھانے کی کوشش میں اور اُلجھ جاتا ہے۔ جنگِ آزادی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور یہ تلخابہ برق رفتار حالات کے تغیراتی عمل کی زد میں آکر زہرِ ہلاہل بن گیا۔

دُنیا اُمید پر قائم ہے۔ چنانچہ جنگ آزادی کے سپاہیوں کی قیادت قبول کرتے وقت یقیناً نہیں تو کسی نہ کسی حد تک ظفرؔ کے ذہن میں یہ تصور ضرور انگڑائیاں لے رہا ہو گا کہ وہ ظفریاب ہو کر "بہادر شاہ"

بن سکتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اس کی کوئی حرص یقیناً نہیں ہوگی لیکن بقدر پیمانہ تخیّل سرورِ خودی کے وجود سے انکار بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ فطرتِ بشری کے منافی ہے اور اہل ہند کی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ وہ قیدِ فرنگ سے آزاد ہوکر اُس پرچم کی چھاؤں میں پناہ لینا چاہتے تھے جو ان کے سروں پر صدیوں سے سایہ فگن تھا لیکن اس آتشیں تحریک کی پسپائی کے بعد بہادر شاہ ظفر کا ساتھ غالباً موہوم سے موہوم اُمید نے بھی چھوڑ دیا ہوگا۔ تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کیسی زندگی ہوگی جو خوشی و خوش دلی کے چھینٹوں سے تو خالی تھی ہی، آس کی شبنم سے بھی محروم ہوگئی۔ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ حکمران کے بجائے ایک قیدی ہوگئے بلکہ انگریزوں کی بربریت نے اس قید کے لئے رنگون جیسے دُور اُفتادہ مقام کا انتخاب کیا جہاں نہ کوئی ہم نوا تھا نہ ہم نفس، مونس نہ مددگار۔ ظفر تھے اور محتاجی و بے کسی کا اتھاہ سمندر! یہ تھے وہ حالات جن میں ظفر کی غزلوں کی تخلیق ہوئی۔

ظفر کی قادر الکلامی اپنے دامن میں بڑی وُسعت اور رنگارنگی رکھتی تھی۔ انہوں نے غزل، رُباعی، قطعہ، مستزاد، قصیدہ، نعت، سلام، مرثیہ، دوہا، ہولی، ٹھمری، بھجن، گیت، مجرا، سہرا اور سِنکھا سبھی کچھ کہا لیکن ان کی شاعری میں اساسی حیثیت غزل ہی کو حاصل ہے جس کی تعمیری ہیئت کی اُستواری میں عشقیہ اور متصوفانہ خیالات کے علاوہ سیاسی رنگ آمیزی کا بھی بڑا حصہ ہے اور اس سے مفر یا اجتناب کی کوئی صورت غالباً ظفر جیسے آدمی اور شاعر کے لئے تھی ہی نہیں۔ کیونکہ سیاسی تغیرات و کوائف سے تعلق رکھنے والے خارجی مضامین ایک اعتبار سے ان کی زندگی و شاعری میں داخلیت کے مترادف نظر آتے ہیں۔ قلعہ معلیٰ کی اندرونی حدود سے لے کر پُورے ہندوستان کی سیاسی فضا ظفر کی زندگی سے عمیق ربط رکھتی تھی۔ اس قلزم سے اُٹھنے والی ہر موج قلعہ معلیٰ کی دیواروں سے ٹکراتی اور شگاف کی شکل میں ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی تھی۔ ایک معنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے داخلی حالات کی تشکیل ایک حد تک خارجی اثرات کے تحت ہوتی تھی اور اس طرح ان کی لوحِ سُخن پر جو نقوش و خطوط اُبھرتے تھے ان کے آب و رنگ میں بعض اوقات غمِ روزگار کی کارفرمائی بڑی گہری ہوتی تھی، یہ اور بات ہے کہ ان پر غزلیہ روایات کا رنگین آنچل ہوتا تھا۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ظفر ہر غم کو غمِ جاناں بنا کر دشواریٔ حیات کو آسان کرنے کے قائل تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے غموں پر عموماً غمِ جاناں کی نقاب ڈالے ہوئے مِلتے ہیں۔ اگرچہ "اندازِ قد" اس کی پردہ دری کرتا رہتا ہے۔ مثالاً چند شعر درج ذیل ہیں:

نہیں پرواز کی صیاد بال و پر میں جب طاقت
قفس میں ہم اسیروں کی رہائی گر ہوئی تو کیا

شیرازہ

ٹھہرا ہوا جو پاؤں ٹھکانے سے اُٹھ گیا
دِل بھی قسم ہے ایک زمانے سے اُٹھ گیا

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دِل کی دِل ہی میں تمنّائے رہائی رہ گئی

اے ظفر ہے دیکھ کھٹکا باغباں کا کس قدر
باغ میں بُلبل کی آج آواز بھی آتی نہیں

ہوشیاری سے سمجھ کر چال چلنا چاہیئے
کارِ دُنیا بھی ظفر شطرنج کا سا کھیل ہے

کیجے نہ دس میں بیٹھ کے آپس کی بات چیت
پہنچے گی دس ہزار جگہ دس کی بات چیت

جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اُڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم بریاں تھے

ہم نے اس ہستی میں رہ کر دُہ اُٹھائے رنج و غم
جو روانہ ہو گئے سُوئے عدم اچھے رہے

سینے میں اِک دُھواں کئی بار اُٹھ کے رہ گیا
نکلا نہ میرے دِل کا بُخار اُٹھ کے رہ گیا

دُنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا
ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا

ظفر کی دُنیا میں چمن و زنداں، صیّاد و بُلبل اور قفس و آشیاں جیسی علامات اپنے روایتی معنوں سے گذر کر ایک ایسے مفہوم و تاثر کی تخلیق کرتی ہیں جس کی آڑ میں حقائق و واقعات کی نیرنگیاں اور سنگینیاں سانس لیتی ہوئی ملتی ہیں۔ نیز ان میں ظفر کی رُوح کسمساتی اور دِل دھڑکتا ہوا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا یہ حصہ تاریخ کے ایک اہم تر باب کی شکل رکھتا ہے۔ فرق محض اس قدر ہے کہ تاریخ میں تفصیل و تشریح ہوتی ہے اور اس میں کنایات و استعارات کی معنی آفرینیاں ہیں جو بایں لحاظ زیادہ غور طلب ہیں کہ ان میں وہ باتیں بھی مِل جاتی ہیں جنھیں تاریخ کا دامن کسی وجہ سے سمیٹ نہیں سکا ہے۔

ظفر کے تغزل میں کرب و اضطراب اور سوز و التہاب کی نمایاں و پنہاں لہروں سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اپنے تیکھے پن کے باوصف میر یا فانی کے غم سے مشابہ یا اس کا ہم پلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ بسیط و بیکراں ضرور ہے مگر عمیق و رفیع نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ظفر کی شاعری عموماً نالہ و شیون سے مغلوب نظر آتی ہے لیکن ان کے آنسوؤں اور نالوں میں ردِّ عمل کی ایک شوخ یا تیکھی کیفیت کے علاوہ کوئی فکر مندانہ یا دانش ورانہ شعور نہیں ملتا اور ایسے موقعوں پر ان کی شاعری کسی مبصر کے جائزے کے بجائے ایک تماشائی کا بیان بن کر رہ جاتی ہے جس میں مشاہداتی تفصیل تو ہوتی ہے لیکن تجربہ کی گہرائی نہیں ہوتی۔ ذیل کے چند اشعار سے اس کا ثبوت مِل سکتا ہے:

تیری گلی سے عاشقِ زار اُٹھ کے رہ گیا   اُٹھا تھا ناتواں سا غبار اُٹھ کے رہ گیا

نہ پوچھ مجھ سے ظفر تو مری حقیقتِ حال   اگر کہوں گا، ابھی تجھ کو میں رُلا دوں گا

عشق نے کیا جانیے کیا دل میں بھڑکائی ہے آگ - اب جو سینے میں مرے ہر داغ اخگر سا بنا

سُنا میں نے کٹی ان کی بھی ساری رات آنکھوں میں   کسی نے میرا افسانہ سُنایا کچھ نہ کچھ ہوگا

طپشِ دل کو لگے آگ کریا ربّ کیا ہے   بعد مردن بھی تہ خاک نہ آرام دیا

عجب ہے سوزِ محبت پہ دل مرا ٹھہرا   کہیں بھی آگ پر سیماب ہے بھلا ٹھہرا

ہم نے دیکھا ہے جو ستم تیرا   نہیں اب تک سُنا کسی نے ہے

کیا کہوں تم سے اجی اب تو ہے جینا بھی محال   جیسا جی تم نے ستایا مرا جی جانتا ہے

ہے بدنصیب اتنا ظفر دفن کے لیے   دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ظفر کے سرمایۂ شعری کا ایک بڑا حصہ رسمی ہونے کی بنا پر نا قابلِ اعتنا ہے۔ اچھے بُرے اشعار ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں لیکن قدما عموماً انتخاب کے قائل نہیں تھے اور کسی کھوٹے سکّے کو بھی اپنے خزینہ سے علیحدہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس وضع کی پابندی ظفر کے یہاں پورے طور پر ملتی ہے چنانچہ ان کی شاعری کبھی کبھی مذاقِ سلیم کے لئے بڑی صبر آزما ہو جاتی ہے لیکن اس کا تاثر جس کے دوش بدوش زبان و بیان کی سلاست، حلاوت اور نفاست کی جادوگری بھی ہے، شاعر کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ظفر کو کجکلاہی نہیں لیکن کلاہِ خسروی کا امانت دار ضرور کہا جا سکتا ہے جس کو پس منظر میں رکھ کر ان کی درویشانہ زندگی قدرے عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے ان کی طبعی غیر تصنع پسندی کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ غالباً اسی لئے ان کی شاعری میں بھی بناوٹ کم اور جذبات و محسوسات کا سیدھا سادہ اظہار زیادہ ہے۔ انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں فکرِ سخن کر کے غیر شعوری طور پر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دشواریوں سے انہیں فطری لگاؤ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ان زمینوں میں بڑے خوش رنگ پھول کھلائے ہیں۔

اُردو غزل ابتدا ہی سے تصوّف کی پرستار رہی ہے۔ کیونکہ ایک طرف اُردو پر فارسی کے گہرے اثرات نے متصوفانہ رجحانات کو فروغ دیا تو دوسری جانب اُردو کے بیشتر غزل گویوں کے تصوّف سے عمیق لگاؤ نے غزل میں صوفیانہ خیالات کے اظہار کو ایک روایت کی شکل دے دی جو برابر پروان چڑھتی

گئی۔ یہ روایت بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں بھی اپنی تمام صفات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کیونکہ اسے ان کی اُفتادِ طبع سے بھی یک گونہ مناسبت تھی۔ دُکھے ہوئے دِلوں اور آلامِ زمانہ کے ستائے ہوئے ذہنوں کو یوں بھی تصوّف کی آغوش میں بڑا سکون مِلتا ہے۔ چنانچہ ظفر کی متصوفانہ شاعری ایک روایت کی حدود سے بڑھ کر ایک حقیقت کے رُوپ میں ڈھلتی چلی گئی ہے جسے ان کے اپنے محسوسات کی آواز نے زیادہ سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ان کی آواز میں کوئی انفرادی تاثر ہو یا نہ ہو لیکن اس میں ان کی رُوح کا التہاب اور دِل کا اضطراب ضرور چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار درج ہیں جو ان کے تغزل و تصوّف دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں:

تھا جلانا ہی مجھے دُوریٔ ساقی سے اگر — تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفر آج دِل کی آگ — آگئے تو شعلہ سا کوئی بار اُٹھ کے رہ گیا

بڑا رفیق تھا لیکن تری جُدائی میں — جُدا ہمارا دِلِ ناصبور ہم سے ہوا

کیمیا ڈھونڈتے پھرتے ہیں ظفر اہلِ ہوس — دِل گداز اپنا کیا جس نے وہ اکسیر ہوا

ساتھ لے جاتے ہیں جو خاک میں بیتابیٔ دِل — خاک آرام سے وہ زیرِ زمیں رہتے ہیں

ہم اس سے دُور رہے آپ اپنی غفلت میں — وہ اے ظفر نہ کسی وقت دُور ہم سے ہوا

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اُٹھ گیا — ایسا کچھ دیکھا کہ دُنیا سے مرا دِل اُٹھ گیا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

آنکھ چاہت کی بھلا کوئی ظفر چھپتی ہے — اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

جو نہ ہونا تھا ہوا ہم پر تمہارے عشق میں — تم نے اتنا بھی نہ پُوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا؟

کوچے میں ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا — دو چار گھڑی اپنا دِل کھول کے رو جانا

درِ جاناں سے مری خاک نہ کرنا برباد — دیکھ! جانا نہ اُدھر بادِ صبا میرے بعد

خُوں بہا ایک ناز میں ہے ادا — کُشتۂ خنجرِ ادا ہیں ہم

اللہ اللہ ان بُتوں کا غرور — یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

خوش اوقات دیکھے خرابات والے — ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے

جائے گا دَم میں دیارِ یار تک اپنا خیال — ورنہ جو جائے گا وہ منزل بہ منزل جائے گا

پستی میں جو دیکھا وہ بلندی میں نہ دیکھا سُوجھا جو بلندی میں وہ پستی میں نہ سُوجھا

ہر جگہ ایک نیا رنگ ہے اللہ اللہ واہ کیا جلوۂ نیرنگ ہے اللہ اللہ

کیا جانے ظفر کس کو یہ بھیس میں آہو کے صحرا میں ان آنکھوں کی وحشت لئے پھرتی ہے

نصیر، ذوق اور غالب سے شاگردانہ استفادہ کے باوجود ظفر کی غزل گوئی اپنا ایک جُداگانہ انداز و مزاج رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی یا کسی سے اثر قبول نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ان کی غزلوں میں ایک ایسی فضا ملتی ہے جسے ظفر کے علاوہ کسی اور سے نسبت نہیں دی جاسکتی۔ روایات کے گہرے سایے جن میں وضع دارانہ کشاکش کے دھندلکے بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ ظفر کی آواز پر اس طرح منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے یہ احساس یا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ظفر کبھی کبھی خود اپنی نگاہ میں بھی اجنبی سے رہے ہیں یا کوشش کے باوجود اپنے سے قریب نہیں ہوسکے ہیں۔ ان کے دَور کی تاریخ کی روشنی میں اس پر زیادہ حیرت بھی نہیں کی جاسکتی۔ ظفر کے یہاں جراُت یا رنگین کا جو پرتَو پایا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ اجنبیت یا دُوری بھی ہوسکتی ہے۔

ظفر کو حوادث کے جن کوہساروں سے متصادم ہونا اور تغیرات کے جن طوفانی دھاروں پر بہنا پڑا۔ اس کے ردّعمل کا ایک تقاضا ذہنی فرار بھی تھا جو ان کی غزلوں کے دریچے سے جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انہیں دِل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بعض اوقات اپنی سطح سے نیچے بھی اُترنا پڑا ہے جو ان کی بہت بڑی مجبوری تھی ـــ مجبُوری جس کے گرد ان کی پُوری زندگی گھُومتی ہے۔

ظفر کا تغزّل ان کی متصوفانہ سخن آرائی اور ان کا تصوّف ان کی غزل گوئی کی معنوی اور نفسیاتی معاونت اس انداز سے کرتا ہوا نظر آتا ہے جیسے کسی شبستان میں دو خوش وضع قندیلیں ایک دوسرے پر اپنا لطیف پرتَو ڈال رہی ہوں۔ ان کے لہجہ کا تھرتھراتا ہوا گُداز ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ایک سہمی ہوئی کراہ گھُلی ہوئی ملتی ہے، ان کے سوز سے جو ساز اور آنسوؤں سے جو نغمہ جنم لیتا ہے اس میں حیات کی متضاد حقیقتیں کبھی سُلجھی اور کبھی اُلجھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

نہیں حال دہلی سُنانے کے قابل یہ قصّہ ہے رونے رُلانے کے قابل

اُجاڑے لُٹیروں نے وہ قصر اس کے جو تھے دیکھنے اور دکھلانے کے قابل

نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اِک ظفر ہے فقط حال دہلی سُنانے کے قابل

اور وُہ ہر جگہ حالِ دِل کے ساتھ حالِ دہلی بھی سُناتے ہوئے مِلتے ہیں، دِل میں ارمانوں کے لاشے تھے اور دہلی میں زندہ انسانوں کے جنازے۔ دِل اور دہلی دونوں معمورے ان کے لئے ویران تھے اور یہ دہلی ان کے لئے دو گز زمین کی بھی گنجائش نہ نکال سکی۔ جلاوطنی کے بعد ان کی غزلوں میں کوئے یار، زنداں گُلستان جیسی علامات کی تکرار شدّت اختیار کر لیتی ہے اور الفاظ کے محبس میں ایک طائرِ مجبور کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ علی التواتر گونجنے لگتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جلاوطنی نے ظفر کی جسمانی و ذہنی اذیتوں میں اضافہ کر دیا۔ لیکن انہیں ایک ایسے کرب سے بھی آشنا کیا جو ان کی شاعری میں ڈھل کر نئے انداز اور نئی درھج سے سامنے آیا۔ ایسا انداز اور ایسی درھج جس نے ظفر کے شاعرانہ خد و خال کو اُبھار کر اسے دِل کشی و نظر نوازی کی امانت دی اور ان کی غزلوں کو وہ کیفیت عطا کی جس میں ایک جگر گداز شعلگی بھی ہے اور رُوح پرور طراوت بھی۔

انوارِ ابوالکلام آزاد

(باتصویر)

مُرتبہ: علی جواد زیدی

مولانا آزاد اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت میں ایک پورے عصر کی تاریخ مجسّم ہو گئی تھی۔ جشنِ کشمیر کے سلسلے میں اُن کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ایک محفلِ مناظرہ منعقد ہوئی۔ جس میں مُلک بھر کے مقتدر علما و فضلا نے شرکت کی۔ اس مناظرے میں پڑھے گئے مضامین اور اس کی روئداد کو حسین اشاعتی اہتمام کے تحت شائع کیا گیا ہے۔

قیمت: چھ روپے

اکادمی کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہے

شاذ تمکنت

حصارِ سنگ

صلیب آراستہ، مقتل چراغاں ہے جہاں میں ہوں
اِدھر تم ہو، اُدھر دُنیا کھڑی ہے درمیاں میں ہوں

٭

شکایت کیا کروں مجھ پر اگر پتھر برستے ہیں
میں اپنے آپ کو شاخِ ثمرور کہہ کے ہنستا ہوں
سراپا تم ہو میری جان و دِل سے میں تمہارا ہوں
جو دُوری ہو تو دُوری کو مقدّر کہہ کے ہنستا ہوں

٭

تمہیں اندیشۂ رسوائی و خوفِ جہاں ہو گا
مگر مجھ سے بہت دِن تک خُود آزاری نہیں ہو گی
تم اِک دیوار ہو میں زیرِ سایہ ہوں بجا لیکن
مجھے سر مار کر مرنے میں دشواری نہیں ہو گی

میر غلام رسول نازکی

اسلام میں تصوّرِ جمال

اسلام کے ساتھ ہی بانیٔ اسلام علیہ السلام کا تصوّر آنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اسلام کے تصوّر کا خالق اگرچہ خالقِ کائنات ہے لیکن حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دُنیا میں عام کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ حضور کو اس معنی میں بانیٔ اسلام کہنا دُرست نہیں بلکہ پیغمبرِ اسلام کہنا زیادہ صحیح ہے، لیکن حضور کے نامِ مُبارک کے ساتھ یہ اصطلاح بھی چل پڑی ہے۔ اس لئے اسے استعمال کرنے میں حرج بھی نہیں۔ جب ہم اسلام کے کسی پیغام یا کسی پہلو پر نقد و نظر کریں گے تو ظاہر ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ بابرکات ضرور سامنے آئے گی۔ اسلام میں تصوّرِ جمال کا تفصیلی جائزہ لینے سے پیشتر اس لئے ہمیں خود پیغمبرِ اسلامؐ کے جمال و تصوّرِ جمال کو سمجھنا ہوگا۔

تاریخ اس بات پر متفق الرائے ہے کہ حضور علیہ الصلواۃ والسلام مردانہ حُسن کا کامل نمونہ تھے۔ بے داغ، بے عیب اور ماہِ کامل کی طرح بے کم و کاست۔ حضرت علی فرماتے ہیں۔ ایک روز چاندنی رات میں حضورؐ سرخ رنگ کا حلہ پہنے بیٹھے تھے۔ ہم ایک نظر اُن کو، ایک نظر چاند کو دیکھتے تھے۔ مگر خُدا کی قسم حضورؐ چاند سے زیادہ حسین، دِل فریب اور خوب صورت تھے۔ واللہ ما رأینا مثلہٗ، قبلہ و لبعدہٗ۔ آپ ہی کا فرمان ہے، حضورؐ کی چہیتی بیوی اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ایک شام کوئی کپڑا سی رہی تھیں۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ سوئی ہاتھ سے گری۔ اتنے میں حضورؐ تشریف لائے آپ کے جمالِ جہاں آرا سے سوئی چمک اُٹھی۔ حضرت عائشہ بداہتاً بول اُٹھیں ــــــ

لَو اٰمی زلیخا لو رَاَیْنَ جبینہ ۔۔۔ لَاٰثرن بالقطع القلوب علی الایدی

حضرت یُوسف کی عاشق زار زلیخا کا عشق بدنام ہوا۔ تو مصر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب نے زلیخا کو ملامت کی کہ وہ ایک زرخرید غلام کی زُلفِ گرہ گیر میں اسیر ہو گئی ہے۔ زلیخا

نے ان سب کو کھانے پر بُلایا۔ کھانے کے بعد اُن کے سامنے پھل رکھے گئے اور ان کو کاٹنے کے لئے چھریاں موجود تھیں۔ جب ان خواتین نے چھُریاں ہاتھ میں لیں تو یُوسف اُن کے سامنے آ گئے۔ ان کے ہوش اُڑ گئے اور وہ پھل کاٹنے کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کاش وہ میرے اس یُوسف کو دیکھتیں۔ تب اُنہوں نے ہاتھ کاٹے تھے، اب اپنے دِل کاٹ دیتیں۔ حضورؐ کے جمال کی تکمیل اُن عادات و اوصاف سے ہوئی جو اللہ کی طرف سے اُن کو عطا ہوئے تھے۔ وہ باحیا دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے، قادر الکلام شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ خوش گفتار، بادِ صبا سے زیادہ خوش رفتار اور عادات و اطوار کے اعتبار سے دِل پذیر تھے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو مدینے کی لڑکیاں اُن کے لئے استقبالیہ گیت گا رہی تھیں ــــــ

اشرق البدرُ علینا من ثنیّاتِ الوداع

رُخصت کی پہاڑیوں کے پیچھے سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اللہ کی قدرتِ کاملہ نے اپنے بے پایاں حُسن کی دولت سے اس حد تک مالا مال کر دیا ہو، اُس کی اپنی حسن پسندی اور جمال نوازی کیا ہوگی۔ ایک روایت سے یہ حدیث ہے اللّٰہ جمیلٌ یحبُّ الجمال۔ اس کا مفہوم ہے کہ خدا حسین ہے اور وہ حُسن کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے۔ مجھے حدیثوں کی جرح و تعدیل کا علم نہیں۔ لیکن یہ عام اصول میرے سامنے ہے کہ جو حدیث حضورؐ کی طرف منسوب کی گئی ہے اگر وہ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق ہے اور راوی بھی ثقہ ہے تو وہ سچّی حدیث ہے۔ اس عام اصول کے پیش نظر مجھے ذاتی طور پر اللّٰہ جمیلٌ یحبُّ الجمال بالکل صحیح حدیث نظر آتی ہے اوّلاً اس لئے کہ یہ حدیث اسی نبیؐ کی طرف منسوب ہے جو خود حسن و جمال کا بے نظیر نمونہ ہے اور جس نے حسن کی ہمیشہ قدر فرمائی۔ اللّٰہ جمیلٌ یحبُّ الجمال چار لفظوں کا جملہ ہے اور نہ صرف اپنی ترکیب سے خود حسن و جمال کا مُرقع ہے بلکہ معنوی اعتبار سے انسان کے لئے ایک روشن کتاب اور شمعِ مبین سے زیادہ ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ کے جمیل ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑ، جھیلیں، باغات اور وادیاں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا بنانے والا جمیل نہیں ہوگا۔ اقبال نے فرمایا ؎

کوہ ہائے خنگ سارِ او نگر   آتشیں دستِ چنارِ او نگر
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن   پنبہ پرّاں از کمانِ پنبہ زن

کوہ و دریا و غروب آفتاب　　　　من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

ہم کشمیر میں رہتے ہیں، اس لئے ہم کشمیر کے حُسن و جمال کے شیدائی ہیں، اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی کائنات ہے، وہ کتنی حسین ہوگی، شاید اس ساری کائنات میں جس کا کہیں اندازہ بھی نہیں کروڑوں مقامات اور کروڑوں مناظر ایسے ہوں گے جن کے سامنے کشمیر کی شادابی ہیچ ہوگی۔ اس سارے حسن و جمال کے خالق کے اپنے حسن کا اندازہ کون کرسکتا ہے اور اس کے جمالِ جہاں آرا کا معمولی سا اندازہ بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ جمیل میں کوئی کلام نہیں۔ اللہ بے شک جمیل ہے، اس کو دیدہ و کسی نے نہیں دیکھا، لیکن اس کی صنعت گری کو دیکھ کر ہر دل اقرار کرتا ہے کہ وہ جمیل ہے، جس کا نقش اتنا حسین اور دلفریب ہے۔ وہ خود کیا ہوگا، بدصورت آرٹسٹ حسین آرٹ کی تخلیق نہیں کرسکتا، بُرا آدمی اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ کمینہ فطرت کا انسان اعلےٰ قسم کا کہانی کار نہیں ہوسکتا۔ اچھا آدمی اچھی تخلیق کرے گا۔ اچھے اور حسین خدا نے اچھی اور حسین تخلیق کی، جو پہاڑوں اور دریاؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، چشموں اور گھاٹیوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی، طلوعِ قمر اور غروبِ شمس کے روپ میں نظر نواز ہوئی۔ اس دنیا کا حال یہ ہے کہ جہاں نظر پڑتی ہے وہاں حسن کی کارفرمائی ہے۔

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجا ست

شرط اس کے لئے یہ ہے کہ انسان میں شرافت زیادہ ہو۔ وہ ربّ المشرق والمغرب کی تخلیقات میں حسن کی تلاش کرے۔ بُری چیزوں کی تلاش میں اپنی شرافت انسانی کو محلِ نظر نہ بنلائے۔ لطیفہ یہ ہے کہ جانسن نے جب اپنی ضخیم ڈکشنری تیار کی تو ان کے پاس ایک عورت آئی اور بولی ——— ڈکشنری تو آپ نے بڑی عظیم بنائی ہے، لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ آپ نے اس میں فحش الفاظ کثرت سے جمع کئے ہیں۔ جانسن نے جواب دیا۔ "محترمہ! اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ نے تلاش ہی وہ لفظ کئے ہیں جو فحش ہیں"۔ اس قسم کی سپرٹ ہو تو حسین چیز بھی بدصورت نظر آئے گی۔ نفسِ انسانی میں شرافت کا عنصر غالب ہو، تو ہر چیز میں حسن نظر آئے گا

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفترے است معرفتِ کردگار

اللہ جمیل کے اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا ویحب الجمال خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ خدا جمال پسند نہ ہوتا تو حسین و جمیل چیزوں کی تخلیق ہی کیوں کرتا؟ ظاہر ہے کہ اس قدر جمال پسندی کے بعد اُس کا محبوب بندہ وہی بن سکتا ہے جو خود حسین ہو۔ حسین کا لفظ میں وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ جس انسان کو اللہ نے اخلاقِ حسنہ کے زیور سے آراستہ کیا ہے وہ بھی حسین ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ــــ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم آپ کے اخلاق بے شک بہت بڑے ہیں۔ جس کو اللہ نے علم و فضل کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ بھی حسین ہے۔ کیونکہ علم بھی حسن ہے۔ جس کو خدائے بزرگ و برتر نے نوعِ انسانی کی ہمدردی اور دوستی کے جذبات سے سرافراز فرمایا ہے، وہ بھی حسین ہے۔ جس انسان کو خدا نے قبولِ عام بخشا ہے، وہ بھی حسین ہے۔ جس کو وطن اور مُلک کی خدمت کی توفیق ارزانی ہوتی ہے وہ بھی حسین ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا ان سارے حسینوں کو دوست رکھتا ہے۔ قرآن اسلام کی بُنیاد ہے اور ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم کے ارشادات ہی سب سے زیادہ موثق اور قابلِ اعتبار ہیں آیئے اس بحرِ بے کنار سے ہم اپنی محدود استعداد کے مطابق چند قطرے نکال کر آپ کو دِکھا دیں کہ قرآن کے فرمودات کے مطابق حُسن و جمال کا تصوّر کیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ــــ

قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

لوگو! جب لوگوں سے بات کرو تو دِل لبھانے والی بات کرو۔ حُسن و جمال سے بولو، سلیقے سے بولو۔ میں ذاتی طور پر اس تین لفظ کی آیت سے اس قدر متاثر ہوں کہ اس پر بڑے سے بڑا لٹریچر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی شیرینی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا صرف اسے حُسنِ مذاق سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

پھر فرمایا ــــ

الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ؕ

[وہ لوگ جو اللہ کو اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے یاد کرتے ہیں، اس زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ، تم نے جو کچھ پیدا کیا، وہ بے معنی اور باطل نہیں]

زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے جمالیاتی اور افادی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ جب انسان پورے خلوص اور شوق سے ایسا کرے گا تو اسے دنیا کی ہر شے حسین نظر آئے گی۔ وہ اسے شکست خوردہ ذہنیت کے بجائے پُر اُمید نگاہوں سے دیکھنے لگے گا، اسے دُنیا دما فیہا کا حُسن لازوال نظر آئے گا۔ اور یہی حُسن شناسی اُسے نقش سے نقاش کی طرف رہنمائی کرے گی اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اُٹھے گا کہ تُو نے یہ سب کچھ بلاوجہ پیدا نہیں کیا۔ یہ سب کچھ حسین ہے اور حسین چیز بے معنی، ناکارہ، رائیگاں اور باطل نہیں ہوتی۔ اس کا بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا دِل صناعِ ازل کی یاد سے ایک لمحہ کے لیئے بھی خالی نہ رہے گا۔

اور پھر فرمایا ——

قُل ارایتم ان جعل اللّٰہ علیکم الّیل سرمداً اِلٰی یومِ القیٰمۃِ۔ من الٰہ غیرُ اللّٰہ یاتیکم بضیاءٍ افلا تسمعون۔ قُل ارایتم ان جعل اللّٰہ علیکم النھار سرمداً الٰی یوم القیٰمۃ مَنْ الٰہ غیر اللّٰہ یاتیکم باللّیل تسکنون فیہ افلا تبصرون۔

[آپ کہیئے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالےٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آوے، تو کیا تم نہیں سُنتے؟ آپ کہیئے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالےٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دِن ہی دِن رہنے دے۔ تو خدا کے سوا کون وہ معبود ہے جو تمہارے لئے رات لے آئے، جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟

ذرا سا غور فرمایئے۔ تو حُسن و جمال کا صحیح اور بنیادی فلسفہ اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے سے آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا۔ ارشاد ہوا کہ اگر تمہاری زندگی میں رات ہی رات ہوتی تو تم روشنی کو پالینے کے لئے کتنے پریشان ہو جاتے، دِن ہی دِن ہوتا تو تم رات کے نظر نواز حُسن اور سکون کے لئے کہا کرتے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں حُسن و جمال کا بنیادی فلسفہ بیان فرمایا گیا ہے۔ حُسن کے لئے تنوّع ضروری ہے۔ یکسانیت اور یک رنگی میں حُسن نہیں ہوتا۔ اگر ایک باغ میں ایک ہی رنگ کے پھول ہوں گے تو وہ پھول خار کی طرح کھٹک جائیں گے۔ اگر ساری زمین کفِ دست اور ہموار

ہو تو زندگی ناہموار ہو جائے۔ اسی لئے حسین و جمیل خدا نے کہیں خوبصورت وادیاں بنا دیں تو کہیں سر بفلک پہاڑ کھڑے کئے۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت و الی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا۔ آسمان کو کیسے اونچا کر دیا گیا۔ پہاڑ کس طرح نصب کر دئے گئے اور زمین کس طرح ہموار بنا دی گئی۔ یہی رنگا رنگی اور بوقلمونی حسن کی جان اور جمال کی اساس ہے۔ اقبال کے الفاظ میں حسن کی تصویر میں "تغیر" کا رنگ بھر دیا گیا ہے۔ یہ تغیر نہ ہو تو حسن بھی نہ ہو۔ اسی "تصور" کو سادہ اور بلیغ الفاظ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر قیامت تک ایک مسلسل دن ہوتا تو تمہاری زندگی اجیرن ہو جاتی۔ یا قیامت تک ایک لگاتار رات ہوتی تو تم ایک لمحہ زندہ رہنا پسند نہ کرتے۔ وہ اکتاہٹ ہوتی جو جان لیوا ثابت ہوتی۔ اب صورت یہ ہے کہ دن کا جمال جہاں آرا زندگی کا پیغام دیتا ہے اور آدمی تازہ دم ہو کر کارزارِ حیات میں جت جاتا ہے۔ شام تک اس کش مکش میں تھک جاتا ہے تو رات سکون اور اطمینان کا پیام لاتی ہے۔ محرمِ راز بن کر انسان کی محرومی کو دور کرتی ہے۔ غریب ہو یا امیر، بڑا ہو یا چھوٹا، اسی طلسم دوش و فردا اور حیرت خانۂ شب و روز میں اسیر ہے اور اسی "تغیر" کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر جمال کا تصور کوئی اور ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے بہتر حسن کی عکاسی کسی اور طرح سے ہو سکتی ہے؟ یہی "تغیر" ہے جو جمال کو جنم دیتا ہے۔ نشیب و فراز کی پیچیدگیوں سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ خیر و شر کی کش مکش میں جمال پروان چڑھتا ہے۔ حق و باطل کی آویزش میں خوب صورتی کی دیوی جلوہ افروز ہو کر نکلتی ہے۔ نیک و بد کی چپقلش میں حسن پرورش پاتا ہے اور خدائے جمیل کی حسین تخلیق یعنی انسان اس جمالِ لازوال سے ازل سے مستفید ہوتا آیا ہے اور ابد تک مستفید ہوتا رہے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حسن و جمال کی قرآنِ حکیم کی ان آیات میں موجود ہے۔

والانعام خلقها لكم فيها دفء و منافع و منها تاكلون۔ و لكم فيها جمال حين تريحون و حين تسرحون، و تحمل اثقالكم الى بلد

لم تکونوا بلغیہ اِلّا بشق الانفس، اِنّ ربّکم لرؤف رحیم۔ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا و زینۃً و یخلق ما لا تعلمون۔

[اُسی خدائے جمیل نے تمہارے لئے مویشیوں اور چوپایوں کو بنایا۔ ان سے تمہیں جاڑوں کا مقابلہ کرنے کا سامان مِلتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں۔ تم انہیں کھاتے بھی ہو، ذرا اندازہ کرو، صُبح جب تم اپنے ریوڑ کو گھر سے نکالتے ہو اور جنگل لے جاتے ہو اور شام کو یہ ریوڑ لے کر گھر واپس آتے ہو تو یہ منظر کتنا حسین اور دل کش ہوتا ہے۔ یہی جانور تمہارے بوجھ بھی ڈھوتے ہیں اور مُشکل سفر میں تمہاری سہولت کا سامان بنتے ہیں یہ گھوڑے، خچر اور گدھے، یہ تمہارے لئے سواری اور زینت کا سامان ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تمہارے لئے اور چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم ابھی جانتے نہیں]

قرآنِ حکیم میں حُسن و دِل کشی کا جو یہ منظر بیان فرمایا گیا ہے، اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مال مویشی کے مالک ہیں اور صُبح کے وقت جب چرواہا اپنے ریوڑ لے کر جنگل کی طرف انہیں گھاس چرانے لے جاتا ہے اور شام کے دھندلکے میں تانیں اُڑاتا، بانسری بجاتا واپس آتا ہے تو یہ نظارہ واقعی حُسن و جمال کا مرقع ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی معاشی زندگی سے ہے اور معاشی زندگی کی خوش حالی بذاتِ خود ایک حُسن ہے جس کو قرآن نے بہت اہمیت دی ہے۔ اسی سورۂ شریفہ میں آگے چل کر حسین و جمیل زندگی کا ایک اور مرقع پیش فرمایا گیا ہے ——

ھُوالذی انزل من السماءِ ماءً لکم، مِنہُ شرابٌ ومِنہُ شجرٌ فیہِ تُسیمون۔ یُنبِتُ لکم بہِ الزرعَ والزیتون والنخیل والاعناب وَمِن کُل الثمرات۔ اِن فی ذالک لاٰیۃً لقوم یتفکرُون

[اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ یہ تمہارے پینے کے کام آتا ہے اور تمہیں زندگی عطا کرتا ہے۔ درخت اور گھاس اُگاتا ہے جس پر تمہارے مویشی پلتے ہیں۔ کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ زیتون اور انگور اور سیب کے باغ نظر فریب ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کے پھل کے درخت دیدہ و دِل کے لئے نُور کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تمام خوبصورت، دِل کش اور دلآویز مناظر میں سمجھ دار لوگوں

کے لئے بہت سے اشارات ہیں]

آگے چل کر فرمایا ہے ـــــ

وَسخر لکم اللیل والنہار، والشمس والقمر، والنجوم مسخرات باَمرہٖ،
اِنَّ فی ذالک لاٰیٰتٍ لقوم یعقلون

[اللہ نے تمہارے لئے دن اور رات کا حسن و جمال پیدا کیا۔ چاند اور سورج کی ضیا پاشی تمہارے لئے مہیّا کی۔ تاروں کو ایک خاص نظام کا تابع کر دیا تاکہ یہ تمہارے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بن سکیں۔ اس میں بھی اُن لوگوں کے لئے اشارات ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں]

وذرء لکم فی الارض مُختلِفاً الوانہ، اللہ نے ہر چیز جو زمین پر پیدا کی، اسے اس طور پیدا کیا کہ ان کی مختلف اقسام ہیں۔ اُن کے رنگ مختلف ہیں تاکہ تم اُکتا نہ جاؤ ـــــ

ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است

والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم، وانہراً وسُبلاً

[زمین پر سر بفلک پہاڑ موجود ہیں، پھر ان سے بل کھاتی، دوڑتی، گرتی سنبھلتی نہریں جاری ہیں۔ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے راستے موجود ہیں]

قرآن کے ان ارشادات کو پڑھیئے اور پھر دیکھیئے کہ اسلام میں تصوّرِ جمال کیا ہے۔ خدائے حسین و جمیل نے نبی جمیل ؐ کے ذریعہ کتنا جمیل تصورِ حُسن کا بیان فرمایا ہے اور انسان کو اپنی زندگی میں جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے، اُن کے جمیل پہلوؤں کو کس طرح آشکارا فرمایا گیا ہے۔ پہاڑ پر چڑھنے سے انسان کی زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے، اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیونکہ یہ اس کا حسین پہلو نہیں۔ دریاؤں اور ندیوں سے طغیانی بھی آتی ہے، اُس کا کہیں مذکور نہیں۔ کیونکہ یہ اس کا بدصورت پہلو ہے۔ خدائے بزرگ و جمیل حُسن و جمال کا دِلدادہ اور اس کا خالق ہے، اس لئے وہ اسی کا ذکر فرماتا ہے ـــــ

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلام آفتابم همہ زِ آفتاب گویم

اللہ تعالیٰ کے جو مختلف نام ہیں اُن کو اسمائے حُسنیٰ کہتے ہیں۔ حُسنیٰ بھی حُسن سے مشتق ہے اس کی دو قسمیں ہیں، جلالی اور جمالی ـــ ۹۹ اسمائے حُسنیٰ میں سے ۱۵ جلالی ہیں اور باقی جمالی۔ کیوں نہ ہو اللہ جمیلٌ، یحب الجمال خدائے جمیل کے نبی جمیل کا ارشاد ہے ::

اوتار کشن رہبر

بڈشاہی عہد اور کشمیری ادب

(ایک تحقیقی جائزہ)

موضوع، ہئیت اور ادبی محاسن کے اعتبار سے کشمیری ادب کا پہلا دَور گیارہویں بارہویں صدی سے لے کر تقریب قریب پندرہویں صدی تک رہتا ہے۔ اس دَور کے شعرا اور ادبا میں سے صرف للہ عارفہ اور شیخ العالم شیخ نور الدین ولی کے نام عوامی زبان پر ہیں، باقی سب گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس دَور کے ننانوے فی صدی شاعروں نے جو کچھ لکھا وہ آج صفحۂ دُنیا سے ناپید ہے۔ یہ بیش بہا سرمایہ یا تو آگ کی زد میں آگیا یا تو بادشاہوں کی خانہ جنگی کا نشانہ بن گیا۔ کچھ تو کیڑوں نے کھا لیا۔ کچھ انقلاب زمانہ کی نذر ہوگیا۔ یہاں تو اس پُورے دَور کی شاعری پر تنقید و تبصرہ سے غرض نہیں بلکہ میرا مطلب بڈشاہی دَور کے ممتاز کشمیری شعرا، ادبا اور اُن کی تخلیقات سے ہے۔

تواریخی لحاظ سے اگرچہ رینچن عرف ملک صدر الدین (۱۳۲۰ ـــــ ۱۳۲۳ء) کشمیر کے پہلے مسلمان بادشاہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں مسلمان سلاطین کی بُنیادیں شمس الدین شاہ میری کے ہاتھوں اُستوار ہوتی ہیں۔ سُلطان شمس الدین (۱۳۳۹ ـ ۱۳۵۴ء) "شاہ میری" خاندان کے بانی ہیں۔ سُلطان زین العابدین بڈشاہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہی خان عرف سُلطان زین العابدین بڈشاہ (۱۴۲۰ ـــــ ۱۴۷۰ء) کا زمانہ شاہ میری خاندان کے استحکام کا زمانہ ہے۔ اس دَور سے قبل ہندو اور مُسلمان تقریباً ایک دوسرے سے الگ الگ رہتے تھے۔ مُلک میں سیاسی اور مذہبی تضاد بدرجۂ اُتم موجود تھا۔ لیکن بڈشاہ کے عہد میں دونوں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کی طرف جُھکتے گئے اور ریاست میں ایک عظیم مشترکہ کلچر (Composite Culture) کی بُنیاد پڑی۔ آپ کا عہد مغل بادشاہوں کی گنگا جمنی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا آئینہ ہے۔ شاہی خان المتلقب سُلطان زین العابدین بڈشاہ کی زندگی، چال چلن، رعایا پروری اور طرزِ حکومت کا مقابلہ ہم بہ آسانی اکبر، جہانگیر

اور شاہ جہاں سے کر سکتے ہیں۔ بادشاہ کی ہر دل عزیزی اور سکیولر نظریوں پہ کاربند رہنے کا علم اس عام فہم قول سے بھی بہ خوبی ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم بادشاہ کو "بڈشاہ" (ہندوؤں کا بادشاہ) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آج تک جس کسی مؤرخ نے کشمیر پر قلم اٹھایا ہے اُس نے اس دور کو کشمیر کی تاریخ کا عہدِ زرّیں مانا ہے۔

سلطان زین العابدین ادب اور فنونِ لطیفہ سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔ مشہور مؤرخ ابو الفضل "آئینِ اکبری" میں بادشاہ کی ان خوبیوں کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

"His humanity made him prohibit hunting; and he himself never ate any flesh. He translated many books from Arabic, Persian, Cashmeerian, and Sanskrit languages. Under his reign musicians came to Cashmere, from Iran and Turan, amongst whom were, from Khorasan, Ondee, the scholar of well known Khajeh Abdul Cader of Khoraisan and Mulla Jameel who was immitable both in the music and Painting..."

(صفحہ ۴۴۰ باب صوبۂ کشمیر "آئینِ اکبری" مترجم فرنکس گلیڈون)

علمی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے بڈشاہ کے دربار میں ادبا، فضلا، علما، اولیا اور شعرا کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا جن میں ملّا نادری، سید بدر الدین، جید ربٹ، ملّا پارسا، بابا شکر الدین، خواجہ عبد القادر، بابا نصر الدین، شری ور، جونا راج، بھٹ اوتار، بودھ بھٹ، ملّا باقر رومی، ملّا احمد رومی، سید حسین رومی، شیخ شمس الدین زینہ پوری، اتتہ سوم، بابا لطیف الدین، حضرت شیخ نور الدین ولی، بابا قیام الدین، ملّا جمال الدین حافظ بغدادی، سید محمد مدنی، قاضی میر علی بخاری، حضرت سید حاجی مُراد بابا ریگی رشی، بابا ہیم رشی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ خود سلطان عالم اور شاعر تھے۔ "آتش بازی" اور "شکایت" کے عنوان سے آپ نے دو کتابیں تحریر فرمائی تھیں لیکن یہ دونوں آج عنقا ہیں۔ بادشاہ کتابوں کا بہت بڑا شائق تھا۔ آپ کی ادب نوازی اور علم پروری کے متعلق کہا جاتا ہے:۔

"بادشاہ نے اپنے ممالک کے اکثر لوگوں کو، جو علم کی اہلیت اور اس کا شوق رکھتے تھے، وظائف دے کر بیرونی ملکوں میں بھیجا۔ اس میں جو لوگ شادی شدہ تھے، ان کے اہل و عیال کے اخراجات کا بوجھ بھی خزانۂ شاہی پر ڈالا۔ علاوہ ازیں بیرونی ممالک سندھ، ہرات، ہندوستان بُخارا، خراسان، عرب وغیرہ سے فارسی، عربی اور سنسکرت کے عالم بُلوائے۔ ان کو معقول تنخواہیں دیں... ... بعض علما و فضلا ملکِ روم سے بھی کشمیر آئے۔ جیسا کہ بہاؤ الدین متو اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں ــــ "و عہد ... ... علما و فضلا در ایں شہر آمدند مثلاً ملّا محمد باقر رومی، مولانا احمد رومی ... ... در ایں شہر سکونت در ازیدند۔" (صفحہ ۳۵۹)

... ... بادشاہ نے اس طریق سے ایک ایسا کُتب خانہ بنالیا جو اس کے عہد میں اس کے معاصر بادشاہ کے پاس نہ تھا۔ یہ کُتب خانہ بادشاہ کے بعد ایک سو سال یعنی سُلطان فتح شاہ کے عہد تک دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں محفوظ رہا۔ اس کے بعد دیگر تمام فانی اشیا کی طرح یہ خزانہ علوم و فنون بھی، جس میں خدا جانے کیسے کیسے بیش قرار علمی جواہرات تھے، فنا و نابُود ہو گیا۔ (صفحہ ۳۴۱)" ...

مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں ــــ نوشہرہ میں شفاخانہ اور لنگرخانہ ہی نہ تھا۔ بلکہ دولت خانہ شاہی کے بالکل متصل راجدھانی (نوشہرہ) میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک شاہی بیت العلوم بھی جاری کیا گیا... ... اس مدرسہ میں مندرجہ ذیل مسلمان اُستادوں کے نام تاریخوں میں نظر سے گزرے ہیں ــــ ملّا پارسا، ملّا محمد، ملّا احمد، ملّا نادری، ملّا یحییٰ، ملّا جمالی جو بڈشاہی عہد کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ (صفحہ ۳۶۳)"

[تاریخ بڈشاہی ــــ محمد دین فوق]

بڈشاہ سے قبل کے مسلمان حکمرانوں نے بالعموم ادب کی سرپرستی کی مگر شاہی خان نے کشمیری ادب کی ترقی میں بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ آپ نے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی حد سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور کشمیری زبان کو فروغ دینے میں ہمہ تن کوشاں رہے۔ سنسکرت کی مشہور و معروف کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ فارسی کی اعلیٰ کتابوں کو کشمیری میں منتقل کیا گیا۔ ایک طرف باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو کشمیری روایات سے رُوشناس ہونے کا موقع دیا اور دوسری طرف کشمیریوں کو فارسی و عربی زبان و ادب، اسلامی کلچر اور تہذیب سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ اس زمانے میں لوگ ہشاش بشاش

نظر آتے ہیں۔ انسان اور اس کا عشق، خلوص اور انسانی درد ہر ایک فرد کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

پنڈت شری ورنے "زینہ راج ترنگنی" میں اس دور کے چشم دید حالات درج کئے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کے خیالات زیادہ معتبر اور قابل قبول سمجھے جاتے ہیں۔ بہ قول شری ور سلطان اس خیال کا قائل تھا کہ انسان اُسی زبان میں دُرست تعلیم حاصل کر سکتا ہے جو زبان وہ اچھی طرح جانتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادری زبان نے ترقی کی۔ سنسکرت کی بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ فارسی اور کشمیری میں کیا گیا۔ کشمیری زبان نے اس عہد میں اس حد تک ترقی کی کہ علم نباتات اور علم کیمیا کا مطالعہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں کر سکتا تھا۔

کشمیر میں صوفیائے کرام نے مذہبی ترویج کے لئے مقامی زبان کا کافی سہارا لیا۔ کسی حد تک مذہب اور تصوّف کے غلبہ کی وجہ سے ہی رنگِ تغزّل نکھرنے سے رہ گیا۔ بڈشاہی دور میں بھی رُوحانیت اور تصوّف کا غلبہ کشمیری ذہن پر سوار رہا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کشمیریوں کو جو خوشحالی عہدِ بڈشاہی میں نصیب ہوئی، اس کے غیر شعوری اثرات ادب پر بھی پڑے۔ عشقِ مجازی کے رِندانہ تصوّرات کشمیری ادب میں پہلی بار داخل ہوئے۔ اس کی زندہ مثال "بانہ سرکتھا" ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حبہ خاتون کی آمد تک اس قسم کی شاعری میں کوئی قابل قدر رنگینی اور سرمستی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ زمانے کی بدحالی اور خرابی ہے جو بڈشاہ کے بڑھاپے سے ہی شروع ہوتی ہے۔ سُلطان کے آخری ایام پریشانی میں گذرے۔ ایک بیٹے کو سنبھالا تو دوسرے نے بغاوت کر دی۔ بیٹوں نے اپنی خانہ جنگیوں، نافرمانیوں اور باہمی منافقتوں سے سُلطان کی سُنہری داستان مٹی میں مِلا دی۔ بڈشاہ کے آخری ایام بہت حد تک مُغل شہنشاہ شاہ جہاں سے مِلتے جُلتے ہیں۔

بڈشاہی دور کے سب سے اہم شاعر شیخ العالم شیخ نُورالدین ولیؒ ہیں۔ اس عظیم صوفی شاعر کی زندگی، فکر اور فلسفہ پر کسی قسم کی تنقیدی بحث اس مضمون کے دائرہ سے باہر ہے۔ البتہ یہاں یہ بات کہنے کے لائق ہے کہ شیخ صاحب کا کلام سب سے پہلے عہد بڈشاہی میں ہی مُرتب کیا گیا۔ اور اسی دور میں ملّا احمد نے فارسی میں "شرح کلام شیخ نُورالدین" کے نام سے منتقل کیا۔ ملّا احمد اپنے دور کے بہت بڑے علما اور فضلا میں سے تھے۔ "رتنہ کر پُران" اور "راج ترنگنی" جیسی کتابوں کو آپ نے ہی فارسی کا جامہ پہنایا کہا جاتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں "شرح کلام شیخ نورُالدین" کی ایک کاپی مشہور سیّاح مسٹر ہوجیل کو مِلی تھی۔

شیخ صاحب کے علاوہ عہدِ بڈشاہی میں کشمیری شعرا اور ادبا کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا۔ ان

سب میں شری ور، اتھہ سوم، بابا نصر الدین، شامر بی بی، یودھ بھیٹ اور بلدٹ اوتار کے نام سرِ فہرست ہیں۔

شری ور کی ذات مجموعہ کمالات تھی۔ جوناراج کے شاگرد تھے۔ گانے بجانے میں ماہر تھے۔ شاعر، سیاست دان اور مؤرخ کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ جوناراج نے ۱۱۴۹ سے ۱۴۵۹ء یعنی کلہن کے مابعد زمانے سے لے کر سلطان زین العابدین بڈشاہ تک کے حالات " زینہ ترنگنی " کے نام سے قلم بند کئے۔ شری ور نے ۱۴۵۹ء سے لے کر ۱۴۸۹ء تک کے چشم دید حالات بزبانِ سنسکرت نظم کئے۔ یہی تواریخی تصنیف " زینہ راج ترنگنی " کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

بڈشاہ نے شری ور کو اپنی اولاد کی طرح پالا اور ہمیشہ اس کی ہمّت افزائی کی۔ سلطان کے آخری ایّام تلخی میں گزرے۔ شری ور ان ایّام میں بڈشاہ کے پاس ہی رہا کرتا تھا اور ہمیشہ تسکینِ خاطر کی تلاش میں رہتا تھا۔

شری ور کشمیری میں اعلےٰ شعر کہا کرتے تھے۔ آپ کی کشمیری کتابیں کون کون سی تھیں؟ کن کن موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں؟ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ خود اپنی کتاب " زینہ راج ترنگنی " میں " وشِشٹ برہما درشن " کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ والمیکی جی کی اس تصنیف کو سلطان زین العابدین نے بہت پسند کیا۔ بادشاہ نے اس کتاب کا ترجمہ فارسی اور کشمیری میں کرایا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کتھا کا ترجمہ شری ور نے ہی کیا تھا لیکن آپ خود اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

بڈشاہی دَور کے دوسرے بڑے کشمیری شاعر اتھہ سوم ہیں۔ اتھہ سوم کے متعلق خیال ہے کہ بہ حیثیت علم و فضل دوسرے کئی ہم عصر شعرا سے کہیں زیادہ قابل تھے۔ شعر و شاعری اور فنِ تصنیف اور تالیف سے کم سِنی کے عالم سے ہی دلچسپی تھی۔ سنسکرت کے علاوہ فارسی، عربی اور تبتی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ موسیقی سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے موسیقی پر بہ عنوان " مانک " سنسکرت میں ایک کتاب تحریر فرمائی تھی۔ اتھہ سوم جن کو سوم پنڈت کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، اپنے وقت کے بہترین کشمیری شعرا میں سے تھے۔ آپ نے " زینہ چرت " نام کی ایک کتاب لکھی جس کا تعلق بادشاہ کی زندگی سے تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی تھی۔ اس بیان میں زیادہ سچائی معلوم نہیں ہوتی۔ شری ور ان کا تعارف

یُوں فرماتے ہیں :۔

"پنڈت اتھ سوم سنسکرت اور کشمیری میں شاعری کرتے تھے۔ آپ نے بڈشاہ کی سوانح حیات کشمیری میں نظم کی اور بادشاہ کو پیش کی۔"

(بیانِ شری ور۔ کتاب کِنگس آف کشمیر۔ مترجم جے سی دت۔ صفحہ ۱۳۵)

بڈشاہی دَور کے شاعروں میں بابا نصرالدین کا نام بھی اہم ہے۔ متانت اور شانِ استغنا صوفیوں کی بہترین خصوصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ آپ ان اوصاف کے مالک تھے۔ بچپن میں معدے کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی۔ اس وجہ سے "نُندہ ریشی" کے پاس آیا کرتے تھے اور آخر کار اُن کے ہی ہو کر رہ گئے۔ پوری زندگی ان کی صحبت میں بسر کی۔ پہلے دَور کے بیشتر شعرا کی طرح آپ کا کلام آج صفحۂ دُنیا سے معدوم ہے۔ حضرت نُندہ ریشی عرف شیخ العالم شیخ نورُالدین کی تاریخِ ولادت آپ نے یُوں نکالی ہے ؎

دوٗپ نصرِی تاریخ درگ
نُندہ زوٗدِتھ گوٗ بابہ سورگ

مندرجہ ذیل "واکھ" بھی آپ کے نام موسوم کئے جاتے ہیں ؏

(الف) دِلہِ کِس باغس دُود کرِ گاشُل — اَدِہ وونُوی یمبرزلِہ باغ !
مُرِ تھی منگہ نَے عمرِہ ہُند حاصِل — موت چھُوی پتہ پتہ تحصیل دار

(ب) سرِہ یَس ہیوُ نہ پرکاش کُنے — گنگہِ ہیوُ نہ تیرتھاہ کانہہ
بائِس ہیوُ نہ باندو کُنے — رنہِ ہیوُ نہ سُو کھاہ کانہہ

یُوں تو یہ دونوں "واکھ" للّ عارفہ کے بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے کے متعلق خاص طور پر سِدھہ بابو اور للّہ عارفہ کی جو کہانی بیان کی جاتی ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم یہ "واکھ" ان کا نہیں ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بابا صاحب کا بہت سا کلام للّ عارفہ اور شیخ نورُالدین رحؒ کے کلام سے خلط ملط ہوا ہے۔

شامہ بی بی کا صرف ایک مرثیہ ہم تک پہنچا ہے جس میں آپ نے شیخ العالم شیخ نورُالدین ولیؒ کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ادبی اور فنّی لحاظ سے یہ مرثیہ زیادہ زور دار نہیں ہے۔ تاہم اشعار میں کہیں کہیں جذبات کی شدّت اور احساس کی گرمی محسوس کی جاتی ہے ؏

شیرازہ

روہ یہ وَنس حقس وُوتکُ — تتہ غلقن خبر گیوٗ
نَو لچھ ٹوکہ ویپاتکُ ! — ننُدہ ننیرؔ گوو سو رگس ماتوٗ
ژاٹہ کوزہ میہ ووٗدمے شامی — ونده بل دِت اُسم شامی
گارک پیرہ کائتو شامی — ننُدہ ننیرؔ گوو سو رگس ماتوٗ

ان کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ حافظ محمد عنایت اللہ امام مسجد سلطان زین العابدین بڈشاہ گاڑہ یار سرینگر نے کچھ سال پہلے " کلام حضرت شیخ العالم قدس سرہٗ " کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع فرمائی ہے۔ اس میں آپ شامہ بی بی کے بارے میں لکھتے ہیں:

" شامہ بی بی — یہ اُس اکھ عارفہ زنان۔ ینہِنس وقتس اندر اُس مردانِ خدایَن ہنز تاج۔ عبادتن تہٕ ریاضتن منز اُس بدرجہ کمال واتمژ۔ یہ اُس مُرید شیخ صاحبنز۔ یلہِ یہ ینہٕ والکہِ دوہ ہسُو نِک نٔزاُنپانس منز وآریو۔ وتہ پکان پیٹھ شیخ صاحبس نظر اُمس کَرن۔ امی اکہِ نظرہ سیتی سپُد اُمس دُنیا تہٕ آخرت فراموش۔ کرتھ ژٕجس بے اختیار نیرِ نِھ۔ نٔزاُنپانہ اندرہ دِژہن ووٹھ تہٕ پیٹھ پیٹھر وُستھ چھہ ودان۔ شیخ صاحبن کُرس نصیحت کہِ پردہ اندرہ نیرُن چھُ چانِس ماَلِس ماجہ کرِتھ سیٹھاہ شرم۔ گژھ پردس اندر بیہہ۔ نظراہ کرُن شیخ صاحبس کُن۔ دوٗپنس — " اے پیرِ وقت ژٕ ژی تمکھ یہ شور تہٕ ژٕ چھُ ہمہ یہ ونان " سیٹھاہ چھہ ودان۔ دوٗپُن یس حقس وجود میون دوٗد ووٗ نہٕ حق چھُم نہٕ طاقت۔ امی اکہِ نظرہ سیتی بنیہٕ صاحب کمال۔ اُمی ہندی حالات چھہ نہایت عجیب و غریب۔ اُمی سُند کلام چھُ نہایت عالی ... "

(صفحہ ۱۴)

بڈشاہی دَور کا ایک اور قابل قدر فنکار بھٹ اوتار تھا۔ ملّا جمیل، ملّا عود، اُلقہ سوم کی طرح بھٹ اوتار غضب کے مغنّی تھے اور فنِ موسیقی پر کافی عبور حاصل تھا۔ بھٹ اوتار اپنی ذہانت اور حافظہ (memory) کے لئے ملک بھر میں مشہور تھا۔ فردوسی کا "شاہ نامہ" لفظ بہ لفظ زبان کی نوک پر تھا اور جب بھٹ اوتار اپنے مخصوص انداز میں اس کو پڑھتے تھے پورے دربار پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ آپ نے " زینہ وِلاس " نام کی ایک کتاب

کشیر ہی میں تحریر فرمائی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کتاب کا نام " زینہ پرکاش " بتایا ہے۔ اس سلسلے میں محمد دین فوق کے متضاد خیالات نوٹ فرمائیے :۔

(۱) "یودھ بھٹ۔ کشیری زبان کا زبردست شاعر تھا۔ اس نے بڈشاہ کے ایک واقعہ کا ڈرامہ کشیری زبان میں " زین پرکاش " (جین پرکاش) کے نام سے لکھا جو بعض دیگر کتابوں کی طرح کشیر میں معدوم ہے۔ " (تاریخ بڈشاہی صفحہ ۳۹۴)

(۲) " زینہ ولاس " (منظوم ناٹک) مصنف یودھا بٹ۔ اس میں بادشاہ کی زندگی کے ایک واقعہ کو ڈراما کی صورت میں لکھا گیا۔ " (صفحہ ۳۶۶ تاریخ بڈشاہی)

(۳) " زینہ پرکاش "۔۔ از تصنیف اوتار بھٹ۔ یہ وہی اوتار بھٹ ہے جس کو "شاہ نامہ" فردوسی ازبر تھا۔ اس کتاب میں بادشاہ کے فرامین، ارشادات اور بعض احکام زبانِ سنسکرت میں درج تھے۔ " (تاریخ بڈشاہی صفحہ ۳۶۵)

(۴) یودھ بھٹ۔ کشیری پنڈت تھا۔ خدا نے اسے عجیب دماغ دیا تھا۔ ذہن اس قیامت کا رسا اور حافظہ اس بلا کا تیز تھا کہ شاہ نامہ فارسی جس کو فردوسی نے تین سال میں لکھا تھا اسے ازبر یاد تھا۔ " (تاریخ بڈشاہی صفحہ ۳۴۰)

معلوم ہوتا ہے کہ عبدالاحد آزاد نے فوق کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ لہذا آپ بھی غلط نام درج کرنے سے نہ بچ سکے۔ سری ور کی معتبر رائے ہیں :۔

" Bhatt avtara who had perused the Shahnama, Vast as the sea, Composed a work Zaina Vilasa as the Counterpart of the kings " instruction". The king was pleased... ..."

(کنگس آف کشیرا۔ بیانِ سری ور۔ صفحہ ۱۴۵ مترجم جے، سی دت)

بھٹ اوتار کی ایک اور کتاب "بانہ سُر کتھا" ہے۔ خوش قسمتی سے اس کتاب کا ایک نسخہ حال ہی میں پونا سے ملا ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس میں اُوشا اور انرودھا کی کہانی نظم ہوئی ہے۔

فوق نے بھٹ اوتار اور یودھ بھٹ کے حالات کو خلط ملط کیا ہے۔ یودھ بھٹ کشیری زبان کے زبردست شاعر تھے۔ آپ نے سلطان زین العابدین بڈشاہ کی زندگی کے ایک واقعہ کو

شیرازہ

ڈرامہ کی صورت میں لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ" زینہ پرکاش "کے نام سے مشہور تھا۔ سٹری ور اس بیان کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

" Yodhabhatta, a poet in vernacular language Composed a drama, Pura like mirror, Called the Jaina Prakasha, in which he gave an account of the king ..."

(کنگس آف کشمیرا۔ بیانِ سٹری ور۔ صفحہ ۱۴۵ مترجم جے، سی دت)

" شیشے کی طرح صاف "۔۔ ان الفاظ سے اس ڈراما کی پختگی کا اندازہ بہ خوبی ہوسکتا ہے۔ بہت ممکن ہے یہ ڈراما عہد بڈشاہی میں اسٹیج کی زینت بنا ہوگا۔ اس دور میں سنسکرت ڈراموں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو کافی متاثر کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا سنسکرت ڈراموں نے اچھے ڈرامہ نویس ہی نہیں پیدا کئے بلکہ اچھا اسٹیج بھی پیدا کیا تھا۔ اداکاری کو فنِ رقص اور فنِ موسیقی سے میل دے کر اسٹیج کی شان اعلیٰ رتبہ پر پہنچی تھی۔ اداکاری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور دیگر محاسن کی وجہ سے اسٹیج کو "Four faced god" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ تارا اپنے زمانہ کی مشہور رقاصہ اور اداکارہ تھی۔ آپ کی تعریف کرتے ہوئے سٹری ور لکھتا ہے کہ تارا ایک ہی وقت ۹۴ قسم کے بھاؤ (emotions) کا اظہار کر سکتی تھی۔

حال ہی میں " شکھ دکھ چرت " نام کی ایک اور کتاب پونا سے ملی ہے۔ یہ کتاب بھی عہد بڈشاہی سے تعلق رکھتی ہے۔ مصنف کا نام گنگا پرہتا ہے۔" بانہ سرکتھا " اور اس کتاب پر تفصیل سے لکھنے کی کافی ضرورت ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری لسانی گتھیاں سلجھانے میں بھی مفید ثابت ہوسکتی ہیں ؛

" شیرازہ "

کے لئے معیاری منظومات کی ضرورت ھے

(مدیر)

غزل

ترتیب دے رہا ہوں دیوانِ عاشقی کو
لکھ لکھ کے کاٹتا ہوں عنوانِ زندگی کو

تو ساتھ چل سکے گی اے گردشِ زمانہ
اب اِک نئے سفر پر جانا ہے آدمی کو

گمراہ ہو کے میں نے ڈھونڈی ہیں اپنی راہیں
ایماں دعائیں دیتا ہے میری کافری کو

گھر سے نکل پڑے ہیں اب کس کی جستجو میں
پہچانتے نہیں ہیں ہم آج سے کسی کو

در پے رہا ہے جن کے انبوہ کم سواداں
وہ خوب جانتے ہیں آشوب آگہی کو

کیا دیکھ کر کروگے یہ دامن دریدہ
ہے دیکھنا تو دیکھو دل کی شکستگی کو

برسوں پھرے ہیں ہم بھی مثل غزالِ وحشی
پہلو میں لے کے تیری خوشبوئے دلبری کو

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں ایک ایک پنکھڑی کو

کل بیٹھ رہا تھا ان کی محفل میں آبِ حیواں
ہم لوٹ آئے لے کر ناموسِ تشنگی کو

●

وشوا ناتھ کھجوریہ

پہاڑی لوک گیت "چن"

بنفشہ کا تازہ جنگلی پھول جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ظاہرا طور پر وہ کتنا چھوٹا اور بے قدر سا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اُس کی سادگی، اُس کی نزاکت اور اُس کا شرمیلا پن قدر دان دِل کو چھو لیتا ہے۔ یہی بات ہمارے پہاڑی لوک گیتوں پر پوری اُترتی ہے۔ جو لوگ ان لوک گیتوں کی آغوش میں پلے ہیں یا جنہوں نے ان گیتوں کے ماحول کو، ان کے گانے والوں کو پاس سے دیکھا ہے' وہ ہی جان سکتے ہیں کہ یہ گیت کیا جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔ ان کی لمبی سُریلی تان فراق کی تپش کو شانت کر دیتی ہے۔ یہ تان کانوں میں پڑتے ہی مایوسی سے مُرجھائے ہوئے چہرے خوشی سے چمک اُٹھتے ہیں۔ تھکے ہارے اعضا میں نئی جان' نئی اُمنگ آجاتی ہے۔

سادہ لوح اور اکثر ان پڑھ پہاڑی لوگ بڑے محنت کش' اپنی قسمت پر شاکر و قانع ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے لوک گیتوں کے شیدائی۔ غربت شاید ازل سے ہی ان کی قسمت میں لکھی گئی ہے۔ یہ غربت ہی شاید پہاڑی حُسن کا سرمایۂ حیات اور ان پہاڑی لوک گیتوں کا سرچشمہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہاڑی زندگی میں غربت نہ ہوتی تو ہجر و فراق کی تڑپ نہ ہوتی۔ ہجر و فراق نہ ہوتا تو پہاڑی لوک گیت نہ ہوتے اور پہاڑی لوک گیت نہ ہوتے تو ـــ کیا ہوتا؟ اپنے سبزہ زاروں اور پریوں کی طرح اُڑتی اپنی اُودی گھٹاؤں کے باوجود پہاڑ سچ مچ اُداس سُنسان ہوتے۔ ایک نغمۂ بے آواز ہوتے۔ پہاڑوں کی خوبصورتی رابندر ناتھ ٹھاکر کے افسانہ کی "سوبھاشنی" ہوتی جو دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے لیکن ـــ گونگی ہے۔ کمر توڑ محنت اور غربت کے باوجود ان لوگوں کی دِلی تمنّا کے سُر یوں بولتے ہیں: جینا پہاڑیں دا جینا!" بانسری اندر سے چاہے کھوکھلی ہو' پر فریادوں سے بھری ہوتی ہے۔ اُس کے

کسی سوراخ پر اُنگلی رکھیں۔ دِل ہلا دینے والے سُر پھوٹ نکلیں گے۔ یہی حال پہاڑی عوام کی زندگی کا ہے۔ وہ زندگی امارت کے لحاظ سے چاہے کھوکھلی ہو، لیکن اُس کے سینے سے لطیف جذبات کا لازوال سیلاب پھوٹ رہا ہے، ہجر و فراق کے، جُدائی کے بعد ملاپ کے اور فصل کی بوائی۔ کٹائی کے اُن کے لوک گیت سُن کر بڑھتے قدم رُک جاتے ہیں اور سخت سے سخت دِل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں کہیں تڑپ ہے تو کہیں درد بھری مِٹھاس۔ اپنے مرغزاروں سے، چیل، دیودار کے تمکنت سے کھڑے درختوں سے، اپنے نہلاتے کھیتوں، اپنی بھیڑ بکریوں سے، اپنے ساجن سے، اور اپنے بھرپور جیون سے لازوال پیار ان گیتوں میں پایا جاتا ہے۔ دِل کی بات صاف، سُتھرے اور سیدھے سادہ ڈھنگ سے ظاہر کرنا ان گیتوں کی مخصوص روایت ہے اور بے ساختگی، بے باکی ان کی بے مثال ہے۔ اپنے "مرد" کو ان گیتوں میں یُوں مخاطب کیا جاتا ہے۔

" او میری سس شُودے آ چھورُو آ۔ او جالما... او بالما — " (میری ساس کے چھوکرے، میرے بالم، لیکن دِل کے کھوٹے ظالم)

یہ گیت "پنگل" کے پیمانے پر چاہے پُورے نہ اُتریں لیکن دِل کی گہرائیوں میں جا اُترتے ہیں۔ ان کی سادگی ستار، تانپورہ، طبلہ یا سارنگی کی قطعی محتاج نہیں۔ بانسری کی لے۔ یہ بھی نہ ہو تو کسی پہاڑی جھرنے کی چھم چھم۔ کل کل کے سہارے ہی یہ گیت دِل کے تار ہلا دیتے ہیں۔

پہاڑ کی طرف نگاہیں اُٹھتے ہی تصوّر کے طیارے پر سوار ہمارا من ریاسی، پونچھ، بھدرواہ رام نگر یا بسوہلی کے مرغزاروں اور اُن کی ڈھلوانوں پر بسے کسی پہاڑی گاؤں میں جا پہنچتا ہے اور کسی پہاڑی لوک گیت کی درد بھری لے لہراتی سی محسوس ہونے لگتی ہے — "کُونجے پہاڑیں دی سے۔ کی آس کری آواں تیرے کول "

[کسی مجبور پہاڑی نوجوان کو پردیس میں اپنی "پہاڑی کُونج" کی یاد آجاتی ہے اور اُس کی فُرقت زدہ بے بسی کُوک اُٹھتی ہے کہ اے جانِ من ! تیرے پاس آنے کو دِل تڑپ رہا ہے لیکن ... "

ان گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ "میٹھا رس بھرے" ان گیتوں کو لکھنے والے کون فن کار کون تھے؟ یہ کب لکھے گئے؟ تاریخ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے بھلا کون بتا سکتا ہے کہ فلاں چشمہ دھرتی کے سینہ سے کب پھوٹا تھا؟ فلاں پہاڑی نالے نے

روانی کب اختیار کی تھی؟ عام خیال جسے باور نہ کرنے کی ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہیں ہے یہ ہے کہ جب حضرت انسان نے گویائی کی نعمت حاصل کی، تبھی یہ لوک گیت اُس کے چشمۂ دل سے پھوٹ نکلے اور معاون جھرنوں کی طرح نئے تقاضے ان میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ہمارے تمدن کی یہ ندی اِٹھلاتی، پھراتی اور پاس پڑوس کی زمینوں کو سیراب کرتی بہتی چلی جا رہی ہے۔

قربان جایئے اُن ان پڑھ اور ادب کی رموز سے محض ناواقف قدیم کلاکاروں پر، جنہوں نے دُکھوں کے ان گنت کانٹوں میں اُلجھ کر پھول سے بھی نازک ان گیتوں کی تخلیق کی تھی۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ آدم ذات نے پہلا دان اُس وقت کیا تھا جب کہ ایک ماں نے اپنی چھاتی سے بچے کو دودھ پلایا تھا۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے اپنی ہستی کے لئے پرکرتی ماتا کی خدمت میں پہلا شکرانہ اُس دن ادا کیا تھا جب کہ اُس کے مُنہ سے کسی لوک گیت کے پہلے بول نکلے تھے اور اُن بولوں میں شاید اُس کی عقیدت، اُس کے پیار کی ایک جھلک تھی!

ان پہاڑی گیتوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ علاقہ ڈُگر سے آگے اُتر پردیش، آسام، منی پور اور نیپال ہی نہیں، دُنیا بھر کے کسی بھی پہاڑی علاقہ کی نبض ٹٹولیں، ہر جگہ ایک سی دھڑکن محسوس ہوگی۔ گنگا ساگر الگ الگ سانچے کے چاہے ہوں اُن میں بھرا ہوا "لوک امرت" ایک ہی تاثیر والا ہوگا۔ بول الگ الگ ہوں گے لیکن اُن کی آتما ایک ہوگی۔ ماں کی ممتا، فُرقت کی تڑپ، اپنے ڈھور، ڈنگر، اپنے کھیت، کھلیان سے پیار دھرتی کے ہر کونہ پر آپ کو ایک سا محسوس ہوگا۔

ہمارے پہاڑی لوک گیتوں کی تعداد وغیرہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ ان میں ایک طرف بیاہ شادیوں پر گائے جانے والے گیت، لوک ناچ کی تھرکن پر چلنے والے گیت دیوتا کی تعریف میں گائے جانے والے اور کھیتی باڑی سے تعلق رکھنے والے گیت ہیں تو دوسری طرف ہجر و فراق کے وِرہا گیت اور محبت کے عہد و پیمان کے سنگاری گیت ہیں۔ موخرالذکر میں کونجوا، رولا، ڈھولا، بے بُوا اور "چن" وغیرہ نام کے لوک گیت ہمارے پہاڑی علاقہ کے الگ الگ حصوں میں گائے جاتے ہیں۔ "چن" شوالک سلسلۂ کوہ اور علاقہ کنڈی کے بالائی حصوں میں زیادہ مقبول ہے۔ پنجاب کے مشہور "ماہیا" کی طرح "چن" کے ہر ایک بند میں دو دو ہم ردیف مصرعے ہوتے ہیں۔—

چٹی چناں چادری بھلا پھر۔ پھر چلدی
اِک میری جندڑی چناں پہاڑیں دیس رُلدی

لوک گیتوں کے رمز شناس مصنف نے "سینٹڈ ڈسٹ" (SCENTED DUST) نامی کتاب میں لکھا ہے کہ سوئٹزرلینڈ، سکاٹ لینڈ اور اٹلی کے چرواہے ایسے لوک گیت گاتے ہیں جو ترکیب کے لحاظ سے "ماہیا" اور "پہاڑی چن" سے ملتے جلتے ہیں۔

"چن" کے پہلے مصرعہ کے بول کچھ اٹ پٹے سے ہوتے ہیں لیکن مصرعہ ثانی بڑا زوردار ہوتا ہے اُس کا ہر ایک لفظ تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ چن بمعنی چاند کی لمبی اور دل دوز تان سُن کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ دل کے نازک تار آپس میں کہیں اُلجھ گئے ہیں، کہیں کچھ کھو گیا ہے اس کے بول گویا دامن پسار پسار کر کہہ رہے ہوں کہ "آج اس چٹکی چاندنی میں، سرسراتی ہوا کے پالنے میں جھومتے ہوئے ہمیں اپنی گھٹن ہلکی کر لینے دو۔ جدائی کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھو لینے دو۔"

چاند اپنی کشش سے سمندر دل میں طلاطم برپا کر دیتا ہے۔ اسی طرح چاندنی رات میں محبت کے تیروں سے گھائل، فرقت زدہ دلوں میں بھی شاید اُبال سا آجاتا ہے۔ ویوگن "گوری" کو پردیس گئے اپنے پریتم کی یاد ستاتی ہے۔ وہ مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتی ہے تو چاند کے خوب صورت چہرے میں اُسے اپنے "چن" کی ہی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ چاند کو مخاطب کر کے وہ جدائی کے تیروں سے گھائل دل کی دہائی، اپنی اشک آلودہ آنکھوں کا واسطہ دیتی ہے۔ اکثر یہ گیت ایک دوسرے پر فدا مرد، عورت کے بیچ سوال و جواب میں بھی چلتا ہے اور ایسی صورت میں دونوں بالواسطہ ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی بجائے پردۂ حجاب میں چاند کی وساطت سے ایک دوسرے پر شکوہ شکایت کے تیر برساتے ہیں۔ مرد اپنی محبوبہ کو "چاند" کہہ کر اور محبوبہ اپنے محبوب کو "چاند" کہہ کر مخاطب ہوتی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے دلبر کے خوبصورت چہرے کی تشبیہہ دینے کے لئے چاند سے زیادہ خوبصورت چیز اُس نامعلوم لوک گیت کار کو سوجھی نہ ہو۔

پنجابی "ماہیا" کی طرح "چن" کی ترکیب اتنی سادہ اور آسان ہے اور اس کے بولوں میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ موقع محل کے مطابق انہیں حسبِ خواہش تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس میں نئے نئے بند جوڑے جا سکتے ہیں۔

آیئے آپ کو ریاسی کے سرسبز پہاڑوں پر لے چلیں۔ جہاں ایک جھرنے کے پاس کھڑی ایک پہاڑی برہن چاند کو، ہجر کے پھپھولے دکھا رہی ہے۔ خاموش چاندنی رات میں اُس کی درد بھری مترنم آواز سُننے والوں کے دلوں کو بھی مسوس رہی ہے:۔

۵ چِٹی چنّاں چادری۔ او پھُل پاماں پھیر مال۔ چوؤں دِن ایں دا بول کیتا مہینہ چڑھیا تیرھوال
چنّ میری جان۔ او ... و

[اے میرے جسم وجان کے مالک چاند! تم چار دِنوں میں گھر لوٹ آنے کا وعدہ کر کے پردیس گئے تھے لیکن تمہیں گئے ہوئے آج پورے تیرہ مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہیں اس پاک محبت کا ہی واسطہ ہے جلدی گھر لوٹ آؤ۔ فُرقت کی لمبی، ملن بھری گھڑیاں کاٹنے کے لئے میں تمہاری سیج کے لئے سفید چادر پر (رنگ دار ریشمی دھاگوں سے) گول گول پھول کاڑھ رہی ہوں (تصوّرِ جاناں میں وقت کاٹنے کا اس سے کارگر اور دوسرا ذریعہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟)]

(۲) چِٹّی چنّاں چادری بھلا پھر۔ پھر چُھلدی۔ اِک میری جندڑی چنّاں پہاڑیں دیس ایں رُلدی
چنّ میری جان۔ او ... و

[اے میرے چاند! میری سفید ہلکی چُنّری ہوا میں پھڑ۔ پھڑا رہی ہے اور اسی کی مانند میرا پھول سا نازک جسم ان اُداس پہاڑوں پر تمہاری جُدائی کے تھپیڑوں میں لڑکھڑا رہا ہے اور برہا کی تپش سے مُرجھا رہا ہے۔ اے چاند سے مُکھڑے والے ساجن! گھر آ کر میری تپش بُجھاؤ

(۳) چنّاں دی آچاننی۔ بھلا چنّ تو کی تپّ نی۔ کودے کچھا پچھاں چنّاں سب کوئی چپ نی
چنّ میری جان۔ او ... و

[شب کی تاریکی میں کسی کھوئی ہوئی چیز کا ڈھونڈنا مُشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھ ابھاگن کی بدبختی کو کیا کہیئے کہ میرا چاند سا نورانی چہرے والا پریتم اس اُجلی چاندنی رات میں کہیں کھو گیا ہے۔ اور لاکھ ڈھونڈنے پر بھی کہیں مِل نہیں رہا ہے۔ میں جا بجا اُسے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ ہر آنے جانے والے سے اُس کھوئے ساجن کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہی ہوں۔ لیکن کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ سب کے سب خاموش ہیں۔ پیارے ساجن! تو ہی بتا اب تیرا پتہ ٹھکانا کِس سے پوچھوں؟]

(۴) چنّ ماپڑا چڑھیا۔ لگا پاریں کیری آ۔ نِکّے نِکّے اتھروں چنّاں کیر آں گودا تیری آ۔
چنّ میری جان او ... و

[میرا پردیسی چاند دُور دیس سے چلتا چلتا اب اُس پار کی پہاڑی تک آ پہنچا ہے۔ اے میری جان سے بھی زیادہ عزیز اور چاند سے خوبصورت بالم! اب جلدی سے میرے پاس چلے آؤ۔ تمہارے فراق میں روتے روتے آنسوؤں کے میرے "نین سمندر" خشک ہو چلے ہیں جو تھوڑا بہت "پریت جل" ان میں باقی رہ گیا ہے وہ میں تمہاری پیار بھری گود میں بیٹھ کر تمہارے گھر آنے کی خوشی میں ٹپکا دینا چاہتی ہوں]

ان چار بندوں میں اپنے پریتم سے بچھڑی ایک برہن کی گھٹن کی پوری کہانی بیان کی گئی ہے جسے دردِ فراق کے اتنے دُکھ جھیلتے ہوئے بھی یہ یقین ہے کہ اُس کا "بھلکڑ" بے پروا پریتم کسی نہ کسی دن آخر ضرور گھر آئے گا۔ تب اُس کی آغوش میں بیٹھ کر وہ تمام دُکھ درد بھول جائے گی۔ اُس کے تمام گلے، شکوے تب دُور ہو جائیں گے۔ اُس کا دِل خوشی سے پھول کی طرح کھِل اُٹھے گا اور اُس کی اُداس آنکھوں سے خوشی کے نِرمل، ننھے آنسو اس طرح اُتریں گے جس طرح پھول کی کومل پتیوں پر اوس کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔

اے لو! کوئل کی درد بھری کوک کی طرح "چن" کے بول اب دوسری طرف سے سُنائی دینے لگے۔ یہ شاید راجوری، چنگس یا نوری چھمب کا "چن" ہے جہاں مُغل شہنشاہ جہانگیر اور "عطروں کی ملکہ" نور جہاں کی محبت کی یادیں آج بھی گونج رہی ہیں اور نوری چھمب کے دِل فریب جھرنے پر رقص کر رہی ہیں۔ اس "چن" میں تڑپ ریاسی کے "چن" جیسی ہی ہے مگر سُر نَے میں باریک سا فرق ہے اور میٹھا درد کچھ گہرائی میں ہے:۔

(۱) چن ماہڑا چڑھیا اُپر ربوری آ۔ بنی جایاں پکھرُوتے مِلی جایاں چوری آ
چن جی بجوگ لگدے میری جان او ...

[چاند آج راجوری کی سرسبز پہاڑی پر طلوع ہوا ہے اور وہاں سے تاک جھانک کر رہا ہے اے میرے دِل کے چاند! تُو بھی اپنا دیدار دے۔ اگر اس طرح آنے میں کچھ جھجک ہو تو پرندہ بن کر اُڑتے ہوئے چلے آؤ۔ اور چوری سے مِل جاؤ۔ تمہاری جُدائی میری جان کو گھن کی طرح کھا رہی ہے]

(۲) تہوئی تہپا سُٹ نی آں سُک او کٹینہا۔ ڈاہڈا مندا لگدا اسپچ کری منتے آں

چن جی بجوگ لگدے میری جان او .....

[اے درد اور تڑپ دینے والے بے پروا پریتم! تمہارے کپڑے میں نے دھو کر سُکھانے کے لئے دھوپ میں ڈال دئے ہیں۔ ان کے سوکھتے سوکھتے گھر لوٹ آؤ۔ اے چاند کی سی موہنی مورت! تمہاری جدائی اب سہی نہیں جاتی]

(۳) چٹی چناں چادری مجھی کنڈے سی نی آں۔ چھنے دی نشانی این گی دکھی دکھی جیینی آں
چن جی بجوگ ... ...

[اے میرے چاند! تمہاری سیج کی سفید چادر کو میں مچھلی نما، آڑی ترچھی سلائی میں سی رہی ہوں یہ سلائی بھی اس بات کی شاہد ہے کہ تمہارے بنا میرا کومل دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے جو چیزیں تم اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ وہی اب میری زندگی کا سہارا ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ہی جی رہی ہوں۔ اے چاند! جدائی کے یہ لمبے دن کب ختم ہوں گے؟]

(۴) اک گھڑا بھریا۔ دُوا بھری ڈھولیا۔ شکر گجارنی آں چن موں آبولے آ
چن جی بجوگ لگدے میری جان او ....

[میرا ساجن مجھ سے کیا رُوٹھا۔ میری عقل و دانش بھی چھین لے گیا۔ اُس کی ناراضی اور بے رُخی سے میں پگلی سی ہو گئی ہوں۔ مجھے اپنی سُدھ بُدھ ہی نہیں رہی ہے۔ اس پریشانی میں میں اپنا سب کام کاج بگاڑتی چلی جا رہی ہوں۔ پن گھٹ پر ایک گھڑا پانی سے بھرتی ہوں اور دوسرا اُنڈیل دیتی ہوں۔ میری یہ حالتِ زار دیکھ کر آخر ایک دن ساجن کا دل نرم ہوا۔ اُس کا غصہ دُور ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے بولنا شروع کر دیا اور میری جان میں جان آگئی]

لیجئے "چن" کی ایک اور "پھاکھ" مشرقی پہاڑی علاقہ کی طرف سے گونجتی ہوئی آ رہی ہے۔ اس میں باریک زنانہ سُروں کے ساتھ پختہ مردانہ آواز بھی ملی ہوئی ہے۔ اس "چن" کا انداز کچھ نرالا ہی ہے۔ کسی پہاڑی نالہ کے آر پار دو پیار بھرے دل چکوے چکوی کی طرح اپنا درد و کرب ایک دوسرے کو سُنا رہے ہیں۔ بچارے آمنے سامنے کھڑے ہیں لیکن مل نہیں پاتے۔ شاید سماجی مجبوریاں اس گہری کھائی کی طرح اُن کے درمیان حائل ہیں :-

(زنانہ آواز) : چن ماہڑا چڑھیا او لاگے پاریں ٹکریں۔ تولا تولا چل چناں گھرناجو اکلی

مَنا جرُور میری جان او ... و ...

(مردانہ آواز) : چنّ ماہڑا چڑھیا اد چنّ پیدا ٹوری آ۔ بنی جانگ پکھرُو تے ہلی جانگ چودی آ

ہل انگ جرُور میری جان او ... و ...

[آج میرا چاند سامنے والی پہاڑی پر طلوع ہوا ہے۔ لیکن میرے پاس نہیں آتا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا ہے! اے چاند کی طرح خوبصورت چہرے والے ساجن! جلدی جلدی چلے آؤ۔ فراق میں تڑپتی تمہاری ناجو آج گھر پر اکیلی ہے۔ اُسے ضرور مِل جاؤ۔ دوسری طرف سے اُس کا ساجن ویسی ہی تڑپ میں جواب دیتا ہے۔" اے چاند کی طرح خوبصورت سجنی! ذرا صبر کر۔ میں خود تیرے ہجر میں تڑپ رہا ہوں۔ اور تیرے پاس آنا چاہتا ہوں۔ اگر اس طرح جلدی پہنچنا ممکن نہ ہوا تو میں پرندہ بن کر محبت کے پروں سے اُڑتا ہوا تیرے پاس آجاؤں گا]

جنگ کی تباہ کاریاں پہاڑی گوری کے سہاگ پر بجلی بن کر گرتی ہیں اور سہاگنوں کے سہاگ لُٹ جاتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی تمام شادمانی اُجڑ جاتی ہے۔ یہ حقیقت بھی پہاڑی لوک گیتوں نے اپنے سُروں میں پرو لی ہے۔ ان دیکھے، ان جانے دشمنوں سے لڑنے کے لئے ڈوگرہ پہاڑی جوان فرنگیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر سات سمندر پار لڑنے کے لئے جا رہے ہیں۔ ان پڑھ، ان جان "بھاگاں" جنگ کی تباہ کاریوں سے ناواقف ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے۔ غیروں کی اس لڑائی میں کون سچا، کون جھوٹا ہے۔ لیکن جنگ کا خوفناک نام سُن کر اُس کا معصوم دِل کانپتا ضرور ہے۔ وہ بھرتی والے فوجی افسر کے ہمراہ جاتے ہوئے اپنے چاند جیسے خوب صورت "کنیت" کو موت کے خوفناک تھپیڑوں سے بچانے کے لئے "باہو والی کالی ماتا" یا "شکرالا ماتا" کے حضور میں "پھلیاں" چڑھانے کی منت ماننے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے! وداع کرنے سے پہلے وہ اپنے بچھڑتے "چاند" کو گھوٹ کر گلے لگاتی ہے اور کانپتے ہوئے خشک ہونٹوں میں پھپھاتی ہے ــــ" اے میری مانگ کے سیندھور۔ میرے سُہاگ۔ اپنی خیر و عافیت کی اطلاع بھیجتے رہنا۔ ... اے میرے چاند ... ... ادھوری بات کو آگے پہاڑی لوک گیت کار کی ہی زبانی سُنیئے :۔

(۱) چھنے دی ہٹی آپر بکدے بدام جی۔ ایس نے ہیتہ چناں لگی جانی لام جی۔ چن میری جان جی۔

(۲) چھٹی چناں چادری پر پھُل پانی تھاگیں دا۔ اج چناں ملی تے پھری میلہ پھاگیں دا۔

(۳) چن ماہڑا چڑھیا تے لاگے پارین دندے آ۔ سُکھ ساند بھیجے آں او لامے پر جندے آ

چنّ میری جان جی ...

(۴) اپنے دی ہٹی آپر بکڑی آں چلّی آں۔ چن ماہڑا گھر آوے باہو ے، چاہڑاں چھیلیاں

چنّ میری جان جی ...

[اے میرے چاند! کسے معلوم تھا کہ یہ منحوس جنگ چھڑ جائے گی اور میرے مالک کو لڑائی پر جانا پڑے گا۔ اے میرے دِل کے چاند! آج جی بھر کر گلے مِل لینے دو۔ کون جانے پھر مُلاقات ہو یا نہ ہو! تم مجھے ظالم دُنیا کے تھپیڑے کھانے کے لئے اکیلی چھوڑے جا رہے ہو۔ اس تنہائی میں تمہاری خیر و عافیت کا ہی سہارا رہیگا۔ اس لئے جلدی جلدی خط بھیجتے رہنا۔ تمہارے راضی خوشی گھر واپس آنے پر میں "باہو والی ماتا" کے حضور میں زندہ بکریاں چڑھاؤں گی]

آبی بخارات سے لدی کالی گھٹائیں اُونچے پہاڑوں سے ٹکرا کر جیسے ہلکی، بھاری بوندوں میں برس پڑتی ہیں۔ اسی طرح ہجر و فراق کی گھٹاؤں سے گُھٹا گُھٹا دِل آہیں بھرتا ہے۔ اپنے پریتم کی جُدائی سے تڑپ تڑپ اُٹھتا ہے اور اُس کا غبارِ خاطر اس پہاڑی "چنّ" کے سُروں پر آنسو بن کر بہہ نکلتا ہے۔

"شیرازہ" میں چھپنے والی نگارشات

ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

ہندوستانی تاریخ، تمدّن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

ریاست کے تمدّنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

سیوا سنگھ

کشمیر میں پنجابی محاورات اور کہاوتیں

(۱)

کہاوتیں اور محاورات زبان کا قیمتی ورثہ ہوتی ہیں۔ ہر زبان میں اپنے محاورات اور کہاوتیں ہوتی ہیں۔ جتنا وسیع ان کا خزانہ ہوگا اُتنی ہی وہ زبان ترقی یافتہ اور پُر اثر ہوگی۔ یہ محاورات کسی مُلک کی آب و ہوا، ماحول، رہن سہن کے طریقے اور کلچرل سطح کے مطابق بنائے جاتے ہیں اور اُس ملک کے لوگوں کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگ روزمرہ کے کام کاج میں اصلیت پر مبنی خیالات کا اظہار اس ڈھنگ سے کر جاتے ہیں کہ اُن کے بعض جُملے کہاوتیں بن جاتے ہیں۔ ان چیزوں کی تخلیق گو سادہ لوح انسان ہی کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی زندگی کا تجربہ وسیع ہونے کی وجہ سے اُن کی باتیں روزمرہ کی زندگی کے متعلق عام لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اُن میں سچائی ہوتی ہے، اس لئے یہ محاورات اور کہاوتیں کسی زبان کا ایک انمول حصہ بن جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں کے ادب میں بالخصوص شاعری کا مطالعہ کرتے وقت کچھ ایسے بلند پایہ شاعر دیکھنے میں آئیں گے جن کے کلام کی بہت سی سطور عوام کی وردِ زبان ہو گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں زندگی کے متعلق سچائیوں کو قلم بند کیا گیا ہوتا ہے اور اُن سے لوگوں کو نصیحت آموز باتوں کا احساس ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری میں گورو نانک دیوجی، بھائی گُورداس، وارث شاہ اور بھائی ویر سنگھ کی تصنیفات میں سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں

پنجابی زبان محاورات اور کہاوتوں کے لحاظ سے کافی مالدار ہے۔ کہاوتوں کو پنجابی میں "اکھان" کہتے ہیں۔ ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اس زبان کی کئی شاخیں ہیں جو بُنیادی طور پر پنجابی ہی ہیں، لیکن مختلف علاقوں کی آب و ہوا اور ماحول کی وجہ سے ان کے لب و لہجہ میں تھوڑا سا فرق واقع ہو گیا ہے۔ ہر علاقے کی بولیوں کے الفاظ ان میں جذب ہو گئے ہیں۔ اس لئے ہر شاخ میں

اپنی نوعیت کے محاورات وجود میں آگئے ہیں جن پر دوسری زبانوں کا اثر بھی ہوا ہے اور یہ پنجابی زبان میں مجموعی طور پر ایک قابل قدر اضافہ خیال کیا جا سکتا ہے۔

ہماری ریاست میں پنجابی کی پہاڑی شاخ بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چبھالی، پونچھی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ ان زبانوں کا منبع پوٹھوہاری اور خاص کر ہندی پنجابی ہے۔ ٹھیٹھ پنجابی جموں شہر اور سیالکوٹ کے ملحقہ علاقے میں بولی جاتی ہے۔ مختلف شاخوں میں لوک ادب، جس میں لوک گیت، محاورے اور کہاوتیں پہیلیاں وغیرہ کہے جاتے رہے ہیں۔ ان کی بڑی تعداد ہے جس وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ انہیں کتابی صورت میں اکٹھا کیا جائے۔

جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا محاورات اور کہاوتیں زندگی اور تہذیب و تمدن میں مختلف اثرات سے وجود میں آتے رہیں۔ یہ اثرات کچھ اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں :-

(الف) لوک کہانیوں پر مبنی

(ب) تاریخی واقعات کا پس منظر

(ج) موسم کا تغیر و تبدّل اور اثر

(د) کچھ جگہوں کی خصوصیات یا برائیاں

لوک کہانیوں پر مبنی

عام لوگ خاص کر بچّے کہانیاں سننے کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ فالتو وقت گزارنے اور دل بہلانے کے لئے کہانی کہنے کا رواج انسان کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے۔ بھوت پریت، دیو پریوں اور پرندوں کی کہانیاں عام سننے میں آتی ہیں۔ شام ہوتے ہی بچّے دادی امّاں کے گرد جھرمٹ لگا دیتے ہیں اور ایک کے بعد دوسری کہانی کی فرمائش کرتے ہیں۔ جب تک کہ ان کی آنکھوں میں نیند نہ آجائے۔

کئی بار روزمرہ کی زندگی میں معمولی لیکن صداقت سے وابستہ واقعات پیش آتے ہیں جو "اکھان" یا کہاوتیں بن جاتے ہیں اور انہیں کئی مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو کشمیر میں پنجابی بولنے والوں کی زبان پر ہیں

(۱) آٹا گیا اُڈّن پُڈّن اُونٹ گیا پہیاوی

کہتے ہیں ایک بے وقوف کسی ساہوکار کے پاس نوکری کرنے گیا۔ ساہوکار کنجوس تھا۔ نوکری کے

لئے اُس نے یہ شرط رکھی کہ تنخواہ اُسی صورت میں دی جائے گی کہ اگر اُس سے کوئی غلطی نہ ہو۔ نہیں تو وہ نوکری سے بھی برطرف کر دیا جائے گا۔ انسان تو غلطیوں کا پُتلا ہے اور پھر بے وقوف انسان کب تک غلطی نہ کرتا۔ کچھ غلطیاں کرنے کے بعد اُسے نوکری سے برطرف کر دیا گیا وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اُس کا چھوٹا بھائی کافی عقل مند تھا۔ بڑے بھائی کا بدلہ چُکانے کے لئے ساہوکار کے پاس اُس کی شرائط کی بنا پر نوکر ہو گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے کام کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اُسے اُونٹ پر مکّی لاد کر پن چکّی سے آٹا پیس کر لانے کے لئے روانہ کیا گیا۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر اُس نے اُونٹ فروخت کر دیا اور آٹا خورد برُد کر دیا۔ واپس آکر ساہوکار کے پُوچھنے پر جواب میں اُوپر کی مثال پیش کر دی کہ آٹا اُڑ گیا ہے اور اُونٹ آٹا پیسنے کی اُجرت میں چلا گیا ہے۔

(۲) کُنڈیوں کو سائیں گھی کھا تو میئو

ایک گوجر کے پاس بے شمار بھینسیں تھیں۔ گھر میں دُودھ اور گھی کی افراط تھی لیکن کنجوسی کی وجہ سے اُسے یہ چیزیں دیکھنا نصیب نہ ہوتی تھیں۔ کمزوری کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ جب مرنے لگا تو بیٹوں نے اُس کی مونچھوں پر گھی لگا دیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اُن کا باپ مرتے دم تک گھی کھاتا رہا ہے۔ لیکن جو لوگ اُس کی حالت سے واقف تھے۔ کہنے لگے کہ "کُنڈیوں کو سائیں گھی کھا تو میئو۔" یعنی بھینسوں کا مالک گھی کھاتے کھاتے مرا ہے۔

(۳) جیا تِناں خُدا جنگل کو گاڈ بنائے

یہ کہاوت بھی کسی گوجر کے سلسلہ میں کہی جاتی ہے۔ گوجر لوگ جنگل کے متصل ہی آباد ہوئے ہیں جہاں کہ وہ معمولی سی زمین داری بھی کرتے ہیں اور گائے بھینس بھی چراتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایندھن وغیرہ کاٹ کر قصبوں میں فروخت کرتے ہیں۔ محکمہ جنگلات کے افسران اور مُلازم اُنہیں لکڑی کاٹنے پر منع بھی کرتے ہیں اور کئی بار جرمانہ بھی وصول کرتے ہیں۔ اُن کا زیادہ تر گارڈ سے ہی تعلق ہوتا ہے۔ وہ اُسے جنگل کا مالک سمجھتے ہیں۔

ایک بار کسی گوجر کی عدالت میں پیشی تھی۔ جج نے مقدمہ کا فیصلہ اُس کے حق میں سُنایا اُس نے خوش ہو کر فاضل جج کو دُعا دی اور کہا— "جیا تِناں خُدا جنگل کو گاڈ بنائے!"

(۴) بَلا بولے تا دلی کو

ایک بھلا آدمی شادی کی دعوت پر اپنے رشتہ داروں کو مدعو کرنے بھیجا گیا۔ بہت سے

گاؤں میں خود دعوتیں کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں شادی ہو گئی۔ رشتہ دار آئے اور چلے گئے۔ آخر کار اُسے گو یاد آیا اور چھ مہینوں کے بعد واپس لوٹا۔ اپنے گھر کے صحن میں تیزی سے داخل ہوا جیسے کہ ابھی ابھی دعوت نامے تقسیم کر کے واپس آیا ہو اور اسی تیزی میں پگڑی درخت کی ٹہنی سے ٹکرا کر گر پڑی وہ جھٹ سے بول پڑا۔ " بلا پڑے تاولی کو۔ " یہ جلدی کا کام بھی کتنا نقصان دہ ہے۔

تاریخی واقعات پر مبنی

بہت سی کہاوتیں روزمرہ کی زندگی میں سننے میں آتی ہیں جن کو کئی تاریخی واقعات کی وجہ سے گھڑ لیا گیا ہے۔ اسی طرح کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

راجہ ہے نادان گل نہ ٹھہر دی
سدانند وزیر کانی کہر دی
چُوہڑ ہے کوتوال سختی شہر دی

یہ کہاوت پونچھ کی ریاست میں ۱۵۸۷ء کے بعد چغتائی خاندان کی حکومت کے وقت جب شیر باز خان گدی پر بیٹھا تو اُس کے نابالغ ہونے کی وجہ سے ریاست کے کام کاج میں زیادہ تر اُس کا وزیر سدانند اور کوتوال چوہڑ بہت سختی سے حکومت کرتے تھے جن کے متعلق یہ کہاوت عوام کی زبان پر ہے۔

اسی دورِ حکومت میں آگے چل کر وزیر منگا اور ٹہل سنگھ داروغہ بھی اپنی سختی کی وجہ سے عوام میں یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی ایک کہاوت مشہور ہے جو حسب ذیل ہے :۔

جا کہو وزیر سے منگے کی
نہ جانے مندے چنگے کی
جیوں پِچھ مروڑے ڈنگے کی

موسم کا تغیر و تبدّل

گرمی و سردی نیز سال کے مختلف موسم زندگی میں کئی طرح کی خواہشات اور اُمنگیں، مشکلات اور تکلیفیں لے کر آتے ہیں۔ ان کے متعلق کئی باتیں سچائی بن کر عوام کی زبان پر چڑھی ہوتی ہیں۔ ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

چیت کو چیتے رکھو، بساکھ کا بساہ نہ کرو!

کشمیر میں کئی موسم بدلتے ہیں۔ بہار، گرمی، خزاں اور سرما۔ یہاں برسات کا موسم عموماً چیت

اور بیساکھ میں ہوتا ہے۔ گرمی بھی ہوتی ہے لیکن زیادہ تر بارش کا زور رہتا ہے۔ کھیتی باڑی کے لیے ایسا موسم بیج بونے میں دیری کا باعث بن جاتا ہے۔ کسان عموماً یہ کہاوت استعمال کرتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ "چیت کو چیتے رکھو، بیساکھ کا بساہ نہ کرو۔" یعنی چیت کے مہینے کو یاد رکھنا چاہیئے اور بیساکھ کا اعتبار کرنا بھی اچھا نہیں۔

جاں بولے تاں سبال، جاں روڑا تاں کال

یہ کہاوت بھی کشمیر کے موسم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اگر مئی اور جون کے مہینے تک بارش برستی رہے تو اس قدر سردی ہو جاتی ہے کہ سرما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسا عموماً پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر گرمیوں میں بارش نہ ہو تو کنڈی (خشکی) کے علاقوں میں جہاں نہری پانی نہ ہونے کی وجہ سے آبادی کا انحصار بارش پر ہوتا ہے، فصلیں پیدا نہیں ہو سکتیں اور کال یعنی قحط کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح کئی بار تاریخی واقعات کے پیش نظر کچھ کہاوتیں رائج ہو جاتی ہیں۔ وہ واقعات، جو زندگی پر اثر چھوڑ جاتے ہیں، مثالیں بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی کسی جگہ کی بُرائی یا بھلائی میں گھڑ لی جاتی ہیں۔ کسی گاؤں کی چڑھائی یا اُترائی، وہاں پانی کی کمی، خشک سالی کی حالت، خوراک میں چاول کی کمی، لیکن مکی یا گیہوں کے آٹے کا افراط استعمال ——— یہ سب چیزیں عوام کی زندگی کو دوبھر بنا دیتی ہیں۔ انہیں مجبوریوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں کہاوتوں کا موضوع بن جاتی ہیں۔

کبھی کبھی ذات پات کی بُرائیاں بھی کہاوتوں کی پیدائش اور تخلیق کا باعث بن جاتی ہیں۔ انہیں ترک کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں نفرت آمیز لہجے میں گھڑ لی جاتی ہیں۔ ذیل میں ایک کہاوت کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا :-

بوفو دا مُڈ بُنیاد، لالچی دا مُڈ رمیال

جس طرح وادیٔ کشمیر کی طرف آتے ہوئے برف باری کے لحاظ سے بُونیاد ضلع بارہ مولہ ایک حد مانی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں تک برف باری کثرت سے ہوتی ہے۔ اسی طرح کہاوت ہے کہ لالچ کی بُنیاد "رمیال" ذات کے لوگوں نے ہی ڈالی ہے۔ یہ مظفر آباد کے علاقے میں رائج ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رمیال ذات کے دو بھائیوں میں کچھ روپیہ بانٹنے کے بعد ایک پیسہ بچ گیا تو اُن

کا لالچ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اُس پیسے کو کاٹ کر دو حصے کر دئے گئے۔ تب جا کر وُہ مطمئن ہوئے۔

اسی طرح "چیتر مارے اڑی، دُوپے بکے گڈی۔" "پھگن چلّے پچھے بگن، اور بجے ہو وال مانہہ لاداں بوٹیاں تو داہ" وغیرہ بھی موسموں کے بارے میں کہی گئی کہاوتیں ہیں۔

اب ہم اِن کہاوتوں اور محاورات کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ کون سے اثرات تھے جن کی وجہ سے یہ رائج ہوئے۔ ہر مُلک کی طرح کشمیر میں بھی یہ وقتاً فوقتاً گھڑے جاتے رہے ہیں۔ ان کی زیادہ تر تعداد پہاڑی، چبھالی، پونچھی وغیرہ پنجابی کی شاخوں میں پائی جاتی ہے۔ خصوصًا پہاڑی زبان کے محاورات پر پوٹھوہاری کا زیادہ اثر ہے۔ لیکن کشمیر کے پنجابی بولنے والوں نے ان کو اپنے لب ولہجہ کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ نیز کشمیری زبان نے ان پر اپنا کافی اثر ڈالا ہے پہاڑی اور کشمیری کے باہمی میل جول سے نئے محاورات کی تشکیل ہوتی رہی ہے۔ کچھ تو ان لوگوں نے یہاں کے کلچر اور آب و ہوا کے اثر سے نئے "اکھان" اور محاوروں کو جنم دیا ہے اور اس کے علاوہ یہاں کے رہن سہن کے مطابق گیت اور پہیلیاں بھی گھڑ لی ہیں۔

نیچے اُن محاورات اور کہاوتوں کی ایک فہرست دی جاتی ہے جو کشمیری زبان کے اثر سے پہاڑی پنجابی میں رائج ہوئے ہیں۔ ان میں کشمیری زبان کے الفاظ اس طرح جذب ہو گئے ہیں کہ وہ پہاڑی کا ہی ایک حصہ بن گئے ہیں:۔

محاورات

محاورہ	مطلب	کشمیری محاورہ
اسمانو چہڑنا	حیران ہونا	
اگ لگیاں، کھوہ کھنناں		نارہ وِزِہ کرُور کھنن
اول دول دیناں	ٹال مٹول کرنا	اول دول دِین
ادر کھل کرناں	بگاڑنا	اُدرہ کھل کرنی
امری چوٹے دی طراں ہونا	چہرے کی لالی کو ظاہر کرتا ہے یعنی تندرست ہونا	امبری ژونٹھ ہیو آسن
عین داند ہونڈاں	بے سمجھ ہونا	اُنی داند آسن
ادمرے کرنے	چھیڑ چھاڑ کرتے رہنا	ادِہ مرِہ کرنی

اکھیاں تے چڑھ جانڈاں	نظر لگنا	اُچھن کھسُن
اڈہ ٹُٹی ہونڈیں	بے وقت موت	اڈہ ژوٹ گژھن
		اڈہ ژٹی گژھن
اگا دے ہونڈاں	پیچھے پڑ جانا	اگادِہ گژھن
اگ پھکڑیں	آگ اُگلنا	اَسس منز نار نیرُن
ادا درا	صحت مند ہو جانا	
اکھیاں نِیچ جا کرنی	عزّت کرنا	اُچھن منز جائے کرِنی
پائجوٹ کرِنی	آپس میں بانٹنا	پائجِوٹ کرِنی
پہانڈ پاتھر لانڈاں	سوانگ رچانا	بھانڈ پائتھر لاگُن
بیٹھن دی جگہ نہ ہونڈیں	بہت غریب ہونا	بِہنہ نہ جائے آسُن
بُڈہ کچلا	سفید داڑھی والا ہونا یعنی بہت بوڑھا ہونا	بُڈہ کچھل
بوشس چڑھنی		
بیواری کرنی	بے عزّتی کرنی	بے واُری کرِنی
بُکلی وِچ مُشک کھنڈیں	اپنے عیبوں کی طرف توجہ کرنی	بلیہ مُشک ہیوّن
بونڈیں دے گُڈا جیہا ہونڈاں	بہت موٹا ہونا	بونہ گُوڈ ہیو آسُن
بگو وٹیاں	خاتمہ بالخیر کرنا	دُگو دُٹن
پہاٹھیاں کرنیاں	خوب پیٹنا	باچھ کرُن
پھٹ جاناں	دولت اور ہنر کا دِکھاوا کرنا	پھُٹِتھ نیرُن
پاتھر لانڈاں	سوانگ رچانا	پائتھر لاگُن
پھرٹ ہو جاناں	بہت زیادہ ڈر جانا	پھرٹ گژھن
پہت گردن دنڈیں	کھلونے سے کسی کام کا لینا یا اُس کا مُنہ بند کرنا	
پہیاں پے جاناں	مصیبت کی وجہ سے پست ہو جانا	پتھرِہ پیوّن

پرشس ہونڈیں		پُرشش آسُن
پیچی تلے ڈھکیا رہناں	ملتوی کرنا	[illegible]
تصرف ہونڈاں	بھوت سوار ہونا	تصرف آسُن
تار کانچی لانڈیں	باہمی رابطہ بڑھانا	تارِہ کانِچ کرُن
تُل کترُ لگناں	ٹھنڈا ہو جانا	تُل کترُ لگنُ
تالے ٹونگ آنڈناں	ناک میں دم کرنا	تالِہ ٹونگ انُن
تھپاں دیناں	زبردستی چھیننا	تھپ دِنی
ٹھپ تھپ کرناں	کسی چیز کے پیچھے پڑنا	تھپہ تھپ کرِنی
تمعے کو تاوَن	خواہشات کا پورا نہ ہونا	طمہس تاون
نہ تتی سُکھ نہ متی سُکھ	کہیں بھی آرام نہ ہونا	نہ تتی سُکھ نہ یُتی سُکھ
ٹسوے کرنے	مخول کرنا	ٹسول کرُن
ٹپلا لگناں	حساب میں گڑبڑ کرنا	ٹپلہ کرُن
ٹھُل ٹھُل کرناں	لڑائی کرنا۔ جھگڑنا	ٹھولہ ٹھول کرِنی
ٹھِلاں کڈھنیاں	کسی کو دور کر دینا	ٹھِل کڈِنی
ٹین بجانڈاں	کسی کی بے عزّتی کرنا جب کہ وہ کوئی جگہ چھوڑ رہا ہو	ٹین واینُ
ٹھولاں کو بہاہ دینڈاں	ایک ہی جگہ بیٹھ رہنا	
ٹھولاں تے بہہ رہناں	آلس (سستی) کا عادی	ٹھوکُن بہاہ دِیُن
جِن جِہا ہونڈاں		جِنّ ہیوُ آسُن
جوانڈاں مرگ ہونڈاں	جوانی میں ہی مر جانا	جان مرگی گژھُن
جِنّ جِہا پینڈاں	وحشیانہ طریقے سے پیش آنا	جِنّ ہیوُ پیٛون
جوتِل جم		جوتِل جم
جِگر اِچ جا کرنی	بہت پیار سے رکھنا	جگرس منز جاے کرِنی
جاہل کرنی	جہالت	جاہل کرِنی

جگیر گھننی		جاگیر رٹن
جلاب لگدڑیں	ڈر جانا	جلاب لگن
جیب ملی ہونڈیں	گندی زبان رکھنا یا گالی گلوچ کا عادی ہونا	زبوہ زیُوبھڑ آسُن
جڑاں کو دراٹی لانڈیں	کسی کو بہت نقصان پہنچانا	مُولن درُوت لاگن
جنگ تلیو کڈھڈان	معاف کر دینا	زنگہ تلُی کدٹن
چلم ہونڈیں	زبردستی کسی نوکری وغیرہ سے برطرف ہو جانا	چلم گرڑھنی
چٹی پینڈیں	خواہ مخواہ کسی بات کا نقصان بھرنا	چُٹ پینی
چھوک لگنی		چھوک لگنی
چینتے بھرنے	رشوت دینی	چندہ بھرن
حالے حیران ہونڈاں	دربدر ہو جانا	حالِ حیران گرڑھن
خیر پاٹھ کرنا	حال احوال پُوچھنا	خیر پاٹھ کرُن
ہوش ڈھلنے	بے چین ہو جانا	ہوش ڈلنی
دیوت لہہ جانڈیں	عقل ٹھکانے نہ رہنی	دیوت وڑین
دنداں سنڈیں جمناں	بہت پکا ہونا	دَندوسان زیوّن
ڈام لانڈاں	بہانہ کرنا	ڈام لاگن
رانڈگی کرنی	مستی کرنا	رانڈہ گی کرنی
رات مُگل ہونڈاں	رات کو کام کاج کرنا یا بے سمجھ لگانا	راتہ مُگل آسنی
رچھ جیہا ہونڈاں	گنوار ہونا	ہا پُتھہ ہیو آسُن
سوئی کو پگ بنہڈیں	کسی معمولی آدمی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا	لوبہ دستار گنڈن
شال جیادادی	وہ کام جس کی ذمہ داری لینے سے آدمی خود پھنس جائے	شالِ جماداری

شوم لانڈاں	کنجوسی کرنا	شوم لاگُن
شُرگی کرنی	بچوّں کی طرح باتیں کرنا	شُرہ گی کرِنی
شِکس لد		شِکس لد
کُتیاں کو باہنڈاں	بے قدری کرنا	ہونہِن تراوُن
کالی برف پینڈیں	اَن ہونی بات کا واقعہ ہونا	کرِہُن شین پیوّن
کلہ لانڈاں	جان بُوجھ کر کسی بات کا ٹالنا یا چھپانا	کوّل لاگُن
کوُڈر ہونڈیں		کدُر آسنہٕ
کُتّے ہڈی ہونڈیں	بے شرم واقع ہونا	ہوُنی اُڈِج آسنہٕ
گراں دینڈاں		گام دِیُن
گردن نہ پھرنی	لاپرواہونا	گردن نہٕ پھیرٕنی
لم لم کرناں		لم لم کرُن
مرن سرٹاں لگرٹیاں	ٹال مٹول کرنا	مرن سرٹ آسنہٕ
مٹے لگناں	کسی بات کی ذمّہ داری سر پر آجانا (بُرے معنوں میں)	مٹ لگُن
مٹے کرناں	سپُرد کرنا	مٹ کرُن
مُوہاں کو بھپو دیناں	کسی کو بات نہ کرنے دینا	ٲسس ٹھوپ دِیُن
مُوہاں کو سرف ہونڈاں	کسی کی شخصیّت میں وصف کرنا	بُتھِس شرف آسُن
منگ دگ ہونڈیں	باتُونی ہونا	مِنگ دگ آسنہٕ
ماں ماں لینڈیں / ماں ماں کرنی	بڑوں کے ساتھ برابری کرنا	ماں ماں کرٕنی
مُنڈ کھٹھ	یتیم (آوارہ یا لاوارث ہونا)	موُنڈِہ کھٹھ
نڈرے جھیا	کمزور	ندٕر ہیوٗ آسُن
نندر متا ہونڈاں	زیادہ نیند کرنے والا	نیندرِہ موّت آسُن

دوئی ہیڑی چڑھنا	دوسری شادی کرنا	
نیال گالڑاں / نیال نہ رہناں	بالکل ختم ہوجانا۔ نشان نہ رہنا	نیاؔل گلنُ / نیاؔل نہ روزُن
ڈونٹھ پینڈیں	بنا ہوا کام بگڑ جانا	ڈوٹھ پیوٚن
ووڑ ووڑ اُٹھناں		ووڑِ ووڑِہ ووتھنُ
واتل بٹوار کرناں	آج کل کرنا	واتل بٹہ وار
وال واشی زِبچ پھساں	جال میں پھنسنا	والہِ واش لگنُ
یلہ ہونڈاں	بے مالک ہوجانا	یلہٕ گژھنُ

کہاوتیں

اپنی گُگڑی حرام زادی نہ ہووا پرائے کہر کیاں ڈھُول باہوا	یہ کہاوت اُس عورت کے لئے استعمال ہوئی ہے جو روکنے پر بھی اپنی بدچلنی سے باز نہیں آتی!	پننی کوہ کرِ...
بہن نالوں بگار ای چنگی بیکارا نوں ترے کار	بیکاری سے بیگار بھلی بیکار انسان حسبِ ضرورت کئی فضول کام کرنے لگتا ہے	بہنہٕ کھوتہ بیگارٕ ہو جان بیکارس ترٛیہ کار
وارا کو آپنا ای پُنوں تھیندا	ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے	دارٕ کمیوٗ پھاپہٕ وُکھ ڈوٛینس پننی پیٛز
دَب کُسا دا بَب آ؟ شرعے چہ شرم کے آ	سچائی کی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا	دیب چھا کانٕسہِ بیب شرعس ترٕ شرم کیاہ؟
کہر جوائی کُتے جائی	خانہ داماد کے ساتھ جو بُرا سلوک سُسرال میں ہوتا ہے اُس کے متعلق کہا جاتا ہے	گھرہ پیٹھک ترامتُ یَرہ پیٹھک ہوٗن
لحاظ کِسا دا بھرا آ	کسی سے لحاظ کرنا بُرا ہوتا ہے	لحاظِ گو ورٕ کُس بوے

اُوپر بیان کئے گئے محاورات کشمیری زبان کے اثر سے بنے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو کشمیری محاورے کا صحیح ترجمہ ہیں۔ لیکن کچھ تو اپنے لہجے کے مطابق لکھے گئے ہیں اور نئی صورت میں پیش کئے گئے ہیں لیکن اُن کا مطلب ایسا ہی ہے جیسا کہ کشمیری محاورے کا ہے۔ چند ایک پیش کی گئی کہاوتیں صرف ترجمہ ہی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ سب محاورات اور کہاوتیں اس طرح بول چال میں استعمال ہوتی ہیں جیسے کہ پہاڑی پنجابی کی اپنی ہی زبان کا ایک حصہ بن چکے ہوں۔

مندرجہ ذیل چند ایک کشمیری کہاوتیں ہیں جو ہُوبہو شکل میں وادی کے پنجابی بولنے والے بکثرت استعمال کرتے ہیں ——

۱ ہُون وودان کارخانۂ پکان

۲ تُل پکو وو ہتھ ژلو

۳ کھنہ پل تہٖ کھادن یار

۴ اپھہ پیو و ترہ یباٴرہ کھیو و

۵ اسے زر یہٖ خوش کری تہٖ کر

۶ کر پرس ائی گھرس

۷ سٔے کارس تہ بٔہ کار

۸ کم کھیؤن غم نہٖ ہیؤن

۹ پُژہس پؤژھ کھران، خانہٖ دارس دو شوسے، خانہ دارنہٖ ترٔشوسے

۱۰ دیھٹہ میاٴنی کانگر وُچھ میاٴنی ٹکھ

۱۱ آسُن وَتھ ہاوان نہ آسُن منڈہ چھاوان

۱۲ پرٕ گگُر کران گھر گگرن لار

۱۳ یٔلو سہ تیٔلو نہ کنہ، یٔلی کن تیٔلو نہ کنہ

۱۴ اللہ اللہ خیر صلاہ !

ہم نے کشمیری زبان کا پہاڑی پنجابی کے محاورات اور کہاوتوں پر جو اثر ہوا ہے یا اس کے باعث جن نئے محاورات کی تشکیل ہوئی ہے اُن کا جائزہ لیا ہے۔ یہ چیز بہت دلچسپ ہے کہ پنجابی زبان نے کشمیری کے سینکڑوں الفاظ اس طرح اپنے میں جذب کر لئے ہیں کہ اب وہ اُس کا ہی جزو بن

چکے ہیں۔ کشمیری اور پنجابی کے میل سے نئے لفظ وجود میں آ چکے ہیں۔ نئے Compound words مُرکّب الفاظ گھڑ لئے گئے ہیں جو باہمی ملاپ اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) "گل کتھ"۔ یعنی بات چیت۔ اس میں "گل" پنجابی اور "کتھ" کشمیری۔ دونوں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۲) "گنڈ واٹ"۔ گنڈ پنجابی اور واٹ کشمیری۔ یعنی جوڑ یا رشتہ

(۳) ہیچ کیچ۔ بہت نازک و نرم۔ ہیچ کشمیری اور کیچ پنجابی لفظ۔ دونوں نرم چیز کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) شین کوچی۔ چھت سے برف اُتارنے کی چیز۔ شین برف اور کوچی صاف کرنے والی، یعنی چھت سے برف صاف کرنے والی چیز

ان کے علاوہ کچھ کشمیری مُرکب جو ہُو بہو پنجابی (پہاڑی) میں استعمال ہوتی ہیں جیسے:۔

شمسی مُر

تال

کھین دُ

مران مرٹ

کشمیری زبان کا اثر جو پنجابی پر ہُوا ہے، اُسے ہم نے دیکھ لیا ہے۔ اب پنجابی زبان کے محاورات اور کہاوتوں نے کشمیری پر جو اثر کیا ہے اُس کی مثالیں نیچے دی جاتی ہیں:۔

محاورات (پنجابی)	معنی	مقابل کا کشمیری محاورہ
اکھی تا کھی نہ جرناں (جھلنی)	کسی کی پروا نہ کرنا	اُچھن بیٹھ نہ مچھی زِردِنی
اکھیاں نوں ملناں	عزت سے کسی چیز کو لینا	اُچھن متھن
اندر چور ہوناں	دل صاف نہ ہونا	اندری ژور آسُن
اپناں آپ مارنا	دل وجان سے ہمدرد ہونا	پان تہ جان مارُن
بُکل چہ مُنہ کرناں	اپنے عیبوں کی طرف توجہ دینا	بلینہ منز بُتھ کرُن
تیل پیڑناں		تیل پیڈُن

ٹھکاں نوں ہتھ دھرناں	خوشامد کرنا	تھوکن اتھ دارُن
سُر سُر کرناں		چھور چھور کرناؤن
چال ڈھال ہونی	اچھی شخصیت	چال ڈھال آسنی
دھرم کرناں	نیک کام کرنا	دھرم کرُن
دُر دُر کرناں	کسی سے نفرت کرنا	دُر دُن کرُن
ڈھل جاناں	ہوش ٹھکانے نہ رہنا	ڈلُن
سِدھیاں اُنگلیاں گھیو آناں		
سنڈھا جیا ہوناں	موٹا تازہ ہونا	سنڈہ ہیو آسُن
سپ دی کھڈ وِچ پیر پاناں	خطرناک کام کرنا	سرفہ کھوڈس کھور ترادُن
سانگ لاندیں	کسی کی نقل اُتارنا۔ بہانہ کرنا	سانگ لاگُن
سادھ سنگت کرنی	نیک آدمیوں کی صحبت میں رہنا	سادن ہُند سنگت کرُن
گھر وِچ گنگا	گھر میں ہی ہر طرح کی سہولت میسّر ہونا	گھرس منز گنگا
مگر لگناں	پیچھے پڑ جانا	مگر لگُن
نال نال ہوناں	ساتھ ساتھ رہنا	نالی نال آسُن
نگر نگر پھرنا	ہر جگہ پہنچنا	نگر نگر پھیرُن
نوہاں دا ماس گل جاناں	اپنے ہاتھ سے محنت کرنا	نمن ہُند ماز گلُن
کھوری پچھے مت	بیوقوف ہونا ظاہر کرتا ہے	کھور پیتھ عقل آسُن
کھنی نہ ہوندیں	پرواہ نہ ہونی	کھیس آسُن
مُنہ مُنہ دیکھنا	حیرانی سے کسی کی طرف دیکھتے رہنا	بُتھ بُتھ وُچھُن
موڑھیاں اُتوں دیکھناں	مغرور ہو جانا	پھیکہ پیٹھ نظر کرنی
راندیں خان دا پتر ہوناں	اپنے آپ کو اُونچا ظاہر کرنا	
رام رام کرناں	نراش ہو جانا	رام رام کرُن
کہوڑے دی دُم لمبی ہوسی تاں اپناں آپ ہی کجی	ہر کوئی اپنے لئے ہی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے	شالس لوٹ ڈیو ٹھ ڈوٹن وتھرُن پتھن

این منی جھگڑا اٹھ ٹیا		آن مانیز جھگڑہ تُھیّنن
منگناں مرناں ہوندا اے	کسی سے کچھ مانگنا موت کے برابر ہوتا ہے	منگُن تہ مرُن
مُلاّں دی دوڑ مسیتی تیکر	کسی انسان کی تنگ نظری کو ظاہر کرتا ہے	ملس ٹھِکھ مشیدِ تام
اکرا دہی اے دہی اے دہی کرا خصما خصماں		مائیجِ کران کوری کوری، کوّو کران ریہنز ریہنز
جہڑے نہ جاناں گراں اُس دا کی لیناں ناں	جس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو اُس کے بارے میں سوچنا فضول ہے	ییتھ گامس نہ گژھن آسیہ تور کیاہ کام ؟
آپ مرو دھرم کرو۔ گھر نہیں اُدھار کرو	جب اپنے پاس کوئی چیز نہ ہو تو دوسرے کو کیا دے سکتا ہے ؟	
جدکھیگا پہلکے آؤ تدھ کھیگا حوال		
چِٹی داڑھی آٹا خراب	بوڑھا ہو کر بھی بدکار کرنا	
چوٹے کو دیکھ کے چوٹا رنگ پکڑدا	خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے	
ہم وٹیا سوئی کھٹیا	جو چیز حاصل ہو جائے وہ ہی اپنا ہے	
جٹ جناں دسے سالے		
گبھے کو لت کاری	اچانک مدد ملنا	کوِّبس لتھ کارگر

(باقی باقی)

غلام رسول سنتوش

ڈل کے آنسو

غلام رسول سنتوش کا شمار معاصر ہندوستانی مصوری کے ممتاز ترین نمائندوں میں ہوتا ہے
وہ کشمیری زبان کے شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں اور اُن کا ایک اُردو ناول طباعت کے مرحلے طے
کر رہا ہے۔ یہ اُردو افسانہ اُن ہمہ جہت ذہن کی تخلیقی اپج کا ایک اور پہلو پیش کرتا ہے۔ (ایڈیٹر)

سلیمان پہاڑی پر "میاں ڈل" کی قبر صدیوں سے سو رہی ہے۔ لیکن قبر میں دفن "میاں ڈل" کی آنکھیں اب بھی جاگ رہی ہیں۔ جب کنول کے پتوں پر لرزتے موتی پک جائیں گے۔ اور وہ ڈل میں کود کر تمام موتی سمیٹ لے گا۔ اُن کی ایک مالا بنا کر... "چاندنی کی پری" کے گلے میں ڈال دے گا۔ اسی لئے "چاندنی کی پری" چاندنی راتوں میں اپنی اُمید وفا کی جھولی "میاں ڈل" کی قبر کے سامنے پھیلا دیتی ہے۔ اور ہر بار نا اُمید اور مایوس ہو کر خالی جھولی سمیٹے اماوس کی تاریک راتوں میں سسکتی رہتی ہے
کنول کے سیپوں کے اندر کچے موتی لرزتے رہتے ہیں۔ اُن کی ایک ایک لرزش میں ہزاروں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن داستانوں کو کبھی ڈل نے سُنا۔ اور اُس کے جوان چہرے میں جھُریاں پڑ گئیں۔ اُس کی آنکھیں رو اُٹھیں۔ کنول کے پتوں نے اُس کے آنسوؤں کو اپنے اندر سمو لیا۔ "چاندنی کی پری" دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔ اپنے سانسوں کی حدت اُن میں سموتے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن یہ موتی بن نہیں پائے۔ صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ صدیوں سے یہ موتی کچے ہی رہے۔

بوڑھے غفارا کی چہیتی "مالا" آج بھی "میاں ڈل" کی قبر کے ساتھ لگ کر بابا سے سُنی ہوئی کہانیوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ اپنے بوڑھے بابا کی کہانی "میاں ڈل" کو سُنا رہی ہے۔

"میاں ڈل" یہ اماوس کی راتیں ہیں۔ تمہاری قبر کی طرح تاریک اور سنسان۔ جن تاریکیوں کو تمہاری "چاندنی کی پری" بھی روشن نہ کر سکی۔ جن تاریک راتوں میں یہ موتی پک بھی جاتے ہیں اور سمیٹے بھی جاتے ہیں۔ ان تاریک راتوں میں ان کا سودا بھی ہوتا ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں دیکھ پاتے۔ یہ اب کی بات نہیں۔ یہ باتیں اُس زمانے کی ہیں۔ جب کوئی غفارا میاں ان کا رکھوالا نہ تھا۔ میری جیسی "مالا" رات رات بھر ناؤ پر بیٹھ کر ان کی رکھوالی کرنے والی نہ تھی۔ اب یہ

مالا نہ لے موتیوں کے کھیتوں کی رکھوالی کرتی ہے۔ اماوس کی تاریک راتوں میں، ٹھنڈی ٹھنڈی شفاف چاندنی راتوں میں سرما کی منجمد کر دینے والی راتوں میں تم ان کچے موتیوں کے پکنے کا انتظار کرتے ہو۔ یہ پک جائیں اور تم ان کی مالا بنا کر "چاندنی کی پری" کے گلے میں ڈال دو، اور میں اپنے آنسوؤں کی مالا بنا کر اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں۔

میری باتوں پر تم کان دھرے بیٹھے ہو۔ لیکن میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ صرف ان موتیوں کے کھیتوں کو دیکھے جا رہے ہو۔ یہ کھیت تمہارے ہیں۔ تم نے ان کا سودا کیا ہے۔ صدیوں پہلے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم صدیوں سے ان کی رکھوالی کرتے آئے ہیں۔ لوگ میرے بابا کو پاگل کہا کرتے تھے۔ اس لئے کہ اُسے ان کے پک جانے کا یقین تھا۔ لوگ مجھے پگلی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ میں بھی اس بات پر یقین رکھتی ہوں — پاگل باپ کی پاگل بیٹی۔ لیکن تم ہی بتاؤ — کیا میں پاگل ہوں؟ کیا میرا بوڑھا بابا پاگل تھا؟ تمہیں "چاندنی کی پری" کی قسم — تم کیسے عاشق ہو؟ اپنی محبوبہ کے لئے مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ شاید تم بھی مجھے پگلی سمجھتے ہو۔ تمہارا اس میں کیا قصور — اس دنیا اور اس میں بسنے والوں کی یہی ریت ہے۔

بابا کہتے تھے کہ لوگ تمہیں بھی پاگل کہا کرتے تھے۔ اس لئے کہ تم نے ان لرزتے پانی کے قطروں کو موتی سمجھ کر سودا کیا تھا۔ دنیا والے سونے اور چاندی کو ہی اصلی موتی کہتے ہیں۔ جس سونے اور چاندی سے وہ تمہارے ان موتیوں کے کھیتوں سمیت ساری دنیا کو خرید سکتے ہیں۔ یہی سونا اور چاندی اُن کی بہو بیٹیوں میں موتی کی سی چمک دمک پیدا کر دیتا ہے جس ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر وہ باطن کی سیاہیوں کو دیکھ نہیں پاتے۔

سچ مانو "میاں ڈل" یہ وہ موتی ہیں۔ جو چند آدمیوں کو نہیں، لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں۔ ان موتیوں میں کیا ہی ڈل میں بسنے والے لوگ اصلی موتیوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خواب حقیقت نہیں بن پاتے۔ اس لئے کہ جب یہ موتی پک جاتے ہیں۔ تب اُن کی آنکھوں کی بینائی اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ دیکھ نہیں پاتے۔ اُن کے ہاتھ اتنے کمزور ہوتے ہیں، کہ وہ انہیں سمیٹ نہیں سکتے۔ میرے بوڑھے بابا نے بھی تمہارے ان موتیوں کے میرے لئے خواب دیکھے تھے۔ پیدا ہونے سے جوان ہونے تک اُس نے لاکھوں بار میری مانگ ان موتیوں سے بھری۔ ان موتیوں سے میرے فرن کے پیوند ستیا رہا — لیکن ان موتیوں میں وہ چمک پیدا نہ کر سکا۔ جو کسی کی آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ اپنے اس موتی کے لئے کوئی خریدار پیدا نہ کر سکا۔ سوداگر اب بھی ہیں، سودا اب بھی ہے۔ لیکن کوئی خریدار نہیں۔ کوئی "میاں ڈل" نہیں جو ان موتیوں کا مول جانتا ہو۔ کون جانے کہ تم جیسا "میاں ڈل" بھی غفار راہانجی کے اس موتی کا خریدار بن سکتا ہے یا نہیں!؟

"میاں ڈل" میرا بابا بھی تمہاری طرح ایک وصیت چھوڑ کر چل دیا۔ بابا کی وصیت تھی کہ مجھے وہاں دفنایا جائے

جہاں سے میں "میاں ڈل" اور ڈل دونوں کو دیکھ سکوں اور بابا نے کہا تھا کہ میں جب پیدا ہوئی۔ تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اُس نے مجھے "محنتہ" نام دیا تھا۔ جوان ہونے تک میں "محنتہ مال" موتیوں کی مالا بن گئی۔ تب بابا نے میرا نام بدل کر "مالا" رکھا اپنی اس "مالا" کے لئے وہ اس شہزادے کو ڈھونڈتا رہا۔ جو مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے جاتا۔ لیکن کوئی شہزادہ نہیں آیا۔ بھلا تم ہی بتاؤ۔ ان کچے موتیوں کی مالا کو کون اپناتا۔ جن کچے موتیوں کا اس دُنیا میں کوئی خریدار نہیں، بوڑھا بابا اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکا۔ ان دُنیا والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُوٹھ گیا۔ میں اپنے شہزادے کو ڈھونڈتے نکلی۔ کہیں نہ ملا۔ حالاں کہ میرے بابا نے کہا تھا کہ ضرور ملے گا۔ میں "محنتہ" سے "مالا" بنی۔ اب "مالا" سے "پگلی" ہو گئی۔ لوگ میرے سبھی پرانے نام بھول گئے ہیں۔ سبھی مجھے "پگلی" کہتے ہیں۔ کون جانے مرنے تک اور کتنے نام اپناؤں گی۔ "مالا" میں اب بھی ہوں۔ جانتے ہو کونسی "مالا" اپنے ہی آنسوؤں کی مالا۔ جو آنسو آنکھوں سے موتی بن کر نکلتے ہیں۔ لیکن چھو جانے پر پانی کے قطروں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ کنول کے پتوں پر بکھرے موتیوں کی طرح، جو ہاتھ لگاتے ہی پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

جب میں چھوٹی تھی تو بابا مجھے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اُس کی آنکھیں ہمیشہ سلیمان کی اور دیکھتی رہتیں۔ میں نے بابا سے پوچھا تھا۔

"بابا سلیمان پہاڑی کی طرف تم ہر وقت کیا دیکھتے رہتے ہو؟"

وہ جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہتے۔

"میاں ڈل کو دیکھ رہا ہوں بیٹی"

"میں تو تمہارے نام پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اس لئے کہ میں جب سے پیدا ہوئی تھی۔ تو ایک ہی ڈل کو جانتی پہچانتی تھی۔ جس ڈل میں ہمارا نیا نیا ڈونگا تھا۔ جس میں سے ہر وقت دیودار کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہمارا ایک سجا سجایا شکارا بھی تھا۔ جس میں میرے بابا لوگوں کو تمہارے موتیوں کے کھیتوں کی سیر کراتے۔ جب رات کو بابا اپنا شکارا لے کر واپس آتا اور چولہا پھونکنے میں لگ جاتا۔ میں چپکے سے شکارا لے کر تمہارے ان موتیوں کے کھیتوں کو دیکھنے جاتی۔ میں نے کئی بار انہیں اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ چھو جانے پر پانی پانی ہو جاتے۔ مسکراتے ہوئے کنول مجھے باز رکھنے کی کوشش میں سرگوشیاں کرتے۔ غصے سے لال ہو جاتے۔ لیکن جوں جوں میں جوان ہونے لگی۔ بوڑھے بابا کے ہاتھ شکارا کھیلنے کے بدلے مجھے مضبوطی سے پکڑتے رہتے۔ اُس کی آنکھیں تمہاری طرف دیکھنے کی بجائے مجھ پر نگاہ رکھتیں۔ جیسے میں کوئی موتی تھی، اور مجھے کوئی اُٹھا لے جانے کی تاک میں تھا۔ لیکن وقت کے بڑھاپے کے ساتھ ساتھ بابا کی جوان مضبوط باہیں کمزور ہوتی گئیں۔ اس کے چہرے کے تناؤ میں جھریاں پیدا ہو گئیں۔ ہمارے ڈونگے کی بوسیدہ گھلاڑی تختیاں چرچرانے لگیں، اور

ایک دن ہمارا ڈونگا، میرا ہی ایک فرن بن گیا۔ جس میں دوسرے ہی رنگ، کے پیوند تھے۔

جانے دو، پرانی باتیں ہیں۔ بابا کے بڑھاپے اور صورت، سے بھی پرانی۔

مجھے شہزادوں کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ بابا کہتے کہ مجھے بھی کوئی شہزادہ آ کر ڈولی میں بٹھا کر لے جائیگا۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ اور کہانی سنتے سنتے میں بوڑھے بابا کی گود میں سو کر سپنوں میں کھو جاتی۔ اپنے شہزادے کی تلاش کرتی رہتی۔ اُسے میں نے بارہا سپنوں میں دیکھا۔ لیکن جب میری جاگ کھلتی۔ تو وہاں کوئی شہزادہ نہ ہوتا۔ سرد تاریک راتوں کی یخ بستہ ہوائیں اور بابا کی پھٹی پرانی پھو کی گود!

میں بابا سے پوچھتی۔

"تو میاں ڈل کس شہزادی کو ڈولی میں بٹھا کر لے گیا؟"

"میاں ڈل! شہزادے کو ڈل کی ایک پری نے دیوانہ بنا دیا۔"

"تو کیا ہمارے اس ڈل میں پریاں بھی ہوتی ہیں؟"

"بابا مجھے گم سُم دیکھتے۔ جیسے میں بھی کوئی پری تھی۔ جیسے میں نے بھی کسی "میاں ڈل" کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ بابا پری محل پر نظر ٹکائے کہتے۔

"ہاں! وہ سامنے پری محل سے پریاں اتر کر ڈل میں نہاتی ہیں"

میں مچل اٹھتی۔ بابا مجھے بھی پریاں دکھا دو۔ بابا مجھے دیکھتے دیکھتے جیسے کھو جاتا۔ پھر مجھے گود میں لے کر لاکھ لاکھ پیار کرتا ہوا کہتا۔

"ایک دن جب پری محل کے پہاڑ کی چوٹیوں کی اوٹ سے چاند نکلا۔ تو سارا ڈل شفاف چاندنی کی پھوار میں سیم تن کنول کی گلابی مسکراہٹیں لئے جھومنے لگا۔ کنول پر سیمابی قطرے لرزتے ہوئے چمکنے لگے۔ تب برفانی پریوں کے ساتھ، "چاندنی کی پری" ڈل میں اُتر کر نہانے لگی۔ آس پاس کہیں "میاں ڈل" دیکھ رہا تھا۔ وہ "چاندنی کی پری" کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔

"وہ پری کیسی تھی بابا؟"

"بالکل میری 'مختہ' جیسی"

"میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔ لیکن جب میں بچی سے جوان ہوئی۔ تو ان باتوں کو یاد کر کے اپنے آپ شرما جاتی۔ سپنوں میں کھو جاتی۔ جہاں میں "چاندنی کی پری" ہوتی۔ اور ساتھ کہیں "میاں ڈل" کی نظریں مجھے گھورتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

بابا حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہتے۔

"میاں ڈل" نے "چاندنی کی پری" سے کہا۔ "آؤ میں تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جاؤں گا"

میں پوچھتی

"چاندنی کی پری" نے کیا جواب ؟"

اُس نے کہا کہ مجھے کیا دو گے ؟ "میاں ڈل" نے کہا کہ میں تمہیں سونے اور چاندی کے زیوروں سے لاد دوں گا۔ اور تمہیں چاندی کی ڈولی میں بٹھا کر لے جاؤں گا ۔۔ وہاں، جہاں سونے سے بنے ہوئے محل ہیں ۔۔ نوکر اور باندیاں ہیں۔ تب "چاندنی کی پری" نے کہا۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیئے ۔۔ پھر کیا چاہیئے ؟ "چاندنی کی پری" نے کہا۔ "مجھے اِن کنول کے پتوں پر لرزتے موتیوں کی مالا چاہیئے۔" میاں ڈل" نے کہا۔ ایک مالا کیا، یہ تمام کے تمام کھیت تمہارے لئے خریدتا ہوں "میاں ڈل" نے موتیوں کے یہ کھیت خرید لئے اور نوکروں کو حکم دیا کہ ان کی مالائیں بناؤ، اور "چاندنی کی پری" کی خدمت میں پیش کرو۔

لیکن موتی، کنول کے پتوں پر بارش کے قطرے تھے۔ شبنم کی بوندیں تھیں سیمابی فطرت تھی۔ کون پکڑتا ۔ کون اپنے بس میں کرتا !؟

جب "میاں ڈل" اِن موتیوں کی مالا نہ بنا سکا۔ تب "چاندنی کی پری" واپس اپنے چاند کی بستی میں چلی گئی۔ "میاں ڈل" نے اُسے بہت روکنے کی کوشش کی۔ جب "میاں ڈل" کہ "چاندنی کی پری" نے روتے دیکھا تو اُس کا دِل پسیج گیا۔ اور "میاں ڈل" سے کہا۔ تمہاری میں ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ تم مالا نہیں بنا سکے۔ جو میرے باپ نے میری قیمت رکھی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کر سکتی ہوں کہ چاندنی راتوں میں تمہیں دیکھنے آیا کروں گی۔ جب کبھی یہ موتی پک جائیں اور تم ان کی مالا بناؤ۔ میں تمہاری ہو جاؤں گی۔" میاں ڈل" اِن موتیوں کے پک جانے کے انتظار میں وہیں ڈونگے میں بیٹھا رہتا۔ اور چاندنی راتوں میں "چاندنی کی پری" کے دیدار کے لئے منتظر رہتا۔ اور ایک دن اپنے ارماں اور حسرت لئے "میاں ڈل" مرگیا، اور مرتے وقت ایک وصیت چھوڑ گیا۔ مجھے سلیمان کی پہاڑی کے اوپر دفنا دینا۔ میرا منہ کعبے کی بجائے ڈل کی طرف کرنا۔ تاکہ اِن کچے موتیوں کو پکتے ہوئے دیکھ سکوں۔

"یہ میرے بوڑھے بابا کی باتیں ہیں۔ تمہاری موت میں اُس کی موت کی باتیں ہیں ۔۔ میں سُن کر رو اٹھی۔ اب بھی روتی رہتی ہوں۔ نہ جانے کیوں؟"

"لیکن بچی سے جوان ہونے تک میں بابا سے ہر وقت یہ سوال کرتی"

"بابا یہ موتی کب پک جائیں گے؟"

بابا ہمیشہ اس سوال پر مسکرا دیتے۔ اور دُور کہیں خلاؤں میں اُس کی نظریں گھورتی رہتیں۔ اس کی سوچیں گہرائیوں میں جیسے ڈوب جاتیں۔

اب میں بچی نہیں، جوان ہوں — مجھے سوچنے اور سمجھنے کی تمیز ہے۔ وہ "چاندنی کی پری" میری ہی ایک بہن تھی۔ میری ہی جیسی ایک مالا تھی — جو ان موتیوں کے کھیتوں میں پیدا ہوئی۔ اور ان میں ہی مری۔ جس نے پشت در پشت سونے اور چاندی کو لٹتے دیکھا۔ اُس کے پیچھے پنہاں سیاہیوں کو دیکھا۔ جو سونے اور چاندی کی چمک دمک ختم ہونے کے ساتھ اُبھرتی ہیں۔ اور وہ آنکھیں بھی دیکھیں، جو ہر قدم پر بجھ جاتیں۔ اور وہی آنکھیں تھیں جو پھر بھی جاتیں۔ شوخ جوانی پری محل کے کھنڈروں کی طرح ویران ہو جاتی۔ تمہاری "چاندنی کی پری" نے بھی اپنے بابا سے کہانیاں سنی ہوں گی۔ وہ کہانیاں، جہاں لاکھوں چاندنی کی پریاں سونے اور چاندی سے تولی جاتیں اور گاجر مولی کے داموں فروخت ہوتیں۔ اس نے اُن آنکھوں کی کہانی بھی سنی ہوگی جن سے موتی جھڑتے اور لوگ انہیں آنسو کہہ کر قہقہے لگاتے۔ اُن پازیبوں کی داستان سنی ہوگی جن کی چھنچھناہٹ اُبھر کر چند لمحوں کے بعد ہی ڈوب جاتی ہے۔ تمہاری "چاندنی کی پری" ویسی ہی ایک پری تھی۔ اُن کی ہی ایک بہن تھی۔ جیسی تو اُس نے کچے موتیوں کو سونے اور چاندی پر ترجیح دی۔ اس لئے کہ ان موتیوں میں چمک ابھری ہے۔ ایسے لوگوں کو دُنیا پاگل کہتی ہے۔ تمہیں اور مجھے پاگل کہتی ہے۔ لیکن ایک دِن جب یہ موتی پک جائیں گے اور تم ان کی مالا بنا کر "چاندنی کی پری" کے گلے میں پہناؤ گے۔ اور یہ "مالا" بھی اپنے سپنوں کے شہزادے کی مالا بن جائے گی۔ تب وہ ہمیں پاگل کہنا چھوڑ دیں گے۔ کہتے چھوٹے منہ کی ایک بڑی بات ہے۔ اور لوگ مجھے پگلی کہتے ہیں۔ کیوں کہ تم نہیں ہو۔ میرا بابا نہیں ہے۔ میرا شہزادہ تو ابھی شائد پیدا بھی نہیں ہوا!

کائنات کی ہر دھڑکن سو رہی ہے۔ "میاں ڈل" تم بھی سو جاؤ۔ صدیوں سے تمہاری یہ آنکھیں سونے کے لئے ترس رہی ہیں۔ جب یہ موتی پک جائیں گے تو میں تمہیں آواز دے کر جگا دوں گی۔ کل جب "چاندنی کی پری" کو دیکھ لوگے۔ تو اُسے یہ نہ کہنا کہ تم "چاندنی کی پری" نہیں۔ تم بھی ایک "مالا" ہو۔ "ڈل کی مالا"۔ ڈل کی مالا کی صدیوں پرانی ایک بہن۔ تمہارے باپو نے تمہاری قیمت کچے موتیوں کی مالا رکھی ہے۔ یہ "مالا" اپنے آنسوؤں کی مالا بنا کر اُس سپنے کے شہزادے کا انتظار کرتی ہے۔ جو کبھی نہ کبھی آئے گا۔ جس کا اُسے یقین ہے۔ جیسے "میاں ڈل" کو ان موتیوں کے پک جانے کا یقین ہے۔ اور اسی یقین میں میرا مستقبل ہے تمہاری مضطرب آنکھوں کی موت ہے۔ اور میرے نا اُمید بابا کی اُمید ہے۔ اور میں زندہ رہوں گی۔ جب تک تمہارا مستقبل تمہاری موت، میرے بابا کی اُمید، اپنی منزل کو نہیں پا لیتی۔ میں پگلی نہیں۔ مجھے پہچاننے والی آنکھیں پگلی ہیں!؟ — تب تک پگلی رہیں گی۔ جب تک "میاں ڈل" اپنی قبر میں سے اُٹھ کر کسی شہزادے کا روپ دھارن کر کے میری جیسی بھٹکی بھٹکی پری کا ہاتھ تھامنے نہیں آئے گا!؟ شہزادہ

نشور واحدی

غزل

ظلمتِ شام کا چرچا ہی رہے گا کچھ دِن
چاند ڈوبا ہے اندھیرا ہی رہے گا کچھ دِن

چھا گئے کہنہ خیالات کے بادل ہر سُو
صبح تا شام دھندلکا ہی رہے گا کچھ دِن

آستیں کام نہ آئے گی نہ دامن کوئی
اشک پلکوں پہ لرزتا ہی رہے گا کچھ دِن

ہم نوا زیست کا مِلتا ہے کہیں صدیوں میں
آدمی جگ میں اکیلا ہی رہے گا کچھ دِن

چلتی راہوں میں یُوں ہی پھول نچھاور ہونگے
یُوں ہی آرام کا دھوکا ہی رہے گا کچھ دِن

ختم اِک دور ہوا، دوسرے دَور آنے تک
سانس رُک جانے کا دھڑکا ہی رہے گا کچھ دِن

ہم سفر پہنچ کے سو جائیں گے ہر منزل پر
کارواں زیست کا لُٹتا ہی رہے گا کچھ دِن

غم بھی کھانا کوئی چاہے تو نہ ممکن ہو گا
آدمی دہر میں بھُوکا ہی رہے گا کچھ دِن

رفتہ رفتہ کہیں اُٹھ پائے گا سُورج سے نقاب
چھٹکے تاروں کا سہارا ہی رہے گا کچھ دِن

اس اندھیرے میں دیا کوئی ہے درکار نشور
دِل جسے کہتے ہیں جلتا ہی رہے گا کچھ دِن

نیلامبرہ بو شرما ڈپٹی سیکرٹری اکادمی

جموں میں اکادمی کی سرگرمیاں

(سرما کے پروگراموں کا ایک جائزہ)

سری نگر کی طرح اکادمی نے جموں میں بھی اپنے پروگرام ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اِس سال کے جاڑے میں اُس پر ہی عمل کیا گیا۔ کل ہند اُردو مشاعرہ، مصوری کی نمائش، بچوں کے موقعہ پر ہی سنگیت اور مصوری کے مقابلے، تو اُسی رنگ کے پروگرام تھے، جن کا مظاہرہ سرینگر میں بھی کیا گیا تھا۔ لیکن اِن کے علاوہ کچھ ایسے پروگرام بھی پیش ہوئے جو رنگینی کے ساتھ ساتھ تنوع بھی رکھتے تھے۔ دو ڈرامے کھیلے گئے۔ جن کا اہتمام بالترتیب سناتن دھرم ناٹک سماج اور جموں کلا مندر نے کیا تھا۔ اگرچہ اِن ڈراموں کی تحریک اکادمی نے کی تھی۔ لیکن سٹیجنگ، سیٹ اور دوسرے لوازمات میں اِن کے تمام انتظامات اِنہی کلبوں نے انجام دیئے۔ صرف دعوت نامے اکادمی کی طرف سے جاری کئے گئے۔ یہ ایک بہت ہی خوشگوار تجربہ تھا کیونکہ اِس طرح سے پہل کا موقع کلبوں کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اور یہ بات ریاست میں تھیٹر کے فروغ کے لئے کافی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک ڈوگری مشاعرے کا انتظام بھی کیا گیا۔ دعوت نامے جاری کئے گئے۔ اور ڈھنڈورہ پیٹ کر بھی اعلانات کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی بھون شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نظموں کا معیار بڑا ہی اعلیٰ تھا اور سامعین نے مناسب موقع پر داد دی۔ سری نگر میں منعقد شدہ ہلکے پھلکے سنگیت کنسرٹ کے برعکس جموں میں کلاسیکل موسیقی کا کنسرٹ منعقد کیا گیا۔ اِس میں بمبئی کے پنڈت حسن لال، جالندھر کے ایس سوہن سنگھ، شری کندن لال اور شری مدن لال جیسے موسیقاروں نے شرکت کی۔ کندن لال اور مدن لال نے اپنے کمالات کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ لیکن پنڈت حسن لال اور ایس سوہن سنگھ نے ایک ملکوتی سماں باندھ دیا اتنی پیرانہ سالی کے باوجود ایس سوہن سنگھ کے ضبط اور جادو کا عالم بے پناہ ہے۔ پنڈت حسن لال نے اپنے وائلن اور آواز دونوں سے طلسمی کیفیت پیدا کی۔ انہوں نے اِس بات کا پورا ثبوت دیا کہ وہ کتنے اعلیٰ فن کار ہیں اور ایک باکمال فن کار اپنی آواز اور سازوں کے امتزاج سے کیا قیامت بپا کر سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کے کلاسیکل سنگیت جو کبھی عالم جدائی میں لے جاتا ہے اور کبھی آزادی کی پرواز پر مائل کرتا ہے کے کھرے ترجمان ثابت ہوئے۔ جوگ راگ کی نازک کیفیات کو انہوں نے لے

انتہائی استادانہ مہارت سے بازتخلیق کی۔

۲۷ رجنوری کی شام بڑی سرد تھی۔ لیکن سامعین وجد کے عالم میں مست رہے۔ کلاسیکل سنگیت کا ذوق رکھنے والے اپنے چہیتے فنکاروں سے سنگیت کا آخری جرعہ پینے تک وہیں ڈٹے رہے۔

میسور کے تمدنی وفد نے بار تقریبات پر اپنا کمال دکھایا۔ دو مرتبہ جموں میں اور ایک ایک بار ادھم پور اور کٹھوعہ میں؛ یہ وفد اسی سکیم کے تحت جموں آیا۔ جس کے تحت اس سے قبل منی پور کا تمدنی وفد سرینگر آیا تھا۔ منی پوری وفد کا جوہر منی پوری رقص کے کلاسیکل پہلوؤں میں کھلتا تھا۔ ان رقصوں میں نفاست اور نزاکت، اسلوب اور تنوع کا نادر امتزاج تھا۔ لیکن میسور کے تمدنی وفد کا سرمایۂ ناز اس ریاست کی لوک روایات تھیں۔ بھارت ناٹیم، تلانا اور ایلار پو کے مظاہرے بھی کئے گئے لیکن سامعین پر جن چیزوں نے اثر کیا۔ وہ لوک گیت اور لوک ناچ تھے۔ "یکھشا گان" نے سامعین کو جیسے میسور کی شام سے لطف اندوز کر دیا۔ جہاں کالی اور ستاروں بھری راتوں کے وقت لوگ مہابھارت اور رامائن کے قصوں کو دیکھنے، سننے کے لئے آگئے ہوں۔ یکشا گان کے کاسٹیوم اور اس کا اسلوب جنوبی ہند کے مشہور رقص۔ کتھاکلی سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن یہ بھارت ناٹیم شاستر کے تمام لوازمات بھی پورا کرتا ہے۔ اس میں رعنائی ہے۔ اس میں حرکت ہے اور اس میں مکالمات اور بول چال ہے۔ کتھاکلی بھاؤ یا اداؤں کی زیبائی سے معمور ہے۔ لیکن اس میں بول چال کا امکان نہیں۔ تقریر کی اس کمی کو "بھینیا" سے پورا کیا جاتا ہے۔ شیطانی رقص نے ہمیں میسور کے اس دور افتادہ گاؤں میں پہنچا دیا۔ جہاں خبیث روح ایک خدا دوست کی روح کو مغلوب کرنا چاہتی ہے۔ لیکن آخر پر قابو میں کر لی جاتی ہے۔ ان کے سازوں اور ڈھولوں کی تکنیک سے ہمیں جموں کے اسی قسم کے لوک ساز یاد آگئے۔ "چھاتنا" "کرکھا" اور اس قسم کے دوسرے ناچوں سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان اور خاص طور جنوبی حصے کے رقصوں، لوک آرٹ اور تمدن میں مذہب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

گویوں نے اس سلسلے میں جو پروگرام پیش کئے۔ انہیں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان گلوکاروں میں خاص طور، منگلا جیا اور سری نیش کے نام قابل ذکر ہیں۔ منگلا کی آواز میں وہ رس اور لچک ہے۔ جو ہندوستان کے چوٹی کے پیشہ ور موسیقاروں میں سے خال خال ہی کسی کو حاصل ہے۔ جس ادا سے وہ ایک سُر سے دوسرے سُر کا فاصلہ طے کرتی پیار ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی منزل پھاند لیتی۔ وہ بے حد فطری اور ہموار تھا۔ گاؤں کی دوشیزاؤں کا کھورا مزاج، معصومانہ سادگی اور دلربائی اس کی آواز سے بخوبی آشکار ہو جاتی تھی۔ جیا کی بھی بے حد لوچ دار آواز تھی اور کلاسیکل سنگیت میں تو وہ منگلا سے ایک قدم آگے نکل جاتی تھی۔ سری نیش جس طریقے سے تن تنہا محفل کو مسحور کر سکتا۔ وہ بھی قابل تحسین تھا۔ ٹروپ لیڈر شری ایم ایس نٹراجن واقعی مبارک باد کے مستحق تھے۔

لیکن جموں کے پروگرام کا نقطۂ عروج بھارت ناٹیم اور کچی پوڈی کی ترجمان رقاصہ یامنی کرشنا مورتی کے ناچ تھے۔ جب اس نے ۱۹۶۲ء میں سرینگر کے ٹیگور ہال میں رقص کے تین اعلیٰ مظاہرے کئے۔ تو سامعین پر اس کے فن کا جادو چل گیا تھا۔ جن.. لوگوں نے اس کے رقص کا مشاہدہ کیا تھا۔ ان کا متواتر مطالبہ یہ تھا کہ اسے پھر مدعو کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس کے فن کا پھر سے لطف لینا چاہتے تھے۔ جن لوگوں نے یہ مظاہرے دیکھے نہیں تھے، مگر ان کے متعلق سنا تھا۔ وہ تو اور زیادہ اصرار کر رہے تھے۔

جموں میں ایک اچھے ہال کی عدم موجودگی کھٹکتی ہے اور اس کی وجہ سے ثقافتی تقریبات میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جموں میں اب وکرم سنگھ میموریل ہال تعمیر کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک یہ مکمل نہ ہو، سنگیت اور ناٹک پریمیوں کو دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یامنی ہندوستان کے اعلیٰ پائے کے فنکاروں میں سے ایک ہے۔ اور اس کے فن سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایک اچھے ہال اور اچھے سٹیج کی سہولت فراہم کی جائے۔ ہم نے میسرز کے سی تھیٹرز سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے اپنے یہاں یہ تقریب منعقد کرنے کی رضامندی دکھائی۔ لیکن اگرچہ ان کے پاس بڑا عمدہ آڈیٹوریم ہے۔ لیکن فنکار کے نقطۂ نگاہ سے ان کا سٹیج اس قدر اعلیٰ نہیں۔ اور جس صورت میں یہ سٹیج تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی توسیع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کھلی فضا میں اس قسم کے فن کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔ کوئی کرے تو کیا کرے ؟

صدر ریاست کی ذاتی مداخلت پر ہمیں شنکر تھیٹر فراہم کیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۲ مارچ کو کیا گیا۔ ۲۴ اور ۲۵ مارچ کو رقص پیش کیا جانے والا تھا۔ اسی دوران ہزاروں کارڈ چھاپنا اور تقسیم بھی کرنا تھے۔

شنکر تھیٹر میں سٹیج کے بارے میں وہی مشکل پیش آئی۔ جو کے سی تھیٹر میں پیش آئی تھی۔ لیکن یہاں کے سٹیج کی ایک خوبی یہ تھی کہ اسے وسعت پذیر کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ بناؤ سنگار کے لئے ایک کمرہ بھی تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ سٹیج کو وسعت پذیر کرنے کا کام یا تو شو دکھانے سے پہلے کرنا تھا۔ یا رات کے وقت۔

اس لئے معمار اور ترکھان کام پر لگائے گئے۔ لکڑی کے سلیپر کرائے پر لائے گئے اور رات کے دوران ہی ۳۰' × ۲۰' سٹیج تیار کیا گیا۔ ایک اور مسئلہ پیدا ہوا۔ تھیٹر کے تیسرے درجے کو رقص کے لئے پہلے درجے میں تبدیل کر دینا تھا۔ لکڑی کی کرسیوں کی نو قطاریں اٹھا دینا پڑیں، اور وہاں صوفے اور آرام کرسیاں بچھائی گئیں یہ اور اسی قسم کا سارا کام صرف تھیٹر کے مالکوں کے اور سٹیج کے ماہر شری دھیان سنگھ کے تعاون سے ہی ممکن ہو سکا۔ ہمارے پاس جو فرمائشیں آئیں۔ ان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم نے جتنے لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ یا ہال میں جتنے لوگ سما سکتے ہیں۔ اس سے کئی زیادہ لوگ آنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہم نے کوئی ۱۱۵۰ آدمیوں کے لئے انتظام کیا تھا اور ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جو لوگ دیکھنے کے لئے آئے۔ ان میں صدر ریاست اعلیٰ سول

اور فوجی افسران، تمدنی جماعتوں کے نمائندے، صحافی، اُستاد، ڈاکٹر اور زندگی کے دوسرے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔

یامنی کے پتا مسٹر کرشنا مورتی نے اپنی بیٹی اور اُس کی بہن جیوتشمتی کرشنا مورتی، جسے لارڈ سے جیوتی کہہ کر پکارا جاتا ہے کا تعارف کرایا۔ وہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ گئے تھے۔ جہاں اُن کی بڑی سراہنا ہوئی۔ یامنی کو آسٹریلیا میں ساحرہ کہہ کر پکارا جاتا تھا اور اُس کی بہن کو اُس کی اپسراؤں جیسی آواز پر داد ملی تھی۔ اور یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یامنی کے بارے میں وہی کہا جا سکتا ہے۔ جیسا قیصر نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

"میں آیا... میں نے دیکھا... اور میں نے فتح کیا"

اُس کی چال میں رعنائی، اُس کی حرکات میں لچک اور اُس کی اداؤں میں سحر ہے۔ وہ "ستیم، شیوم، سندرم" (حق حسین ہے۔ اور آرٹ حق کی تلاش ہے۔ اس لئے آرٹ حسین ہے) کا پیکر زیبا ہے۔

دوسرے دن ہجوم پہلے دن سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ یوں کہئے کہ دروازے تک سلامت نہیں ہے۔ ہال کی فضا میں گھٹن تھی۔ لیکن اُس سے ناظرین متاثر نہ ہوئے اور نہ رقاصہ پر کوئی ناخوشگوار اثر پڑا۔ ایک عظیم فن کار اپنے ماحول کی حدود کی تسخیر کر لیتا ہے۔ یہی یامنی نے بھی کیا۔ وہ ایک ایسی اپسرا لگ رہی تھی۔ جو آسمان کی بلندیوں سے زمین پر اُتر آئی ہو اور اس سُتھرے رقص کا لطف اُس کی بہن کی کوئل جیسی آواز سے دوآتشہ ہو جاتا تھا۔ یامنی نے اپنی بہن جیوتی کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے۔

"جیوتی (روشنی) کے بغیر میں ہمیشہ کے لئے یامنی (رات) ہی بن کر رہ جاتی" اُن کے باپ مسٹر ایم کرشنا مورتی، جو خود.. انگریزی اور سنسکرت کے پروفیسر ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور ایک دلربا شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ رقص کے دوران مختلف حرکات اور کیفیات کی جو تشریحیں کرتے ہیں۔ وہ شعریت میں اس قدر شرابور ہوتی ہیں کہ اُن سے کیف کا عالم اور گہرا ہو جاتا ہے یامنی کچی پودی کے عظیم ترین فنکاروں میں سے ایک ہے۔ مگر اُس کی عظمت کا راز صرف پُرانی روایات کے ساتھ بندھے رہنے میں نہیں ہے۔ اُس کی اصل عظمت یہ ہے کہ وہ پُرانے خول توڑ کر باہر آئی ہے اور اُس نے چند جدتوں کو پیش کیا ہے اور ان جدتوں سے رقص پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا ہے۔ بلکہ اُس کی معنویت دوچند ہو گئی ہے۔ اور ایسی سٹائل میں وہ صنم گری کے روپ دھارتی ہے اور دیکھنے والے کو جگن ناتھ پوری بھونیشور اور کونارک کی سنگ تراشی یاد آ جاتی ہے یامنی ہر رقص کی موزونیت سے جس طور ڈھل جاتی ہے۔ وہ حیرت ناک ہے۔ جس بھاؤ کی اُسے ترجمانی کرنی ہوتی ہے۔ وہ اُس کی رُوح بن کر جلوہ آرا ہو جاتی ہے۔ سنگ تراشی کو منجمد موسیقی کہا گیا ہے۔ لیکن یامنی اپنے فن کے

جوش اور حرکت سے اس میں ارتعاش پیدا کرتی ہے اور یہ ایک ندی کی طرح خرام میں آجاتی ہے۔ یہ اُس کے فن کا اعجاز ہے کہ گفتار کی عدم موجودگی میں اور نامانوس سنگیت کی رفاقت میں وہ اپنے فن کو انسانی آتما کا اِتنا قابلِ فہم اظہار بنا دیتی ہے انہی خوبیوں کی وجہ سے وہ جموں نواسیوں کی آنکھ کا تارا بنی اور لوگ بار بار اُس کے فن کا لطف لے کر بھی سیر نہ ہوئے۔
اس چھوٹے سے مضمون میں تمام سرگرمیوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ یہ تو محض چند موٹے موٹے تاثرات کو یک جا کرنے کی ایک کوشش ہے اور بس!

غیر طلبیدہ مضامین کے لئے واپسی کے ٹکٹ اور لفافوں کا آنا لازمی ھے۔ دوسری صورت میں انہیں واپس کرنے کی ذمہ داری نہیں لی جاتی ھے

(مدیر)

نثار عزیز — ایک تعارف

۱۹۴۷ء ریاست کی تاریخ میں ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال کے بعد جو اہم تبدیلیاں ریاست میں رُونما ہوئیں، ان کے گہرے اثرات فن اور ادب نے بھی قبول کئے۔ زمانے کا رُخ بدل جانے سے پُرانی قدریں بدل گئیں اور نئی قدروں نے جنم لیا۔ شاعر اور مصوّر نئے معیار سے آشنا ہوئے۔ زبان و بیان میں تبدیلی آئی۔ پُرانا لب و لہجہ بدل گیا۔ جہاں شعر و ادب میں غزل کی جگہ نظم، نظم معرّا یا دوسرے اصناف نے لی وہاں مصوّری میں بھی ایک عظیم انقلاب آیا۔ پُرانے انداز بدل گئے۔ نئی تنقید کے ساتھ نئے انداز سامنے آئے۔ حقیقت پسندانہ Realistic آرٹ کی جگہ ماڈرن آرٹ نے لی۔ نہ صرف ہمارے پُرانے فن کار ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بلکہ شاعروں اور مصوّروں کا ایک نیا ہجوم اُبھرنے لگا۔ مصوّر نثار عزیز کا تعلق اسی ہجوم سے ہے۔ نثار فن کے میدان میں آج بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس وجہ سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

نثار فطری طور پر بہت ملنسار اور رواداری واقع ہوئے ہیں۔ مزاج میں شہزادوں کی سی شوخی پائی جاتی ہے۔ صورت سے کوئی بہت بڑے جوہری معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا ان سے دل مل جائیے، آپ فوراً ان کی اصلی معصوم صفت شخصیت سے واقف ہو جائیں گے۔ نثار فطرتاً ایک مصوّر ہے جس کے جسم میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے —— نثار کا بچپن اور عنفوانِ شباب کافی لاڈ پیار میں گزرا۔ غالباً اسی چیز نے انہیں علومِ مروّجہ میں منتہی نہ ہونے دیا۔ کالج کی منزلوں تک پہنچنے سے بہت پہلے درس و تدریس کا سلسلہ ترک کرنا پڑا۔ والدِ

بزرگوار کا خیال تھا کہ بیٹا بڑا ہو کر باپ دادا کی طرح تجارت کا پیشہ اختیار کرے گا، لیکن بیٹے کی توجہ اس طرف مائل نہ ہو سکی۔

۱۹۴۵ء میں نثار کے ساتھ ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا۔ اچانک ایک دن فٹ بال کھیلتے کھیلتے ان کی ایک ٹانگ بُری طرح سے ٹوٹ گئی۔ دو تین مہینے ایک ہی جگہ رہنا پڑا اپنا پُرانا ہارمونیم تو تفریح کے لئے پاس تھا لیکن سُر اور تال کی بے خبری کی وجہ سے سہ ۔۔ رے ۔۔ گم ۔۔ کی عجیب و غریب آوازیں آخر کب تک ان کا دم بھرتی۔ ذہن میں بسا ہوا مصوّر اضطراب میں تھا۔ وہ ذہن کی سخت اور سنگین دیواریں پھاند کر باہر آنا چاہتا تھا۔ بس کیا ہوا ؟ ایک دن نثار کی نظر ایک تصویر پر پڑی۔ نہ جانے کیوں اس تصویر نے ان کا دِل موہ لیا۔ نثار نے بس یُوں ہی پنسل اُٹھائی اور اس کی نقل اُتارنے کی کوشش کی۔ دفعتاً اس کے دِل کی گہرائیوں میں بسا ہوا مصوّر کھِل اُٹھا۔ اور اسے یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی ایسے ہی رنگ و روغن کے زندۂ جاوید شہ پارے تخلیق کرے گا۔ اب تو تصویروں کی نقل اُتارنے کا شغل برابر جاری رہا۔ دن گذرتے گئے۔ کچھ مہینے بیت گئے۔ اب ننّھا مُنّا مصوّر چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ اسی دوران سر امر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا ایک پوسٹر نظر سے گذرا۔ آگے بڑھنے کی راہ دیکھ کر خوشی کی انتہا باقی نہ رہی۔ دوسرے ہی دِن انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل سے ملے اور ڈرائنگ اور پینٹنگ سیکھنے کے لئے داخلہ حاصل کیا۔ چار سال کی مکمل تربیت کے بعد یہ کورس پُورا ہوا اور نثار ایک سند یافتہ آرٹسٹ کی حیثیت سے مصوّری کے میدان میں داخل ہوا۔

نثار کی زندگی کا دوسرا اور ایک اہم دور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ نے ایک سرکاری مدرسہ میں معلّمی (آرٹ ٹیچر) کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن یہ پیشہ راس نہ آیا۔ ایک دو سال کی مُلازمت کے بعد اس عہدے سے مستعفی ہونا پڑا اور اپنی راہ بنانے کے لئے کمرشل پینٹروں کی جماعت میں داخل ہونا پڑا۔ غالباً یہ ۱۹۵۲ء کا وقت تھا۔ اس سال سے یکے بعد دیگرے سرینگر میں انجمن ترقی پسند مصنفین، اِنڈو آرٹسٹس ایسوسی ایشن، مجلسِ دانش وراں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نثار ایک سرگرم ممبر کی حیثیت سے ان میں برابر کام کرتا رہا۔ ان انجمنوں کی کوششوں سے دس بیس مصوّری کی نمائشیں سرینگر میں منعقد ہوئیں جو بلاشبہ

ایک بہت بڑا ثقافتی کارنامہ تھا۔ نثار عزیز ان میں برابر شرکت کرتا ہے اور دن بدن اپنے فن کو افکار اور عمل کی دلآویزی سے بساتا سجاتا آگے بڑھتا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں آپ نے پہلی بار ریاست سے باہر قدم رکھا۔ سرینگر سے دلّی پہنچا۔ دلّی سے بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ اپنے ہم عصر آرٹسٹ بنسی پارمو کے ساتھ یہاں آپ نے اپنی تصویروں کی نمائش دینے کا انتظام کیا۔ نمائش کامیاب رہی۔ کئی اخباروں اور رسالوں میں نقّادوں کی تنقید چھپ کر سامنے آئی۔ اپنی خامیوں اور انفرادی خوبیوں کی تفصیل دیکھ کر اس نوجوان آرٹسٹ کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یقیناً اگر کسی شاعر یا مصوّر کو اپنے ہم وطنوں کی بجائے دوسرے لوگ سراہیں تو یہ حقیقی معنوں میں دادِ تحسین سے کم نہیں ہوتا۔ اس دن سے اب تک اس نوجوان مصوّر نے فن اور عمل کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں نیشنل گیلری آف آرٹس نئی دہلی نے ان کی ایک تصویر خریدی۔ دوسری جگہوں سے بھی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء سے برابر ۱۹۶۴ء تک سٹیٹ کلچرل اکادمی سے ایوارڈ حاصل کیے جن میں دو بار پہلا انعام نصیب ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں محکمۂ مردم شماری میں آرٹسٹ کی عارضی اسامی پر ان کا تقرر ہوا۔ لیکن یہ ملازمت چند ناخوش گوار حالات کی وجہ سے پچھلے سال چھوڑنی پڑی۔ اُس دن سے اس دم تک گھر میں کام کر رہا ہے۔ اس سال بمبئی، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں اپنی تازہ تخلیقات کی نمائش کرنے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کام میں مصروف ہیں اور تن من دھن سے اس منصوبے کو کامیاب بنانے کی فکر میں ہیں۔

نثار نے اپنی مختصر زندگی میں بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ زندگی کی خوبصورت گھڑیاں، اس کی رعنائیاں، اس کے مُشکل ترین لمحات، دِل کش اور دِل خراش تجربات ——— غرض اسی اندھیرے اُجالے کا ایک عجیب طلسم ان کے فن میں آباد ہے۔ وہ اپنے موقلم سے رنگوں کی آمیزش اور نمائش کے علاوہ زندگی کے اہم مسائل حل کرنا چاہتا ہے۔ نثار کے فن کی وُسعت، اس کی گہرائی اور اظہار خیال کا اندازہ "فضیلت" (Perfection) "Mystrey at Sunset" "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں"۔ "چاند" "Contours of Existence" "اندھیرے اُجالے" "اُف! صبح آئی" وغیرہ تصویروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ نثار آرٹ اور مصوّری کی بڑی بڑی اصطلاحیں نہیں

جانتا۔ نہ اس معصوم صفت مصوّر نے مفروضہ اور غیر عملی باتوں سے کبھی دوسروں پر تسلّط جمانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے فن سے باخبر ہے اور اپنے کام کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عالمی سطح پر نمودار ہونے والے سنتوش کی منزل تک پہنچنے کے لئے ابھی اسے بہت محنت کرنی ہوگی۔ اُمید ہے کہ یہ تیس[۳] سالہ مصوّر اپنی باقی عمر میں نہ صرف یہ منزلیں طے کرے گا بلکہ فن کی دُنیا میں بہت دُور تک جائے گا۔ کیونکہ ع

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے (فیض)

کشمیری شاعروں کا انتخاب

اکادمی کی جانب سے کشمیری زبان کے مشہور شاعروں کو اُردو دُنیا سے متعارف کرانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان کتابچوں میں شاعر کی زندگی، اُس کے کلام پر تبصرہ، کلام کا مختصر انتخاب اور اُس کا اُردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اب تک اس سلسلے میں لل دید، حبّہ خاتون، پرمانند، مقبول شاہ کرالہ واری، رسول میر، شمس فقیر، عزیز اللہ حقانی، وہاب پرے، عبدالاحد نادم، آزاد اور مہجور کے بارے میں کتابچے شائع ہو چکے ہیں

تفصیلات اکادمی کے پتے سے
معلوم ہو سکتی ہیں

جے ایل کول

قومی یک جہتی اور مصنّف کا فرض

قومی یک جہتی کے سوال پر آئے دِن خوب بحث ہو رہی ہے اور ہر طرف سے سارے مُلک میں ہمارے سیاسی لیڈر، پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر اور دیگر سربرآوردہ اصحاب اس مسئلہ پر اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں اور اس کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اس بحث سے اب عیاں ہے کہ سبھی لوگ کم و بیش سمجھتے ہیں کہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ مگر میری رائے میں ابھی ہم سب یہ سمجھ نہیں پائے ہیں کہ مسئلہ ہے کیا؟ قومی یک جہتی سے کیا مُراد ہے؟ بلکہ کبھی کبھی ہم اس کو جذباتی یک جہتی Emotional integration کے نام سے بھی پُکارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے بہت کم گھر ہیں جہاں میاں اور بیوی میں، بھائی اور بھائی میں، باپ اور بیٹے میں جذباتی یک جہتی ہو۔ اور جہاں رائے کا اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ بلکہ جہاں کبھی کبھی چھوٹے موٹے جھگڑے بھی نہ ہوتے ہوں۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہی کوئی گھر ہوگا جہاں بھائی نے دیکھا کہ گھر میں چور آنے لگے ہیں اور سوچا "چلو مجھے کیا، آنے دو چور کو۔" اسی لئے قومی یک جہتی سے بالخصوص ایک جمہوری (Democratic) طرزِ حکومت میں کبھی یہ مُراد نہیں ہو سکتی ہے کہ مُلک یا قوم میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو اور تمام لوگوں کا ایک ہی نقطۂ نظر ہو۔ ہمارے جیسے وسیع و عریض مُلک میں، جہاں بہت سارے تواریخی وجوہات سے کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، کئی پس ماندہ طبقے ہیں، مختلف مذاہب ماننے والے لوگ رہتے ہیں۔ مختلف ذات اور رسم و رواج ہیں۔ ایسے مُلک میں یہ توقع رکھنا کہ سبھی لوگ ہم خیال و ہم رائے ہوں، تواریخ سے ناآشنائی اور حالات سے مُنہ موڑنے کا ثبوت ہے۔ اس لئے قومی یک جہتی کا یہ تقاضا نہیں کہ رائے میں

اختلاف نہ ہو۔ بلکہ یہ ہے کہ بُنیادی باتوں میں سب نہیں تو بیشتر لوگ پُورا یقین رکھتے ہوں۔ اور بحران اور ہنگامی حالات میں وہ سب ان بُنیادی اصولوں کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ بُنیادی باتیں یا اصول کیا ہیں، اس پر قطع نظر کسی بحث کے اس وقت یہ کہنا غالباً کافی ہوگا کہ مُلک کی سالمیت یا ایکتا اور اس کی آزادی ہر ایک مُلک اور مُلک کے باشندوں کے لئے ایک بُنیادی بات ہے، کیونکہ اگر مُلک کی سالمیت ہی نہیں رہی یا اس کی آزادی چلی گئی تو ظاہر ہے کہ وہ مُلک "مُلک" ہی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ یہ تقریباً اتنا ہی لازم ہے کہ مُلک کے بیشتر لوگ مُلک کے طرزِ حکومت اور مُلک کے مقاصد، بلکہ فلاح و بہبود اور اخلاق اور شہریت کے اصولوں، جو کہ مُلک کے آئین میں درج ہوتے ہیں، اُن پر شدت کے ساتھ یقین رکھتے ہوں، حالاں کہ یہ ماننے میں کوئی دریغ نہیں ہو سکتا کہ طرزِ حکومت اور حکومت کے مقاصد میں تبدیلی مانگی جا سکتی ہے۔ بلکہ فلاح و بہبود کِس میں ہے اور کِن طریقوں سے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ ان سب باتوں میں ضابطہ اور طریق کار کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر مثال کے طور پر جب ۱۹۳۹ء میں برسرِاقتدار پارٹی نیشنل کانگرس اپنے سرکاری عہدوں سے مستعفی ہوئی۔ کیونکہ وائسرائے نے ہندوستانیوں سے پُوچھے بغیر ہندوستان کو جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ مگر وقت کے مسلم لیگیوں نے "یوم نجات" منایا۔ ظاہر تھا کہ اس وقت ہندوستان میں قومی یک جہتی نہیں تھی۔ جس کا نتیجہ برصغیر ہند کے بٹوارے کی صورت میں ہوا۔ جس بٹوارے کے ہولناک نتائج بہت دیر تک بھولے نہیں جا سکتے۔

بدقسمتی سے ہمیں ایسی کئی مثالیں اپنے ہی مُلک کی تاریخ سے مل سکتی ہیں اور ان مثالوں سے اگر ہمیں کچھ سیکھنے کا شعور ہو تو ہم کبھی یہ نہ بھُولیں گے کہ ہندوستان جیسا وسیع مُلک اگر غلام ہُوا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مُلک اور قوم میں یک جہتی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخ ابھی بھی ہمارے فرنگی آقاؤں کی لکھی ہوئی Text Books کی تواریخ ہے۔ جس سے پڑھنے والوں کے ذہن پر، بلکہ پڑھانے والوں کے ذہن پر بھی ہماری تواریخ اب بھی ہندو تاریخ اور مُسلم تاریخ کے رُوپ میں متاثر ہے جس کے اکثر یہی معنی ہوتے ہیں کہ فرنگی آباد کاروں نے یہاں ہندوؤں کو مُسلمانوں سے نجات دِلائی اور کچھ دیر بعد یعنی اس صدی کے آغاز سے

مسلمانوں کو بڑھتے ہوئے ہندوؤں کے اثر اور اقتدار سے نجات دلائی۔ یعنی دونوں صورتوں میں وہی آباد کار ہمارے نجات دہندہ ہوئے۔

یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جو زبان، ریاست، مذہب وغیرہ کے اختلافات ہیں، وہ سطحی نہیں ہیں۔ ایسا کہنا بالکل غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی تمدن کا مسلسل طور پر یہ رجحان رہا ہے کہ کثرت میں وحدت تلاش کی جائے اور عملاً یہ کہ سماج مذہب اور رہن سہن کے سب شعبوں میں رواداری برتی جائے۔ یہ روایت بہت پرانی ہے ویدِ مقدس، شریمد بھگوت گیتا، رامائن و مہابھارت، سمراٹ اشوک کے کتبے، بھگتی کوی کبیر، سوُرداس وغیرہ، مسلمان صوفی اور اولیا — خواجہ غریب نواز رحؒ، حضرت نظام الدین اولیا رحؒ، حضرت امیر خسرو رحؒ اور یہاں کشمیر کی للی وید اور شیخ نورالدین ولی رحؒ وغیرہ، شہنشاہ اکبر، بلکہ سب ہندوستانی زبانوں کے شعر و سخن اس روایت سے مالا مال ہیں۔ بقولِ حضرت نظام الدین اولیا رحؒ — "ہر قوم راست راہے، دینِ و قبلہ گاہے۔" یا بقولِ غالب ؎

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

اور

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی۔ وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یا اقبال کا مشہور شعر ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یہ کہہ کر صرف اس پر اکتفا کرنا کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لئے رواداری کی شاندار روایتیں چھوڑی ہیں، کافی نہیں۔ کیونکہ آج کل کے حالات مختلف ہیں۔ آج ہم ایک آزاد قوم ہی نہیں بلکہ ایک جمہوری ریاست کے شہری ہیں اور ہمارے آئین کا اعلانیہ مقصد ایک ہمہ گیر فلاحی سٹیٹ قائم کرنا ہے، جہاں باوجود اختلافِ زبان و ذات پات و مذہب وغیرہ پر ایک انسان برابر مواقع کا مستحق ہو اور جہاں پوری برابری، ہر قسم کی انفرادی آزادی اور افراد میں بھائی چارہ ہو۔ چاہے ہم اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں۔ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی یا سکھ۔ کشمیری ہوں یا پنجابی۔ بہاری یا بنگالی، مرہٹی یا گجراتی، تامل یا ملیالی وغیرہ جو کچھ ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں۔ اس لئے ہر ہندوستانی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جس قدر ہو سکے، وہ اپنے عمل سے، اپنے چھوٹے بڑے دائرہ، اثر و رسوخ میں، ان مقاصد کو

اپنائے۔

اگر یہ ہم سب کا فرض ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے تاریخ دانوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، غرضیکہ ہمارے مصنفوں پر یہ فرض اور بھی زیادہ لازم ہے۔ کیونکہ سیاسی اور سماجی لیڈر، کارخانوں کے مالک، فیکٹریوں کے منیجر، حکومت کے چلانے والے افسر، سبھی ملک اور قوم کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن جو چیز ملکوں اور قوموں کو زندہ رکھتی ہیں وہ اس ملک و قوم کی قدریں ہیں اور ان قدروں کی تشکیل دینے میں، ان کو لوگوں کے قومی شعور یا لاشعور میں جگہ دلانے میں، انہیں مصنفین کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف بحیثیت مصنف اس فرض کو کیسے نبھا سکتا ہے؟ کیا اُسے سرکار کی طرف سے یا کسی سیاسی یا سماجی پارٹی کی طرف سے پروپیگنڈا کرنا چاہیئے۔ نہیں! پروپیگنڈا ایک وقتی ضرورت ہے۔ یہ کام ہمارے ادیبوں اور مصنفوں کا نہیں۔ اُن کا کام اس سے کہیں زیادہ پائدار ہے جو ملک و قوم کا ورثہ بن کر صدیوں تک اثر انداز رہے گا۔ مختصر الفاظ میں اُن کا کام یہ ہے کہ وہ خود ملک کے اس بحران سے متاثر ہوں اور خود آج کل کی زندگی کا جتنا مکمل اور ہمہ گیر مشاہدہ ہو سکے، کریں۔ اور آج کل کی انفرادی یا اجتماعی، سماجی، سیاسی یا اقتصادی، فرقہ دارانہ، طبقاتی یا قومی، زندگی کے سیاق میں اپنے مشاہدے کو اپنی تصنیفات میں مجسّم بنا دیں۔ اگر یہ ایسا کریں تو جس قدر ان میں صدق ہو جس قدر ان میں ژرف نگاہی ہو اور اقبال کے الفاظ میں "سوز از دل" اور "ضرب کلیمی" ہو، اُس قدر اُن کا فن اُتم ہوگا اور ان کی تصنیف اثر انداز ہوگی۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کل ہمارے ملک کے اکثر مصنف مغربی تصنیفات سے متاثر ہو کر جرائم اور جنسیات Crime اور Sex کو ہی اپنا موضوع بنا بیٹھے ہیں۔ اور وہ چند مصنف، جن کو تخلیقی مصنف کہا جا سکتا ہے اُن میں سے اکثر یا تو داخلی کیفیات میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایک مایوس آدمی کی ذہنی کیفیات کے مطالعہ میں لگ جاتے ہیں یا خود اپنی بیزاری سے متاثر ہو کر سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اگر مصنف اگر سوشلزم کو کسی نہ کسی انداز سے اپنا موضوع بنا بھی لیتے ہیں اور اپنے افسانوں یا ناولوں میں لاتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ یہ کوئی کامیاب کوشش نہیں بنتی۔ یا تو یہ سطحی، محض جذباتی Sentimental یا مبہم خیالات پر مبنی ہوتی ہے۔ جیسے میں نے ابھی کہا، ہمارے ملک میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ سطحی نہیں۔ ان کو سمجھنے کی

کوشش کرنی چاہیئے اور اُن اختلافات کی تہہ تک پہنچنا چاہیئے۔ اور ہماری آج کل کی سماجی اور انفرادی جابرانہ حرکتیں، ہمارے خیالات اور جذبات کی جارحانہ روش اور ہماری زندگی کی تنگ ظرفی طشت از بام کرنی چاہئیں۔ مُصنفین کا فرض ہے کہ اس یک جہتی کے مسئلہ کے ہر پہلو کو جانچیں اس کے تنقیحات کو صاف اور پُر اثر الفاظ میں بیان کریں۔ اس مسئلہ اور ہماری روزمرہ زندگی کے آپسی رشتہ کو ہمارے سامنے خلوص سے رکھیں۔ ہمارے ماضی اور حال کے مسئلے، مثلاً شمال و جنوب کے جھگڑے، اقلیتوں کے خدشات، پس ماندہ طبقوں کی اُمنگیں اور توقعات، زبان کے مسئلے، مختلف مذاہب کے تمدّن، اُن کا اختلاف اور اشتراک ــــ ان سب کو آج کل کے زمانے کے زبردست تقاضوں، ہمارے مستقبل کی تمنّاؤں اور اُمیدوں کے ترازو میں تولیں اور ان مسئلوں کو اپنی تصنیفات کا موضوع بنا کر اپنے فن کو زندگی سے زیادہ قریب کردیں۔ یہ ہے ہمارے مُلک کے مصنفین کا فرضِ اوّلین۔ یہ سچ ہے کہ آج کل کے مشینی دَور میں مُصنف اور ادیب کا غالباً وہ درجہ نہیں رہا جو اُس کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اُس کو آج سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب اخباروں، Comics اور Pamphlets کا زمانہ آگیا ہے، کتابوں کا نہیں۔ حالاں کہ اب روز بروز پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ باوجود ان سب دُشواریوں کے، میرا یقین ہے کہ تخلیقی مُصنف کا اب بھی اپنا مقام ہے۔ بلکہ وہی ہمیں ہماری آج کل کی پیچیدہ اور فرومایہ زندگی سے نجات دِلا سکتا ہے۔ رہبریت اور مذہب کے کہے ہوئے دوسری دُنیا کے راستے سے نہیں۔ بلکہ سماج وادی خوش حالی کی بُنیاد پر قومی یک جہتی کی تعمیر کا تصوّر ہمارے سامنے لا کر وہ ایسا کر سکتا ہے۔ میرے گھر کے متصل پس ماندہ طبقے کے بچوں اور بچیوں کے لئے ایک پرائیویٹ ادارے کا سکول تھا۔ صبح جب وہ چھوٹے بچے جمع ہوتے تھے تو اکٹھے ہو کر گاتے تھے ــــ "سارا ہندوستان ہمارا"۔ میرے نزدیک قومی یک جہتی کی یہی تعریف ہے۔ اور یہی تصوّر ہمارے ذہنوں میں بٹھانا ہمارے ادیبوں اور مُصنفوں کا کام ہے!

دو ماہی **شیرازہ** سرینگر

نومبر ۱۹۶۴ء

شمارہ ۱۷ ———— جلد ۳

شمارہ ۷

مجلسِ مشاورت

عبدالقادر سروری

صاحبزادہ حسن شاہ

رام ناتھ شاستری

نگران

جے لال کول

ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

اِندرانی رحمان ...... (مضمون صفحہ ۱۴۲)

رقص کے چند زاویے







غروبِ آفتاب عمل: موہن رینہ

حرفِ آغاز

نومبر کا یہ شمارہ یوں تو ہمارا معمول کا شمارہ ہے لیکن مضامین کے تنوع اور اُن کے معیار کو دیکھ کر اسے ایک خاص نمبر کی سی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اب "شیرازہ" کا ایک مخصوص مزاج اُبھر آیا ہے جس میں سارے ملک میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ بات بھی حوصلہ افزا ہے کہ ہمیں تحقیقی اور تنقیدی موضوعات پر اس قدر اچھے مضامین حاصل ہو رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس اب اچھے مضامین کی افراط ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی حساب سے انتخاب کا معیار بھی زیادہ سخت ہوتا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ "شیرازہ" دن بدن ایک ایسے فورم کی حیثیت اختیار کرتا جائے گا جہاں ریاست اور ملک کی بہترین ثقافتی روایات کا بڑا ہی خوبصورت سنگم نظر آئے گا۔ اس شمارے میں علی محمد لون اور پران کشور کے مقالات شامل کئے گئے ہیں۔ یہ مقالات ایک سمپوزیم کے لئے لکھے گئے تھے۔ اسی لئے ان میں بحث طلب مسائل اُبھارے گئے ہیں۔ "شیرازہ" کے صفحات ویسے بھی ان صحت مند مباحث کے لئے ہر وقت حاضر ہیں، لیکن اگر متذکرہ صدر مقالات کے سلسلے میں کوئی اہلِ قلم "شیرازہ" کے صفحات استعمال کرنا چاہے تو ہمیں اپنا تعاون پیش کرتے ہوئے بڑی مسرّت ہوگی۔

"نہرو نمبر" رواروی میں ترتیب دیا گیا تھا۔ لیکن ہمارے کرم فرماؤں اور مُلک کے مقتدر ادیبوں نے اسے جس انداز میں سراہا ہے اُس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ "شیرازہ" ہر سال اپنا خاص نمبر پیش کرتا ہے۔ "نہرو نمبر" کے ساتھ اس سال ہماری یہ ذمّہ داری پُوری ہوگئی۔ آئندہ سال بھی ہمارا ایک خاص نمبر نکلنے کا ارادہ ہے!

(محمد یوسف ٹینگ)

فراق گورکھپوری

کارتکی پورنما

[دیوالی کاتک یا کارتک مہینے کے پہلے پاکھ کے ختم ہونے پر منائی جاتی ہے، یعنی اماوس کو جب رات بھر اندھیرا رہتا ہے۔ اس کے بعد سے چاندنی رات شروع ہو جاتی ہے اور کارتکی پورنما کو رات بھر چاندنی رہتی ہے۔ یہ رات ہندوستان میں بہت متبرک سمجھی جاتی ہے۔ جاڑوں کا آغاز ہوتا ہے اور اس شبِ ماہتاب کا منظر نہایت دلفریب ہوتا ہے۔ فراق]

سکوتِ نیم شبی نے اُٹھا لیا ہے ستار
فلک پہ جلوۂ انجم اُسی کی ہے جھنکار

یہ وقت! چرخِ بریں سے یہ بارشِ انوار
یہ رات! چاند نگر سے شعاعوں کا یہ اُتار

اسی طرح کبھی گنگا فلک سے اُتری تھی
مِلی تھی شیو کی جٹاؤں میں پہلی جائے قرار

بھنور سے پڑتے چلے دودھیا فضاؤں میں
کہ بنتے جاتے ہیں گردابِ نُور سلسلہ وار

فضا میں جیسے ہو اِک گونج ایک آہٹ سی
صدا ہے شب کے پروں کی یہ اَن سُنی جھنکار

یہ جھاڑیوں میں جو شبنم کی جھمجھماہٹ ہے
کسی کی پائلوں کی ہے یہ نقرئی جھنکار

گُلوں کے گِرد جو پگھلی ہوئی لکیریں ہیں
یہ چاندنی کی سُبک اُنگلیاں ہیں مینا کار

فلک پہ کھیت کر آئی ہے چاندنی ہر سُو
اُفق سے تا بہ اُفق خوابِ نُور کے آثار

یہ چندرما ہے کہ ماتھے پہ کرشن کے ہے تِلک
یہ جو ئے نُور ہے رادھا کا جلوۂ انوار

فضائے نیم شبی ہے تمام کاہکشاں
پگھلتے جاتے ہیں ہیروں کے اَن گنت مینار

یہ رنگ و نُور کے پیارے ہیں کہ رقصِ نجوم
کہ دستِ ناز سے پریوں کے چھُوٹتے ہیں انار

فضا میں نغمۂ مہتاب کے ہیں کومل سُر
جو باغ و راغ پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار

زمیں سے تا بہ فلک دُور تک یہ حدِّ نگاہ
چہار سمت یہ خُنکی و نُور کے کہسار

یہ چاندنی ہے کہ باریک چادرِ غفلت
کہ گہری نیند میں ہیں چارسُو در و دیوار

فسونِ نیم شبی کا یہ جاگتا جادُو
مہِ تمام شبستاں کا طالعِ بیدار

جہاں نُما ہے یہ سیال خوابِ فطرت بھی
کہ ماہتاب کی دیوی ہے آئنہ بہ کنار

یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں یہ رسمسی شبِ ماہ
یہ بھیگی بھیگی فضائیں اس ابتری کے نثار

یہ تھرتھراتی لویں آج شبستاں کی
یہ کپکپاتی بھویں رات کی یہ کیفِ خمار

یہ خامشی ہے سراسر اُسی کے پاؤں کی چاپ
دُھندلکے ہیں غمِ ہستی کے کارواں کا غبار

ہوائیں نیند میں ہیں اور ماہتاباں کی
شعاعیں بادۂ شبنم کو پی کے ہیں سرشار

کھِلا ہوا ہے جو مہتاب کا سفید گلاب
چھلک رہا ہے کوئی آبگینۂ سرشار

گلُوں کے شہر میں شبنم کی دیپ مالا ہے
ہے خوشبوُوں کے چراغوں کی آگے پیچھے قطار

اُجالی رات ہے یا کوئی خوابِ سیمیں ہے
اُتر رہے ہیں شعاعوں کے بھیس میں اسرار

یہ جوئے شیر پہاڑوں سے ہو کے آتی ہے
سرِ کنارِ کہستاں کھنک رہے ہیں ستار

فضا میں نیم اشارے عروسِ فطرت کے
خُنک فضا کی لچک ہے کہ ابروئے خمدار

ہر ایک برگ کسے آئنہ دِکھاتا ہے
چھلک رہا ہے بصد آب و تابِ روئے نگار

یہ کیفِ نیم شبی! اس سے کیا کہے شاعر
کسی قدر جو ہے غافل کسی قدر بیدار

ہوائیں لغزشِ مستاں فضائیں مُشک آلُود
لوئے پریدہ ہے رم دیدہ آہوئے تاتار

یہ ہر سنگھار کا سایہ یہ بھینی بھینی مہک
یہ پھُول جھڑتے ہیں یا ہے تراوشِ انوار

یہ رسمسائی ہوئی ادھ کھِلی کلی سرِ شاخ
ہے رنگ و بُو کے حجابوں میں لاجونتی نار

بہت ہی دھیمی ہے اس ماہِ نیم ماہ کی آنچ
یہ آنچ وہ ہے جسے کہئے کیمیا آثار

یہ دھج یہ روپ سجل چاندنی کی دیوی کی
کسی دُلہن کا بھی ایسا رچاؤ ہے نہ سنگار

پگھل رہی ہے یہ خُنکی کی آنچ سے چاندی
یہ غسلِ نوُر سے نکھرے ہوئے گل و گلزار

یہ گونجتی ہوئی خاموشئ شبِ آخر
جو کہہ رہی ہے ہر اِک نیک و بد سے پاؤں پسار

ہے خواب گاہ کہ آئینہ شبستاں کا
کہ گہری نیند میں ہے کائنات نقش و نگار

ندی پہ چاند کی کرنیں ہیں یا ہیں جل پریاں
یہ دِل فریب اشارے یہ رقصِ شعبدہ کار

یہ نیم شب یہ ہم آغوشئ زمین و فلک
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے آج مہ بکنار

فلک سے تا بہ زمیں معجزے اُترتے ہیں
زمیں سے تا بہ فلک شب ہے جادوئے بیدار

کروڑوں سال پُرانی بھی ہو کے تُو ہے نئی
ہزاروں دورِ فلک تیری تازگی پہ نثار

سرے سے تپتے ہوئے ماتھے پڑ گئے ٹھنڈے
ہر اک جبیں پہ کھلے نیند کے گُلِ بے خار

ہوائیں ہیں ترے دامن کی اِک پیامِ سکوں
کہ سو گئے ترے پہلو میں کافر و دیں دار

دیارِ ہند کی اے پُورنما! تری آنکھیں
ہیں عہد عہد کے دیکھے ہوئے چڑھاؤ اُتار

ہزاروں جگ تری پلکوں کے سایے میں گذرے
بتا رہا ہے مجھے تیری انکھڑیوں کا خمار

مہِ تمام تری آرتی کا دیپک ہے
ستارے کیا ترے منڈپ کے ہیں یہ بندنوار

خنودگی کا یہ عالم، یہ محویت یہ کیف
اُجالی رات ہے اِک داستانِ خواب آثار

خنک فضاؤں میں سرگوشیوں کا عالم ہے
ہر اِک لچکتی کرن کی یہ نرمیٔ گفتار

سکوتِ ناز کی دھیمی دمک یہ ہونٹوں کی لَو
ہر ایک بات نظر آ رہی ہے دُور از کار

دفینہ ہے ترا سینہ ہمارے ماضی کا
جو ہے ہمارے لئے ایک دولتِ بیدار

ہماری فکر میں، فن میں ترا بھی حصہ ہے
رہی ہے ہند کی تاریخ کی تُو اِک کردار

شعور و فکر و فنِ ہند کی یہ نرم لچک
یہ ٹھنڈک اور سکوں سب ہیں اے تری جھنکار

یہ اعتدال و توازن مزاجِ بھارت کا
ترے طفیل ملی یہ دُرستیٔ کردار

مہِ تمام سے امرت برس رہا ہے فراقؔ
چھلک رہی ہے فضا مثلِ ساغرِ سرشار

فراق گورکھپوری

غزل

جب نظر آپ کی ہو گئی ہے
زندگی زندگی ہو گئی ہے

بارہا خود بخود بے سبب ہی
دوستی دشمنی ہو گئی ہے

جو سنک تھی نسیم سحر میں
وہ تری کج روی ہو گئی ہے

یہ قضا و قدر بڑھتے بڑھتے
میری بے چارگی ہو گئی ہے

کچھ جو ہے بے خودی شاملِ حال
آگہی آگہی ہو گئی ہے

اب تو بیگانگی آدمی کی
فطرتِ ثانوی ہو گئی ہے

غم کی بھی تیری بزمِ طرب میں
حاضری لازمی ہو گئی ہے

لطف بیگانہ وش سے بھی اے دوست
دِل کی بے خاطری ہو گئی ہے

کہتے آئے تھے ہم موت جس کو
اب وہی زندگی ہو گئی ہے

منہ پر آئی تھی جو اِک بات
وہ تری خامشی ہو گئی ہے

علم و حکمت کی ہر آگہی وائے
بڑھ کے ناآگہی ہو گئی ہے

فکر کی کہکشاں اس غزل میں
موتیوں کی لڑی ہو گئی ہے

بڑھتے بڑھتے تری مہربانی
ختم یک بارگی ہو گئی ہے

ابتری عشق کی بڑھ کے تیری
زلف کی ابتری ہو گئی ہے

ادھ کھلی آنکھ کی نیم جنبش
فکر کی جزرسی ہو گئی ہے

پہلے جو چیز پیغمبری تھی
اب مری شاعری ہو گئی ہے

ڈھل کے شوخی فراقؔ اس غزل میں
سربسر سادگی ہو گئی ہے

عبد الرسول استغنا کشمیری

لیجیے ایک شاعر کو پیش کر رہا ہوں جس کے بارے میں اتنا کم جانتا ہوں جو نہ جاننے کے برابر ہے۔ کشمیری دوست اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتے ہوں گے۔ میرا مطلب حالات و سوانح سے ہے میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ عہدِ عالم گیر کا شاعر ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مفکر شاعر ہے اور فکر سے ہٹ کے بھی جو شعر کہتا ہے مزے سے کہتا ہے۔ ایک شعر تو ظالم غضب کا کہہ گیا ہے اور اسی سے میں اس تعارف کا آغاز کرتا ہوں۔ باوجود اس کے حالات سے ناواقفیت ہونے کے میں اس سے اتنی اچھی طرح واقف ہوں کہ تعارف کی خدمت بخوبی ادا کر سکتا ہوں۔ اس شاعر کو میں کیسے بھول سکتا ہوں جو ایسے شعر کہہ سکتا ہے ؎

دل را در انقلابِ جہاں اُستوار کُن۔ عالم بیک قرار نماند قرار کُن

اس لمحہ بہ لمحہ بدلتی دُنیا میں اپنے دِل کو مضبوط بناؤ اور یہ سمجھ لو کہ عالم کو تو قرار ہی نہیں۔ ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے۔ یہی دُنیا کا کارخانہ ہے۔ اس میں ایک ہی صورت بڑائی، بلندی اور عظمت کی ہے۔ شاید سکون و طمانیت کی بھی یہی آخری صورت ہے کہ اس چارسُو کی بے قرار منقلب دُنیا میں دِل کو جمع رکھو اور کتنی ہی کڑی مصیبت آپڑے، کیسی ہی تکلیف یا رنج کا سامنا ہو، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ہر چیز آنی جانی ہے، تم اپنی جگہ مستحکم رہو، جمے رہو، سب کچھ موجوں کی طرح آئے گا اور گزر جائے گا۔ ایک اور جگہ اس مضمون کو ہلکے پھلکے انداز میں کہا ہے :-

جہاں دولت دیرپائے ندارد۔ ہمہ دارد اما وفائے ندارد

اور پھر ایک جگہ بابر کے فلسفہ کی بھی ترجمانی کردی ہے۔ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ

نیست۔ " پتہ نہیں یہ حال ہے کہ قال۔

بعبرت گاہ دُنیا ناتوانی دادِ عشرت دہ ۔ نہ این مطرب نہ این ساقی نہ این پیمانہ می ماند

ایک شعر یہاں اور سُن لیجئے جس میں شاعر کا فلسفۂ زندگی جھلکتا ہے۔ پھر اس کی شاعری پر عمومی نظر کے لئے مختلف انداز کے شعر پیش کر کے اس کے لئے آپ سے داد چاہوں گا۔ وہ شعر یہ ہے :۔

زبزم بادہ مکن مکتبے چہ خواہد شد بیا، بخواں سبق مشربے چہ خواہد شد

مطلع کے لئے حسب معمول شاعر کو مکتب کے لئے موزوں ترین قافیہ مشرب مِل گیا اور اس کا مطلب واضح تر کر گیا کہ بادہ کشی کی فطری حیثیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ علمی چیز عمل سے آتی ہے نظر سے نہیں۔ وہی بات کہ تیرنا سیکھنے کا اس کے علاوہ اور کوئی متبادل ذریعہ نہیں کہ آدمی پانی میں کود پڑے! اس کے کچھ اور لطیف مضامین ملاحظہ ہوں :۔

ماند کجا بسینہ نہاں رازِ اشتیاق پہنائے سینہ نیست باندازِ اشتیاق

سینہ میں راز کیسے چھپا رہے جب کہ سینہ کی اتنی پنہائی ہی نہیں کہ اشتیاق کو سمیٹ سکے۔

دمے کہ نامہ سویت رواں کنم از شوق برنگ سُرمہ بہ پیچم نگاہ در کاغذ

[جس وقت کہ تیری طرف نامۂ شوق لکھتا ہوں تو میری نظریں پُورے کاغذ پر اس طرح دوڑتی ہیں جیسے آنکھوں میں سُرمہ لگ رہا ہے (نظروں کو سُرمہ کی سلائی سے تشبیہہ غور طلب ہے)

دُور کی کوڑی والا اسی طرح کا ایک شعر اور ہے جس میں کہا ہے کہ اگر میری نظر کو اس کے پُشت پا کے لئے بھی فرصت نظارہ نہ مِل سکے تو حیف ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ نگاہ آنکھ سے نکل پڑتی اور جدھر وہ جاتا دوڑتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی۔ پہلا مصرع خوب کہا ہے :۔

نگہ کاش از دیدہ بیروں خرامد اگر جلوہ بر پُشت پائے ندارد

محبُوب اور اس کی سرو قدی پُرانا مضمون ہے، اس کو پیچیدہ کر کے یوں کہتا ہے :۔

نوبہار از نسخۂ رفتار او مصرعے دزدید و سروش نام کرد

یار استغنا کو یاد کرنے لگے اللہ اللہ! نتیجہ معلوم کہ استغنا پر کیا بیتے گی، اپنے آپ سے بھی گیا! خوب کہا ہے ؎

من فراموش میکنم خود را کہ مرا یاد می تواند کرد

اپنی گناہگاری اور خدا کی رحمت کا مضمون پامال مضمون ہے مگر استغنا کے یہاں یہ بھی اچھوتا

مضمون بن جاتا ہے۔ اُسے کریم کہنا اور پھر گنُاہ نہ کرنا یہ تو میرا گناہ ہے۔ اور گناہ کو دیکھنا اور معاف نہ کرنا یہ کس کا گناہ ہے۔ اس مضمون کو اتنی شدّت سے کم ہی کسی نے کہا ہو گا۔

گفتن کریم و جُرم نکردن نگاہ من   دیدن گناہ و عفو نکردن گنُاہ کیست

ایک اور نادر مضمون ملاحظہ ہو:۔

استغنا کے نزدیک آدابِ زیست ہر کس و ناکس کے بس کے نہیں۔ جو کچھ جس جس کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، شبنم کا رونا، یا غنچہ کی ہنسی۔ تو سچ یہ ہے کہ نہ غنچہ سے ہنسنا آتا ہے نہ شبنم سے رونا!

نہ غنچہ خندہ، نہ شبنم گریستن داند   کسے کجاست کہ آدابِ زیستن داند

محبُوب کی بے مہریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ معمولی فرصت میں تو ان پر گفتگو بھی ناممکن ہے۔ اسے کیا خوُب کہا ہے ؎

قصہ کوتاہ مہر بہا دراز اُفتادہ است   گر خُدا فرصت دہد ایں گفتگو خواہیم کرد

ایک شعر ہے ؎

چرا فلک کمر احتساب می بندد   سزائے بادہ پرستاں خمار خواہد داد

کہتا ہے کہ بادہ کشوں کا احتساب یہ کچھ بھی نہیں کہ شراب نہ ملے، اصل سزا تو ان کے لیے یہی ہے کہ خوُب شراب ملتی رہے اور خوُب خمار چڑھتا رہے۔ خمار خود شراب نوشی کی بدترین سزا ہے۔ اس شعر میں یہ بات بھی پوشیدہ ہے کہ ہر آرام و آسائش کے بطن میں تکلیف چھُپی ہوتی ہے۔

سحر در بزمِ مستاں فیض بہر سیر می آید   کہ از گلُدستۂ پیمانہ بوئے خیر می آید

شعر میں کوئی خاص بات نہیں، عام مضمون ہے کہ بزمِ مستاں میں سحر کو فیض خود سیر کے لیے آتا ہے کہ پیمانوں سے بوئے خیر آئی ہوتی ہے۔ لیکن مطلع کی روانی قابلِ لحاظ ہے اور خاص کر قافیہ کے لیے حسبِ معمول موزوں ترین لفظ، جس کی نوعیت ہر جگہ مطلعوں میں معنویت کا پھیلاؤ ہوتا ہے، کھی پر کھی مارنا نہیں۔

سایۂ گلُ خوابگاہ پائے پروانہ منت   برگ برگ گلُ ز موجِ رنگ دامم میکند

معنی صرف اتنے ہیں کہ گلُ کا سایہ میرے پائے پروانہ کی خواب گاہ ہے اور پھُول کی ہر ہر پتی اپنی موجِ رنگ میں مجھے اسیر کر رہی ہے۔ لیکن اس موضوع پر اتنی نزاکت کے ساتھ ایسا سبک بیان کم ہی

کسی شاعر کے یہاں ملے گا۔ الفاظ کی دروبست کا اندازہ (اور خاص کر موضوع کی مناسبت سے نازک ترین الفاظ کا انتخاب) ترتیب سے لگایئے۔ سایۂ گُل کے بعد خوابگاہ، پھر اور لکھا "پلنے پرواز" اس کے بعد برگ برگ گُل اور پھر موجِ رنگ اور ان کا مجموعی تاثر جیسے خواب میں ہلکے ہلکے رنگ گھُل گئے ہیں! ایک تمثیلی مضمون ہے۔

سختیٔ جرم خروش افگنِ بحرِ کرم است آب بر سنگ چو آمد بصدا می آید

جُرم کے کڑے پن سے خدائے کریم کے کرم کے سمندر میں اُبال آگیا ہے۔ اس کی مثال یُوں سمجھو کہ سمندر کا پانی جب بہتا بہتا کسی کڑی چٹان سے ٹکراتا ہے تو تیز آواز پیدا ہوتی ہے۔

ایسے ہی ایک اور شعر ہے ؎

کار اگر بر خود نگیری تنگدل گرد و فراخ دامنِ صحرا شود گر خانہ را دیوار نیست

تم اگر اپنے کام کو اپنے اُوپر ہی نہ سونپ رکھو اور یا یہ کہ اگر اپنے کام میں خود غرضی کے ساتھ دلچسپی نہ تو تنگ دِل میں بھی فراخی آجائے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر گھر کی دیوار کی بندش نہ ہو تو گھر محدود نہیں رہتا۔ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ دامنِ صحرا بن جاتا ہے۔

دریں گلزار تا کے غنچہ باشی چو گُل یک لب تبسّم میتواں کرد

اس شعر کو اگر محبُوب سے ہٹا کے عمومی تخاطب دے کر یہ معنی سمجھے جائیں کہ

؎ بارے کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو (میرؔ) تو شعر کی معنویت میں بلندی آجاتی ہے۔ غنچہ کی طرح لب بستگی کے بالمقابل پھُول کی طرح دُنیا کو ایک تبسّم سے مسرور کر جاؤ۔ پھُول کے بس کا تبسّم ہے، تمہارے بس میں اس کا جتنا کچھ بتبادل ہے وہ دے دو۔

یہ مضمون کہ تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے... جگر کس کا ہے۔ ذرا پیچ کے یُوں کہا ہے کہ میرے شیشۂ دِل کی شکست پر تو منفعل نہ ہو کہ اس کی تقدیر میں تقدیر کے خالق نے شکستگی گوندھ دی تھی۔

اے سنگدل ز دِل شکنی منفعل مباش ایں شیشہ را برائے شکست آفریدہ اند

ایک تمثیلیہ اور ملاحظہ ہو:۔

دِل تنگ اسیراں باکشایش بر نمی آید شود چوں غنچہ گل از صحنِ گلشن بار می بندد

اسیروں کی تنگ دلی میں کشادگی ان کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہے۔ جیسے غنچہ جب تک

غنچہ ہے چمن میں ہے، جیسے ہی پھُول بنا، زندگی ختم۔

حافظ کے مشہور مضمون کو کہ چاندنی رات ہی گوشۂ چمن ہے۔ ساقی ہی شراب ہے۔ ایسے میں توبہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح استغنا نے ذرا اُلٹا کے گھُما کے کہا ہے کہ شاہد و پیمانہ، گل و مہتاب میں موجود ہیں۔ اسباب کی سب طرح تکمیل ہے۔ ایسے میں توبہ پر شب خُون ماردوں تو کیا عجب ہے۔

گر زنم بر توبہ شبخوں یک جہاں اسباب ہست شاہد و پیمانہ دمساز، وگل و مہتاب جہت

یک جہاں اسباب کے خوبصورت فقرہ کی تشریح کے لئے اگلا مصرعہ ہے اور پھر ان کے ذریعہ توبہ پر شب خُوں!

الفاظ کی بازیگری کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ پہلا مصرعہ اپنے مخصوص رنگ میں ہے اور دوسرا صائب کا سا تمثیلیہ

ساختن با سوختن باید زمن آموختن شمع شاگردِ من و پروانہ اُستادِ من است

پہلا مصرعہ ایسا بے ساختہ ہے کہ salable quote سا ہو گیا ہے۔ سوز کے ساتھ ساز مجھ سے سیکھنا چاہیئے "ساختن با سوختن باید زمن آموختن۔"

ایسے ہی یہ شعر ؎

تغافلہائے چشمت بسکہ حیرانم نمیدانم۔ تو میدانی کہ میدانم، نمیدانم، نمیدانم

بیا، بیا، نظرے کُن بعالم استغنا۔ ببیں، ببیں، چہ بلا بیقراری دارم

"بیا بیا" کا بدل، "ببیں ببیں" اور پھر "بے قراری دارم" بھی کہہ سکتا تھا بالکل سیدھا سادہ مگر نہیں، دارم کے بجائے اُس نے یُوں کہا کہ "مجھے اُس نے بخشی" دارد ـــ م۔ مندرجہ بالا دو لفظوں کی تکرار کا ہی لُطف ایک جگہ اور بھی ہے اور زیادہ بلیغ ہے۔

ببیں ببیں کہ براہت سفید شد چشم بیا بیا کہ ہنوز انتظارہا دارد

"دیکھ تو، تیری راہ تکتے تکتے میری آنکھیں سپید پڑ گئیں۔ آجا، اب بھی آجا کہ ان میں اب تک تیرا انتظار باقی ہے۔" اور پھر اُوپر کے ایک شعر میں جمع کے صیغے "گفتگوہا" نے جتنا مزہ دیا تھا اُس سے "انتظارہا" کہہ کر درد و کرب کے اظہار میں شدّت پیدا کر دی ہے۔

محبُوب سامنے ہوتا ہے اور دیدار کا تمنّائی کثرت جلوہ، شکستگیٔ دِل یا وفورِ مسرّت کسی ایک

وجہ کے تحت دیدار سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہ شعرا کا دلپسند موضوع ہے۔ استغنا کو بھی اس کے رونے نے دیکھنے کی فرصت ہی نہ دی۔ عام مضمون ہے مگر لفظ کہاں کہاں سے لایا ہے اور کیسے مختصر انداز اور سبک بیانی کے ساتھ کہہ گیا ہے۔

در حسرت نگاہ تو ام روبروئے تو از گریہ کہ فرصت دیدن نمی دہد

ایجاز بیان میں شاید فارسی زبان کی مدد بھی شامل رہتی ہے۔ "روبروئے تو" اور "فرصت دیدن" فارسی کی دین ہیں۔

ناصح ملامت کر کر کے میرے پوشیدہ اور گمنام عشق کو مشہور کر رہا ہے۔ اتنی سی بات کو کیا مزے سے کہا ہے :-

ناصح بیصرفہ گو از من ملامت میکند عشق گمنام مرا شہرت کرامت میکند

ناصح کو "بیصرفہ گوئی" کے ساتھ متصف کرنا اور پھر ملامت کے لئے کرامت کا قافیہ مل جانا "شہرت کرامت میکند" (شہرت عطا کرتا ہے) نے شعر کو بنا دیا ہے۔ مطلع میں قافیہ کے لئے استغنا کو اکثر اچھے بولتے ہوئے لفظ مل جاتے ہیں۔

الفاظ کے جوہری کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں :

ع یا انصافت کہ غم خوارہ ایں چنیں یار ایں چنیں باشد

اور ع تماشا دوستم، ساقی قرینم نادر آئینم

کیا خوبصورت تراکیب استعمال کی ہیں ـــ تماشا دوست، ساقی قریں، نادر آئیں!

محبوب کو گل سے تشبیہ بہتوں نے دی ہے اور پھر بہت کچھ کہا ہے۔ استغنا کو بھی دیکھیے میں نے "پیرایۂ گل" کا استعمال کم دیکھا ہے۔

قنادم بے تو اے پیرایۂ گل بپائے گلبنے چوں سایۂ گل

اور پھر اس شعر کی معنویت میں دوسرے مصرعہ کا ایجاز بھی اور اعجاز بھی جس میں "چوں سایۂ گل" کام دے گیا ہے۔

آزاد منش، وارستہ مزاج، انسان دوست، غزل گو شاعر دیر و حرم پر کعبۂ دل کو ہمیشہ ترجیح دیتے آئے ہیں۔ استغنا نے یہاں بھی اپنا اچھوتا پن برقرار رکھا ہے۔ حسنِ اسلوب کا اچھوتا پن! بات وہی کہی ہے مگر الفاظ ایسے لے آیا ہے تو لطف دے گئے ہیں۔

کعبہ و بُت خانہ را بیگانہ میدانیم ما   یا درِ دل یا در میخانہ میدانیم ما

دوسرے مصرعہ میں پہلے مصرعہ کے دو آئیٹموں کے مقابلے پر دو ہی چیزوں کا تذکرہ توازن کے لئے ضروری تھا۔ "درِ دل" دوسرے شاعروں کے یہاں اپنی بات پُوری کر دیتا۔ مگر اُس نے خیال پر ایک اور تازیانہ لگایا اور درِ دل کے بعد ایک دوسرا متبادل درِ میخانہ لے آیا۔ بات بھی بھرپُور ہو گئی اور مصرع بھی رواں دواں ہو گیا۔ مصرع کی روانی الفاظ کے در و بست سے آتی ہے۔ یہ بات پہلے مصرعہ میں بھی ہے۔ "کعبہ و بُت خانہ را بیگانہ"۔ پڑھنے والے کو تیز تیز صاف صاف اور مزے مزے میں اگلے مصرعہ کی طرف لے چلتا ہے۔ جہاں پہلے مصرعہ کے الفاظ آخری حصوں کے ٹکراؤ کے مقابلے میں پہلے حصوں کی تکرار "یا در" مزہ دے جاتی ہے۔

الفاظ کی نشست و برخاست اور ان کی ترتیب سے نغمگی پیدا کرنے کے اپنے فن کا غالباً خوُد شاعر کو بھی احساس تھا۔ ایک غزل میں (اور اس طرح متعدد جگہ) محض ایک لمبی ردیف الفاظ کے حسنِ ترتیب کے سبب مزے دار شعر پیدا کرتی چلی گئی ہے۔

یارِ بہانہ دار من دست منست و دامنت   ناز تو کرد کار من، دست منست و دامنت

گر نہ بری غبار من از دلِ کوئے یار من   گریہ زار زارِ من دست منست و دامنت

اُسی بات کو کہ چرخ کج رفتار کسی کا دوست نہیں، اُلٹے انداز پر اس طرح کہتا ہے کہ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ آسمان کی دوستی کن لوگوں سے ہے تو اُدھر سے ہی کچھ سفارش کرائی جاتی۔

می تواں آورد استغنا سپارش نامہ   چرخ کج رَو را اگر دانیم از یاراں کیست

ایک مضمون بڑا جذباتی قسم کا باندھا ہے کہ معلوم نہیں ایسے میں کہ بہار گلشن کے دروازے پر کھڑی میرے انتظار میں ہے۔ میں ہنوز کس کا انتظار کرتا ہوں۔" اور حسب معمول خوُب کہا ہے:

من انتظارِ کہ دارم ندانم استغنا   بہار بر درِ گلشن در انتظارِ منست

"شکستِ رنگ" کو راز کی پردہ دری کا سبب بہتوں نے کہا ہے اور اچھے اچھے مضمون باندھے ہیں۔ استغنا نے بھی کہا ہے اور اچھا کہا ہے

من شکست دِل ز نامحرم نہاں دارم ولے   از شکست رنگ میترسم کند رسوا مرا

"شکست دِل" نے جان ڈال دی ہے اور اس کے بعد "نامحرم" کا لفظ عام مضمون سے بچا گیا ہے۔ اس لئے کہ مومن کی طرح

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ   تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

زیادہ تر شاعر محبوب کے سامنے ہی رنگ شکستہ ہوتے ہیں۔ استغنا کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ اس لئے شکستِ رنگ موقع محل کو یا دوست دشمن کو نہیں دیکھتی۔ "میں شکستِ دل کو اپنا درد نہ سمجھنے والے سے چھپائے ہی رکھتا ہوں اور شکستِ رنگ سے ڈرتا ہوں کہ مجھے رسوا نہ کردے۔"

اس مضمون کو کہ دوست کے روبرو خاموشی سب سے بہتر گفتگو ہوتی ہے۔ اتنے مختصر الفاظ اور عمدہ اسلوب کے ساتھ ادا کیا ہے:

با غنچہ لبانِ خندہ رُو ہا   خاموش کُنیم گفتگو ہا

پہلے مصرع میں تو صرف محبوب مع اپنے القاب و آداب کے آیا ہے اور یہ "القاب" بھی سب کے سب کار آمد ہیں۔ غنچہ لبی خاموشی کے لئے اور خندہ روئی زبانِ حال سے گفتگو کے لئے کیسے مُناسب الفاظ ہیں۔ اس کے بعد انتہائی مختصر الفاظ میں دوسرے مصرعے میں یہ کہدیا ہے کہ (ان ہنس مکھ غنچہ لبوں سے) خاموش بنے ہوئے گفتگوئیں کرتے رہتے ہیں۔ ردیف بھی مزہ دے گئی ہے۔ گفتگو کی بہ نسبت "خاموش" کے بالمقابل "گفتگو ہا" ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

الفاظ اور تراکیب میں حسن پیدا کرنے میں استغنا ایسا ماہر ہے کہ جہاں چاہتا ہے ذرا سی جُنبشِ قلم سے ایک جہانِ معنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس شعر میں:

نمکِ خندہ ہائے زخم نواز   سینہ چاکاں چشیدنی دارا

پہلا مصرعہ تو پُورے کا پُورا ایک ترکیب میں پرو دیا اور کیسی پُر معنی ترکیب۔ پھر اس پر مستزاد دوسرا مصرعہ جس میں سینہ چاک عاشقوں کو خندہ ہائے زخم نواز کے نمک پر دعوتِ شیراز دی ہے اور دعوت کا بھی کیا لطیف انداز ہے کہ ایک لفظ نے سب کام کر دیا ہے، "چشیدنی" نے!

دلت از کوچۂ آشوب دارِ زُلفِ استغنا۔ رہے در پیش گر دارد رہِ بیمودۂ دارد

استغنا اگر تیرے دل کے لئے زُلفِ یار کے پُر آشوب کوچے میں رہ نوردی پیش ہے تو تجھے اس کی کیا فکر، یہ سب تو تیرے لئے ایسی ہی ہے گویا راہ پیمائی کی ہوئی ہے۔ شعر تغزّل سے معمور عمومی لحاظ سے بڑا ارجائی جذبہ رکھتا ہے۔

خوش نشین شاہ راہِ کعبۂ اُفتادگی　　شکر استغنا کہ چوں نقش جبینم کردہ اند

پہلے مصرع کی رواں دواں بندش قابل داد ہے اور خاص کر اضافتوں کے ذریعہ ایک خوبصورت ترکیب جو بے اختیار ڈھل گئی ہے۔ استغنا کا مرتبہ قابل احترام ہے کہ شاہ راہِ کعبۂ اُفتادگی کے خوش نشینوں نے مجھے ایسا بنالیا ہے جیسے نقشِ جبیں۔

رنگ دارد بوئے دارد نشہ دارد حسنِ گل　　گر کند عزم جہانگیری سپاہے دادہ اند

"پھُول کے حسن کے لئے اس کے پاس رنگ ہے، خوش بُو ہے اور سب کا مجموعی تاثر ایک نشہ ہے جو اس کے متوالے پر طاری ہو جاتا ہے (ایسے ہی محبوب کے پاس سمجھو) اب اگر وہ دُنیا کو فتح کرنا چاہے تو دینے والے نے تو سارا سامانِ سپاہیانہ دے دیا ہے۔"

اور آخری شعر ؎

زِ دوستان و عزیزاں بپرس استغنا　　کہ راہ و رسم نشستن بہم چرا برخاست

"اے استغنا، دوستوں اور عزیزوں کے بارے میں معلوم تو کر: یہ انہیں کیا ہوا ہے کہ ساری قدیم راہ و رسم، جو میل ملاقات کی تھی، نشست و برخاست کی تھی، محبت اور رفاقت کی تھی، وہ سب ختم ہوگئی۔" زمانہ کا مرور کیا کیا اثر ڈالتا ہے۔ لوگ کہاں کہاں بچھڑ جاتے ہیں، کچھ زمانے کے ہاتھوں، کچھ زمانے کے دست نگر، موت کے ہاتھوں۔ فکرِ معاش اور زیست کرنے کی مجبوریاں کس کس کو کہاں کہاں بکھیر دیتی ہیں۔

مندرجہ بالا مختصر اور سرسری سے تعارف کے لئے استغنا کے دیوان کا نسخہ رام پور میرے پیش نظر ہے جس کی کتابی تفصیل یہ ہے: آغاز اس غزل سے ہوتا ہے جس کا مقطع یہ ہے:

ہر دم استغنائے ما گر داند از روئے نیاز
کرد چشم ساقئ ما جانِ ما ایمانِ ما

شعر کی ایک قصیدہ نما غزل میں کسی درباری وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

پیش احرام ایں درگاہ حج اکبر است
عید را قربان شدن بر شاہ عید دیگر است
شاہِ ابراہیم ہمت، پیر اسمٰعیل دِل
کز شرافت کعبہ را ہم سجدۂ او در سر است

استغنا نے جتنی غزلیں کہی ہیں، کسی غزل میں بھی زیادہ شعر نہیں کہے ہیں۔ اچھوتی بحروں کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ دیوان کے سو صفحے ہیں اور کوئی ۴۰۰ اشعر ہیں۔ اس میں مندرجہ بالا دو شعروں کو چھوڑ کے یا ایک رباعی میں ایک مصرع آگیا ہے۔

ع این جشن جلوس شاہ عالم گیر است۔ باقی کہیں اپنے عصر کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ خود اپنے بارے میں، اگر غزل کے شعر کو عمومی تجربات کی عکاسی سے بڑھا کے کہیں کہیں خصوصی انفرادی واردات کا اظہار بھی سمجھا جا سکتا ہے تو اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ تخلص رکھنے میں ہمارا شاعر واقعی مخلص تھا۔ نام اور طبیعت دونوں سے استغنا تھا!

آسماں بے ہودہ لاف کام بخشی میکند　　حاجت خود کے کند اظہار استغناست این

کچھ اسی قسم کی فضا اس پوری غزل میں ہے، خاص کر مطلع کے بعد کے تین شعروں میں:

سر گذشت شمع گفتیم بلبلے گویا نشد　　قصۂ پروانہ سر کردم دل گل وا نشد

در محیط فیض ما را تشنہ دارد آنچو در　　قطرۂ آبے ازیں دریا نصیب ما نشد

موسم و گل رفت و بوئے بر دماغ ما نزد　　گشت آخر صد بہار و فکر یک سودا نشد

کار مردم نیک شد در روزگار بدنواز　　شکر میگوئیم استغنا کہ کار ما نشد

مطلع میں تو فن کاری زیادہ ہے اظہار حال کم۔ کہتا ہے کہ بلبل کے سامنے گل کے متبادل محبوب شمع کا تذکرہ کیا، اُسے کچھ بھی پتہ نہ چلا اور گل کے سامنے بلبل کے بجائے شمع کے عاشق پروانہ کا قصہ چھیڑا تو اس کے دل کے تاروں میں کوئی جھنکار نہ ہوئی۔ محذوف مطلب یہ ہے اور اگر واقعی یہی ہے تو بہت اعلیٰ درجہ کا ہے کہ ساری محبتیں اضافی ہیں، اپنے اپنے محدود حلقے ہیں، محدود پسندیدگیاں ہیں۔ اپنی اپنی نظر ہے اور اپنا اپنا منظور نظر!

مطلع کے بعد کے اشعار غالباً اظہار واقعہ کے ذیل میں آتے ہیں جن سے یکسر محرومی کا اظہار ہوتا ہے اور اس محرومی پر وہ نازاں ہیں کہ "روزگار بدنواز" کے احسان سے بچ گیا۔

ایک جگہ ردو میں اپنے مخصوص طرز شعر گوئی کے بارے میں بھی کہہ گیا ہے کہ پیچیدہ گوئی کا مجھے مرض ہے۔

گہے کاکل گہے خط گاہ زلف یار می بندد

خیالم معنیٔ پیچیدہ را بسیار می بندد

"معنی پیچیدہ کی بندش" کی مثالیں ابھی پیش ہوئیں۔ اس ذیل میں دو قسم کے شعر آئیں گے۔ ایک پرانے مفاہیم کی نئی صیقل گری اور دوسرے ہر مضمون کو ذرا پیچ کے کہنا یا سامنے کی بات کو اُلٹ پھیر سے کہنا۔

دوسری خصوصیتِ شعری، جس کا ذکر ضروری ہے، جس میں استغنا صائب سے آزاد یا اس کی پیروی میں تمثیلی انداز اختیار کرتا ہے، یہ تمثیلیہ اشعار اس کثرت سے ہیں کہ اس کی ایک مستقل خصوصیت بن گئے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کی مثالیں بھی آپ کے سامنے آئیں۔

اور تیسری خصوصیت اس کا حسنِ بیان اور الفاظ کے دروبست اور انہیں آگے پیچھے موزوں نشست پر بٹھا کے مجموعی صوتی اور معنوی حسن پیدا کرنا ہے۔ اس ذیل میں اکثر اس کے مطلعے اتنے سبک اور ڈھلے ہوئے نکل آتے ہیں اور دونوں مصرعوں کے قافیے ایسے سج جاتے ہیں کہ شاعر کی فن کاری کو داد دینا پڑتی ہے۔ مختصر سا شاعر ہے، اس کا یہ مختصر تعارف ہی فی الحال کافی ہوگا۔

جموں و کشمیر کے

ادیبوں کی ہندی تخلیقات کے دو نمائندہ انتخابات

گدیانجلی اور پدیانجلی

جن میں ریاستی ادیبوں کے نام سے نکلی ہوئی
ہندی کے منظوم اور نثری ادب کی نمائندہ
نگارشات جمع کی گئی ہیں

تفصیلات کے لئے

جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

کائناتِ کُلِ نغمہ

(فراق سے ایک گفتگو)

آپ نے کبھی فراق کی باتیں سُنی ہیں ؟

گھر پر چائے کی صحبتوں میں، ادبی و علمی نشستوں میں، دورانِ سفر میں، کافی ہاؤس میں، غرضیکہ مختلف جگہوں اور مختلف مواقع پر جن لوگوں نے فن و ادب، تاریخ و فلسفہ، کلچر اور سیاست اور علوم و فنون کی دیگر شاخوں سے متعلق فراق کو یوں ہی رواروی میں بھی کچھ کہتے ہوئے سُنا ہوگا وہ اچھی طرح یہ سمجھتے ہوں گے کہ فراق محض زُلفِ شعر کے اسیر نہیں بلکہ علم و فن کے ہر شعبے پر کیسی گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔

گذشتہ پندرہ بیس برس میں مختلف موضوعات سے متعلق فراق کے متعدد انٹرویو منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ زیرِ نظر گفتگو فراق کے نظریات فکر و فن پر مشتمل ہے جس میں ان کے منفرد طرزِ فکر اور مخصوص اندازِ نظر کا عکس بہت واضح خطوط میں نظر آتا ہے۔

شمیم : فراق صاحب! اُردو شاعری سے متعلق آپ کے وُہ کون سے تاثرات تھے جنھوں نے آپ کو اس اجتہاد اور نئے عناصر کی آمیزش کی طرف مائل کیا جو آپ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں ؟

فراق : اب سے نصف صدی پہلے جب میں نے شاعری شروع کی تو مشاہیر ہی نہیں بلکہ نسبتاً کم مشہور اور بااوقات بالکل معمولی حیثیت کے شاعروں کے کئی اشعار مجھے بہت پسند آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مبہم مبہم سا ایک دوسرا ردِ عمل بھی میرے اندر ہوتا رہا اور یہ ردِ عمل ناآسودگی کا ردِ عمل تھا۔

شمیم : اس ناآسودگی کے اسباب کیا تھے ؟

فراق : میرے مزاج کے بُنیادی عناصر ہندوستان کی قدیم اور مرکزی ثقافت و فکریات کی دین تھے۔ قدیم ہندوستان کے ان ثقافتی، فکریاتی اور وجدانی عناصر کا اور ان سے پیدا ہونے والے

لب ولہجہ کا قریب قریب فقدان مجھے اُردو کے عظیم سے عظیم شعرا کے یہاں نظر آتا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے میر کے کلام کا ایک حصّہ تو بڑی حد تک آسودہ کرتا تھا۔ تھوڑی بہت آسودگی اور تشفّی میر کے ہم عصر صفِ دوم کے شعرا کے کلام سے بھی ہو جاتی تھی لیکن غالب کے کلام کے قیمتی سے قیمتی عناصر کو قیمتی سے قیمتی چیز مانتے ہوئے میں ایک نازک اور حسین غیریت کا احساس کرتا تھا۔ انیس کی کائناتِ شاعری بھی والمیک، کالی داس، تلسی داس اور دیگر اکابرِ ادب کی تخلیقوں سے مختلف نظر آتی تھی۔ اقبال کا لب ولہجہ عام طور پر مجھے قدیم ہندوستان کی قیمتی سے قیمتی دین سے لڑائی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت نرمی اور قوت کی وحدت ہے۔ نرمی چھوڑ کر جب قوتِ پیغامِ عمل یا ترجمانیٔ حقیقت کی شکل میں نمایاں ہوگی تو وہ قوت ہندوستانی تہذیب کے لئے قابلِ قبول نہیں رہے گی۔ میں نے نرمی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر میں سنسکرت کا لفظ شانتی یا سنسکرت علمِ بلاغت کے فقرے شانتی رس اور پرسادرس استعمال کروں تو میرا مفہوم اور اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ ان دو رسوں کا قریب قریب فقدان اقبال کے کلام میں، ان کے وجدان کے اجزائے ترکیبی میں اور ان کی شاعری کی رُوح میں محسوس کر کے مجھے عمر بھر شدید ناآسودگی کا احساس رہا۔ نرمی اور شانتی کو چھوڑ کر قوت صرف اکھڑپن بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بات کلامِ اقبال کے صرف ایک حصے میں ہے۔ ان کے اُردو و فارسی کلام میں کلاسیکی ادب کی توانائی اور صحت مندی اور دیگر محاسن بھی ہمیں ملتے ہیں۔ میں ان کے کلام کے وجدانی حصے کا قائل ہوں، پیغامی حصے کا نہیں۔ رہے وہ مشاہیرِ شاعری، جن کا چرچا میری جوانیوں کے زمانے میں گھر گھر تھا، مثلاً داغ، امیر، جلال اور ان سے کچھ پہلے کے مشاہیر۔ ان بزرگوں کا کلام عموماً ان کے اچھے سے اچھے اشعار میں ایک نظر فریب سطحیت ہو کر رہ جاتا تھا۔ کم از کم میری نظر میں!

شمیم: شروع سے لے کر اقبال تک کی اُردو شاعری میں جس کمی کا آپ نے احساس کیا، اس کے متعلق آپ نے صرف یہ بتایا کہ ہندوستانی فکریات اور وجدان اور ہندوستان کے مزاج کی نمایندگی اُردو شاعری یا تو کرتی ہی نہیں تھی یا اگر کسی قدر کرتی بھی تھی تو نہایت ناقص انداز میں۔ ان ثقافتی، فکریاتی اور وجدانی محسوسات و محرکات کی کچھ وضاحت بھی فرما دیجیے؟

فراق: آپ کے سوالات اور میرے جوابات سے ہند و پاک کے بہت سے ذکی الحس احباب کو بدگمانی اور غلط فہمی ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے پہلے میں اس خطرے کی کچھ پیش بندی کر دوں۔ اس امر کا اعلان کر کے کہ اُردو شاعری میں بہت سی باتیں اور چیزیں قدرِ اوّل کی ہیں۔ اور نظم ہو

یا غزل ان کے اچھے اشعار اور اچھے حصے ہمارے لئے بیش بہا ثقافتی ورثہ اور دولت ہیں۔ اُردو شاعری کی بہت سی خوبیوں کا بالاعلان اعتراف کرنے میں تامّل کرنا یا کترانا میں جہالت اور خباثت سمجھتا ہوں۔ اگر ہم کالی داس کو اپنے وجدان سے رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب سمجھیں تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہوئے کہ شیکسپیئر یا ہومر یا میر و غالب کے کلام کی جگمگاتی ہوئی روشنی سے ہم آنکھیں بند کرلیں۔ ادب میں ترجیح کی جگہ ضرور ہے لیکن اخراج کے لئے جگہ نہیں ہے۔

شمیم : فراقؔ صاحب! آپ کی بصیرتِ نظر کا ایک زمانہ قائل ہے۔ یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ اُردو زبان و ادب سے آپ کو والہانہ پیار ہے۔ پھر بھی آپ عموماً اچھی سے اچھی اُردو شاعری سے بھی ناآسودگی کا احساس کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

فراقؔ : اس ناآسودگی کا میں تنہا قصوروار نہیں ہوں۔ کیا میرؔ کو انشاؔ اور رنگینؔ اور بہت سے سنجیدہ لکھنے والوں کے کلام سے ناآسودگی نہیں تھی؟ کیا غالبؔ ذوقؔ کے کلام سے اسی حد تک متاثر تھے جس حد تک اس زمانے کے عوام و خواص متاثر تھے؟ اقبالؔ نے تو حافظؔ تک کو گوسفند کہہ دیا تھا ہر شاعر جو اپنی زبان میں کچھ گراں قدر اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک باغی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ایسا باغی نہیں کہ قیمتی روایتوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دے بلکہ ایسے شعرا کا کلام ایک باغیانہ اور خلاقانہ تقلید ہوتی ہے۔

شمیم : تو کیا آپ کی بغاوت کی نوعیت بھی وہی تھی جو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں اُردو شاعری کی گذشتہ روایات سے ان کے انحراف میں نظر آتی ہے؟

فراقؔ : جی نہیں! میری بغاوت کی نوعیت کافی بدلی ہوئی تھی۔ اس کی مفصل وضاحت تو ایک طویل داستان ہوگی لیکن جیسا کہ اجمالاً عرض کرچکا ہوں، ہندوستان کی قدیم ثقافت اور وجدان کی کارفرمائی اور اس کی جھلکیاں مجھے اُردو شاعری میں نہیں ملتی تھیں اور بہترین اُردو شاعری میں بھی نہیں ملتی تھیں اور دوسرے ہر لحاظ سے اُردو کی بہترین شاعری میرے کلیجے کے ٹکڑوں کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب میں رواروی میں ان کمیوں کی طرف اشارہ کروں گا جن کا احساس مجھے اُردو کی بلند ترین اور درخشندہ ترین شاعری کے باوجود ہوتا رہا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مذہب و ملّت و سیاست اور سماجیات کے تمام اہم پہلوؤں سے کہیں زیادہ قیمتی میرے لئے گھر اور گھریلو زندگی سے متعلق وجدانی کائنات کی اہمیت رہی ہے۔ ڈیوڑھی،

آنگن، چولہا چکی، کھانے پینے کے برتن، روزانہ استعمال کی دوسری چیزیں، گھر میں بچوں، عورتوں اور دیگر افراد کی باہمی جذباتی یک جہتی، صدہا رسوم، گھر کے رات دن، غرضیکہ گھر اور گھریلو زندگی سے متعلق چھوٹی سی چھوٹی جزویات کی پاکیزگی اور ان سے ہم آہنگی کا احساس میں قدیم ہندوستانی ثقافت کی بہت بڑی دین سمجھتا ہوں۔ جہاں تک اس بیش بہا دولت کا تعلق ہے اُردو شاعری میں سناٹا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں اس کی کچھ جھلکیاں میر انیس کے مرثیوں میں مِل جاتی ہیں۔ کہیں کہیں نظیر اکبر آبادی کے یہاں گھربار کی تصویر کشی ہوئی ہے لیکن ایک تو اس قسم کی شاعری یا گھر کا موضوع اُردو شاعری میں بہت ہی کم آیا ہے اور اگر آیا ہے تو اس میں وہ معصومیت، وہ ٹھیٹھ اور مترنّم انسانیت، وہ رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی بات نہیں ملتی جس کی نشان دہی شروع ہی سے ہندوستان کا ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کرتے رہے ہیں۔ گھریلو زندگی کے آدرش ہی زندگی اور شاعری کو تکلّف اور تصنع کی جکڑ بندیوں سے آزاد تہذیب کی دولت ہمیں دیتے ہیں۔ اُردو شاعری میں نہ کافی مقدار میں بچوں کا ذکر ہے نہ پالنے کا۔ نہ ان معصوم غموں اور خوشیوں کا نہ اس چمکار اور پچکار کا، جو ماں کی ممتا یا ایک گھر والوں کے باہمی تعلقات اور جذباتی قرب و ہم آہنگی میں پایا جاتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ غزل میں بالتفصیل اور بالتخصیص گھریلو زندگی کی پاکیزگیوں اور اس کی شعریت یا وجد آفرینی کا ذکر کرنا ممکن ہے۔ لیکن گھر والوں سے محبّت جس شعور اور لب و لہجہ کو پالتی ہے وہ شعور اور لب و لہجہ غزل میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ تفصیل و تخصیص کے ساتھ گھریلو زندگی رُباعیوں اور نظموں میں اُجاگر کی جا سکتی تھی۔ اُردو شاعری میں یہ بڑی کمی رہی۔

دوسرے یہ کہ مادّی دُنیا اور مناظرِ قدرت و حُسنِ فطرت کی سطحی مصوّری یا فوٹو گرافی تو اُردو شاعری میں کافی مِل جاتی ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن مادّے کی رُوحانیت کا احساس، مناظرِ قدرت کی رمزیت، انسانی زندگی سے ان مناظر کی ہم آہنگی، انسان اور فطرت کا باہمی قرب اور باہم ہم رشتگی اور وابستگی، ان کی داخلی یکسانیت اور اس یکسانیت، قرب اور ہم آہنگی سے جو قوتِ شفا ہماری زندگی اور ہمارے وجدان کو مِلتی ہے وہ عربی، فارسی اور اُردو شاعری میں بالکل غائب غلّہ ہے جسے انگریزی میں Nature Worship

کہتے ہیں۔ اس کا پتہ اُردو شاعری میں نہیں ہے۔ ہندوستان کا وجدان ایک ایک پتی میں، چراغ کی ایک لو میں، ہوا میں، آگ میں، پانی میں، مٹی میں، کھیتوں، باغوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں، دن اور رات کی نظر کے سامنے سے گذرتی ہوئی تصویروں میں اپنی رُوح کا عکس دیکھ لیا کرتا تھا اور انسان کو اس وجدان نے فطرت کا راز داں بنا لیا تھا۔ پُوری کائنات انسان کے لئے ماں کی گود بن گئی تھی۔ کالی داس کی نظم میگھ دوت یا ناٹک شکنتلا یا جس چمکار کے ساتھ رامائن میں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں کا ذکر آیا ہے، ٹیگور کی نظموں میں گھریلو زندگی کے ساتھ ہم آہنگی اور مناظرِ فطرت کے ساتھ جس اپنائیت اور قرب کا ذکر آیا ہے۔ جس لہجے میں بنکم چندر چیٹر جی کی نظم بندے ماترم میں سرزمینِ ہند کے پھلوں، پھولوں، ندیوں اور دیگر اہم جذبات کا ذکر آیا ہے۔ ان تمام باتوں کا فقدان اُردو شاعری میں مجھے بہت کھٹکتا تھا۔

شمیم: آپ نے اپنی شاعری میں اس کمی کو پُورا کرنے کے لئے جو کچھ کیا، کچھ اس طرف بھی اشارہ کرتے چلئے؟

فراق: ابھی میں اُردو شاعری میں ہندوستان کی سدا بہار ثقافت کی جو دائمی قدریں نہیں ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں، انہیں گنوا نہیں چکا۔ لیکن اچھا ہی ہوا کہ آپ نے بیچ میں یہ سوال کر دیا۔ میں نے اندازاً بیس ہزار اشعار غزلوں میں کہہ ڈالے۔ جیسا بتا چکا ہوں، صنفِ غزل کے لوازم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان چیزوں اور باتوں کا براہ راست ذکر تو غزلوں میں نہیں آسکتا جن کی کچھ وضاحت ابھی ابھی کر چکا ہوں لیکن گھریلو زندگی سے جس تہذیب، کردار اور وجدان کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اس تہذیب یا کلچر سے ایک لب ولہجہ پیدا ہو جاتا ہے جس میں نرمی، معصومیت، ٹھہراؤ یا سکون، آہستہ روی اور دوسروں سے ہم آہنگی یا قرب کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ گھر خیر و برکت کا مرکز ہے۔ گھر صرف جسم کا نہیں بلکہ رُوح کا گہوارہ ہے۔ ستاروں کے آگے جو جہاں ہیں ان سے گھر کا مقام کہیں بلند ہے۔ تو میری غزلوں میں یہی جو رُوح گردش کر رہی ہے، ان سے جو فضا پیدا ہوتی ہے جو طمانیت اور راحت گھر کے تصوّر میں ہے ان تمام محرکات کو میں نے اپنی غزلوں میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ مجھے اپنی غزلوں کو مغائرت یا غیریت

بیرونیت اور خارجیت سے بھی بچانا تھا اور بیمار قسم کی داخلیت سے بھی۔ مجھے اپنی غزلوں میں ایک ایسے سہانے پن کو پیدا کرنا تھا جو نُور کے تڑکے میں ہوتا ہے۔ سکوتِ نیم شبی میں ہوتا ہے، فطرت کے پس منظر اور پیش منظر میں، گھر اور گھریلو زندگی میں ہوتا ہے اور جنسی زندگی کے ایسے شعور میں ہوتا ہے جو رام اور سیتا، نل دمینتی اور ساوتری ستیہ وان، رادھا اور کرشن، میگھ ناتھ اور سلوچنا، شیو اور پاروتی اور ہندوستانی ثقافت کے پیدا کردہ مرد و زن کے باہمی تعلقات میں زندۂ جاوید کر دیا گیا ہے۔

روپ کی رباعیوں میں پہلے پہل اُردو شاعری گھریلو زندگی کے گھریلو پن، رنگینی، دِل کشی، سداسہاگ دوشیزگی، طہارت، عظمت اور دیویت کا احساس کراتی ہوئی نظر آئے گی اور سُنائی دے گی۔

کاش میں تقریباً ایک ہزار غزلیں کہنے کے علاوہ اپنی پسند کے اور اپنے آدرشوں کے مطابق سَو نظمیں بھی کہہ لیتا! خیر! اس طرح کا افسوس تو مجھ سے بھی بڑے کچھ شاعروں کو رہا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کے علاوہ کیا کیا اور لکھتے۔ لیکن آدھی رات، پرچھائیاں، دھرتی سنگیت، ہیگنو اور ہنڈولہ میری وہ نظمیں ہیں جن میں اور بہت سے دیگر عناصر کے علاوہ مناظرِ قدرت کا جو احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ ہندوستان کی ثقافت اور وجدان سے جس قدر ہم آہنگ ہیں، اس کی دوسری مثال اُردو شاعری میں کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ اُردو شاعر کو خیالات میں ڈوبنا تو خوب آتا ہے لیکن زمین میں سمانا، فضا میں تحلیل ہو جانا، مناظرِ قدرت کی تہ در تہ رمزیت میں ڈوب جانا ذرا کم ہی آسکا ہے۔ حال ہی میں نے اے مادرِ ہند کے عنوان سے سَو مسلسل رباعیوں کی شکل میں جو نظم کہی ہے، مجھے اُمید ہے کہ اس میں ہندوستان کے حقیقی وجدان و فکریات اور آدرشوں کی بہت سی جھلکیاں ملیں گی۔

شمیم: اُردو شاعری میں جن قدروں کی کمی رہی ہے ان میں سے دو پر آپ روشنی ڈال چکے، کیا کسی اور کمی کی طرف بھی آپ اشارہ کریں گے؟

فراق: کہا گیا ہے کہ دُنیا بھر کی ہر زبان اور ہر زمانے کے ادب میں عشق یا محبّت کی حیثیت ایک جابر حکمران کی رہی ہے۔ اگر ہم دُنیا کے ادب سے جنسی محبّت والا ادب خارج کر دیں تو یہی نہیں کہ کائناتِ ادب سونی اور ویران ہو کر رہ جائے گی بلکہ جو حصّہ بچ رہے گا، یعنی غیر

عشقیہ وہ بھی اپنا رس جس بہت کچھ کھو بیٹھے گا۔ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی روایتوں نے جیسا عشقیہ ادب ہمیں اور دُنیا کو دیا ہے وہ نہایت بلند اور پاکیزہ ہے اور انسان کے دِل میں گھر کر لینے والا ادب ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستان سے باہر کا عشقیہ ادب غیر معمولی عظمت کا حامل نہیں ہے۔ Divine Comedy میں دانتے نے بیٹرآیس کا جو کردار اور تصور پیش کیا ہے، فاؤسٹ میں گرٹا نے مارگریٹ کے کردار میں نسائیت اور دیویت کی وحدت جس طرح دکھائی ہے، شیکسپیئر نے جو زندۂ جاوید تصویریں عورتوں کی پیش کی ہیں اور اسی طرح ایران اور دیگر ممالک میں جو بلند ترین عشقیہ شاعری ہوئی ہے، یہ سب آفاقی ادب کی امر تخلیقیں ہیں۔

رہی ہماری اُردو۔ مجھ سے پہلے سب سے بڑی تعداد میں بہترین عشقیہ اشعار میر اور صرف میر کے یہاں ملتے ہیں۔ غالب کے اُردو کلام میں جو عشقیہ اشعار ہیں ان کی نزاکت، لطافت، صداقت اور ان کے بانکپن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان میں انفعالی کیفیت بہت کم ہے۔ احترام حُسن کا جذبہ بھی ان کے عشقیہ اشعار کا غالب عنصر نہیں ہے۔ بجائے ہم آہنگی کے مغائرت کا پہلو غالب کے عشقیہ اشعار میں جھلک رہا ہے۔ لیکن میں کسی ایک خیال کا شکار نہیں۔ غالب کے عشقیہ اشعار بہت کم ہیں۔ پھر بھی ہم کسی قیمت پر اپنے آپ کو ان سے محروم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اُردو کے اچھے عشقیہ اشعار صرف میر اور غالب کے یہاں نہیں ہیں۔ معمولی غزل گویوں نے بھی ایسے جادُو بھرے عشقیہ اشعار کہے ہیں کہ ان کا جادُو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری میں عشق کا لفظ جنسی محبّت کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا بہت آگے نِکل گیا ہے۔ اُردو کے عشقیہ اشعار جنسیت کی سرحدیں توڑتے ہوئے یا ان سے بلندم اٹھتے ہوئے ایک پورا فلسفۂ زندگی مُرتب کرتے ہیں۔ کاش کوئی ایسے جواہر پاروں کا بلند نظری سے ایک انتخاب شائع کر دیتا یا مُرتب کر دیتا! بات چیت کے دوران میں، میں صرف ایک مثال دونگا۔ آسی غازی پوری کا شعر ہے ؎

تمہیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مُشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہ کن کیوں ہو

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اُردو غزلوں کے چھپے ہوئے دواوین میں بھی عشقیہ اشعار خصوصاً ایسے عشقیہ اشعار، جن کا موضوع جنسی محبّت ہے اور جو تاثیر سے بھر بھر رہے ہیں، معمولی اشعار کی بھرمار میں دب کر رہ گئے ہیں۔ اس باب میں جو کمی تھی، اُسے سینما نے پُورا کر دیا اور اس طرح اُردو

کی عشقیہ شاعری سستے پن اور پستیوں کا شکار ہو گئی۔

شمیم: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عشقیہ شاعری کو سنوارنے اور پھر سے رچانے کی کوئی کوشش اُردو شعرا نے نہیں کی؟

فراق: جب میری شاعری نے آنکھیں کھولیں تو داغ و امیر کی آواز بازگشت کی آخری گونجیں فضا میں سُنائی دے رہی تھیں، لیکن نئی آوازیں بھی کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری، عزیز لکھنوئی اور ان کے متعدد ہم نواؤں نے پُر خلوص، مترنم اور پر تاثیر عشقیہ شاعری شروع کر دی تھی۔ حسرت نے بھی عشقیہ شاعری کی آواز اور آہنگ کو بدلا۔ یگانہ، فانی، اصغر اور جگر نے بھی عشقیہ شاعری کی نشاۃ الثانیہ کی قابلِ قدر نمایندگی کی۔ اس صدی کے اوائل میں حالی نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ کام کر کے رہی۔

شمیم: آپ نے اپنے خیال کے مطابق اپنی عشقیہ شاعری میں کن مخصوص مقاصد اور نظریات کی ترجمانی کی؟

فراق: یہ ایک مستقل موضوع ہے جو تفصیل و طوالت چاہتا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں سوچتے سوچتے میں خود تھک تھک کر رہ جاتا ہوں۔ بہر حال مختصراً اور اجمالاً میں یہی کہوں گا کہ نار کو نور میں بدل دینا، شر کو خیر میں بدل دینا، تکلف کو برطرف کر کے معصومیت اور خلوص کو عشقیہ شاعری میں جگہ دینا میری مسلسل کوشش رہی ہے۔ جنسی تعلقات کی رمزیت، پاکیزگی بلکہ روحانیت اور ان ذرائع سے تعمیرِ انسانیت میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے — ہندوستان کی قدیم ثقافت اور ہندوستان کی عشقیہ شاعری میں جو مخصوص سوز و گداز ہے اُسے میں نے اُردو غزل میں منتقل کرنا چاہا ہے۔ بیک وقت شاہدِ حُسن کی انسانیت اور دیویت کا احساس میرے بہت سے عشقیہ اشعار میں ملے گا۔

اس وقت مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ شعر العجم میں ہندوستان کے فارسی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نے کہا ہے اور بہت واضح طریقے سے کہا ہے کہ ہندوستانی ثقافت اور روایات نے جس پاکیزگی اور معصومیت، جس نرمی اور نرم آہنگی اور خیر و برکت کے عناصر سے اپنے آپ کو مالا مال کر رکھا تھا وہ ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام میں روح و رواں کی طرح یوں جاری ساری نظر آتے ہیں کہ حافظ اور سعدی کے یہاں بھی اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ محض حُبِّ وطن

نے شبلی سے یہ بات نہیں کہلوائی بلکہ نازک تنقیدی بصیرت نے۔ ہندو مزاج ایک لحاظ سے انتہائی حد تک مذہبی مزاج ہے لیکن دوسرے لحاظ سے یہ مزاج بالکل غیر مذہبی ہے۔ اسے ہندوستان کی مٹی نے، آب و ہوا نے، فضا نے، جغرافیائی مناظر نے، کھیتوں کی سوندھی خوشبو نے، ہندوستان کی ٹھنڈک اور گرمی نے اور پُر امن زراعتی زندگی نے، اُس سانس نے جو ہندوستان ہی کی فضا میں لی جا سکتی ہے، جنم دیا ہے اور اسی مزاج نے ہندوستانی ثقافت کی تخلیق کی ہے۔ اس مزاج کو اپنا کر کوئی غیر ہندو اپنے دین و مذہب سے بجائے دُور ہونے کے اور قریب تر آجائے گا اور ہندوستان سے بھی قریب تر ہو جائے گا۔

اسی مزاج کی ترجمانی کرنے کی کوشش میں نے اپنی غزلوں میں کی ہے۔ خواہ میرے منتخب اور متفرق اشعار کے ذریعہ آپ میری شاعری کو پرکھنا چاہیں یا اس مجموعی اثر کے ذریعہ پرکھنا چاہیں جو میری غزلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ میری عشقیہ شاعری ایک ایسی طمانیت اور آسودگی کی حامل ہے جو بے صبری، نا آسودگی، سطحی ہیجان اور محض ماورائی خیال آفرینیوں کا نعم البدل ہے۔ میں نے خلوص اور معصومی کے الفاظ کئی بار اس دورانِ گفتگو میں استعمال کئے ہیں لیکن خلوص اور معصومیت کو گہری معنویت دینا، اُسے تہہ در تہہ بنانا، بلند ترین فکریات کو اس میں سمو دینا، اپنی آواز کو ایک سوچتی ہوئی آواز بنا دینا اور شعور میں ایک پُر سکون تھرتھراہٹ پیدا کر دینا اور ان سب کے ساتھ ساتھ ایک دائمی سوز و ساز پیدا کر دینا۔ یہی رہی ہیں میری کوششیں!

شمیم: آپ کے نزدیک غزل کا موضوع کیا صرف جنسی محبت ہے؟

فراق: جنسی محبّت کے موضوع کو غزل میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ جنسی عشق سے متعلق شاعری ایک نردبان کی حیثیت رکھتی ہے اور تدریجی ارتقا کا اس شاعری میں بہت بڑا امکان ہے۔ انسانی جمال سے پیدا شدہ تصوّرات و محرکات ترقی کر کے جمالِ آفاق اور جمالِ حیات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور نئی معنویت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن فارسی اور اُردو غزلوں میں صدہا نہیں، ہزارہا ایسے بلند ترین اور لطیف ترین اشعار بھی ملتے ہیں جن کا تعلق جنسی محبت سے نہیں ہے۔ آغازِ عالم سے اب تک کے تمام مرکزی، دائمی اور انسانیت گیر تصوّرات غزل کے موضوع ہیں۔ صرف عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی نہیں۔ مثالیں دینا شروع کروں تو یہ

بات چیت ایک دفتر بن جائے گی۔ اُردو غزل میں نازک ترین، لطیف ترین، بلند ترین جو غیر عشقیہ اشعار ہیں، ان کا بھی کوئی مجموعہ مُرتّب ہوجائے تو ادب کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

شمیم: اپنی شاعری کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف بھی میری خواہش ہے کہ آپ اشارہ کریں؟

فراق: اُردو شاعری ایک ایسی چیز رہی ہے جسے ہم چاہیں تو پنسل اسکیچ یا صرف ایسے نقوش کہہ سکتے ہیں جن میں لمبائی اور چوڑائی تو ہے لیکن حجم یا جسامت کی کچھ مثالیں میرے علاوہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی خال خال مِل جاتی ہیں۔ مصحفی نے احساسِ جسم اپنے کئی اشعار میں کرایا ہے اور محبوب کا بدن اور اس کا گداز، اس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ مصحفی کے کئی اشعار کا موضوع رہا ہے۔ پھر نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی ایسے بند مِل جاتے ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو کرداروں کا جسم چھوتے ہوئے پاتے ہیں۔ جوش کے کئی اشعار اس لحاظ سے بھر پور ہیں۔ میں نے روپ کی رباعیوں میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ ہم موضوعِ شعر کو صرف سمجھیں نہیں بلکہ انہیں چھوئیں اور اپنی گرفت میں لے سکیں۔ جس طرح چٹانوں کو کاٹ کر جو مندر بنائے گئے ہیں یا ہندوستان میں جو بُت گری کی گئی ہے یا ہندوستانی مصوّری میں بھی جو سہ پہلوی صفت ملتی ہے اسی طرح میں نے لمسیاتی حس کو آسودہ کرنے کی کوشش روپ کی رباعیوں میں کی ہے۔

اب سے بیس برس پہلے کی بات ہے جب ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جون کی گرمی زندگی اور زمین کو پھونک رہی تھی۔ لوگ بھُنے جاتے تھے۔ ایک مختصر سی صحبت میں احباب کے اصرار پر میں اپنے کچھ اشعار سُنا رہا تھا۔ باہر چنگاریاں برس رہی تھیں اور اندر بھی گرمی کی تیز آنچ ہر ایک کو لگ رہی تھی۔ میرے اشعار سُنتے سُنتے (اب یاد نہیں آتا کہ وہ اشعار کیا تھے) ہم لوگوں کے ایک مسلمان دوست اس طرح کانپ اُٹھے گویا انہیں کڑاکے کا جاڑا کاٹنا پڑ رہا ہے اور بول اُٹھے کہ شدید سردی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے اشعار نے چلچلاتی دوپہر میں یہ سماں پیدا کر دیا تھا۔ ٹھنڈک اور تراوت کا احساس مادّی اور رُوحانی دونوں معنوں میں میرے بہت سے اشعار میں ملے گا۔ میرے ایک محبوب دوست نے اسی خصوصیت کے لحاظ سے مجھے مشورہ دیا کہ اپنی غزلوں کے پہلے مجموعے کا نام میں شبنمستاں رکھوں۔ اُردو شاعری کو اب سے اندازاً چالیس برس پہلے تک ایسا لگتا تھا کہ بُخار چڑھا ہوا ہے اور کبھی کبھی سرسامی کیفیت

بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی شاعری میں اسی نُجار کو اُتارنا چاہا ہے۔

شمیم: شاعری میں زبان یا اسلوب سے متعلق آپ کے کیا خیالات رہے ہیں؟

فراق: زبان کا ایک خارجی پہلو ہوتا ہے اور ایک داخلی۔ داخلی پہلو کا تعلق لُغت اور قواعد سے ہے اور درس و تدریس سے۔ لیکن داخلی پہلو کا تعلق شاعر کے انفرادی وجدان و محسوسات سے ہے۔ انفرادی درک و وجدان کو عالم گیر ہونا چاہیئے۔ یہاں شاعر اپنے آپ کو اُس وقت پاتا ہے جب انسانیت کے وجود میں اور اس کے ماضی و حال میں اور ممکن ہو تو اس کے مستقبل میں بھی اپنے آپ کو تحلیل کر دے۔ تہذیب اور جبلّتیں مِل کر جب ایک ہو جاتی ہیں اُس وقت وجدان کی تکمیل ہوتی ہے۔ کامیاب شاعر وہ ہے جو اپنی زبان میں شعر کہے اور ہر ایک یہ محسوس کرے کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے۔" لیکن یہ دِل بھی ایک عجیب بلا ہے۔ دِل بھی ایک تہہ در تہہ چیز ہے۔ جب داغ اپنے اشعار رام پور میں سُناتے تھے تو لوگ پھڑک اور تڑپ اُٹھتے تھے بلکہ ہندوستان بھر کا یہی عالم ہوتا تھا۔ لیکن داغ اور ان کے معاصرین کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ ان کی آواز دِل کی بھیتری رگوں اور آخری تہوں کو نہیں چھُوتی بلکہ دِل کی سطحوں پر پھسلتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ زبان اور اسلوب سے متعلق میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ زبان کے خارجی حصے کو یعنی لغت کو داخلی حصے کا ترجمان بنا دیا جائے۔ لغت میں جنم لے چکنے کے بعد شاعر کی تخلیقوں میں الفاظ کو پھر سے جنم لینا چاہیئے اور عام الفاظ میں مخصوص خط و خال اور مخصوص آواز اور تحت الالفاظ صفات پیدا ہو جانی چاہئیں۔ لفظوں و فقروں اور شعر کی صوتیات کی ایک شخصیت رُونما ہونی چاہیئے اور یہ شخصیت بھی بیک وقت نُمایاں اور تہہ دار ہونی چاہیئے۔

آپ مُنہ کا لفظ لے لیجیئے۔ کتنا عام اور معمولی لفظ ہے۔ اب میر کا یہ شعر سُنیئے ؎

آئنہ خانہ ہے یہ سارا جہاں
مُنہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

یہ کون سا مُنہ ہے؟ کس کا مُنہ ہے؟ اور کیسا مُنہ ہے؟ اور نظر آنے کا کیا مفہوم ہے؟

اب میرے چند شعر سُنیئے ؎

شام کے سایئے گھلے ہوں جس طرح آواز میں
ٹھنڈکیں جیسے کھنکتی ہوں گلے کے ساز میں

آواز میں شام کے سائے کا گھل جانا، یہ عام الفاظ کا مخصوص اور انفرادی استعمال ہے۔ ٹھنڈکوں کی کھنک کس نے سُنی ہے؟ لیکن ایک لطیف احساس کو میں اسی طرح بیان کر سکتا تھا۔ بے وفائی کو دُنیا میں کون ایسا شخص ہے جو مستحسن بتائے۔ دُشمن سے بھی بے وفائی قابلِ لعنت ہے۔ لیکن اس شعر میں ؎

ہم سے کیا ہو سکا محبّت میں　　خیر تم نے تو بے وفائی کی

معشوق کی بے وفائی یا دوست کی بے وفائی قابلِ احترام چیز بن گئی ہے۔ نیند کا لفظ ایک جانا پہچانا ہوا لفظ ہے لیکن اس کا انتہائی لطیف استعمال اس شعر میں دیکھئے ؎

کون یہ لے رہا ہے انگڑائی

آسمانوں کو نیند آتی ہے

اور اس شعر میں بھی ؎

دِلوں میں داغِ محبّت کا اب یہ عالم ہے

کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

اب یہ دیکھئے کہ محشر لکھنوی نے اس شعر میں "کہاں" کے لفظ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ؎

بات بھی پوچھی نہ جائے گی جہاں جائیں گے ہم

تیری محفل سے اگر اُٹھے کہاں جائیں گے ہم

شاعری میں زبان کا استعمال کچھ اس طرح ہونا چاہیئے کہ انتہائی مانوسیت کے ساتھ ساتھ استعجاب اور رمزیت کا بھی گہرا احساس ہو اور الفاظ صوتیات کی مدد سے اپنی تہیں اُٹھاتے ہوئے نظر آئیں۔ یہ کام ایسے شاعروں کے لئے، خواہ وہ کتنے ہی بڑے شاعر ہوں، ایک امرِ محال بن جاتا ہے جو شاعری کو عمل کا پیغام بنانا چاہتے ہیں یا کسی مذہب و ملّت کے لوگوں کو محض بھڑکا دینے اور للکار دینے کو شاعری سمجھتے ہیں غیر شاعرانہ مقاصد، خواہ انہیں کوئی کتنا ہی بلند سمجھ لے، بلند شاعری کو جنم نہیں دے سکتے، البتہ ایسی شاعری ایک منظوم خطابت ضرور ہو سکتی ہے۔

شمیم: زبان کے سلسلے میں جن اہم لوازم کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی کسی امر کی طرف آپ اشارہ کریں گے؟

فراق: شاعری کی زبان و اسلوب کے سلسلے میں غنائی عناصر کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اُردو شاعری میں اس صفت کی بڑی کمی رہی ہے، خاص کر لکھنؤ اسکول کی شاعری میں۔ منظوم نثر کو

شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ شعر میں لچک اور جھنکار صرف اس بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ شعر تقطیع سے نہیں گرتا۔ تمام اصنافِ سخن میں غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کی متعدد بحروں اور زمینوں میں موسیقیت اور ترنّم کوٹ کوٹ کر بھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا اُردو شاعری میں کیا بہت کم گیا۔ رُباعی میں بھی دوسری سمتوں اور اطراف سے اور دوسرے انداز سے غنائی صفت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایران میں تو رُباعی کا نام ہی ترانہ تھا۔ نظموں میں بھی غنائیت کی کھنک، جھنکار اور تھرتھراہٹ پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں تلسی داس کی رامائن ہے۔ یہ اُسی بحر میں لکھی گئی ہے جسے فارسی کے شعرا نے بھی استعمال کیا ہے اور اُردو شعرا نے بھی۔ مثلاً ؎

خیز بر رسمِ بادہ گساری یا اے دلِ ناداں اے دلِ ناداں

یا میر کی مثنوی ؎ ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل رے خامہ بسم اللہ اب

لیکن اس بحر کو فارسی اور اُردو شعرا موسیقیت میں اس طرح شرابور نہیں کر سکے جس طرح تلسی داس نے اسے کر دیا۔ ان کی رامائن کا ہر مصرع اور ہر شعر ایسا اثر پیدا کرتا ہے گویا کانوں میں کوئی رس گھول رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے الفاظ نہیں ہیں، امرت کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ فارسی شاعری میں حافظ اور سعدی سے بھی کہیں زیادہ مترنّم مولانا روم کی مثنوی ہے اور غالباً مرزا بیدل کی شاعری ہے۔ اُردو میں غزلیں گائی تو بہت گئی ہیں لیکن اشعار میں فی نفسہٖ غنائیت صرف کہیں کہیں اور کبھی کبھی پیدا ہو سکی ہے۔ میں نے، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، اپنی شاعری کے بڑے حصے میں غنائیت کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ میرے علاوہ دوسرے شعرا کے یہاں غنائی شاعری سرے سے ملتی ہی نہیں۔ شعر راگ راگنی تو نہیں ہے لیکن سنگیت سے اس کے قریبی تعلق کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ غالب کے یہاں اکثر ہمیں یہ صفت نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں بھی کافی غنائیت ہے۔ اس دَور میں فانی کی متعدد غزلیں نہایت مترنّم ہیں، البتہ یہ ترنّم اور غنائیت معانی کی طرح تہہ در تہہ ہونی چاہیئے۔ جیسے جیسے شعر بڑھئے آواز میں تہیں پڑتی جائیں۔

اچھا بھائی! اب میں کسی قدر تھک گیا ہوں اور آپ کو اور باتیں پوچھنی ہوں اور تبادلۂ خیال کرنا ہو تو پھر کبھی!

سر جارج ابراہم گریرسن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور انگریز مستشرق سر جارج ابراہم گریرسن اور ہندوستانی زبانوں کے محققوں کے تعلقات بقول غالب "کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی" کی تفسیر بن کر رہ گئے ہیں۔ گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کے سلسلہ میں اتنا ہمہ جہت اور پُر از معلومات کام کیا ہے کہ ان زبانوں کے کسی بھی طالب علم یا محقق کو اس سے استفادہ کئے بغیر مفر بھی نہیں۔ لیکن عموماً اس نے ایسی فاش غلطیاں بھی کی ہیں کہ لوگ آخر میں بجائے اس کا شکر گذار ہونے کے اس کی فراہم کی ہوئی معلومات کا ردّ کرنے لگتے ہیں۔ اس کی تحقیق کے بعض گوشوں کے سلسلے میں تو اختلاف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے الفاظ میں "لسانیات کی دُنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔" اس کے باوجود اس کی تصانیف اور تالیفات، خاص طور سے ہندوستان کے لسانی جائزے کی ابتدائی اور بنیادی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی تصانیف و تالیفات کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا ہے۔

ان تصانیف کی تعداد، ضخامت اور دائرے عمل کی وُسعت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کے ذوق و شوق اور اولوالعزمی کی داد دینی لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کو کام کے ابتدائی زمانے میں سرکاری سرپرستی کی وجہ سے نسبتاً کچھ زیادہ آسانیاں مِل گئی تھیں لیکن پھر بھی آہ کو اثر تک پہنچنے کے لئے بے شمار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں اور بہت ہی بڑے ولولہ کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔ غالباً اس کی لگن اور کارکردگی سے خوش ہو کر ہی قدرت نے بھی اس کو عمرِ طویل سے نوازا تھا اور تقریباً ایک صدی تک اس دُنیا کے زیر و بم دیکھنے کا موقعہ عطا کیا تھا۔

سر جارج ابراہم گریرسن کی پیدائش ڈبلن میں ۷ جنوری ۱۸۵۱ء کو ہوئی تھی۔ اس کے والد کا نام

بھی جارج ابراہم گریرسن ہی تھا۔ اس کی تعلیم کی تکمیل سینٹ بینز شریوزبری اسکولوں اور ٹرینیٹی کالج ڈبلن میں ہوئی تھی۔ اس کا خاص مضمون علمِ ریاضی تھا۔ ۱۸۷۱ء میں اس نے ہندوستانی سِول سروس کا امتحان پاس کیا اور پاس ہونے والوں کی فہرست میں ۲۸واں نمبر پایا۔ اس کے بعد دو سال اور اس نے ٹرینیٹی کالج میں قیام کیا اور اس دوران میں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی تحصیل کی اور ان زبانوں میں متعدد یونیورسٹی انعامات جیتے۔ آخری امتحان میں اس نے بارہویں پوزیشن حاصل کی۔ یہاں اس کی ملاقات مشہور مستشرق روبرٹ اٹکنسن (Robert Atkinson) سے ہوئی۔ گریرسن اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ یہ شخص تھا بھی بے حد حوصلہ مند۔ اس نے گریرسن کے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے ہی اس کی ہندوستانی زندگی کا خاکہ مرتب کر دیا اور اس کو ہندوستان کا لسانی جائزہ ترتیب دینے کی ترغیب دی۔ شاگرد کی اولوالعزمی بھی اُستاد سے کچھ کم نہ تھی۔ اُستاد کی اس تجویز کو، جو اس وقت صرف ایک خیال کا درجہ رکھتی تھی۔ اس نے برسہا برس کی لگاتار صبر آزما اور اَن تھک محنت کے بعد عملی جامہ پہنا ہی دیا۔

۱۸۷۳ء میں وہ ہندوستان آیا اور علاقہ بنگال میں اس کی تعیناتی ہوئی۔ ۲۳ سال تک وہ ہندوستانی سِول سروس کے متعدد فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۸۸۶ء میں وی آنا میں ہونے والی مستشرقین کی کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے اس کو نمائندہ منتخب کر کے بھیجا گیا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کانفرنس کے سامنے ہندوستان کے عمومی لسانی جائزے کی تجویز پیش کی اور ساتھ ہی اس کا ایک مفصل خاکہ تیار کر کے بھی کانفرنس کے سامنے رکھ دیا۔ کانفرنس نے وہ خاکہ منظور کر لیا اور حکومت سے اس کو عملی جامہ پہنانے کی سفارش کی۔ اس کے بعد کئی سال تک اس خاکے کی وُسعت عمومی لائنوں اور کام کے ارتقائی مدارج کے بارے میں مباحث جاری رہے۔ آخرکار اس کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۸۹۸ء میں ہندوستان کے لسانی سروے کا محکمہ قائم ہوا اور محکمے کے نگران کا عہدہ اس کو تفویض ہوا۔ ۲۰ کلرکوں کے عملے کے ساتھ اس نے شملہ میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور بڑی لگن سے کام شروع کر دیا۔ وہ میدانی زندگی کا عادی ہو چکا تھا، اس لیے پہاڑی آب و ہوا نے اس کی صحت کو بے حد متاثر کیا اور اسے ۱۹۰۳ء میں انگلستان واپس لوٹنا پڑا۔ انگلینڈ میں اس نے تقریباً بغیر کسی مدد یا تنخواہ کے اکیلے میں اس کام کو جاری رکھا اور ۱۹۲۸ء میں تکمیل تک پہنچایا۔ انگلینڈ پہنچنے کے کچھ

عرصہ بعد ہی اس نے جائزہ کی جلدوں کو شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے ان کی باقاعدہ اشاعت میں خاصی رُکاوٹیں پڑیں۔

جائزہ اُنیس فولیو جلدوں میں ہے۔ تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور زبانوں کے پانچ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ۱۷۹ زبانوں اور ۵۴۴ بولیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس نے صوبے صوبے، ضلع ضلع اور گاؤں گاؤں کی زبانوں، بولیوں اور جزوی بولیوں تک کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اس میں ان گاؤں اور شہروں میں بسنے والے مختلف طبقوں اور ان طبقوں سے متعلق عورتوں اور مردوں کی بول چال کے باریک اختلافات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ زبانوں کی اس گروپ بندی سے ماہرینِ لسانیات نے شدید اختلاف کیا ہے اس کے باوجود یہ بات مسلّمہ ہے کہ اس نے نہ صرف غیر ملکی مستشرقین کے لئے بُنیادی اور ابتدائی معلومات کا انبار فراہم کر دیا ہے بلکہ اپنی زبانوں پر تحقیقی کام کرنے والے ہندوستانیوں کے لئے بھی اس نے تحقیقی مواد کی کانوں کے در کھول دئے ہیں۔

طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ پہلے وہ ہر زبان کا خام مواد خط و کتابت کے ذریعہ حاصل کرتا تھا۔ پھر اس خام مواد کو خوب چھان پھٹک کر گہرے غور و فکر کے سہارے متن اور تراجم کا انتخاب کرتا تھا اور ہر زبان کی جغرافیائی حدوں اور بولنے والوں کی تعداد کا تعیّن کرتا تھا۔ اس کی قابلِ ذکر کتابوں کی فہرست تیار کرتا تھا اور لسانی رشتوں اور قواعد کے بُنیادی خاکوں کو مرتب کرتا تھا۔

ہندوستان پہنچنے کے چار سال بعد ہی ۱۸۷۷ء میں اس کا پہلا مقالہ شائع ہوا اور اس کے بعد مقالات، تبصروں اور کتابوں کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال تک ہندوستانی زبانوں اور اس کے عوامی ادب کو مختلف پہلوؤں سے دُنیا کے سامنے پیش کرتا رہا۔

گریرسن کو سب سے پہلے بہار کی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے ان زبانوں کے بارے میں کئی بڑی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے بہاری زبان کی بولیوں اور جزوی بولیوں کی سات قواعدیں، جو آٹھ حصوں میں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۷ء تک شائع ہوئیں اور دوسری بہار کے

کسانوں کی زندگی جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی، بہت زیادہ اہم ہیں۔ اس دوسری کتاب کو نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں دوبارہ شائع کیا گیا۔ یہ ایڈیشن ۵۹۲ صفحات کی ایک جلد پر محیط ہے اور اس میں صوبے کی زراعتی زندگی اور اس سے متعلق اصطلاحوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کی توجہ خاص ہندوستانی زبان کی طرف مڑ گئی اور اس نے تلسی داس اور جائسی کے تراجم شائع کئے۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا مقالہ "ہندوستان کا جدید ورناکیولر ادب" ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوا۔ اس نے امیلن سینارٹ کے مضمون "پیادسی کے کتبے" (Inscriptions of Piyadasi) کا ترجمہ کیا تھا جو انڈین اینٹی کیوری میں شائع ہوا تھا۔ ایملی کے اس مضمون نے اس کی توجہ ہند آریائی گروپ کی زبانوں کی تاریخ اور تقابلی مطالعہ کی طرف مبذول کردی اور اس نے نہ صرف الگ الگ زبانوں پر بے شمار مضامین سپردِ قلم کئے بلکہ اس نے جدید ہند آریائی ورناکیولر صوتیات پر لکھے مقالات میں ان کی ارتقائی کڑیوں کی وضاحت بھی کی۔ یہ مضامین ۱۸۹۵ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئے۔

اس کے بعد اس نے کشمیری زبان کے مطالعہ کا آغاز کیا اور کشمیری زبان کی ایک لغت مرتب کی۔ یہ لغت ۱۲۵۲ کوارٹو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۱۶ء اور آخری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے ان زبانوں پر متعدد مقالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ ان بولیوں کے سلسلہ میں اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ دادری گروپ کی ان تمام بولیوں سے، جو ہندوکش کے پہاڑوں میں گھر کر فطری ارتقا سے کٹ گئی تھیں، اس نے تہذیب یافتہ دنیا کو روشناس کرایا۔ پشاچا زبانوں کے نام سے اس نے ان زبانوں پر متعدد مقالات لکھے اور کتابیں تصنیف کیں جن میں پہلی "شمالی مغربی ہندوستان کی پشاچا زبانیں ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی اور دوسری Torwali ۱۹۲۹ء میں جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقائی مدارج کے مطالعہ نے اس کا دھیان پراکرتوں کی طرف بھی مبذول کیا۔ اس کے علاوہ جدید ہند آریائی زبانوں پر، جن باہری خاندانوں کی بولیوں کا اثر پڑا تھا اس نے ان زبانوں کا مطالعہ بھی کیا اور اس سلسلہ میں کئی مقالات سپردِ قلم کئے۔ ان میں سے آسام کی قدیم زبان "اوہم اور کگی چن" کے بارے میں لکھے ہوئے مقالات کافی اہم ہیں۔

۱۸۹۴ء میں گریرسن O.I.E مقرر ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں K.C.I.E - ۱۹۲۸ء

میں آرڈر آف میرٹ تفویض کیا گیا۔ اس کو ہالے، ڈبلن، کیمبرج، اوکسفورڈ اور بہار کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ اس کے علاوہ بہت سی علمی مجلسوں کا اعزازی ممبر بنایا گیا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۹ء تک برٹش اکاڈمی کا فیلو بھی رہا۔

اس کی پچہترویں سالگرہ پر اس کو 'ہندوستانی اور ایرانی مطالعہ جات" کا مجموعہ پیش کیا گیا۔ اس مجموعہ کی ترتیب میں تمام دنیا کے ۵۲ عالموں نے حصہ لیا تھا۔ یہ تالیف علوم مشرقی کے سکول کے بلیٹن کی ۸ ویں جلد میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعہ میں اس کی تصانیف کی فہرست بھی شامل ہے۔ یہ فہرست ۱۲ بڑے اوکٹو صفحات پر محیط ہے۔

۱۹۰۳ء میں ہی وہ انگلینڈ واپس چلا گیا تھا۔ جانے کے بعد چمبرلے میں اس نے اپنا مکان بنوایا اور اس کو اپنے دادا کے نام پر موسوم کیا۔ تاحیات یہیں مقیم رہ کر وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتا رہا۔ انگلینڈ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں ناروے کے ایک محقق اسٹین کونوف STEN KONOW نے تصنیف و تالیف میں مدد دی تھی۔ لیکن بعد میں برسا برس وہ تنہا ہی اپنے مشکل اور صبر آزما کام میں مشغول رہا۔ چمبرلے ہی میں ۹ مارچ ۱۹۴۱ء کو اس کی وفات ہو گئی۔

فنی اعتبار سے گریرسن کا کام بے حد ابتدائی ہے، اس لئے خام بھی ہے۔ اس کے یہاں قدم قدم پر غلطیاں ملتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اس نے جدید ہند آریائی ورناکولر زبانوں کی تقسیم و ترتیب ہی غلط کی ہے۔ خاص طور سے اندرونی اور بیرونی زبانوں کی گروپ بندی کے سلسلہ میں اس سے زبردست اختلاف کیا گیا ہے۔ اس نے دادری زبانوں کو ایشیا اور یورپ کی جپسی بولیاں لکھا ہے حالانکہ یہ تمام بولیاں، جن میں ایک کاشمیری بھی شامل ہے، جدید ہند آریائی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں اور وسطی زمانہ کی اپ بھرنشوں کی ارتقا پذیر شکلیں ہیں۔

لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود اس کے کام کی بنیادی اور اساسی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس اہمیت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے کام کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور مختلف ہندوستانی زبانوں سے تعلق رکھنے والے محققین اس کی تصانیف کو از سرِ نو ترتیب دیں اور اضافے اور حواشی کے ساتھ ان کو دوبارہ شائع کریں۔ اس کی تمام تصانیف متفرق یورپی زبانوں میں ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ وہ نئی ترتیب کے ساتھ متعلقہ زبانوں میں شائع کی جائیں۔

لسانی جائزے میں ہندوستانی زبان کی قواعدوں کی فہرست میں پائے جانے والے ایک ابہام

کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ابہام دو مختلف شخصیتوں کے بارے میں ہے جن کو اس نے صرف نام کی یکسانیت کی وجہ سے ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک کیپٹن ولیم پرائس ہے۔ یہ فورٹ ولیم کالج سے متعلق تھا۔ پہلے بنگالی سنسکرت اور مراہٹی کا مددگار پروفیسر تھا۔ بعد میں شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر کا عہدہ تفویض ہوا۔ دوسرا صرف ولیم پرائس تھا۔ ڈکشنری آف نیشنل بائیگرافی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ صرف دو سال کے لئے ایک ملک کے سفیر کے عملہ میں شامل ہو کر ایران گیا تھا۔ اس کو مشرقی زبانوں خاص طور سے ہندوستانی (اردو) عربی اور فارسی سے گہرا شغف تھا۔ اس نے اپنے گھر میں اپنا پرائیویٹ چھاپے خانہ قائم کیا تھا اور مشرقی علوم کے بارے میں اس نے متعدد کتابیں لکھیں اور شائع کی تھیں۔ یہ اپنے ایک دوست کی سمینری میں مشرقی زبانوں کی تعلیم بھی دیا کرتا تھا۔

یہ دونوں آدمی نہ صرف دو الگ الگ اشخاص تھے بلکہ دو مختلف رجحانات کے حامل بھی تھے کیپٹن ولیم پرائس جو فورٹ ولیم کالج سے متعلق تھا، سنسکرت، بنگالی اور مراہٹی کا عالم ہونے کی وجہ سے ہندی کا حمایتی تھا۔ اس نے اپنی مرتب کردہ لغت کے دیباچہ میں گل کرسٹ کی رائے سے خاصا اختلاف ظاہر کیا ہے۔ جب کہ ولیم پرائس فارسی اور عربی کا عالم ہونے کی وجہ سے اردو کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

کیپٹن ولیم پرائس نے اردو یا ہندی کی کوئی قواعد نہیں مرتب کی۔

ولیم پرائس نے ایک قواعد اردو کی اور ایک تین اہم مشرقی زبانوں یعنی ہندوستانی، فارسی اور عربی کی قواعد مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی مشرقی زبانوں کے بارے میں اس کی متعدد تصانیف ہیں۔ گریرسن نے ان دونوں اشخاص کی الگ الگ تصانیف کو ایک شخص کیپٹن ولیم پرائس سے منسوب کر دیا ہے۔ اس نے ولیم پرائس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتابیں گریرسن کی نظر سے نہیں گذری ہیں اور اگر اس نے دیکھا بھی تو نہ متن کا ہی بغور مطالعہ کیا اور نہ سرورق پر ہی نظر ڈالی۔ اس لئے اس کو ان کتابوں کے مختلف نظریات سے متعلق ہونے کا پتہ چلا اور نہ مصنف کے نام کا فرق ہی اس کی نظر میں آسکا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ان دونوں کی الگ الگ شخصیتوں کا پتہ چلانا ایسا مشکل نہ تھا۔ کیپٹن ولیم پرائس کا ذکر بیشتر ہندوستانی آرمی لسٹوں میں ملتا ہے اور ولیم پرائس کی سوانح ڈکشنری آف نیشنل بائیگرافی اور ۱۸۳۰ء کے اینول رجسٹر میں موجود ہے:

حسرت سہروردی

غزل

ہم جئے بھی تو اس طرح سے جئے
جیسے شبنم میں جل رہے ہوں دِئے

آپ کے ساتھ زندگی توبہ
موت کے ساتھ ساتھ کون جئے

کچھ مِلی بھی تو یوں مِلی دُنیا
ہر قدم پر غمِ حیات لِئے

ہائے بدبختیاں زمانے کی
آدمی آدمی کا خون پیے

آپ سے شکوۂ جفا کیسا؟
لیجئے ہم نے اپنے ہونٹ سیئے

ہم نے دُنیا سے دوستی کر لی
کہا دُنیا نے "اِک ذرا سُنیئے"

زُلفِ گیتی ہنوز برہم ہے
ہم نے کیا کچھ کیا نہ اس کے لِئے

خونِ دل برس رہا ہے شعروں میں
لوگ کہتے ہیں اِک غزل کہیئے

دُشمنوں سے بھی دوستی کر لی
ہم نے حسرت سکونِ دِل کے لئے

•

علی محمد لون

کشمیری افسانہ - ایک جائزہ

کشمیری زبان کے افسانہ پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتانا چاہیئے تھا کہ افسانہ کیا ہے ؟ اور آج کے نثری ادب میں اس نے کونسا مقام اور انفرادیت حاصل کی ہے ۔ اس بات کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت تھی کہ افسانے کے لئے کون سی تیکنیک اور ہیئت استعمال کی جاتی ہے ۔ اور یہ کہ افسانہ کن خصوصیات کی وجہ سے خاکہ، داستان اور ناول سے ایک الگ اور منفرد صنفِ ادب بن چکا ہے ۔ لیکن افسانے سے متعلق یہ ساری باتیں بجائے خود اتنی بڑی اور طویل ہیں کہ ان کا جائزہ لیتے لیتے نہ صرف یہ مقالہ ہی ختم ہوگا بلکہ دفتروں کے دفتر سیاہ ہوں گے ۔ جب بھی بات تشنہ ہی رہے گی ۔ یہ اندیشہ اور خدشہ مدِّ نظر رکھ کر میں نے جرأت نہیں کی کہ پہلے ان مسائل پر گفتگو کروں اور پھر اس کے بعد کشمیری زبان کے افسانے کا جائزہ پیش کروں ۔

افسانہ نگار اور قاری دونوں جانتے ہیں کہ افسانہ اب نثری ادب کا ایک مستقل، جان دار اور سنجیدہ حصہ بن چکا ہے اور یہ داستان ، لوک کتھا اور پریوں کی کہانی سے اوپر اُٹھ کر اپنی انفرادیت اور افادیت منوانے میں کامیاب ہو چکا ہے ۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک نثری ادب کی جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں ۔ اُن میں افسانہ کو ایک سنجیدہ صنفِ ادب کی حیثیت سے جگہ نہ دی جاتی تھی ۔ لیکن اب افسانہ جان دار ادب (Powerful Medium) بن چکا ہے ۔ اب یہ مزاحیہ داستان روائتی کہانی یا تفریحی چیز نہیں رہا ۔ اس نے اب ناول ہی کی طرح ساری زندگی کا احاطہ کیا ہے ۔ اور یہ اس کی تشہیر کے ساتھ ساتھ اس کی تفسیر بھی بن چکا ہے ۔ یہ اس قابل ہو چکا ہے کہ انسانی رُوح کی گہرائیوں

میں اُتر کر اس میں چھپے ہوئے راز کو نکال لائے۔

ہم جب کشمیری افسانے کا جائزہ لیں تو ہمیں افسانے کی اس انفرادیت، سنجیدگی اور مقام کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کشمیری افسانے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ افسانے کے ساتھ ہی کشمیری زبان میں نثر لکھنے کی کوششوں کی باقاعدہ بُنیاد پڑ گئی۔ اس خصوصیت کے لئے کشمیری زبان کے نام لیوا اس کے ممنون ہیں۔ مختصر افسانہ کی عمر ابھی ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن کشمیری افسانہ حال حال ہی میں وجود میں آیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیرہ سال عمر ہوگی اس کی۔ لیکن اس قدر نوعمر ہونے کے باوجود یہ اُن تمام ہیئتوں، تیکنیکوں اور تجربات کا وارث ہے جن سے دُنیا کا مختصر افسانہ آج ڈیڑھ سو سال سے گذرتا آیا ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کشمیری افسانہ مختصر افسانے کے ارتقا میں اس کی ابتدائی منزلوں میں نہیں بلکہ آخری سرے پر ہے۔ اس لئے جب ہم کشمیری افسانے کی بات کریں تو ہمارے پیش نظر اسٹائن بیک، فالکنر، ہیمنگ وے، الیکسی طالسطائی، منٹو، بیدی، ریفو اور ان کے باقی ہم عصر افسانہ نگار ہوں گے۔ کشمیری افسانہ پڑھتے پڑھتے ہماری تنقیدی نظر واشنگٹن ارونگ ایڈگر ایلن پو، ہاتھورن، لرمنتوف اور دوسرے ایسے ہی افسانہ نگاروں کی طرف نہیں اُٹھنی چاہئیں۔ اس بات کا کوئی معترض اگر یہ کہے کہ کشمیری افسانہ نگار کو آج سے ڈیڑھ سو سال پیچھے کے زمانے میں جانا چاہیئے اور اپنے افسانے کو داستان سے شروع کر کے اس کے ارتقا کی ساری منزلیں طے کرنی چاہئیں۔ تو یہ بات کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی ابھی ذکر آیا ہے کہ کشمیری افسانہ نوعمر ہونے کے باوجود اُن سارے تجربات اور اُس تیکنیکی تنوع کا وارث ہے۔ جو دُنیا کے افسانہ نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ دوسری بات جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے یہ ہے کہ فن اور ادب کی کوئی حد بندی نہیں ہوتی۔ یہ کسی ایک مُلک، ایک قوم یا ایک سماج کی میراث نہیں ہوتے بلکہ ساری دُنیا کے مُلک، ساری قومیں اور ہر پڑھا لکھا باشعور سماج ان سے مستفید ہوتا ہے۔ ہمارے کشمیری افسانہ نگار بھی پڑھے لکھے باشعور انسانوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے بھی انگریزی زبان کی بدولت نہ صرف انگریزی ادب بلکہ سارے یورپی اور امریکی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح ہندی اور اُردو زبانوں کی بدولت انہوں نے ان زبانوں کے ادب کے علاوہ اپنے مُلک کے علاقائی ادب

کے بعض شہ پارے بھی پڑھ لئے ہیں۔ مختصر افسانہ ڈیڑھ سو سال سے جن ارتقائی منزلوں سے گذرا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار اُن سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ مطالبہ قبل از وقت پانا روا نہیں کہ ہمارا افسانہ نگار بھی اُن روایات کو نہ صرف آگے بڑھائے گا بلکہ ان میں قابلِ قدر اضافہ بھی کرے گا جو دُنیائے افسانہ میں اُسے نظر آتی ہیں۔

آج سے تیرہ سال پہلے بھی افسانہ کی دُنیا بہت وُسعت پکڑ چکی تھی اور یہ اپنی ساری سوغات لے کر ہمارے افسانہ نگاروں کے سامنے باہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ شاید یہ سمجھ کر کہ کشمیری زبان کے نوجوان افسانہ نگار، جو پڑھے لکھے اور باشعور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، بھی اس سوغات، انسانی تہذیب کے اس سرمایہ میں اپنے فن کی نزاکتوں سے اضافہ کریں گے۔ لیکن جب ہم کشمیری افسانہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ اور کہیں کہیں کوئی اُمید کی ایک ہلکی سی دُھندلی سی کرن نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر کشمیری مختصر افسانہ موضوع اور تیکنیک دونوں لحاظ سے محدود اور "مختصر" ہے۔ یہ بات ایک ہی مثال سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ کچھ افسانہ نگاروں کو یہ مثال بڑی دُور کی کوڑی نظر آئے گی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ رحمان راہی کا افسانہ "جب اُس کا جنم ہوا" اب بھی کشمیری افسانوں میں سب سے جان دار اور موضوع کے اعتبار سے سب سے بلند پایہ ہے۔ رحمان راہی نے یہ افسانہ اُس زمانے میں لکھا جب دینا ناتھ نادم نور محمد روشن اور سوم ناتھ زتشی طبع زاد افسانے لکھ رہے تھے۔ ہمیں اب ان کے طبع زاد افسانوں کے صرف نام ہی نام یاد رہے ہیں، جیسے "جوابی کارڈ"۔ "برف گرتی جایا"۔ "جب صبح ہوئی۔" اور "بادِ بہاری" وغیرہ۔ لیکن "جب اُس کا جنم ہوا" اب تک ہمارے دِلوں میں بسا ہوا ہے۔ اس کی عظمت ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ اور ہم بار بار سوچتے ہیں کہ کاش ہم بھی ایسا ہی کوئی بلند پایہ افسانہ لکھ سکتے! لیکن ہماری بدنصیبی اور محرومی یہ ہے کہ یہ افسانہ طبع زاد نہیں ہے۔ راہی نے اسے میکسم گورکی کی کہانی "میلادِ آدم (Man is born) سے ترجمہ کیا ہے۔

دینا ناتھ نادم، سوم ناتھ زتشی اور نور محمد روشن جب اپنے افسانوں پر فاتحہ پڑھ چکے تو افسانہ نگاروں کی ایک نئی جماعت سامنے آئی۔ ان افسانہ نگاروں نے رحمان راہی کے ترجمہ کے بعد سینکڑوں نہیں تو کم از کم درجنوں افسانے لکھے۔ لیکن رحمان راہی کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ اب بھی ان درجنوں افسانوں میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ آئیے ہم اسی ضمن میں مرزا عارف

کے افسانہ "زئے" کو یہ کہتے ہیں۔ اس افسانہ میں مرزا عارف نے کسی حد تک گورکی کے موضوع کو اپنایا ہے لیکن میکسم گورکی کا افسانہ جن بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، اُس سے کہیں زیادہ پستیوں میں مرزا عارف کا افسانہ گرا ہوا نظر آتا ہے۔ بچّے کا جنم ایک حقیقت ہے، ایک ایسی حقیقت جو زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ساگر کی آبیاری کرتی ہے، لیکن یہی حقیقت جب مرزا عارف بیان کرتے ہیں تو کچھ ایسے بھونڈے طریقے پر کرتے ہیں کہ یہ بڑی خطرناک، بدصورت اور منحوس نظر آتی ہے اور سب سے بُری چیز، جو دِل میں جاگزیں ہوتی ہے، یہ ہے کہ مرزا عارف کا افسانہ پڑھ کر بچّہ پیدا ہونے کے عمل سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اور جب افسانے کی ہیروئن "زئے" اس عمل کے دوران بڑی محرومی اور بےبسی کے عالم میں مر جاتی ہے تو زندگی کی ساری خوبصورتی اور اُمید بدصورتی اور مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ کشیری افسانے کی ترقی کے بارے میں جب بھی کسی نے شک کا اظہار کیا تو اُس کی زبان بندی کا حکم جاری ہوا۔

کہا گیا کہ کشیری افسانہ ایک ایسا بچّہ ہے جو حال حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ اس کے دُودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے، اسے گھٹنیوں چلنے دیجیے۔ آگے چل کر یہ دوڑے گا، بھاگے گا اور کارنامے کر دکھائے گا۔"

یہ دلیل ہر لحاظ سے غلط ہے اور اس کے ساتھ کوئی بھی باشعور ادیب اور قاری اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ دلیل صحیح ہے تو ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ بچہ کب پالنے سے نکلے گا۔ کب گھٹنیوں چلے گا اور جب تک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا تب تک مختصر افسانہ گلوب سے نکل کر ستاروں اور سیّاروں میں اپنے جھنڈے گاڑ چکا ہوگا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے بعض افسانہ نگار اور قاری بھی یہی دلیل پیش کر کے کشیری افسانے کی نسبت اپنی ذمہ داریوں سے سُبکدوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار کو پروفیسر جے لال کول کی ایک بات بار بار یاد آتی ہے۔ پروفیسر کول نے ایک دن باتوں باتوں میں کہا:

"Listen my dear. It took them two hundred years what we achieved in less than a decade."

پروفیسر کول کشیری زبان کے شیدائی بھی ہیں اور محسن بھی۔ یہ کیفیت ہو تو منطق بالائے

طاق رہ جاتی ہے۔ بہر حال آج خوش قسمتی سے موقعہ ملا ہے کہ کشمیری افسانے کے اس "حاصل" کے سلسلے میں عاشق و معشوق کا رشتہ بھول کر اظہار رائے کیا جائے۔ کیونکہ ... ... سوال کشمیری افسانہ نگار کا ہے جس کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ سوال اُس قاری کا ہے جس کے بارے میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کشمیری افسانہ پڑھ کر اُسے کیا ملتا ہے اور سب سے اہم سوال کشمیری زبان اور ادب کا ہے جن کے بارے میں ہمیں غور کرنا ہے کہ ہم انہیں کس طرح اپنے فن سے مالامال کر رہے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ یہ سارے سوال بڑے اہم ہیں اور ہم سب کو بڑی ایمان داری، خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر سوچنا چاہیئے۔

کشمیری زبان کی ترقی کی راہ میں کونسی رُکاوٹیں حائل ہیں؟ اس کے آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی کوششوں میں کس طرح روڑے اٹکائے جاتے ہیں؟ یہ ہمارے مقالے کا موضوع نہیں ہے۔ اس لئے ہم اُن کوششوں پر رائے زنی کریں گے جو ہمارے افسانہ نگار بالکل ذاتی اور انفرادی حیثیت سے کشمیری زبان و ادب کو آگے لے جانے کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو بذات خود یہ کوششیں بڑی اچھی اور قابل مبارک ہیں۔ ذاتی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ ان کوششوں کے پیچھے یہ جذبہ کار فرما ہے کہ کشمیری زبان ترقی کرے۔ اس کا ادب بھی کسی شمار و قطار میں آسکے۔ دوسری زبانوں کا ادب پڑھ کر جو مسرّت اور فرحت ہمیں حاصل ہوتی ہے، ہمارا ادب بھی اُسی مسرّت اور فرحت کا حامل ہو۔ دوسری زبانوں کے ادیبوں کے کارنامے پڑھ کر جو احساسِ کمتری جاگتا ہے وہ دُور ہو اور ہم بھی کوئی کارنامہ کر دکھائیں۔ یہ ایسے جذبات ہیں جن کی تکمیل کے لئے کڑی محنت، خلوص، ایمان داری اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ ان جذبات کی تکمیل کے لئے ہم محنت، خلوص، ایمان داری اور ریاضت سے کام نہیں کرتے۔

افسانہ لکھنا ایک مُشکل فن ہے۔ جس طرح غزل کا ایک شعر اپنے اختصار کے باوجود اپنے وجود میں معنی و مفہوم کا ایک ساگر سمو دیتا ہے، اسی طرح مختصر افسانہ بھی اپنے چھوٹے محدود کینواس میں انسان کی جسمانی، سماجی، رومانوی اور نفسیاتی زندگی کے تنوع اور رنگا رنگ پہلوؤں میں رنگ بھرتا ہے اور خود ایک شہپارہ بنتا ہے۔ اور جب ہم اپنے تیرہ سالہ کشمیری افسانے کا جائزہ پیش کرتے ہیں تو کینواس نظر تو آتا ہے۔ انسان کی جسمانی، سماجی، رومانوی اور نفسیاتی زندگی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن کینواس کے رنگ عموماً بھدے اور بھونڈے نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ

ترتیب اور صفائی سرے سے ہی غائب ہے جو رنگوں کے امتزاج اور فن کارانہ میل کو ایک شہکار بناتے ہیں۔ کچھ کینو اس، کچھ افسانے ایسے ہیں جنہیں ہم عہد آفرین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ ایک بار پھر مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان افسانوں میں رحمان راہی کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ "جب اُس کا جنم ہوا" سرِفہرست ہے۔ اس کے بعد اختر محی الدین کے افسانے "داناتا کِل کِل" "ریشمی شلوار" اور "آدم ہے عجب ذات"، محمد امین کامل کے افسانے "مُرغوں کی لڑائی" اور "نئی بپتا"، اُمیش کول کا "ادھوری کہانی"۔ علی محمد لون کا "بُرقعہ" اور ہردے کول بھارتی کا "شکست" آتے ہیں۔ ان افسانوں کو عہد آفرین کہتے وقت جن باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اُن پر اسی مقالے میں آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان افسانوں نے کچھ نئی راہیں، نئی سمتیں اور نئے اُفق اُبھارے اور افسانہ نگاروں نے ان سے فیضان حاصل کیا۔

دینا ناتھ نادم، نور محمد روشن اور سوم ناتھ زتشی کے افسانے کشمیری زبان میں ایک تاریخی اہمیّت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ کشمیری زبان کے ابتدائی افسانے ہیں۔ لیکن جب ہم انہیں فن کے پیمانوں پر جانچتے ہیں تو یہ پُورے نہیں اُترتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں کہیں کہیں نعرہ بازی کی گئی ہے اور کہیں کہیں محض کاری گری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ کسی بھی سنجیدہ صنفِ ادب کی طرح افسانہ بھی نہ تو نعرہ بازی کا نام ہے اور نہ ہی ظاہری کاری گری کا۔ افسانہ بہت "کچھ" ہے۔ یہ بہت کچھ کیا ہے؟ اس پر بار بار بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کی بہت سی تفسیر وتشریح ہوئی ہے۔ مقالہ نگار کا اس سلسلے میں یہ ذاتی نظریہ ہے کہ جب ہم کوئی افسانہ پڑھیں، کوئی نظم سُنیں یا کوئی تصویر دیکھیں تو ہمیں کچھ حاصل ہو۔ یہ حاصل مادّی وجود نہیں رکھتا۔ لیکن پھر بھی یہ ہماری زندگی میں کسی نہ کسی طور پر کوئی اضافہ ضرور کرتا ہے۔ کچھ لوگ اسے رُوحانی مسرّت کہتے ہیں یا ذہنی فرحت، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں جو کمی ہے، جو تلخی ہے، وہ کمی پُوری ہو جاتی ہے اور وہ تلخی مِٹ جاتی ہے۔ کچھ حاصل کرنے کا یہ احساس ہی ایک افسانے، نظم یا تصویر کو فن پارہ بنا دیتا ہے۔ اور اگر افسانہ پڑھتے پڑھتے نظم سُننے کے بعد اور تصویر دیکھ کر یہ احساس بیدار نہ ہو، جان لینا چاہیئے کہ ادیب شاعر اور مصوّر سے کہیں چُوک ہو گئی ہے۔ کہیں رنگ غلط لگ گیا ہے۔ کہیں لکیروں میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کہیں کوئی جذبہ نیم بسمل رہ گیا ہے اور کہیں کوئی احساس آنکھ کھولنے سے پہلے ہی دم توڑ بیٹھا ہے۔ اور جب ہم نادم، روشن اور زتشی کے افسانے پڑھتے ہیں۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ ہم "حاصل" سے محروم رہ گئے۔ حاصل سے یہ محرومی افسانے کا عیب ہے اور اس میں قاری کا کوئی قصور نہیں۔ قصور افسانہ نگاروں کا ہے جن کا فن پُختہ نہیں۔

ان تین افسانہ نگاروں کے بعد ہماری توجّہ اختر محی الدین کے فن کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اختر کشمیری زبان کے پہلے صاحبِ کتاب افسانہ نگار ہیں۔ اس حیثیت سے اختر کے افسانے بھی تاریخی اہمیّت رکھتے ہیں۔ اختر نے افسانہ نگاری کا فن بڑی سنجیدگی سے اپنایا ہے اور کچھ ایسے افسانے لکھے ہیں جو کشمیری ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان کے افسانوں کی پہلی کتاب کشمیری زبان کی پہلی اور آخری نثری کتاب ہے، جسے مُلک کے سب سے بڑے قومی اعزاز اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کتاب کا نام ہے "ست سنگر" یعنی سات چوٹیاں۔ اس میں اتفاق سے سات ہی افسانے ہیں۔ "ست سنگر" کے دو افسانے "دانتا کِل کِل" اور "ریشمی شلوار" کشمیری زبان کے پہلے مکمل افسانے ہیں جنھیں "عہد آفرین افسانوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔

"دانتا کِل کِل" میں جو زبان، روزمرہ اور طنز و مزاح استعمال کیا گیا ہے وہ اتنا اہم نہیں جتنا اس افسانے کا موضوع اہم ہے۔ عشمی چمارن اور بریستو چمار ہمارے سماج کے سب سے نچلے طبقہ کے کردار ہیں۔ اختر نے جس فن کاری اور نفاست کے ساتھ یہ کردار اُبھارے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس طبقہ کے لوگوں کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہمارے سامنے اس طبقہ کا روزمرہ، ان کا طنز و مزاح، ان کی آئے دِن کی لڑائیاں اور ایک دوسرے سے پیار کرنے کی بات اس صفائی اور خوبی سے نہ آتی۔ اختر نے "دانتا کِل کِل" میں کرداروں کے جو نام رکھے ہیں اُن سے ان کے بعد کے لکھنے والے افسانہ نگار بہت متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ناموں کی مقبولیت دیکھ کر انھوں نے بھی اپنے کرداروں کے نام کچھ اسی طرز پر رکھنا شروع کئے مثلاً جان تیلی، غفار ذبیحہ، عازم لنگڑا، پھاتہ نجارن وغیرہ۔ نام سے مزاح پیدا کرنے کی ابتدا بھی اختر نے ہی کی۔ انھوں نے ہی دوسرے افسانہ نگاروں کو تحریک دی اور وہ اُونچے محلّوں سے نکل کر ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں اور گندے گلی کوچوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں کچھ افسانہ نگار جو اختر کے اس کمالِ فن کو نہ پہنچ سکے، اختر پر الزام دھرتے ہیں کہ وہ محض مکالموں اور ناموں سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ اختر کے افسانوں کے واقعات (SITUATIONS) بذاتِ خود یہ مزاح پیدا کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ یہ اعتراض "دانتا

"کل کل" پڑھنے پر بالکل غلط اور ناقابلِ قبول نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم اختر کا دوسرا افسانہ "ریشمی شلوار" پڑھتے ہیں تو اختر کی فن کاری اور فن شناسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس افسانے کا موضوع بھی بڑا جاندار اور منفرد ہے۔ ایک کاریگر، جو لوگوں کے بوسیدہ اور کٹے پھٹے شالوں کو رفو کرتے کرتے آنکھوں کی بینائی سوئی کے تار میں پروتا ہے جو دریائے جہلم کے کنارے ایک ٹوٹے پھوٹے کوٹھے میں رہتا ہے اور خود بھی اپنی زندگی کی ناؤ تقریباً کنارے لگا چکا ہے۔ عمر کی اس منزل میں بھی اچھے کھانے پینے اور حسن و عشق کا سودائی ہے۔ اور جب اس کے اس سودا کے سامنے مان مریادا اور رشتہ داروں کی ٹیڑھی تیکھی نظر میں آ جاتی ہیں تو کاریگر اپنی سوئی کے بھروسے پر کہتا ہے کہ ہم کیا کسی کے نوکر ہیں؟ سب اپنے اپنے گھر کے راجہ ہوتے ہیں۔ اختر کے اس افسانے کا واقعہ (situation) اتنا جاندار ہے کہ زبان اور مکالمہ میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ افسانے کے کردار ایک ایسے ماحول سے وابستہ کر دئے گئے ہیں کہ ایک لاثانی سچویشن ابھرتی ہے۔ کردار دھیرے دھیرے اٹھتے ابھرتے اور چھا جاتے ہیں اور کسی بھی مقام پر زور یا جبر کا گذر نہیں ہوتا۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ کردار سہ سمتی (Three diamensional) ہیں اور ان کی زندگی کی جسمانی، سماجی اور نفسیاتی تصویر پوری آب و تاب کے ساتھ آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے۔ کرداروں میں یہ تینوں سمتیں نہ ابھاری جائیں تو یہ خام رہ جاتے ہیں اور قاری کی وہ پیاس بجھتی نہیں جس کے لئے وہ کسی فن پارے کو پڑھتا ہے۔

اختر کا تیسرا عہد آفرین افسانہ "آدم ہے عجب ذات" پر زیادہ رائے زنی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ کشمیری زبان کا وہ یادگار افسانہ ہے جس پر مقامی اخباروں رسالوں اور انجمنوں میں بڑی دیر تک بحث چلی اور جس پر درجنوں مضامین اور مقالے لکھے گئے۔ سعادت حسن منٹو کے بدنام افسانے "دھواں"، "بو"، "ٹھنڈا گوشت" اور "کھول دو" بھی اسی طرح کھنگالے نہیں گئے۔ حالاں کہ ان کی اشاعت پر منٹو پر مقدمے بھی چلائے گئے۔ اختر کے افسانے پر جو بحث ہوئی وہ کئی لحاظ سے دلچسپ تھی۔ رحمان راہی نے اس پر جو مقالہ لکھا وہ خالص علمی (Academic) انداز کا تھا۔ شمیم احمد شمیم نے اس افسانے کو کشمیری زبان میں رومانوی طرزِ فکر کا بنیادی پتھر کہا۔ کچھ ترقی پسندوں نے الزام لگایا کہ اختر اپنا

شیرازہ

آدرش (ideal) گنوا کر ایک رجعت پسند کی طرح فرار کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ بعض انتہا پسندوں نے کہا کہ اختر کا یہ نیا رجحان اُن کے فن میں زوال کا آغاز ہوگا۔ الغرض یہ علمی اور نظریاتی بحث الگ رکھ کر جس سنجیدگی، خلوص اور نیک نیتی سے اس افسانہ پر خصوصاً اور کشمیری افسانے پر عموماً بحث ہوئی۔ اُس سے یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ اس بحث کی روشنی میں دوسرے افسانہ نگار فیضان حاصل کریں گے اور اختر کے افسانہ کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور لاثانی افسانے لکھیں گے۔ لیکن یہ اُمید کسی بھی طور پوری نہ ہو سکی۔ نظریاتی بحث کو پسِ پُشت ڈال کر اگر دیکھا جائے تو اختر کا یہ افسانہ ایک یادگار اور عہد آفریں افسانہ نظر آئے گا۔ فطرت کے ساتھ انسان کا جسمانی یا جذباتی تعلق کئی شہپاروں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن کشمیری زبان میں کم از کم نثر کے میدان میں اس کی ابتدا کا سہرا بھی اختر ہی کے سر ہے۔ اختر نے جس نفاست، کاریگری اور فن کاری کے ساتھ انسانی جذبات کا "مدّ و جزر"، حُسنِ فطرت کے ساتھ مختلف کرداروں کا "ردِّ عمل"، رنگ و نُور کا ملاپ دکھایا ہے۔ وہ قابلِ تحسین ہے اور جہاں تک اس افسانے کی ہیئت کا تعلق ہے یہ اختر کا بہترین افسانہ ہے۔ "آدم ہے عجب ذات" یُوں تو تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ وُہ ہے جہاں بُوڑھا مانجھی عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے بیان دیتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ جس میں مانجھی کا بیٹا غفار بہار کا متوالا بن کر مرتا ہے اور تیسرا حصہ وہ جہاں میم صاحبہ حُسنِ فطرت کو اپنے کینوس پر اُتارنے میں ناکام ہونے پر خودکشی کر کے خود بھی اسی حُسن کا ایک انگ بننے کی خواہش کرتی ہے۔ لیکن یہ تینوں بظاہر الگ الگ حصے ایک دوسرے کے ساتھ بڑی فن کاری اور چابک دستی کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ ایک جذبہ ہے جو ان تینوں موتیوں کو ایک ہی لڑی میں پروتا ہے۔ اختر نے اس افسانے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ موضوع کے ساتھ پُوری طرح میل کھاتی ہے اور کرداروں سے جو الفاظ کہلوائے گئے ہیں وہ کردار نگاری کے تقاضوں کو پُورا کرتے ہیں۔ اختر کے بعض معترضین کہتے ہیں کہ اختر افسانوی زبان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن "آدم ہے عجب ذات" افسانہ پڑھنے کے بعد یہ الزام سراسر بے ہُودہ نظر آتا ہے۔

اختر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ کسی سنجیدہ موضوع پر افسانہ لکھ ہی نہیں سکتے اور ایسے کردار اور واقعوں کا انتخاب کرتے ہیں جن میں گالی گلوچ، سر پھٹول اور ہنسی ٹھٹھول ہو۔ اور وہ ان ہی آزمودہ حربوں کو استعمال کر کے افسانہ لکھتے ہیں۔ یہ الزام بھی "آدم ہے عجب ذات"

پڑھ کر بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

اختر محی الدین کے ان تین عہد آفرین افسانوں کے بعد اب ہم محمد امین کامل کے افسانوں "نئی بپتا" اور "مُرغوں کی لڑائی" لیتے ہیں۔ پہلے ہم "نئی بپتا" کے سماجی پس منظر کو پرکھتے ہیں۔ مُلک کی آزادی کے بعد ہمارے سماج میں نئے دولت مندوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ یہ نو دولتیے ——— (Nouveau Riche) نہ صرف سڑکوں پر مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑیاں دوڑاتے ہیں اور جگہ جگہ بنگلے اور کوٹھیاں تعمیر کرتے ہیں بلکہ یہ اُن ساری خامیوں اور اخلاق سوز حرکتوں کے شکار بھی ہیں جو پُرانے جاگیری نظام کے ٹھیکے داروں کی زندگی میں پائی جاتی تھیں۔ کالج میں پڑھنے والی دو معصوم لڑکیاں ایک ایسے ہی نو دولتیے کے بنگلے میں پہنچائی جاتی ہیں اور وہاں اپنی عزت، معصومیت اور عصمت گنوا دیتی ہیں۔ بدلتے ہوئے سماجی حالات اور ان حالات کے شکار انسانوں کے ساتھ محمد امین کامل نے پہلی بار ہمارے افسانے کو متعارف کیا اور یہ افسانہ نگار کی جراُت مندی، حق پسندی اور حقیقت نگاری کی زندہ مثال ہے۔ جس واقعہ کو ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ایک افواہ، ایک اسکینڈل یا ایک تہمت کے طور پر چوراہے پر پھیلا دیتے اُسی واقعہ کو محمد امین کامل ایک دِل دوز حقیقت کا رُوپ دے کر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور بہ حیثیتِ افسانہ نگار اور ایک باشعور ادیب کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ایک طرف اگر محمد امین کامل ان نئی سماجی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں تو دوسری طرف "مُرغوں کی لڑائی" میں ایک نازک اور لطیف نفسیاتی کش مکش کو بڑی چابک دستی سے نبھاتے ہیں۔ شاہ مال اور جان پتلی پڑوسنیں ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسری پر اپنی فوقیت اور برتری جتانے کے لئے وہی کچھ کرتی ہیں جو کلب جانے والی فیشن ایبل بیبیاں ایک ہی میز پر بیٹھ کر ایک دوسرے کا یار ورغلانے کے لئے کرتی ہیں۔ "مُرغوں کی لڑائی" کے مُرغے ایک خارجی حقیقت سے زیادہ دو زندہ علامتیں ہیں۔ شاہ مال اور جان پتلی مُرغوں کی طاقت، خوب صورتی، لڑنے کی صلاحیتوں اور ان کے نجیب الطرفین ہونے کے سہارے ایک دوسری کو نفسیاتی شکست دینا چاہتی ہیں۔ اور جب آخر میں مُرغوں کی لڑائی ہوتی ہے اور جان پتلی کا مُرغا ہار جاتا ہے تو بھی جان پتلی ہار ماننے پر رضا مند نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جو محمد امین کامل نے مُرغوں کی لڑائی کے ذریعہ اچھی طرح ظاہر کی ہے۔ افسانے کی دوسری خُوبی اس کی زبان ہے۔ جو برمحل، خوبصورت اور موضوع کے ساتھ پوری

طرح میل کھاتی ہے۔

کشمیری افسانہ نگاروں میں غالباً اُمیش کول ہی ایک صاحبِ طرز افسانہ نگار ہیں۔ ان کا کوئی بھی افسانہ پڑھیئے، مصنّف کا نام جانے بغیر آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ اُمیش کا افسانہ ہے۔ یہ خوبی ہمارے بیشتر افسانہ نگاروں میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُمیش کول کو افسانے کے فن پر پوری طرح عبور حاصل ہے۔ اُمیش، جو بھی افسانہ لکھتے ہیں اُس میں غیر ضروری تفصیلات بالکل نہیں ہوتیں۔ ان کے لکھے ہوئے جُملے مختصر اور چھوٹے ہونے کے باوجود پُرمعنی ہوتے ہیں۔ بات بات میں ایک گہرائی اور فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ جو بات، جو حقیقت کوئی دوسرا افسانہ نگار سیدھے سادے انداز میں پیش کرتا ہے اُمیش اُسی بات اور حقیقت کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بات زیادہ باوزن اور حقیقت ایک فلسفہ بن جاتی ہے۔ اُمیش کول کا پہلا کشمیری افسانہ "ادھوری کہانی" کو اسی پس منظر میں پرکھنا ضروری ہے۔ راجہ اور بھوشن ہمارے سماج کے ایک خاص طبقے کے دو عام کردار ہیں۔ جو ناموافق سماجی حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے کے باوجود ایک دوسرے کے بن نہیں سکتے۔ ایسے حالات بار بار ظہور میں آتے ہیں۔ یہ جُدائیاں سدا سے ہماری زندگی کی تلخیوں کو بڑھاتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو راجہ اور بھوشن دو عام سے کردار ہیں۔ لیکن یہ دونوں جس فلسفیانہ انداز سے اپنی نفسیات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں اور جس تیکھے اور طنزیہ طریقے میں اپنے سماج کی حقیقتوں سے نقاب اُٹھاتے ہیں وہ ان دونوں کو یادگار کردار بناتا ہے۔

اُمیش کول کے بعد ہم ہردے کول بھارتی کا افسانہ لیتے ہیں۔ اس افسانے میں پہلی بار ایک نئے نئے اُبھرتے ہوئے رُجحان کا پتہ مِلتا ہے۔ یہ افسانہ "شکست" ہے جو میری نظروں میں ۱۹۶۲ء کا بہترین کشمیری افسانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ "شکست" افسانے میں بھارتی نے بنسی کا کردار کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ ہر اُس نوجوان کا نمائندہ بن گیا ہے جو ذہنی اور جسمانی دباؤ (Frustration) کا شکار ہو۔ بنسی کی کہانی ہر اُس ایمان دار، پُرخلوص اور دوست پرور نوجوان کی کہانی ہے جو ہر ایک کی مدد کرتا ہے۔ جو دوسروں پر اپنا سب کچھ نچھاور کر کے خود زندگی کا شکار بن جاتا ہے۔ بنسی اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ انہیں نوکریاں دِلواتا ہے اور خود بے کار رہتا ہے۔ اُن کے دِلوں کی دُنیا آباد کر کے اپنے دِل کی دُنیا اُجاڑ دیتا ہے اور جب بنسی کے دوست اسے ترقی کا زینہ سمجھ کر اوپر جا پہنچتے ہیں اور اپنی دُنیا بسا لیتے ہیں۔ تو یہ بنسی کی طرف اپنی پیٹھ پھیرتے ہیں اور بنسی اس بھری

بڑی دُنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ شکست خوردہ، ہارا ہوا، اُجڑا ہوا بے یار و مددگار — اس کی زندگی آہستہ آہستہ دُنیا کی خود غرضی، ریاکاری اور دوستوں رشتہ داروں کے خام اور ملوّث رشتوں کی وجہ سے ایک بھنور میں پھنس جاتی ہے۔ دِل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی متاثر ہوتا ہے اور ہمارے سامنے بنسی کے رُوپ میں ایک تھکا ہارا، بجھا بجھا سا اور اُجڑا ہوا سِنک —— (Cynic) آتا ہے جو خُون تھوُکتے تھوکتے اور مرتے مرتے بھی زندگی پر طنز کرتا ہے، جو آنسو نہیں بہاتا بلکہ ہنستا ہے اُس زندگی پر، جس نے اُسے کچھ نہ دیا۔ جو اُسے قابو نہ کر سکی۔ خُون کے جن قطروں پر زندگی کو ناز ہے، بنسی نزع کے عالم میں وہ خُون کے قطرے زندگی کو لوٹا کر کہتا ہے: " لو۔ انہی قطروں پر ناز تھا تمہیں ؟ لے لو واپس یہ قطرے۔ اور مل لو اپنے چہرے پر!"

" شکست " افسانے میں جو المیہ پیش کیا گیا ہے اُس میں ایک کلاسیکی جلال ہے۔ اس المیہ کا تاثر بڑا گہرا اور لازوال ہے اور اس میں ذہن و دِل دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ذہن اس لئے کہ بنسی کو کن حالات نے سِنک بنا دیا ؟ دِل اس لئے کہ ایک نوجوان کا اس طرح اپنی ہی زندگی سے انتقام لینا اور شکست قبول نہ کرنا کس قدر دِل دوز اور الم ناک جذبہ ہے!

ان چند افسانوں پر تفصیل سے بحث کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پچھلے تیرہ سال میں کشمیری افسانے کا "حاصل" کیا رہا ہے۔ اس مقالے میں اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا کہ ان افسانوں کے علاوہ جتنے بھی افسانے لکھے گئے اُن پر ہمیں زیادہ ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی خوش فہمی میں مُبتلا ہو کر یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے دس سال سے کم عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جو دوسروں نے دو سو سال میں حاصل کیا۔ فن کاروں اور ادیبوں کی حیثیت سے ہمیں کچھ دیر کے لئے اپنی انا (Ego) کو فراموش کر کے سنجیدگی سے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہماری اکثر تخلیقات اُس سنجیدگی، عظمت اور رفعت کی پرچھائیوں کو بھی چھو لیتی ہیں جو موجودہ مختصر افسانے کا طرّہ امتیاز ہے۔ اگر ہمارے افسانہ نگار کبھی ایسا کریں تو انہیں اپنے آپ ہی معلوم ہو گا کہ ہمارے افسانے موضوع اور تیکنیک کے اعتبار سے بڑے ٹکڑے سمٹے ہیں۔ کبھی کبھار ہمارے افسانہ نگار اچھے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن اس کی پیش کش (Presentation) اتنی بھونڈی ہوتی ہے کہ موضوع بھی فنی خامیوں کی وجہ سے اپنی خوبی اور نفاست کھو بیٹھتا

ہے اور بعض اوقات تیکنیک پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ موضوع ہی گم ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قابلِ فخر اور دوامی ادب کی تخلیق نہیں ہونے پاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم اختر کے "ست سنگر" اور افسانوں کے دوسرے مجموعہ "دھنک" کے بیشتر افسانے لیتے ہیں۔ دو افسانوں کو چھوڑ کر، جن کا ذکر انہی صفحوں میں اُوپر کیا گیا ہے۔ باقی سبھی افسانے اکثر فنّی اعتبار اور موضوع کے لحاظ سے بہت کمزور اور خام ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فن کی کس کسوٹی کے مطابق "مجھ سے بات نہ بن پائی۔" "پچھوا نہ" "ہوتی آئی ہے" اور "کرایہ دار" وغیرہ کو افسانہ کہا جائے۔ "دھنک" کے مجموعہ میں صرف "محمدو ولدِ لسو" ہی ایک ایسا افسانہ ہے جو موضوع کے اعتبار سے ہماری توجّہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ افسانے میں محمدو دوسری جنگ سے بھاگ آتا ہے اور اپنے گاؤں میں جا چھپتا ہے۔ یہ بات پسِ پُشت ڈال کر کہ محمدو کو کون سے حالات جنگ کے میدان سے بھگاتے ہیں، ہمیں پہلی بار دیہاتی زندگی کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہمارے سبھی افسانہ نگار شہر میں زندگی گذارتے ہیں۔ اور ان کے اکثر افسانے اسی زندگی کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اختر اس افسانے میں ہمیں گاؤں لے جاتے ہیں۔ گاؤں کی زندگی کی چند اچھی تصویریں اُبھارتے ہیں۔ ایسی تصویریں؛ جو کئی وجوہ کی بنا پر شہری زندگی سے زیادہ بہتر، زیادہ پُرخلوص اور وسیع ہیں لیکن افسانہ لکھتے لکھتے اختر سے کئی بار لغزشیں ہوئی ہیں۔ افسانے کی بے جا طوالت اس کے مرکزی تاثر کو مجروح کر دیتی ہے۔ معمولی واقعات پر صفحوں کے صفحے لکھنے کی وجہ سے اصل موضوع بار بار آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ واقعہ جب گاؤں میں شادیوں کا موسم آتا ہے اور اس کے فوراً بعد ہی ہیضہ پھوٹتا ہے۔ یہ سارا واقعہ بڑے سلیقہ سے چند سطروں میں لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اختر نے اس واقعہ کو طلسم ہوشربا کی داستان بنا کر پیش کیا ہے اور افسانے کا ایک اچھا بھلا موضوع محض اختر کی اپنی فنّی خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے کمزور اور خام رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اختر کا "محمدو ولدِ لسو" افسانہ نہیں بلکہ ایک داستان ہے، ایک تفریحی کہانی۔ جس کے اختتام پر بچوں کی کہانیوں کی طرح ایک نتیجہ (Moral) بھی نکلتا ہے کہ کشمیری بُزدل نہیں بلکہ زندگی کے شیدائی ہیں۔

اختر کو غالباً خود بھی اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ "دانتا کل کل"، "ریشمی شلوار"

اور "آدم ہے عجب ذات" کو چھوڑ کر اُن کے بیشتر افسانے اتنے مقبول نہ ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موضوع میں تنوّع ہونے کے باوجود تیکنیک کی یک رنگی نے ان افسانوں کو Monotonous یا اُکتا دینے والا بنا دیا ہے۔ اختر غالباً خود بھی اپنی تیکنیک کی یک رنگی سے اُکتا گئے ہیں۔ اس لئے آج کل نئی تیکنیک کو اپنا کر افسانے لکھتے ہیں۔ "ہاہاکار" اور "دو آنکھیں" اسی تجرباتی دَور کے افسانے ہیں۔ اختر کے سہ سمتی کردار اب زیادہ تر اپنی نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار نظر آتے ہیں اور خارجی عوامل ان کے داخلی جذبات کو متحرک کرنے کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ ایک صدی بن جاتا ہے اور اختر شعور کی رَو یا (stream of conciousness) تیکنیک پر تجربے کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں مطالعہ سے لاپروائی اور غفلت اس تیکنیک کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ ہوسکتا ہے کہ اختر اس تیکنیک میں آگے چل کر اچھے افسانے لکھ سکیں، لیکن اس وقت تک ان کے اس تیکنیکی تجربے کے افسانے اطمینان بخش نہیں ہیں۔

اختر کے مقابلہ میں محمد امین کامل تجربات کے قائل نہیں ہیں۔ کامل اب بھی پُرانے اُستادوں کی تیکنیک کو لے کر ہی افسانے لکھتے ہیں۔ او، ہنری اس معاملہ میں محمد امین کامل کا پیر و مُرشد ہے۔ "میں ہوں ہندوستانی"۔ "غریب کی جورُو"۔ اور "عائشہ نکمی" افسانے اپنے خاتمہ پر پڑھنے والے کو ایک ذہنی جھٹکا دیتے ہیں۔ اور وہ حیران ہو جاتا ہے۔ نئی سماجی حقیقتوں پر طنز کرنے کا یہ آزمودہ نسخہ ہے۔ او، ہنری کو مرے ہوئے اب پچپن ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ اس کی موت کے بعد بھی قاری کو حیرت میں ڈالنا افسانے کا ایک مقصد مانا گیا۔ سماجی حقیقتوں پر اس کے بعد بھی طنز کیا گیا۔ لیکن تیکنیک کو آگے بھی بڑھایا گیا۔ اس سلسلے میں ہم امریکی افسانہ نگار اسٹائن بیک اور فالکنز کے علاوہ اُردو افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور شوکت صدیقی وغیرہ کے نام لے سکتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ او، ہنری کی تیکنیک سے بہت آگے نکل چکا ہے اور اختتام پر یہ خلافِ توقع تحیّر اور یہ ذہنی جھٹکا نہ صرف مغربی افسانے کا ہی ماضی بن چکا ہے بلکہ اُردو اور ہندی افسانہ بھی اس لگی بندھی تیکنیک سے دامن چھڑا کر اب بہت آگے نکل چکا ہے۔ اگر آج کا قاری بھی افسانے کی ان ہی خوبیوں کا متوالا ہوتا تو شاید اُسے سامرسٹ مام، ہیمنگ وے، راجندر سنگھ بیدی اور ریتو کے افسانے بالکل متاثر

نہ کرتے۔ اور اگر ہم خود کامل کے افسانے "آئینہ" میں اس خلافِ توقع تحیر کو تلاش کریں تو ہمیں مایوسی ہوگی۔ کامل اس افسانے میں اُو ہنری کو فراموش کر کے نکلے ہیں اور "آئینہ" ایک عام سی نفسیاتی حقیقت ہونے کے باوجود بھی ایک اچھا افسانہ بن گیا ہے۔

اختر محی الدین کے بعد اوتار کرشن رہبر، صوفی غلام محمد اور بنسی نردوش ہمارے ایسے افسانہ نگار ہیں جو صاحبِ تصنیف بھی ہیں۔ رہبر کی کتاب کا نام "تبرک" ہے۔ رہبر نے اپنے افسانوں میں موضوع اور تیکنیک کی اہمیت کو فراموش کر کے زیادہ تر زور زبان پر دیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ "تبرک" کا کوئی بھی افسانہ ذہن و دل پر کوئی امٹ نقش نہیں چھوڑتا۔ اس کتاب کے بعد رہبر نے کچھ اور بھی افسانے لکھے ہیں جن میں "عائشہ" ان کے دوسرے افسانوں اور خاکوں کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

صوفی غلام محمد اب تک دو کتابیں شائع کرا چکے ہیں۔ ایک "شیشہ اور سنگ" اور دوسری "ڈوبے ہوئے تارے"۔ ان دونوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد صرف تین افسانے ایسے نظر آتے ہیں جو قاری کی توجّہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ افسانے ہیں، "کوئلہ چور"، "مال دیدی"، اور "عجب ملک نوش لب"۔ "کوئلہ چور" افسانے میں ایک نانبائی کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی دردناک کہانی بیان کی گئی ہے۔ کارخانے کا مالک ان مجبوروں کی محنت کا دن رات استحصال کر کے اپنی تجوریاں بھرتا ہے اور جب ایک مزدور اس زیادتی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اُسے مکھن میں سے بال کی طرح الگ کر دیا جاتا ہے اور بغاوت اور نفرت کی یہ آگ سہ پہر کے تندور ہی کی طرح ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ افسانے کا موضوع کم از کم کشمیری افسانے کے لئے اچھوتا ہے۔ لیکن کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی روزمرہ زندگی کا حال پڑھ کر قاری کے ذہن میں میکسم گورکی کی ایک شہرہ آفاق کہانی "چھبیس مزدور اور ایک لڑکی" کے کردار اُبھرتے ہیں جو ان ہی مزدوروں کی طرح ایک بیکری میں کام کرتے ہیں۔ پنجرے میں بند پنچھیوں کی طرح یہ مزدور بھی روشنی اور نور سے محروم ہو کر اندھیری بیکری میں دن رات کام کر کے اپنے مالک کی تجوریاں بھرتے ہیں اور خود مفلس و نادار رہتے ہیں۔ اس بیکری کا ماحول بھی کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا کہ صوفی نے اپنے افسانے "کوئلہ چور" میں پیش کیا ہے۔ اس تقابل کا مقصد یہ دکھانا نہیں کہ صوفی نے خدانخواستہ میکسم گورکی سے تاثر لے کر اپنا افسانہ لکھا ہے۔ پھر بھی یہ توارد ایک حسّاس قاری کو ضرور ناگوار گذرتا ہے۔ اس ناگواری کا ایک جواز غالباً یہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ میکسم گورکی کی کہانی جن فنی بلندیوں کو

چھوتی ہے۔ صوفی بہرحال وہاں پہنچنے نہیں پائے ہیں۔ یہاں ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا کشمیری افسانے کا جائزہ پیش کرتے وقت یہ تقابلی مطالعہ موزوں ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ تقابل بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس مقالے میں اس سے پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی گئی کہ مختصر افسانہ اب صرف روس، فرانس، برطانیہ یا امریکہ کی میراث نہیں رہا ہے۔ دُنیا کا کوئی بھی مُلک کوئی بھی سماج اور کوئی بھی فرد مختصر افسانے کو اپنی تمدّنی میراث سمجھتا ہے۔ ادب اور فن کی حدبندیاں نہیں ہوتیں اور ساری دُنیا کے لوگ اس تمدّنی میراث کے وارث ہیں۔

صوفی کے دو اور افسانے "مال ویدی" اور "عجب ملک، نوش لب" ہیں سے پہلے افسانے میں ساگ بیچنے والی ایک عورت کا کردار حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور دوسرے میں ایک میاں بیوی کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی زندگی غربت اور ناداری میں گذرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں وہ انسانی قدریں موجود ہیں جن پر کوئی بھی صاحبِ ثروت انسان فخر کر سکتا ہے۔ پہلے افسانے میں سری نگر کے ایک بازار کی مجموعی تصویر اچھی طرح اُبھری ہے اور دوسرے افسانے میں ایک جھونپڑی کے اندر ہونے والے انسانی ڈرامے سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ افسانے اُس حد تک ہماری تشفّی نہیں کر پاتے جس حد تک ایک اچھا شہ پارہ یہ کام کر سکتا ہے اور پھر ایسے افسانے اُردو اور ہندی رسائل میں سینکڑوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور گمنامی کی موت مرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک بار پھر اپنے ادبی افلاس کا احساس ہونے لگتا ہے۔

"ڈوبے ہوئے تارے" صوفی غلام محمد کی دوسری کتاب ہے جس میں کچھ کرداروں کے خاکے لکھے گئے ہیں۔ اس مقالہ میں ان خاکوں پر بحث مطلوب نہ تھی۔ لیکن صوفی نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ سات تارے خاکے بھی ہیں اور افسانے بھی۔ لیکن صوفی کا یہ بیان بہرحال محلِ نظر ہے۔ صوفی کا یہ کہنا گمراہ کُن ہے کہ یہ خاکے بھی ہیں اور افسانے بھی۔ صوفی کا خیال ہے کہ آج کا قاری مصنف کی نسبت کم شعور یافتہ اور فنّی اہلیت میں اُس سے کم تر ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ آج کا قاری صرف صوفی کے افسانے ہی نہیں پڑھتا بلکہ عالمی ادب کا مطالعہ بھی کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ادیب اور فن کار سے زیادہ فنی شعور اور فہم و فراست کا مالک ہوتا ہے۔ کوئی ادیب کہے تو کہے کہ یہ افسانہ ہے، وہ خاکہ ہے اور وُہ ناولٹ۔ لیکن جب تک نقاد اور قارئین بھی ادیب کی

اس بات سے اتفاق نہ کریں، بات نہیں بن پاتی!

ہمارے تیسرے صاحبِ تصنیف ادیب بنسی نردوش ہیں۔ ان کی دو کتابیں "میں بالادم توڑلو" اور "آدم یُوں ہی بدنام" اب تک چھپ چکی ہیں۔ بنسی نردوش کے افسانے پڑھ کر دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنسی نردوش ایک افسانہ نگار کی نسبت ایک اچھے داستان گو ہیں۔ دوسری یہ کہ ان کے موضوع بڑے محدود ہیں۔ داستان گوئی سے افسانہ نگاری تک کا زمانہ سینکڑوں برس کا ہے۔ داستان گوئی اپنے وقت میں اگر ایک فن تھا تو موجودہ افسانہ اس فن کی معراج ہے۔ اور نردوش کے فن سے یہ معراج سرے سے ہی غائب ہے۔ مثال کے طور پر ان کا "ڈر" لیجئے۔ یہ شروع سے آخر تک ایک مافوق الفطرت ماحول میں اُبھرتا ڈُوبتا افسانے کی ساری خوبیوں سے محروم ہو کر ایک داستان کے رُوپ میں ناپختہ اور نابالغ قاری کو تھوڑی دیر کے لئے محظوظ کرتا ہے۔ یہی حال ان کی دوسری کہانی "بجلی" کا بھی ہے۔ اب رہے بنسی نردوش کے موضوع، ان میں کوئی تنوّع، کوئی رنگارنگی، کوئی جدّت اور دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنسی نردوش اتنے بالغ ہو کر بھی اپنے محلّے کی گلیوں سے باہر نہیں نکل سکے ہیں! اس سلسلے میں مجھے ایک باشعور قاری کی یہ باتیں بار بار یاد آتی ہیں:

> "بنسی نردوش کا سارا فن "بُڈی یار"[1] کے ایک کوچے میں بند پڑا ہے۔ اگر وہ اس کوچے سے نکل کر بڑی بڑی راہوں پر چل نکلنے کے لئے تیار ہوں تو افسانہ نگار بن سکیں گے۔"

اور واقعہ یہی ہے کہ بنسی نردوش نے جو کردار ہمیں دئے ہیں وہ سب کے سب اسی کوچے کے گرد و پیش میں رہتے ہیں۔ اس کوچے سے نکل کر ان کرداروں کا کیا روّیہ (Attitude) رہے گا؟ یہ بات بذاتِ خود ایک اچھا موضوع بن جاتا، لیکن نردوش نے اب تک ان کرداروں کو اس کوچے سے نکالنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بنسی نردوش میں ایک اچھے افسانہ نگار کی صلاحیتیں موجود ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ بنسی نردوش میں یہ صلاحیتیں کماحقہٗ موجود ہیں اور اس بات کے ثبوت میں ہم ان کے افسانے "شہد کی مکھی"، "کسی کا بالاپن نہ

---

[1] نردوش کے محلّہ کا نام

لُٹے!" اور " یہ بھی ایک احساس ہے " پیش کرسکتے ہیں۔ یہ تینوں افسانے کشمیری افسانے میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ خصوصاً افسانہ " یہ بھی ایک احساس ہے " مختصر افسانے کی ساری خوبیوں کا حامل ہے نرّدوش کا ناولٹ " کبھی نغمہ، کبھی نوحہ " بھی میرے خیال میں ایک افسانہ ہی ہے جو اپنی غیر ضروری اور ناموزوں طوالت کی وجہ سے ایک اچھا افسانہ نہیں بن سکا ہے۔

بنسی نرّدوش کے فن کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ان کے ذہنی پسِ منظر کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے۔ نرّدوش اپنی زندگی کا بیشتر وقت اخبار نویسی میں صرف کرچکے ہیں اور غالباً ان کا ذہن، دِل اور قلم ایک خاص طرف ڈھل گئے ہیں۔ افسانے میں بیانیہ پر زور، جزئیات پر ضرورت سے زیادہ توجہ اور حسیّات کو وقتی طور پر مشتعل کرنے والے (Sensational) واقعات نرّدوش کی اخباری زندگی کی دین ہیں۔ ان کا " ایرادھی کون ؟ " ان ساری اخباری خوبیوں اور افسانوی خامیوں کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ نرّدوش جب آگ کا واقعہ بیان کرنے لگتے ہیں تو صفحوں کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اور جب اس واقعہ کو ایک افسانہ بناکر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں وقتی طور پر حسیّات کو مشتعل کرنے والے (Sensational) پہلو کی تلاش میں بھٹک جاتے ہیں نتیجہ کے طور پر افسانہ بُری طرح ناکام رہ جاتا ہے۔

تاج بیگم رینزو کشمیری زبان کی پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں۔ انہوں نے کوئی چھ افسانے لکھے ہیں جن میں " خوش فہمی " اور " آستانہ کی ڈیوڑھی " قابل ذکر ہیں۔ " خوش فہمی " افسانے میں تاج بیگم نے موجودہ زمانے کے عیّاشی کے اڈّوں یعنے لکشری کلبوں (Luxury clubs) کی بے تکی، مصنوعی اور گھناؤنی زندگی کے رُخ سے نقاب اُٹھایا ہے اور ہمارے سماج کے اُوپری درمیانی طبقہ کے لوگوں کے رشتوں کے تصنّع، اخلاقی پستی اور غیر انسانی قدروں کا فن کارانہ انداز میں مذاق اُڑایا ہے۔

ایک سرے پر اگر تاج بیگم رینزو کا " خوش فہمی " لکشری کلبوں کی گھناؤنی تصویر پیش کرتا ہے تو دوسری طرف " آستانہ کی ڈیوڑھی " میں بھکاریوں کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ " آستانہ کی ڈیوڑھی " افسانہ اگرچہ حیات اللہ انصاری کے افسانے " آخری کوشش " کی سی بلندیوں کو چھُونے نہیں پایا ہے، لیکن پھر بھی اس میں بڑے اچھُوتے انداز میں بھکاریوں کی بے کس و بے بس زندگی کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔

غلام رسول سنتوش ایک مصوّر کے لحاظ سے اب تک بین الاقوامی شہرت کے مالک بن چکے ہیں۔ ان کی سیمابی طبیعت ان کو فن کے دوسرے اُفق تلاش کرنے کے لئے بھی مجبور کر رہی ہے۔ سنتوش اب تک کئی کشمیری افسانے لکھ چکے ہیں جن میں "خانہ دار" اور "بُندوں کی جوڑی" کامیاب افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ "خانہ دار" میں ایک مانجھی لڑکے کی شبانہ روز محنت کا حال، اور "بُندوں کی جوڑی" میں ایک بہن کی قربانیوں کا بیان قاری کے ذہن میں کئی سوال پیدا کرتا ہے۔ مانجھی کے لڑکے کو، جسے کسی اسکول میں پڑھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچانے کے وقت طلب اور محنت طلب کام میں جُٹنا پڑا ہے؟ بچوں کی مزدوری (Child Labour) آج کے سماج میں بھی کیوں کر واجب الاجازت قرار دی جاتی ہے؟ "بُندوں کا جوڑا" ہمارے سماجی رسم و رواج کے مُنہ پر ایک زوردار چپت ہے۔ یہ رسم و رواج جو شریف النفس عورتوں کو بعض اوقات اپنی شرافت اور حُرمت کا سودا کرنے پر مجبور کرتے ہیں، کیونکر برداشت کئے جاتے ہیں؟

ہمارے نوجوان افسانہ نگاروں میں شنکر رینہ، ہردے کول بھارتی اور عباس تابش کے نام قابل ذکر ہیں۔ شنکر رینہ اپنی طوالت پسندی کے باوجود بعض اوقات اچھی چیزیں لکھتے ہیں۔ بھارتی موضوع میں تنوّع پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے افسانے "مزاج کی گرمی"، "شکست" وغیرہ کشمیری افسانے کی کم مائگی کے پیش نظر قابل قدر افسانے ہیں۔ لیکن بھارتی بہت کم لکھتے ہیں۔ انہوں نے فن کو تجارت کا نام دیا ہے اور جب کہانیوں کا مقابلہ ہو، کہیں سے "ٹھیکہ" ملنے کی بات چلے، تب یہ قلم توڑ کر لکھتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے باوجود کہ فن تجارت نہیں، اچھا لکھتے ہیں۔ بھارتی شاذ و نادر ہی اُس بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہوتے ہیں، جو فن کی تخلیق کا کرب بن کر فن کار کو تڑپاتے ہیں اور اُس سے شہکار چیزیں لکھواتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں عباس تابش ایک جذبہ، شوق اور ریاض کے ساتھ اپنی افسانوی دُنیا سنوارتے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے "مُفلس" اور "فیصلہ" ان کی محنت اور ریاض کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن سوال تعداد (quantity) کا نہیں بلکہ معیار (quality) کا ہوتا ہے۔ ایک باشعور قاری کشمیری افسانے کے اُس "حاصل" سے ہرگز مطمئن نہ ہوگا جو ہم نے تیرہ سال کی محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔

کیونکہ مجموعی اعتبار سے کشمیری افسانے کا معیار بہت بلند نہیں ہے۔ کسی ادب پارے کا معیار دو باتوں سے پرکھا جاتا ہے۔ پہلی بات موضوع ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ موضوع پیش کرنے (Presentation) میں ادیب نے کس طرح فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ کشمیری افسانہ نگاروں نے آج تک جو کچھ لکھا، اُس میں سے بیشتر افسانوں میں نہ تو موضوع کا کوئی تنوّع ہے اور نہ ہی تیکنیکی پختہ کاری۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیری افسانہ ابھی تک دارالخلافہ سے نکل کر دیہاتوں میں نئی سمتوں کی تلاش میں نہیں جا سکا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار ابھی تک شہری زندگی کی تصویریں ہی پیش کرتے ہیں۔ وہ غالباً بھول گئے ہیں کہ دیہاتوں میں بھی ایک رنگارنگ اور متنوّع زندگی ہے۔ اور اگر وہ چاہیں تو دیہاتی زندگی کے موضوعات پر بھی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں۔ اور پھر ان موضوعات میں نیا پن ہوگا۔ رنگارنگی ہوگی، جان ہوگی۔ گاؤں کی زندگی آہستہ آہستہ بدلنے لگی ہے اور ایک غیر محسوس انقلاب اس زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ ان موضوعات پر لکھا جا سکتا ہے اور اچھا لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری محرومی یہ ہے کہ کشمیری زبان کے کم و بیش سبھی افسانہ نگار دیہہ نژاد ہونے کے باوجود شہر میں ہی رہتے ہیں اور گاؤں کی زندگی سے ان کی اپنی زندگی کا رشتہ برائے نام رہ گیا ہے۔ وہ شہری زندگی پر ہی اپنا زورِ قلم ختم کرتے ہیں۔ لیکن وہ بھی محدود طریقے پر۔ ایسے موضوع لیتے ہیں جو فرسودہ ہو چکے ہیں۔ جن میں کوئی جان نہیں، کوئی زور نہیں۔ وہ چاہیں تو ایک حقیقت پسند کی طرح آنکھ کھول کر، حالات کو پرکھ کر، واقعات کو محسوس کر کے شہری زندگی میں سے بھی اچھی چیزیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اُس تضاد کے بارے میں لکھ سکتے ہیں۔ جو ہماری آج کی زندگی کی ایک حقیقت بن چکا ہے۔ سماج کا ایک خاص اور محدود طبقہ روز بروز امیر اور دولت مند بنتا جا رہا ہے۔ جب کہ باقی طبقے روز بروز غریب بنتے جا رہے ہیں۔ اقتصادی منصوبہ بندی کے باوجود اس کے پُر نقص عمل سے زیادہ تر لوگوں کا معیارِ حیات بلند نہیں ہونے پاتا۔ دفتر کے کلرک، کام گار، بے زمین کسان، مانجھی، چھوٹے چھوٹے تاجر، دستکار اور سماج کے دوسرے پیشہ وروں کی زندگی جس بُحران کا شکار ہے، ہمارے افسانہ نگار اس کا تجزیہ پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ان موضوعات پر قلم اُٹھانے کے لئے جس جرأت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے اُس سے ہمارے اکثر افسانہ نگار بے بہرہ ہیں۔ وُہ مصلحتوں کے شکار ہیں۔ ان میں سے اکثر نیم خام دانش ور (Pseudo - intellectuals) ہیں جو حالات کے ساتھ ہی اپنا روّیہ (Attitude) اور نظریہ بھی بدل دیتے ہیں اور ہر اُس سماج میں پائے جاتے ہیں جو تضادات کا شکار ہو۔ ان دانشوروں

میں جو خامیاں اور کوتاہیاں (Limitations) ہوتی ہیں، وُہ تخلیقی عمل کی راہ میں روڑا بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ابن الوقتی، زمانہ سازی اور مصلحت اندیشی کی ایک مسموم ہوا چلتی ہے جو ادب اور فن کے گلشن کی آبیاری کرنے کی بجائے اس کو مُرجھا کر رکھ دیتی ہے۔

ادب کی تخلیق کے سلسلے میں اگر ہمارے پیش رَو بھی اسی ابن الوقتی، زمانہ سازی اور مصلحت اندیشی کا شکار ہو جاتے تو غالباً دُنیا اب تک بہت سے دوامی ادب سے محروم رہ جاتی۔ اُس صورت میں ایملی زولا، گستاو فلابیر، گوگول، داستوویسکی، ڈی، ایچ لارنس، نظیر اکبر آبادی، پریم چند، ناظم حکمت، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو اور دوسرے کئی بلند پایہ ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو چکے ہوتے!

ادب کی تخلیق اگر ایک طرف ادیب کی ذاتی شہرت کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے تو دوسری طرف یہ زندگی کے ایک آدرش اور ایک مشن کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس آدرش کی تکمیل اور اس مشن کے حصول کے لئے ہر زمانے میں ادیبوں نے سختیاں جھیلی ہیں۔ جُولیس فیوچک تختۂ دار پر بھی اُمید اور ایک اچھے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ ناظم حکمت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بھی زندگی کے حُسن کا متلاشی ہے۔ قاضی نذر الاسلام ایک عالم گیر مخالفت کے باوجود پیار کے گیت گاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو افلاس و غُربت کا شکار ہو کر بھی انسان کو انسان بنانے کی تمنّا میں افسانے لکھتا ہے۔

ہمارے ادیبوں میں سے اکثر دوست افسانہ نگاری کو ذاتی شہرت حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ جانتے ہیں اور ادب کی تخلیق اُن کی زندگی کا آدرش یا اُن کا مشن نہیں بن پایا ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو آج کی نسبتاً سازگار فضا میں وہ یُوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھتے۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھتے۔ آج کشمیری افسانے پر جو جمُود آگیا ہے اُس سے ہم سب کو چوکنّا ہونا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے پچھلے تیرہ سال کے "حاصل" پر اکتفا کر کے خاموش ہو جائیں! اور کشمیری زبان —— یہ پیاری پیاری زبان جس سے ماں کے دُودھ کی خوشبُو آتی ہے، جو بہاروں کی پروردہ ہے، جو خزانوں سے بھی پیار کرتی ہے۔ جو یہاں کے عوام کے جذبات اور احساسات کو آسانی سے ادا کرتی ہے۔ ایک بار پھر کس مپرسی کے عالم میں پڑے، ہمارے ادیبوں کو اس زبان کے تئیں اپنے فرائض کو نبھانا ہوگا۔ افسانہ نگار اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ہی کشمیری زبان میں پہلی بار افسانے لکھ کر اس کی نثر کی شروعات کی ہیں اور یہ ان ہی کا کام ہے کہ وہ دردمندی، خلوص اور ایمان داری کے ساتھ اپنا کام جاری رکھ کر کشمیری زبان کو مالامال کر دیں! ●

رحمان راہی

اَکھ خاب

میٚہ وُچھ اَتھ خاباہ!
یہِ پیٹھ وَن، یہِ شیٖنچ نعوٗ دایی، یہِ روتُل
کُنےٚ پہرِ پاوُر ترِ اُتھی منز یہِ آدم
(میٚہ گوٚد برٛ ونت اَنس اندر پان ڈِیوٗکھُم)
نہ، وٚوٚنس نہٕ کینہہ، ترہاشِس چھےٚ سینہٕ
بریہان چھُس دِلکُ نار حارال اُچھن منز
وِڈھن پینٹھ مناجات چھِس تارِہ گامتی

○

یہِ پیٹھ وَن، یہِ ماگیچ نعوٗ دایی، یہِ روتُل
اما برزِتل کیاہ یہِ یکھ واو ہیٚو گوو
مُبارک! مُبارک! یہِ پھاپوٗزہٕ مُبارک!
ہتاہ پانہٕ کیاہ چھُک بہان اُنی کھوتین منز
نیٚبرِ کیٚنہ حیٖنہٕ کٔمی تال کرامات کرٕمژ
اہاہا! ہُمس گنڈہ دُہس پھیور طالع
تہٕ نبھتر نوٚن یہِ کرٕبنزِ رنگہ پھولایہ وٚولنس
شبِستانس اندر یہِ زھوٚٹ سونتہٕ آنگنُ
بسنز دِرمۂ ژرکلاہ، دمشنہ تا پہ فرداہ

یکھ اُتھی تھے رٲژھا ڈٲف ترٲوِو ــــ مگر ہے!
یہِ کُس جانہٕ وَراوس اَتھ کُنڈِ دُپھس پیٹھ
یِہے ژٕول، اُمے سونت وُپھلاوِ تھے رَنیو"

○

میٚہ وٕونس نہٕ کینہہ، از چھُ یِژ تبَنہٕ لیٚومت
ہُہ برٕونہہ برٕونہہ وُڑاں پھُلیہ وَق ہیتھ یکھن تل
یہِ شِنہٕ مرگہٕ ژھُنڈِ ژھُنڈِ اُمس رٹنہٕ دوراں
غبر گتھِ، غبر کورکُن، کوٗت کالاہ
یکھو تلی پھو لن رنگ، کھو رن داغ چھو کلنَ
اما پوز کلِس نِش ہُہ وِچھ رازہ ہونزن
یکھن تل رٕوٹن کیاہ، مگر ہے یہِ شیٚہلیو!
کنیو، شین اُتھی پیٹھ دِتُن ڈٲف آخر

○

یہِ پیتھ وَن یہِ موٚت موٗسِماہ، شوٗژ ساتھاہ
زنگن ہنز وُنل، مُشکہِ سَر لہرہ ماراں
وَندُک شِین گُلی گُلی فضا گِنگراواں
چھُ ہیُتھ پھرہ براندس ترِ از تاپ زُنزواں
کلِس پیٹھ چھُ کُستاں گیواں نغمہ سونتُک
کَنِن نِش یہِ کستانی ہنز کلہِ کھو پرِ، وِچھ
اتھ اندر ترِ کھوتمُت چھُ تھیکہِ نبُل گُلالاہ
میٚہ وُچھ رات خاباہ!

قدیم سنسکرت کا کشمیری شاعر بلہن

ویسے تو کشمیر میں بہت سے سنسکرت شعرا، نقاد، ڈراما نویس، نظریات دان اور مؤرخ ہو چکے ہیں۔ لیکن اُن میں سے بہت کم ایسے تھے جنہوں نے وادی کو چھوڑ کر ہندوستان کے میدانی علاقے میں جا کر دائمی شہرت حاصل کی اور سنسکرت ادب کی تاریخ میں اُونچا رُتبہ پا گئے۔ جیسا کہ میں نے اپنے اس سے پہلے مضامین میں کئی دفعہ دہرایا بھی تھا جہاں کشمیر اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے دُنیا بھر میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے وہاں سنسکرت ادب کے میدان میں بھی یہ سب سے آگے رہا ہے۔ اگر کشمیر میں لکھے گئے سنسکرت ادب کی تاریخ تیار کی جائے تو اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن یہ تاریخ کب تیار ہو گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ فی الحال تو ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں سنسکرت ادب کی تاریخ میں کشمیر کا حصہ باقی تمام حصوں سے بڑا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سنسکرت ادب تمام شعبوں کے زیادہ تر عالم اسی سرزمین پر ہوئے ہیں۔

ان عالموں اور ادیبوں میں شاعر بلہن کا خصوصی مقام ہے۔ کیونکہ اُس نے وادی سے باہر جا کر ہندوستان کے وسیع علاقے یعنی وِشال بھارت کی گود میں بیٹھ کر وہاں کے لوگوں پر اپنے فن کا سکہ جمایا اور کئی راج درباروں میں درباری شاعر کا اُونچا عہدہ حاصل کیا۔ بلہن کی شاعری کے مداح راجے مہاراجے یا عام لوگ ہی نہیں، حسین راج کُماریاں بھی تھیں۔ فن میں ایک عجیب کشش اور رُوحانیت ہوتی ہے جو بہت ہی کم شاعروں کے حصہ میں آتی ہے۔ بلہن کا شمار بلاشُبہ ایسے ہی شاعروں میں ہو سکتا ہے۔ کشمیر سے دو ہزار میل دُور جنوبی گجرات پہنچنا اور پھر سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کرنا ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کشمیری سنسکرت

شاعر کے بارے میں نہ صرف ہندوستانی عالموں نے بلکہ کیتھ، بھلر جیسے یورپ کے عالموں نے بھی تحقیق کی ہے۔

پیدائش اور حالاتِ زندگی

کشمیر کی موجودہ راجدھانی سرینگر (قدیم نام پرورپور) سے سات میل دُور مغرب کی جانب (ہونا چاہیئے جنوب مشرق کی جانب ــ مترجم) پامپور کے پاس ایک مقام جے ون (زیون) کے نزدیک کھونموہ نام کا گاؤں ہے جس کا پرانا نام کھونمُکھ تھا۔ زعفران کی کھیتی کی وجہ سے اس علاقے کو کشمیر میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی گاؤں میں کوشک گوتر والے برہمنوں کی ذات رہائش کرتی تھی۔ ان ہی براہمنوں میں مُکتی کلش نام کا ایک براہمن ہوا تھا جو وید شاستروں کا بہت بڑا عالم تھا۔ اسی براہمن کے خاندان میں مہاکوی بلہن پیدا ہوئے۔ شاعر ہونے کے علاوہ بلہن وید، شاستروں اور پُران سمرتیوں کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ اس وقت کشمیر پر مہاراجہ کلش دیو کا راج تھا۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی بلہن کے دل میں کشمیر سے باہر جاکر دوسرے ممالک دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ نتیجے کے طور پر وہ کشمیر سے چل پڑے اور متھرا، برندابن، کنوج، کاشی، پریاگ، اجودھیا، دھارانگر، گُرجر دیش، سوم ناتھ، سیتوبندھ اور دوسری جگہوں کی یاترا کرکے جنوبی ہند تک آگئے۔ آخر میں بلہن گجرات کے چالوکیہ خاندان کے راجاؤں کی راجدھانی کلیان پور میں پہنچ گئے۔ وہاں کے مہاراجہ وکرمانکدیو نے انہیں اپنے دربار میں راج کوی کا عہدہ بخشا۔ اس سے پہلے بھی بلہن جہاں جہاں گئے تھے وہاں کے راجاؤں نے اُن کی قابلیت اور فن سے متاثر ہوکر انہیں کافی عزت بخشی تھی۔ لیکن گجرات میں وکرمانکدیو کے دربار میں بلہن کو باقاعدہ درباری شاعر کے رُتبے سے نوازا گیا اور انہوں نے وہیں مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔

اسی گجرات صوبے کے انہل پتن نگر کے راجا ویر سنگھ کی بیٹی ششی کلا تھی۔ راجہ ویر سنگھ کی خواہش تھی کہ ششی کلا ایک عالمہ بن جائے۔ اس لئے اس نے صوبے کے تمام عالموں کی ایک مجلس بُلائی۔ جس میں مہاکوی بلہن نے بھی شرکت کی۔ راجا عالموں کی اس مجلس میں سے اپنی بیٹی کے لئے ایک معلّم چُننا چاہتا تھا۔ سبھی عالموں نے اپنی قابلیت کا نقارہ پیٹا لیکن بلہن کو ہی اس کام کے لئے سب سے قابل سمجھا گیا۔ مہاراجہ ویر سنگھ نے بلہن کو اپنی بیٹی کا معلّم مقرر

کرکے فیضیاب کیا۔ آخر بلہن کو ششی کلا سے محبت ہو گئی۔ خبر پا کر مہاراجہ نے بلہن کو پھانسی کی سزا دی۔ لیکن ششی کلا کو اپنے عاشق کے لئے پاگل دیکھ کر اور براہمن ہتیا سے ڈر کر مہاراجہ نے اس کا قصور معاف کیا اور دونوں کی شادی کر دی۔ بلہن کی زندگی کے بارے میں یہ کہانی " بلہن چرت " نام کی کتاب (جو کسی نامعلوم آدمی نے لکھی ہے) میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ کہانی قابلِ یقین نہیں مانی جاتی ہے۔ عالموں کا کہنا ہے کہ بلہن گیارہویں صدی (بکرمی سموت) کے آخر میں کشمیر سے چل کر گجرات پہنچا تھا۔ اُس وقت انہل پٹن میں چالوکیہ خاندان کا کرن راج (۱۰۷۲ — ۱۰۹۴ بکرمی) راج کر رہا تھا۔ ویر سنگھ سمت ۹۲ سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ گجرات کی تاریخ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ بات اب بغیر کسی شک و شبہ کے مانی جاتی ہے کہ بلہن گیارہویں صدی کے آخر میں گجرات آیا تھا۔ بلہن کی تصنیف " وکرمانکدیو چرت " کے ایک شلوک سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو راستے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا:—

بلہن اور ششی کلا کی شادی کو بے بنیاد ثابت کرنے کی یہ رائے ڈاکٹر بہلر کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ آگے لکھتے ہیں:

"کرناٹ میں پائے گئے ایک قلمی نسخے میں راجہ کا نام ویر سنگھ کے بدلے مدن ابھیرام اور اُس کی بیٹی کا نام ششی کلا کے بدلے یامنی پورن تلکا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کہانی بلہن کی تصنیف وکرمانکدیو چرت کے اٹھارہویں سرگ (Canto) میں، جس کا تعلق شاعر کے حالاتِ زندگی سے مانا جاتا ہے، نہیں ملتی ہے۔ چور پنچاشِکا میں شاعر بلہن نے اپنی معشوقہ کسی راجکماری سے مخاطب ہو کر ہجر کی روئیداد بیان کی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ یہ چور نام کے کسی دوسرے شاعر کی تخلیق ہے۔"

آگے چل کر بہلر صاحب لکھتے ہیں کہ بلہن نے ۱۰۶۲ — ۶۵ء کے درمیان کشمیر چھوڑا تھا اور گجرات میں وکرمانکدیو کا درباری شاعر بن کر اُن کی زندگی کے بارے میں وکرمانکدیو چرت کی تخلیق کی۔ اُس وقت بلہن کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ ۱۰۸۵ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔

اس کے برعکس ڈاکٹر کیتھ اپنی کتاب "کلاسیکی سنسکرت ادب (Classical Sanskrit Literature) میں لکھتے ہیں:-

"چورپنچاشِکا اور وکرمانکدیو چرت دونوں کے مُصنّف بلہن ہی ہیں۔ راجہ کا اپنی لڑکی کے عاشق بلہن کو موت کی سزا دینے کی بات تو جھوٹ ہے۔ البتہ بلہن نے اپنی پُر اثر شاعری کے ذریعہ شہزادی کا دِل ضرور جیت لیا تھا۔

کلہن کی "راج ترنگنی" کے مطابق بلہن نے کشمیر کے مہاراجہ کلش کے زمانے میں کشمیر چھوڑا اور گجرات جاکر کرناٹ کے راجہ کے دربار میں عزّت پائی۔ ان کے ڈرامے "کرن سُندری" میں گجرات کے راجہ کرن اور کرن سُندری کی داستانِ عشق کا تذکرہ ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بلہن کچھ وقت کے لئے گجرات میں ضرور رہے تھے۔ اس کے بعد وہ جنوب کی جانب اور آگے بڑھے۔ جہاں انہوں نے کلیان کے راجہ وکرم دیو کے دربار میں خاص رُتبہ حاصل کیا۔ وہیں رہ کر بلہن نے اپنے سرپرست اور محسن کے کارناموں کے بارے میں ایک نظم لکھی۔

اُوپر کی اس ساری بحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بلہن کشمیر کو چھوڑ کر جنوبی ہند (گجرات) گئے تھے۔ اور وہاں کے راج درباروں میں انہوں نے عزت پائی تھی۔

بلہن کی رومانیت

یہ بات غور طلب ہے کہ بلہن کی شاعری کا موضوع خاص طور پر شِنگار (حُسن و عشق) ہی کیوں ہے؟ شاعر کے نظریہ حیات میں اُس کے حالاتِ زندگی کا کافی دخل ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنی زندگی میں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اُن کی گونج اُس کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ شاعری، شاعر کے جذبات کے اظہار کے سِوا اور کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ شاہی درباروں کے حُسن و عشق کے ماحول میں پل کر بلہن کی شاعری بھی اسی سانچے میں ڈھل گئی۔ ساتھ ہی اپنی محبوبہ راج کماری کی محبت کے حسین اور تلخ تجربات نے بھی اُس کی شاعری کو یہی خاص رنگ اختیار کرنے میں مدد دی ہوگی۔

"چورپنچاشِکا" میں شاعر بلہن نے حُسن و عشق سے متعلق ساری حدود کو پار کیا ہے۔ اس میں کام دیو (محبت کا دیوتا) کی تڑپ اور پیڑ کا بیان بلندیوں کو چھوتا ہے۔ راجکماری (شاعر کی معشوقہ) کے ہجر میں شاعر اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرتا ہے، اس سلسلے میں

کچھ مثالیں نیچے دی جاتی ہیں :-

(۱) چندرما کے مانند مکھڑے والی، جس کے بدن کے مختلف عضووں سے جوانی چھلکتی ہے جس کے پستان موٹے ہیں، جو کام دیو کے تیر سے زخمی ہو کر تڑپتی ہے۔ ایسی گوری (اس راج کماری) کو آج بھی اگر میں دیکھ لوں تو اپنے جسم کو ٹھنڈا کر پاؤں۔

(۲) موٹی موٹی آنکھوں والی۔ جس کا سارا بدن ہجر کی آگ سے جھلس رہا ہے۔ ایسی اُس کو (شہزادی کو) آج بھی اگر پا جاؤں تو اُس کے ساتھ ہم آغوش ہو کر اپنی آنکھیں بند رکھوں اور کبھی اُسے نہ چھوڑوں۔

حسن و عشق کا اس قسم کا ذکر کتاب کے ایسے ہی پچاس شلوکوں میں ملتا ہے۔ دراصل حسن و عشق کا یہ بیان اخلاقی نقطہ نظر سے جائز نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ قاری پر اس کا بُرا اثر پڑنے کا بھی اندیشہ ہے۔ مگر شاعر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا ہے اُسے شاعری کا خمار چڑھا ہوتا ہے۔ لہٰذا جائز و ناجائز کا خیال اُس کے لئے اُس وقت ناممکن ہوتا ہے۔ "چور پنچاشکا" لکھتے وقت بلہن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔

اس قسم کے عشقیہ شاعری کی وجہ سے گجرات میں دوسری زبانوں کے شعرا بلہن کی تقلید کرنے لگے۔ بعد میں آنے والے وہاں کے شعرا نے جو "بھاشا" میں شاعری کرتے تھے۔ بلہن کے اسلوب بیان کو اپنایا۔ اُن کی تخلیقات ہمیں آج اس روپ میں ملتی ہیں۔

(۱) گجراتی زبان کی تصنیف "ششی کلا وِرہ (بِرہا) پرتاپ" میں بلہن اور ششی کلا کے عشق کی وہی داستان ملتی ہے جو اُس صوبے کی روایت میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہے۔ یہ تصنیف سولھویں صدی کے وسط کی ہے۔

(۲) ایک جینی شاعر گیان آچاریہ نے "بلہن کاویہ" اور "ششی کلا کاویہ" کی تصنیف اپبھرنش سنسکرت میں کی ہے۔

کالی داس کی تقلید

مہاکوی بلہن کی تمام تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انھوں نے بہت حد تک کالی داس کی تقلید کی ہے۔ بلہن نے اپنے ڈرامے "کرن سندری" میں خود قبول کیا ہے

جس انداز سے کالی داس نے "مالو کا اگنیتر" ڈراما میں مالوکا اور اگنیتر کی داستانِ عشق بیان کی ہے۔ اُسی انداز میں بلہن نے کرن سُندری ڈراما میں گجرات کے راجہ کرن اور کرن سُندری کی داستانِ عشق بیان کی ہے۔

بلہن کی دوسری تصنیف "چور پنچاشِکا" ہے۔ اس میں شاعر نے شہزادی کے ہجر میں اپنے جذبات کا اظہار اس طریقے سے کیا ہے کہ ہمیں کالی داس کی شہرہ آفاق نظم "میگھ دُوت" یاد آجاتی ہے۔ جس میں یکھش بالکل اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ کالی داس نے ہجر کی حالت کا بیان کرتے وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھا ہے اور اخلاقی قدروں اور "مریادا" کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ بلہن سے یہ ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ اُس کی تصنیف "چور پنچاشِکا" پر عُریانیت کا الزام بجا طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ بلہن نے اُسی راستے کو اپنانا چاہا ہے جس پر کالی داس چلا تھا۔ مگر شاعری کے ایک پہلو "شِنگار" (حسن و عشق) کے بیان میں بھی اُس سے کالی داس کے نقش قدم پر پُوری طرح نہیں چلا جا سکا ہے۔ وجہ صاف ہے۔ کالی داس کا اظہار عشق مذہبی، تمدنی اور اخلاقی حدود کے اندر ہی رہتا ہے۔ کالی داس نے "سوکیا نامیکا (اپنے خاوند سے ہی محبت کرنے والی عورت) کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے برعکس بلہن نے "پرکیا نامیکا" (اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ محبّت کرنے والی عورت) کے متعلق لکھا ہے۔ کالی داس نے محبت کے جذبے کا اظہار (مثلاً میگھ دوت میں یکھش کے جذبات کا بیان) ہندوستان کی تمدنی روایت کے اندر رہ کر ہی شائستہ اور واجب زبان میں کیا ہے۔ لیکن بلہن نے کسی روایت کی پرواہ کئے بغیر حُسن و عشق کا عُریان ذکر کیا ہے جو کالی داس کے معیار سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ کالی داس اپنی شاعری میں صرف ہیرو کے وصل یا ہجر کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیّت کو اُس پر حاوی ہونے نہیں دیتا ہے۔ اس کے برعکس بلہن ہیرو کی آڑ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ بلہن کی شاعری میں داخلیت کا کافی دخل ہے۔ "چور پنچاشِکا" میں دوسرا کوئی نہیں بلکہ خود بلہن ہی ہجر کی آگ میں جل رہا ہے۔

اس ساری بحث سے یہ بات عیاں ہے کہ بلہن نے شاعری کے ایک پہلو میں کالی داس کی تقلید کرنی چاہی تھی۔ مگر اُس میں بھی وہ کامیاب نہیں ہوا۔ کالی داس کی دوسری خصوصیتوں کو حاصل کرنا اُس کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ دراصل کالی داس کے رُتبے کا دوسرا کوئی شاعر پچھلے ڈیڑھ دو ہزار سال میں پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ اُن کے فن میں وہ بات تھی جو دوسرے کسی کے حصے میں آج تک نہیں آئی ہے۔

بلہن کی شاعری اور اُس کا فن اُس کی تصنیف "وکرمانکدیوچرت" میں اپنے عروج پر ملتا ہے۔ یہی وہ عظیم تخلیق ہے جس نے اُسے دائمی شہرت بخشی۔ اس میں ہمیں بلہن کی زبان کا گنگا کی طرح صاف اور بے ساختہ بہاؤ ملتا ہے۔ اندازِ بیان کی پُختگی، جذبات کی گہرائی اور زبان کی مِٹھاس اس تصنیف کی چند خصوصیتیں ہیں۔ اس تخلیق کا مرکزی جذبہ ویر رس (جذبۂ شجاعت) ہونے پر بھی اس میں شِرنگار رس (حُسن و عشق کا جذبہ) ہاسیہ رس (مزاح) کرُن رس (المیہ) کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس تصنیف کے چھٹے سرگ (باب) میں شجاعت کے جذبے کی تحریر شاعر نے جس انداز سے کی ہے اُسے دیکھ کر یہ بات بلا شُبہ کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح بلہن کو شرنگار پر عبور حاصل تھا اُسی طرح اُسے ویر رس کے بیان میں بھی کمال حاصل تھا۔ چندر لیکھا کی سراپا نگاری میں شاعر کے تخیّل کی پرواز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

تصانیف

جیسا کہ اُوپر کہا جاچکا ہے، بلہن کی تین ہی تصانیف ابھی تک ملتی ہیں۔ وکرمانکدیوچرت، کرن سُندری اور چور پنچاشِکا۔ چور پنچاشِکا کے مُصنف کے بارے میں عالموں میں اختلاف رائے ہونے کے باوجود بہت سے عالم بلہن کو ہی اس کا مصنف مانتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاعر نے ان کے علاوہ بھی کچھ لکھا ہوگا۔ لیکن وہ تصانیف ہمیں ملتی نہیں ہیں۔ شرنگدھر پدتی میں بلہن کے بہت سے شلوک دیئے گئے ہیں۔ جس سے شاعر کی دوسری تصانیف کا ثبوت ملتا ہے۔

ان تصانیف میں صرف "وکرمانکدیوچرت" ہی ایسی تخلیق ہے جس نے اپنی فنی پُختگی کی بدولت بلہن کو عظیم شعرا کی صف میں شامل ہونے دیا ہے۔ باقی دو تصانیف فنی لحاظ سے خاص اہمیّت نہیں رکھتی ہیں۔ یہاں ہم ان تینوں تخلیقات پر الگ الگ وچار کریں گے۔

(۱) وِکرمانکدیوچرت

یہ ایک رزمیہ ہے جو ۱۸ سرگوں میں ختم ہوا ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے سرپرست اور محسن جنوبی گجرات کے چالوکیہ خاندان کے راجہ وکرم دیو کے حالاتِ زندگی قلم بند کئے ہیں۔ وکرم دیو کی پیدائش سے لے کر سوئمبر، شادی، کئی ممالک پر چڑھائی، فتوحات وغیرہ کا ذکر سترہ سرگوں میں ہے۔ اٹھارہویں سرگ میں کشمیر کا ذکر ہے۔ رزمیہ میں شرنگار اور ویر رس کا حسین امتزاج ملتا

ہے۔ تاریخی رزمیہ ہونے کے باعث سنسکرت ادب میں اس تصنیف کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس ادب میں اس قسم کی تصانیف کا بہت حد تک فقدان ہے۔ مُدرا راکھشس، کُمار پال چرت، وکرمانکدیو چرت جیسی تخلیقات سنسکرت ادب میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ سب سے پہلے وکرمانکدیو چرت کو ڈاکٹر بہلر نے چھپوایا تھا۔ انہوں نے کافی کھوج کے بعد اس کا ایک قدیم نسخہ حاصل کیا تھا۔ کچھ مدّت کے بعد سمت ۱۹۷۸ بکرمی کے بنارس کے مشہور عالم شری رام اوتار شرما نے اسے ایک بار پھر چھپوایا (ناشر ہیں گیان منڈل پرکاشن۔ کاشی)

(۲) چور پنچاشکا

۵۰ شلوکوں کی یہ نظم سنسکرت ادب کی اُس صنف میں شمار کی جاتی ہے جیسے "کھنڈ کاویہ" کہتے ہیں۔ شاعر اس میں بیان کرتا ہے کہ ہجر کی حالت میں اُس کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اس میں عورت کے حُسن کی نگاری، وصل اور ہجر کا بیان بہت کچھ عریاں ہوا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے گجرات میں بلہن راج کُماری کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اُسی کے ہجر میں شاعر نے آنسو بہائے ہیں۔ جناب ایس، ایم ٹانڈ پاترکیر ایم، اے نے ۱۹۴۶ء میں پونا اورینٹل سریز (Poona Oriental Series) کے تحت اسے شائع کرایا تھا۔

(۳) کرن سُندری

یہ چار ایکٹوں کا ایک چھوٹا سا ناٹک ہے جس میں بلہن نے گجرات کے مہاراجہ کرن اور ودیادھر لڑکی کرن سُندری کے عشق کا حال بیان کیا ہے۔ شاعر کو ڈراما لکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس میں بھی نظم نثر پر غالب آئی ہے۔

جناب ایس، ایم ٹانڈ پاترکیر نے ہی ۱۹۴۶ء میں پونا اورینٹل سریز کے تحت اسے بھی شائع کرایا ہے۔

سیّد حرمت الاکرام

بُلاوا

(نذرِ جواہر لال نہرو)

جبیں ترنگے کی سنولا گئی اچانک کیوں؟
یہ کیوں اِک آن میں سر جُھک گیا ہمالہ کا؟
بُجھے بُجھے ہوئے لمحوں کی تیرہ سامانی
طلوعِ نَو "پہ ہے کیوں طعنہ زن، یہ بات ہے کیا؟
بساطِ گنگ و جمن ہے کہ آنسوؤں کا دُھواں
پھر ایک مرتبہ جیسے اُجڑ گئی دہلی
دبیز کہر میں غلطاں ہے وادیٔ کشمیر
یہ جادوؤں کی زمیں جس کا نام ہے بنگال
دکن کی موہنی دھرتی کا حُسن بے پروا
یہ کیا ہوا کہ ہیں سینہ فگار و چاک جگر
فصیلِ وقت میں کِس نے شگاف ڈال دیئے؟
حیات پھرتی ہے زخمِ دِل و نگاہ لیئے

اجل نے چھین لیا ہم سے تم کو، اے نہرو
یقین آئے تو کیوں آئے، ہے یہ بات عجیب
رگوں میں کِس طرح ٹھہرا تمہارا گرم لہو؟

دہکتے سینے میں ذوقِ حیات کی دھڑکن
خموش کیسے ہوئی، میں سمجھ نہیں پایا
تمہارے حوصلۂ چرخ بوس کا پندار
یہ کِس سے پُوچھوں، ہوا کِس طرح اجل کا شکار
سکوں گرفتہ ہوا کِس طرح مذاقِ خرام؟
یہ کِس نے بھر دیا زہرِ اب سے حیات کا جام؟
کوئی تو راز ہے جو فاش ہو نہیں پاتا
سوال کِس سے کروں، کون دے جواب مجھے
تمہیں سے پُوچھ رہا ہوں تمہیں یہ بتلاؤ

بُلاوا آیا یہ کِس دیس سے گلابوں کے؟
چلے اُجاڑ کے گلشن تم اپنے خوابوں کے

پشکر بھان

کشمیری شاعری میں طنز و مزاح

قرونِ وسطیٰ کا ایک کشمیری عالم تھا جس کے پاس دُور دراز علاقوں سے لوگ حصولِ تعلیم کے لئے آتے تھے۔ ایک مُفکر کے ناطے وہ بُنیادی طور پر سنجیدہ تھا اور اُس کا مزاج بھی بہت ہی سُلجھا ہوا تھا اور ایک خاص طبقے میں سمجھا جاتا تھا۔ اس کی مثالیں ہمیں یہاں کے قدیم سنسکرت شعرا کے کلام میں کہیں کہیں مِلتی ہیں۔ خاص طور سے ہمیں کھیمندر کی شاعری میں طنز و مزاح کی نہایت ہی معیاری مثالیں مِلتی ہیں۔ جہاں تک کشمیری شاعری کا تعلق ہے اُس کے نمونے ہمیں للیشوری (للہ عارفہ) سے پہلے نہیں مِلتے۔ للیشوری کی شاعری میں ہمیں عارفانہ رنگ کے علاوہ کئی ایسے واکیہ مِلتے ہیں جن میں اس عظیم شاعرہ نے اُس وقت کے سماج کا بھرپور مذاق اُڑایا ہے۔ وہ جب کشمیری پنڈتوں کو یگیہ کرتے وقت بھیڑ کی قربانی کرتے دیکھتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اس فضول سی رسم کا مذاق اُڑاتی ہے۔

ہتو بٹو پینی ترٛ مٹو   وٹس دکھا کتھی کھیوٛن

اسی طرح گھر گرہستی کے جھگڑے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں گھر کی لکشمی کی یوُں تعریف کرتی ہے:

کینژن رَن چھے رِشہج بوُنی   نیرُو نیبرٛ رِشہُل کرُو

کینژن رَن چھے برٛ پیٹھہ ہوُنی   نیرُو نیبرٛ زنگِی کھینی

اور وُہ جب کسی کو ایک بے وقوف کو گیان دھیان کی باتیں سمجھاتے دیکھتی ہے تو وہ یوُں اپنے طنز کے نشتر پھینکتی ہے:۔

مُڈس گیانچ کتھ نو وُنزے   کھرس گوُر دِنہٕ راوی دوہ

سیکہِ شاٹس بوٛل نو دُوزے   کوٛم یا جینٛ تیل دِنہٕ راوی دوہ

اس طرح اگر ہم کشمیری زبان میں طنز و مزاح کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو اس کا آغاز للیشوری سے ہی ہوتا ہے۔ للیشوری سمپور یا میپور میں سنہ ہجری کے قریب پیدا ہوئی۔ گو ان کی شاعری مے معرفت سے بھرپور ہے لیکن اُنہوں نے کئی واکیوں میں تلخ حقائق کو مزاح کی چاشنی میں ڈبو کر پیش کیا ہے۔ للیشوری روزمرہ کی زندگی میں بھی اپنی کئی حرکات سے مختلف بُرائیوں کا مذاق اُڑاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن اُن کے گورو گھاٹ پر سندھیا اشنان کرتے وقت اپنے جسم کو مٹی سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔ للیشوری نے یہ دیکھ کر ایک برتن میں کوڑا کرکٹ جمع کیا اور اُس کو باہر سے زور زور سے مانجھنے لگی۔ گورو نے کہا۔" للیشوری یہ کیا ہو رہا ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا۔" آپ کیا کر رہے ہیں۔ من کا میل گیا نہیں، تن کا میل اُتارنے سے فائدہ؟"

کشمیری ہر اچھے مزاح کو پسند کرتا ہے۔ اُس کی فطرت میں بذلہ سنجی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کشمیری زبان میں مزاح کا ایک بہت ہی وسیع ذخیرہ ہے لیکن بدقسمتی سے ہمیں کاغذ کے اوراق پر اس صنف کے بہت ہی کم نمونے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ کشمیری ادب میں نثر کا قریباً نفی کے برابر ہونا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک اور بیسویں صدی کے آغاز تک کشمیری قوم ایک محکوم قوم تھی جو مختلف حاکموں کے جبر تلے پسی جا رہی تھی۔ صدیوں کی غلامی، غربت، فاقہ کشی اور جہالت نے اُن کے تمام قوا زائل کر دئے تھے اور اُن کے تخیل کو زنگ آلود کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس دوران بہت ہی کم بھرپور قہقہے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بھی کشمیری ان مصیبتوں سے پست ہمت نہ ہوا۔ سیلاب کی صورت میں قدرت کا عتاب اُس پر نازل ہوا۔ تو اُس نے ایک لڑی شاہ " لکھ کر اس پر ایک قہقہہ مارا۔ سردی شدت کی پڑی تو یہاں کے لوک شاعروں نے اُس کی تصویر نہایت ہی مزاحیہ پیرائے میں کھینچی۔ شدت کے جاڑے کی وجہ سے ہر ایک چیز مہنگی ہو گئی۔ خاص طور سے ایندھن، آگ سُلگانے کے لئے اُوپلوں کی ضرورت ہے لیکن کیا کریں۔ ایک ایک اُوپلہ ایک ایک آنے میں بکنے لگا ؎

گورِن وُچھتو کیاہ کھوٚت لوٗشں پونڈس کُنہٕ ہوے بُٹھ کلپوٗشں

صدیوں سے وادی میں سیلاب کا مسئلہ یہاں کے لوگوں کے لئے عذاب بنا ہوا ہے۔ اس آفتِ سماوی سے یہاں کے شعرا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مُلا حبیب اللہ حکیم (۱۸۶۷ــــ ۱۹۰۵ء) کا سیلاب نامہ ہمارے طنز و مزاح کے ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ سیلاب نامے میں طنز کا ایک نمونہ مُلاحظہ فرمائیے ؎

حاکمِ لُو کن کیاہ اُسں چھُٹہ کیتھ ژلی کیتھ گڑ کائتیاہ پھُٹہ

وقتہ بےکسی چھہ اللہ یار   گوو گُنُی کھنہ بلہ کھاڑنی یار

اسی سیلاب نامے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

یس بۆ پکُنی تگان تس لگان دب   یی یوان اتھہ منزہ تتھ گرڑھان رب
اُتھو دیان یٹہ منز ٹھیٹو بانہ کھار   گوو گُنُی کھنہ بلہ کھاڑنی یار
وارہ کارہ بہتھ اُس لرِہ کھبوو تراس   بلہ زوونہ دہتابہ پیٹھہ کرُ تراس
مُہرو اُٹھ ترک داہ ترک کھار   گوو گُنُی کھنہ بلہ کھاڑنی یار
گیل وُتھی کھیلوان ہاُنز کاٹھ کر   تمہٕ کھیٖیہ تُوکہ لرٕ یس وُزھ نرٕ
اُکہ سُند کار چھُ بیٖیہ سُند مار   گوو گُنُی کھنہ بلہ کھاڑنی یار

مندرجہ بالا مثالوں سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح کشمیری اس آفت پر بھی ہنسی اُڑانے سے پیچھے نہیں رہتا جو اُن کے لئے ایک قہر سے کم نہیں۔ علاقہ بانڈی پور کے ایک شاعر منوّر شاہ نے بھی اپنے سیلاب نامے میں مختلف مناظر کو اس ظریفانہ رنگ میں پیش کیا ہے ؎

دِتن آب باران پتھ تیرونی   پھرن رُود پہلس ستن پیرنی
نوان کُندہ تےٕ گیلہ شہتیر گئے   مگر اُڈمہ فتح پور کی پیر گئے
پُل پایہ چھُن کیاہ دِوان ڈالہٕ اوس   دِوان تتھ سہ قادر جوُ بالہٕ اوس
وُدان آیہ گوجرانہٕ میرے ربّا!   بھلا کیا ہوا یہ برڑے دید یا

اُنیسویں صدی میں یہاں کے شاعروں نے مختلف طبقوں پر کئی نظمیں لکھیں۔ اس سلسلے کا آغاز گلریز جیسے عظیم شاہکار کے مصنف مقبول شاہ کرالہ واری (۱۸۲۰ — ۱۸۷۶ء) نے کیا۔ آپ یہاں کے ایک پیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے "گریسی نامہ" میں اپنی طرف سے یہاں کے کسانوں کے اس برتاؤ کا مذاق اُڑایا جو وہ اپنے پیر کے ساتھ کرتے تھے۔ کسان اپنے پیر کو کچھ نذر و نیاز نہ دینے کے لئے عجیب طرح کے حیلے تراشتا ہے۔ اس کی مثالوں سے مقبول شاہ کا "گریسی نامہ" بھرا پڑا ہے۔ اپنے پیر کو آتے دیکھ کر کسان کہہ اُٹھتا ہے ؎

منگان اُسی از خدا گوڑھ پیر واتن   بہٕ منگہ مس پرانہٕ داراہ چھس بہٕ نیتھہ نون
جواباہ کھیتھ چھہ پیرس آش سوران   گوڈرم کیاہ اُس کوتہ ناحق بہٕ دوران

ژلیم ہیتھ پھر نہٕ ہن زانس ڈُنتھ کیاہ۔ ہکس نہٕ کینہہ ڈُنتھ کِتھ ماگڑھس پٔراہ

آپ نے گرٕیسی نامہ میں کسانوں کو بہت ہی بخیل دِکھایا ہے۔ کِسان بیمار ہے۔ اُس کے ٹھیک ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔ اُس کا بیٹا تجویز کرتا ہے کہ ایک بکرا قربان کیا جائے تو شاید اُس کی جان بچے! لیکن کسان بخیل ہے۔ وہ اس شدید بیماری کے وقت بھی ایسی فضول خرچی کا قائل نہیں۔ چنانچہ اس منظر کی تصویر کشی مقبول شاہ "گرٕیسی نامے" میں یوُں کرتا ہے ؎

پُرژھوک مأمِس چھُہ بیتھ منز کیاہ علاج چون ؟

ڈُوکھ تمُ گرِژھ کرِنی ژھوپہ لوزوٕے میثون

مرُن ما آسِہ کوٹس چھم تِتژھی نٹھ

قفا ما پھیرِ، ٹُکی راوِہ رِیو کٹھ

تھُوِیو موُجود لوٗس وٕے نذر کرِی توم

مرُدوٕے فاتِحاہ ادِہ یانِز پٔرِی توم

چنانچہ ایک بکرا نذر کے لئے رکھا جاتا ہے۔ خُدا کا کرنا کہ کسان صحت یاب ہو جاتا ہے اور اُس کے بیٹے پھر تجویز کرتے ہیں کہ اب بکرے کی قربانی دینی لازمی ہے۔ لیکن بخیل کسان اب بھی بکرے کی قربانی دینا نہیں چاہتا۔ بکرے کو ذبح کرنے کے لئے لایا جاتا ہے تو وہ اُس کے پاس جاکر کھڑا ہوتا ہے ؎

اڈُ نکھ کٹھ بیرِ وینہہ کُن گردنہِ کرِتھ کھپ۔ میہ اژنی نٹھ مے مارن ژِہ مو دیپھ

ڈوپُن تس چانہِ مارنہِ واتِہ کیاہ مے۔ میہ بخشتم خالِقن میہ بخشتھے ژیہ

گو مقبول شاہ کا "گرٕیسی نامہ" مزاح سے بھر پوُر ہے لیکن اس کو ہم ایک وسیع دِل کی تخلیق نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ مقبُول شاہ نے یہاں کے کسانوں کو بہت ہی ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تحصیل بڈگام کے شاعر میرزہ میر نے (۱۸۰۱ — ۱۹۰۱ء) جب "گرٕیسی نامہ" پڑھا تو اُنہوں نے "مقدم نامہ" لکھ کر اس کا جواب دیا۔ آپ نے اس میں کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی تصویر کھینچی اور کسان کی مالی بدحالی کے لئے گاؤں کے مُقدم اور دیگر چھوٹے چھوٹے حاکموں کو ذمّہ دار قرار دیا۔ آپ لِکھتے ہیں ؎

اگر آسِہ تس مالیہٕ ہزار علاوہ ہینٕے پانژھ ہتھ نابکار

بلایَن یِژھن توٗہی ڈُنِو کیاہ کرو خُدانے یمن گالِہ اُسی مامرد

اور جب کسان نمبردار کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اُس کی شکایت تحصیل دار کے پاس کرے گا۔ تو اُس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ جواب میں کہتا ہے ؎

معطل میہٗ تھاٗ تن دوہن ترن تہٕ ژون۔ کریم کیاہ بُہا دس ونن کتھ تگن
دِمس روپیہ ہنٕزاہ کرن ہُون ہیُو پھِرن پانٕسی کُن سُہ مہاراج ہیُو

گاؤں کے نظم و نسق کے علاوہ لوگوں کی عام زندگی میں بھی نمبردار کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پتہ تک اُس کی مرضی کے خلاف جُنبش نہ کر سکتا تھا۔ کسی کا ختنہ ہو یا کسی کی شادی، نمبردار کے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرزہ میر نے ایک ایسے واقعہ کی منظر کشی اپنے "مقدم نامے" میں یوں کی ہے۔ جس میں ایک کسان نے اپنی لڑکی کی شادی نمبردار سے مشورہ کیئے بغیر کی تھی۔ نمبردار کو اس بات کا پتہ چلتا ہے اور کسان بے چارہ حیران و پریشان تحفے تحائف لے کر نمبردار کو منوانے جاتا ہے۔

یہِ بوزِتھ چھُنہٕ چارہ تس کینہہ لگن	کٹھا اکھ تلن سیتی چھےٚ توٚت گژھن
ژہ حقن دوزہ شادی کرہے دُنی پوشاک	رفل تہٕ سہٕ دستار بیہ ترس تپاک
بیٚیہ خاص ایزار تہ ہم قمیص	بیٚیہ واسکٹ سینہ بند ہیتھ دو چیز
بیٚیہ جورہ پٹ یا دُوسہ بگیمان	دِمے روپیی بیٚیہ پیزار تان

شادی بیاہ کے موقعہ پر نمبردار سے صرف کسان ہی نہیں ڈرتے بلکہ باورچی تک اُسے پوری طرح خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ؎

یوان یانہٕ تس واز سی نش دِوان	کنس تل ونن واز سی چھِلی ہنان
کلان ناٹہٕ سار ہی ژہ یہ ہیتھ اندر	کیابہ تہٕ گُشتابہ قورمہٕ دِگر
طبخ ناٹہٕ بیٚیہ تاوہ ناٹہٕ تمام	بیٚیہ آب گوشتک کو دُتھ انتظام
یوان پوٚ جوانکی ہُون اندرس واز	ہیم دیگاہ چھی کرن عیب ماز
بین پیٹھ چھہٕ بھیتھ کرن شور و شر	چھہٕ ٹانگان تتھی بیتھ کنین ٹانگہ خر

اسی دوران کئی شاعروں نے یہاں کی لوک کہانیوں کو نہایت ہی مزاحیہ انداز میں نظم بند کیا۔ ان میں سے سلام الدین صاحب (وفات ۱۹۲۱ء) کا عورت ڈلہ المعروف قصہ دشنان یا مکرِ زن ایک نہایت ہی شیرازہ

خوبصورت فن پارہ ہے۔ اس منظوم کہانی میں ایک ایسی عورت کی مکاری کے کئی واقعات درج ہیں جو سماج سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں سے اونٹ والے اور ایک اعمیٰ سے اُس کی ملاقات سننے والے کو بے ساختہ ہنسا دیتے ہیں۔

یِی وُنِتھ ہوُن تِمس ٹی دُکان — اُونٹ وولی گونٹہ گُر ہیٔو گو دیکان
وُنٹھ دارِتھ گو وُنی چھِم نقد دیار — دوپ حکیمس ڈاٹھی اوس دُو تار
پیٚو ڈاٹو اوستادن لوگ سرمینز — دُونٹھ وارِس بِمیہ سیتی چھِن رود کرنز
تمی دُوکھ میر تہ چھُم نہ کینہہ معلوم نام — بہٕ تہ چھُس وُزنی یِموا اونٹ بدام
بوز وُنی گو وسہ کوتاہ خشم گیں — ترٚووُن از کُرسی تہ پیوُن بر زمین
دارِ کہ ڈنس گار دُھنس باربار — بارٕ خرسندی یا ٹھی کھیاوُن تیوت مار

ہمیں پرمانند (۱۷۹۱ — ۱۸۷۹ء) کے کلام میں بھی کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے لکھے ہوئے "رادھا سوئمبر" میں وہ منظر پڑھنے کے لائق ہیں جب شری کرشن مہاراج چوڑیاں بیچنے والے کے بھیس میں رادھا کے پاس جاتے ہیں اور اُسے ستانے کے لئے اُس کے منگیتر یعنی خود اپنے آپ کی بُرائی کرنے لگتے ہیں۔ یہ مزاح کا ایک بہت ہی خوبصورت نمونہ ہے۔ اسی طرح آپ نے "شو لگن" میں بھی نہایت ہی مزاحیہ انداز میں اُس برہمن کا کردار پیش کیا ہے جو "پاروتی" کا بر ڈھونڈنے کے لئے جگہ جگہ گھومتا ہے۔

پچھلی صدی کے آخر میں سر آرل سٹائن نے پنڈت گوبند کول کی مدد سے کشمیر کی کئی لوک کہانیاں اکٹھی کیں۔ سنہ ۱۸۹۶ء کے موسم گرما میں پنزل (وادی سندھ) کے ایک کسان اور پیشہ ور داستان گو حاتم تیلہ وونی سے سٹائن نے مہند مرگ کے مقام پر کئی کہانیاں اور نظمیں سنیں، جن کا انہوں نے پنڈت گوبند کول کی مدد سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور بعد میں اُنہیں حاتمز ٹیلز (Hatims Tales) کے نام سے چھپوایا۔ اس کتاب میں "یار قند انون زینان" ایک نہایت ہی خوبصورت مزاحیہ نظم ہے۔ اس نظم میں ایک شاعر صابر نے سر ڈگلس فورسٹ کی اُس مہم کے بارے میں نہایت ہی مزاحیہ انداز میں واقعات قلم بند کئے ہیں جو ۷۴-۱۸۷۳ء میں ہندوکش کو پار کر کے کاشغر پہنچنے کے سلسلے میں چلائی گئی تھی۔ فورسٹ صاحب کا مشن وادی کشمیر سے گذرا جہاں پر کر لوگوں کو کیمپ میں کام کرنے

کے لئے اکٹھا کیا گیا۔ شاید "صابر" کا خیال تھا کہ یہ یارقند کو فتح کرنے کی ایک فوجی مہم تھی۔ صابر لکھتا ہے کہ لوگ پریشان ہوئے۔ انہیں جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ گھوڑے دست یاب نہ ہو سکے تو انہوں نے مرغیاں اکٹھی کیں۔ چنانچہ دیگر سہولیات کے لئے علاقے کا علاقہ اس مہم پر چل پڑا۔ اس نظم کے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے ؎

گری منگہ نا دیئے کو کرگامن — "چھم" "کرن یم نہ زاغن"
ہرہ ہرہ کران اُسہ تم پکہ نادان — یارقند انون زیبان
کلہ کنز دُو مچھس لیٹہ کنز لاکم — گاسہ دز "کاسیکھ" محکم
گاسہ گنڈ ترزچہ زین پیر تھ سوار آسان — یارقند انون زیبان
کھارد دِتھ بارد بیگر کتھ سارد — وان کتہ جان سشیرد
حال کیاہ کور یک نال گرنادان — یارقند انون زیبان
وانکڈ دوپ واتچے بُرنے سرہ زاہ — "چھم منگان" "دائر" "موتے" "تہ کاہ"
ژور ژتہ اَدہ ہیتھ میز تر پکہ نادان — یارقند انون زیبان

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں کئی شاعروں نے طنز و مزاح کی طرف رجوع کیا۔ ان میں محی الدین (مہدہ دیکہ) نے کئی مزاحیہ رباعیاں، قطعات اور اشعار کہے۔ ان کا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے۔ اس زمانے کے کئی شعراء نے "ریختہ" کی طرف رجوع کیا اور ہمیں اس فن کے کئی خوبصورت نمونے دیئے جن میں طنز و مزاح کے کئی شاہ پارے ملتے ہیں۔ مثلاً ملا حبیب اللہ حکیم کی ریختی ملاحظہ فرمائیے ؎

چوں تشنہ کہ چشمش نگرانست ٹھس کن
ما یم زاد باد نظر ہاکہ ٹھس کن
دیدی سفر مرگ چہ خوش بود بیبا
محتاج نگشتیم درین راہ ٹھس کن
ہر کہ یڈ را ہمیشہ دارد کھج
یڈ مگو از جحیم باشد گج

میر غلام رسول نازکی اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "کشمیری زبان میں مزاح" ہے، اس تضمین کا پسِ منظر یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک روز گاؤں کی مسجد کا مُلّا، جن کا نام عبداللہ شاہ تھا، ناظم کے پاس آیا۔ وہ ناظم کی شاعری کا قائل نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں عبداللہ شاہ نے ناظم سے کہہ دیا کہ وہ اُسے شاعر نہیں مانتا۔ ناظم نے پُوچھا۔ تو کِسے شاعر مانتا ہے؟ عبداللہ شاہ نے جواب دیا۔ میرا محبُوب شاعر محمود گامی ہے اور ان کے شاعرانہ پن کا معترف ہوں۔ بھلا کوئی اس زمین میں غزل لکھ سکتا ہے جس میں محمود گامی نے یہ غزل لکھی ہے۔ "تمثیلِ آدم پیٹھ زھوم حبابس۔ رِندہ ژھک زِندہ کِتھ آبس سیتھ۔" ناظم نے اسی زمین میں یہ مکمل نظم فی البدیہہ کہہ دی جو کہ عبداللہ شاہ کی شان میں تھی۔ اسی مضمون میں میر غلام رسول نازکی ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ ناظم کے عہد میں بیج بہاڑہ میں ایک بزرگ تھے عبدالقدوس۔ اور گاؤں والے اس کو تعظیماً قُدہ چچہ کہتے تھے۔ ان کے ہاں ایک لڑکے کی شادی تھی۔ شادی ایک دوسرے گھرانے میں تھی جو "کوکر" کہلاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ناظم کی اس دعوت میں بے عزّتی ہوئی یا کوئی چیز اُن پر ناگوار گذری۔ دوسرے دِن انہوں نے ایک طویل نظم لکھی جس کا عنوان تھا۔ "قُدہ چچہ مُبارک!" اس نظم کے کچھ بند یوں ہیں ؎

تفقانہ باقر خانہِ   تی یوز خُدا زانہِ
گنُز رکھ تہٕ لزکھ چپہ   قُدہ چچہ مُبارک
یرٕونھ آیہ کوکر بھایہ   اِچہ مست اِچہ یر ایہ
اِچہ نرچھیہ اِچہ ژھوچپہ   قُدہ چچہ مُبارک
کوکرو کیاہ کرٕ کامہ   شن شن ترأوکھ تردم
اتھہ آیہ زِی زِی مینچھ   قُدہ چچہ مُبارک

کشمیری زبان میں طنز و مزاح کی تاریخ لکھتے وقت ہم بیسویں صدی کے پہلے حصے میں لکھے گئے چند کشمیری ڈراموں کے چند مزاحیہ منظر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ خاص طور سے وہ منظر کامکس کے طور پر نندلال کول کے ڈرامے "ستیچ کہوٹ" کے ساتھ سٹیج پر پیش کئے جاتے تھے۔ اس میں مزاحیہ مکالموں کے علاوہ چند مزاحیہ گانے بھی تھے۔ یہاں کے درمیانہ طبقے کی عورتوں پر یہ ایک طنز ملاحظہ فرمائیے ؎

کائٹر زنانہ ہی بھگوانہ   دو ہلہ گوکھ شونگن
شاند دِتھ لو نگن   کام نہٕ کرانہ
ہی بھگوانہ

یا اس کھیل میں نکیتھر کا گانا کچھ کم ہنسا دینے والا نہیں ہے ؎

شوداہ چھس بُرچرسی مدکی
تریاقی بھنگی۔ زنگس گیہٕ بنے زنگی

موجودہ دَور میں لالہ لچھمن اور خضر مغربی دو ایسے شاعر ہیں جن کا مزاحیہ کلام کافی مقبول ہوا ہے لچھمن رازدان (لالہ لچھمن) کا کلام فنی اعتبار سے کافی شُستہ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ آپ نے اپنے کلام کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دیہی علاقوں میں اس کا کلام زبان زدِ خاص و عام ہے۔ لچھمن رازدان علاقہ کولگام میں ہواند ژولگام کے باشندے ہیں۔ آپ پچھلے سال لگ بھگ ۷۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اس کی نظموں میں "چِھٹی رسان۔" "لالہ لچھمن شکھدار سے دُراو۔" "ڈاکٹر نامہ۔" اور "سیلاب نامہ" یہاں کے مزاحیہ ادب میں اہم مقام رکھتا ہے "چِھٹی رسان" کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ کولگام میں کال پڑا تھا اور بیشتر کسان مزدوری کے لئے پنجاب چلے گئے تھے۔ ان کے لواحقین نے بیچارے چھٹی رسان کا ناک میں دَم کر دیا۔ کیونکہ سبھی اس امید پر بیٹھے تھے کہ ان کے نام منی آرڈر آجائیں گے ؎

اُندرہ ژھوژ ہتے نیٚرہ سرتازے	جندہ زِینن سر تلہٕ سازے
زِچہ گرٕ ہی نی نال زولانے	روز دَماہ بوز وَنے افسانے
یُورہٕ وولہٕ جوٗ اوِیہ جوٗ سہلاب	ژوٗرہنہ چھم ژوشوے پنجاب
عمہ، عاشرٕ، رمہ، سُبحانے	روز دَماہ بوز وَنے افسانے
ڈاکہٕ واٗلس دُتھی نائی مالی	پھزہ کاٗنی واٗلی چیِن پیالی
ڈالہٕ کُس ووٚنی دِس تھہٕ سانے	روز دَماہ بوز وَنے افسانے

علاقہ میر ہامہ میں ایک بڑی دعوت تھی۔ لیکن دعوت کے ساتھ ہی ہیضہ پھیلا۔ اُن دِنوں گاؤں میں شفاخانے نہیں تھے۔ کہیں سے کوئی بازاری ڈاکٹر لایا گیا اور اس نے بیماروں کا علاج کرنے کی بجائے انہیں تنگ کرنا شروع کیا۔ لالہ لچھمن اس عجیب حالت کو یُوں بیان کرتے ہیں ؎

دِتُھکھ سرکارس ثواب	باگراوٗ کھ سہ ٹھکہٕ آب
کونڈرک آبِ زُولال	از ونے مرہم سال
کوٗرکھ بیمارن شِفا	یمہٕ دَواہ چھ وکو دَفع

کشمیری ادب کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس کے کئی ادبی ذخیرے شائع نہیں ہوئے ہیں۔ گو کشمیری ادب کی ترقی کی راہ میں کئی مشکلات درپیش ہیں، لیکن پھر بھی موجودہ دَور کے ادیبوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ادبی میراث خاص طور سے طنز و مزاح کے قدیم اور جدید شہ پاروں کو اکٹھا کر کے محفوظ رکھیں۔ کشمیری ادب کے طنز و مزاح کا کافی خزانہ زمانے کی اُڑتی ہوئی گرد کی نذر ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے جسے ہم ضائع ہونے سے بھی بچا سکتے ہیں۔ طنز و مزاح ایک ایسا تیر ہے جس کا نشان کبھی چوکتا نہیں!

انوارِ ابوالکلام آزاد (با تصویر)

مُرتّبہ : علی جواد زیدی

مولانا آزاد اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت میں ایک پورے عصر کی تاریخ مجسّم ہو گئی تھی۔ جشن کشمیر کے سلسلے میں اُن کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ایک محفلِ مناظرہ منعقد ہوئی، جس میں مُلک بھر کے مقتدر علما و فضلا نے شرکت کی۔ اس مناظرے میں پڑھے گئے مضامین اور اس کی روداد کو حسین اشاعتی اہتمام کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ قیمت : چھ روپے

اکادمی کے پتے سے دستیاب ہو سکتی ہے

اکادمی کی تازہ کشمیری کتاب "دلیلہ"

کشمیری زبان کی اُن بیش بہا لوک کہانیوں کا نادر مجموعہ جو اَب تک سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔

ترتیب : اختر محی الدین، پشکر بھان۔ قیمت ۳ روپے

محمد اکبر الدین صدیقی

صنعتی بیجاپوری

صنعتی کے حالات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس نے اپنی مثنویوں میں خود اپنے متعلق جو معلومات دی ہیں وہی ہمارا ماخذ ہیں۔ "دکن میں اردو" (ہاشمی)۔ "دکنی ادب کی تاریخ" (ڈاکٹر زور) اور قصۂ بے نظیر (پروفیسر سروری) میں اس کا نام محمد ابراہیم بتایا گیا ہے۔ پروفیسر سروری کا خیال ہے کہ یہ وہی محمد ابراہیم خان ہے جس کا تخلص صاحب بساتین السلاطین نے صبتی لکھا ہے۔ یہ تجنیس خطی قسم کی غلطی ہے ورنہ یہ صنعتی ہی ہے اور اگر یہی محمد ابراہیم خان صنعتی ہے تو صاحب بساتین اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

بہ میدان معنی چو تازد سمند — سر اہل دعوی کشد در کمند

چو دریای طبعش شود موجزن — زند جوش گوہر زمین و زمن[1]

جب محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا تو صاحب بساتین نے لکھا ہے کہ ابراہیم خان اسد خانی نے تاریخ کہی:

محمد شاہ را الحمد للہ — نعیم جاودانی داد اللہ

۷۴۸ + ۳۲۰ = ۱۰۶۸

اس پورے شعر کے اعداد ۱۰۶۸ ہیں۔ دوسری تاریخ جو کسی اور نے کہی ہے "عاقبت محمد محمود شد" ہے۔ اس کے اعداد ۱۰۶۷ ہیں اور سلطان محمد عادل شاہ نے طاس نہم روز سہ شنبہ ۲۸ محرم الحرام سنہ ۱۰۶۷ھ کو انتقال کیا۔ ابراہیم خان اسد خانی کی تاریخ میں ایک عدد کا فرق ہے ممکن ہے کہیں تخرجہ ہو، جس کا صاحب بساتین نے ذکر نہیں کیا۔[2]

۱؎ بساتین السلاطین صفحہ ۳۳۴ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۶۴

اس کے بعد ایک تاریخی واقعہ لکھتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ جب وزیر سلطنت خان محمد قتل کر دیا گیا تو اس کی جگہ کچھ دِنوں کے لئے "فضائل و کمالات مرتبت ابراہیم خان" کا تقرّر ہوا۔ اور جب وہ حج کے ارادہ سے محمد عادل شاہ کی ملکہ اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن خدیجہ سُلطان، جس کو عموماً بڑی صاحبہ کہا جاتا تھا، کے ہمراہ چلا گیا اور عہدۂ وزارت و مدار المہامی اس کے لڑکے "فضیلت و کمالات دستگاہ، شہامت و شجاعت انتباہ، ارسطو فطرت، فلاطون حکمت میاں عبدالمحمد کا تقرّر ہوا۔"[1]

یہ بساتین السلاطین کے مُصنف کا بیان ہے۔ اب خود مُصنفّی نے اپنا نام ابراہیم اپنی کسی مثنوی یعنے قصّہ بے نظیر یا گلدُستہ میں ظاہر نہیں کیا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سُنّی تھا اور امام احمد حنبل رضؓ کا پیروُ۔ ایک شعر میں اس تعلق کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے:

شہیداں میں افضل حسینؓ و حسنؓ۔ بدل دیں لئے کربلا کا وطن

اُنن آل میں ہو سکے یو نام و لد۔ کئے دین کے بدلے مذہب حنبلی اُستوار

اپنی دونوں مثنویوں میں اس نے حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانی رضؓ کی مدح کی ہے۔ "قصّہ بے نظیر" میں، جس میں ابو تمیم انصاری کا قصّہ نظم ہوا ہے، کہتا ہے:

کر اس خاک کوں یک نظر سوں کنچن   بحقِ چار یاراں حسینؓ و حسنؓ

... ...

نبی کا چلایا ہے توں دین سب   محی الدین حق نے دیا تُج لقب

دوسری مثنوی "گلدُستہ" میں اس نے حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحؒ کی مدح ایک علیحدہ عنوان کے تحت کی ہے۔ کہتا ہے:

حضرت محی الدین کا کہہ مدح خوانی کر اَیتا
جس مدح کے کہنے سیتی ہو مغز تر ہر جان کا

عجب نام دار و شہ کام گار   علم دین کا جس تے پکڑیا قرار

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۳۶۴

کھرے دین کوں کرا ہیں تب کھرا | محی الدین کر پائے مراتب بڑا
مریداں بدل کر کے محنت قبول | کیُل وقت پر آکرے نت فضول
پڑیا ہوں ترے در میں ہو کر اسیر | پکڑ ہت کھڑا کر منجے دستگیر
ایس فضل سوں کر مرا نیک نام | پر اقدر و عزّت سوں رکھ توں مدام
یہی آس دھر تجہ دھیر یا عین ہے | مسمی حسن شاہ محی الدین ہے
خلفِ مرتضیٰ قادری نامور | ہے تس نام عرفی شاہ حضرت گکر
مرے من کو پروردہ کیتا سو وئی | خبر تیری تحقیق دیتا سو وہی

اس طرح اس نے اپنا نام شاہ محی الدین حسن اور والد کا نام مرتضیٰ قادری بتلایا ہے۔
شاہ مرتضیٰ قادری کے بارے میں عبدالجبار خان آصفی (تذکرۂ اولیائے دکن) رقم طراز ہیں کہ آپ حضرت شرف الدین صوفی القادری الگجراتی کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کا مولد منشا احمد آباد، گجرات ہے۔ ... ابتدا میں آپ کسی مجذوب سے ملے اور آپ پر بھی جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حضرت شاہ عبداللہ بن حضرت شاہ وجیہہ الدین العلوی الگجراتی نے آپ کے حال پر توجّہ کی اور آپ کو حالتِ جذب سے سلوک پر پہنچایا اور طریقۂ سلوک کی رہنمائی کی۔ آپ چند روز میں کامل ہوئے اور گجرات سے بیجاپور ابراہیم عادل شاہ جگت گورو کے زمانے میں آئے۔ ۳۰ جمادی الثانی ۱۰۲۲ھ کو فوت ہوئے۔" حضرت کی قبر بیرون دروازہ ابراہیم پور میں واقع ہے۔ مرقد پر مختصر گنبد ہے۔ اخلاص خان حبشی وزیر ابراہیم عادل شاہ کی قبر بھی ایک گنبد میں آپ کے روضہ سے قریب ہے جو ۱۰۰۶ھ میں فوت ہوا۔[۱]

لیکن ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ "آپ کی ایک دختر تھی جو سید شاہ توکل بن سید محمود قادری کے برادر زادہ سے منسوب تھی۔ آپ کی اولاد باقیات الصالحات اسی عفیفہ رابعہ ثانیہ سے یادگار رہی۔"[۲]

عبدالغفور خان رام پوری نے تاریخ دکن جلد سوم میں انہیں حالات کو لکھتے ہوئے تاریخ وفات شاہ مرتضیٰ قادری کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "آپ کا سنہ وفات

۱،۲؎ تاریخ مملکت بیجاپور حصہ اوّل صفحہ ۱۸۲

کی ہے لیکن گلدستہ میں مدح شاہ کا عنوان نہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ یہ مرشد کے حکم کی تعمیل میں لکھی یا دوسری بات یہ ہو کہ محمد عادل شاہ کے انتقال (۱۰۶۷ھ) کے بعد لکھی گئی ہو اور علی عادل شاہ ثانی کے دربار تک اس کی رسائی نہ ہو یا یہ کہ وہ ضعیف ہو گیا ہو اور مرشد کے مقابلے میں کسی کو اہمیت نہ دیتا ہو۔

کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطہ کی ابتدا میں یہ الفاظ تحریر ہیں:۔

"آغاز قصہ بلعم و خطابی از توحید جل جلالہٗ و عم نوالہٗ تصنیف من شیخ داؤد ابنِ شیخ حیدر۔"

متن کے اعتبار سے تو یہ مثنوی شاہ محی الدین حسن خلفِ مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت متخلص بہ صنعتی کی ہے۔ شیخ داؤد ابنِ شیخ حیدر کی نہیں۔ ممکن ہے کہ فارسی میں اس قصہ کو شیخ داؤد نے نظم کیا ہو۔ اصل مخطوطہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں اور نہ ناقل نے کہیں لکھا۔ اس کے بہت بعد ۱۶۸۹ء (۱۱۰۰ھ) میں عاجز نے "ملکۂ مصر" مثنوی لکھی۔ لیکن واقعہ میں قدرے اختلاف ہے۔ یعنی شاہ مصر کے انتقال کے بعد ملکۂ مصر حکومت کرتی ہے اور گیارہ سال بعد اپنے وزیر سے کہتی ہے کہ جو اس کے سوالوں کا جواب دے گا وہ اسی سے شادی کرے گی اور سلطنت بھی دے دے گی۔ ایک شخص عبدالعلیم نے، جو ہندوستان کا باشندہ تھا، کامیابی حاصل کی۔[1]

ایک اور اختلاف تاریخ تصنیف کا بھی ہے جو لاینحل رہا ہے۔ وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ میں ہاشمی صاحب نے اس کا سنہ تصنیف مابعد ۱۰۵۰ھ بتایا ہے۔ یہ مخطوطہ بہت ناقص ہے۔ اس میں تاریخ تصنیف کا شعر درج نہیں، البتہ اس نے قصۂ بے نظیر مثنوی ۱۰۵۵ھ میں لکھی جس کا شعر ہے ؎

ہزار ایک پر سال پنجاہ پنج۔ ہوئے تب ہوا پُر جواہر یو گنج

اس میں محمد عادل شاہ کی مدح موجود ہے جس نے ۱۰۶۷ھ میں انتقال کیا۔ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطہ میں گلدستہ کی تاریخِ تصنیف کا شعر اس طرح لکھا ہے:۔

---

[1] اردو کی نثری داستانیں تصنیف ڈاکٹر گیان چند صفحہ ۳۲

سنو کان بھر سن اوّل ہجرتی "یہ ہد یاد یا دل لگت صنعتی"

اس سے ۱۱۵۵ھ برآمد ہوتے ہیں لیکن کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات ۱۱۵۵ھ جلد اوّل میں ہاشمی صاحب نے ۱۰۵۵ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

ہماری رائے میں اس تاریخ میں تخرجہ کی صورت ہے۔ اس کے بعد کا شعر ہے:

سمج دیکھنا ہے ایتا دھر نظر "عدد" حرف بر ہے بیاں ابس نشر

اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس میں حرف "عدد" زائد ہے۔ گویا اس کے اعداد ۷۸ خارج کرنے ہوں گے اور اس طرح تاریخ ۱۰۷۷ھ ہوگی۔ حضرت امین الدین اعلیٰ نے ۱۰۸۵ھ میں وصال فرمایا۔ اس لحاظ سے بھی اس تاریخ میں صحت کا امکان ہے۔

صنعتی بہت پُر گو اور قادر الکلام شاعر ہے۔ اس کی تشبیہیں، اس کے استعارے، اس کی زبان پر قدرت اور اس کی شاعرانہ صلاحیتیں قابل داد ہیں۔ وہ نصرتی کے مقابلے میں معمر معلوم ہوتا ہے لیکن نصرتی کے معیار شاعری کو نہیں پہنچتا۔ نصرتی نے جس طرح "گلشنِ عشق" میں ہر عنوان کے لئے ایک شعر اور تمام عنوانات کے اشعار کا ایک قصیدہ کہا ہے یہی طریقہ صنعتی نے اپنی اس مثنوی میں بھی اختیار کیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے "گلشنِ عشق" کو پیش نظر رکھا ہو، اس لئے کہ یہ ۱۰۶۸ھ میں لکھی جا چکی تھی۔ بہرحال یہ مثنوی مناظرانہ انداز اور شاعرانہ خوبیوں سے مملو صنعتی کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو

(۲) ہندوستانی تاریخ و تمدّن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدّنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوّری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

رتن لال شانت

دو ہندی نظمیں[2]

(۱) بیماری : ایک انُوبھو[1]

اری او ہوا !
ذرا جھٹک دینا اس کھڑکی کے پٹّے کو
پہلی کِرن دُھوپ کی
دُوتی[2] سُورج کی
اس پلّے کے ساتھ ٹنگی ہے، چپک گئی ہے
جب سے میری آنکھیں دُھندھلی ہوئیں
میں نے اِسے اَچَل[3] گلہری سا وہیں چپکا پایا
میرے کمرے کا وِشاکت واتاورن[4] ہے
یہ سیج بھی ہو
یہ کونا بھی مُکت[5] نہیں اس کے سپَرش[6] سے !

اری او ہوا !
اس گھُٹتے اندھیرے کو ایک اَوسر[7] کا دے
اور کھول دے کھڑکی کو جھٹکا دے کر
کہ یہ دُھوپ کی کِرن
ٹُوک ٹُوک[8] ہو کر
سارے کمرے میں
بن چاہے بھی چھترا جائے
میرے سرہانے ایک ٹکڑا
کہ اُسے سانسوں سے چوموں
ٹیبل کے تلے ایک ٹکڑا
وہاں کھیلتا ہے میرا چھوٹا بچہ
دیوار پر ایک ٹکڑا
کہ میں دیکھ سکوں تصویر جو ٹنگی ہے
ایک ٹُوک میری پُستک[9] پر
پُورن[10] کروں ادھیائے[11] یہ
دُھوپ کی پاوَنتے[12] !
تم پتت - پاوَن[13]
مجھ سے اپاوَن[14] نہیں ہوگی
میں یدی[15] تن سے بیمار ہوں
من کرتا ہے
تمہیں گود میں لے لوں !

---

(۱) تجربہ (۲) قاصد (۳) جو چلے نہیں (۴) زہریلا ماحول (۵) آزاد (۶) لمس (۷) ظرف (۸) ٹکڑے ٹکڑے (۹) کتاب (۱۰) پورا (۱۱) باب (۱۲) پاکیزگی (۱۳) گرے ہوؤں کو پاک کرنے والی (۱۴) ناپاک (۱۵) اگر

(۲) ایک آشاوادی کا (بیان):

پٹڑی پر گردن رکھنے والے ٹھہرو!
تمہیں ضرورت ہے میری ساکشی[1] کی
میرے گرنتھ کے پنّوں[2] پر
بہت دیر سے چھایا ہے ایک سپاٹ[3] مَون
شاید تمہاری بے بسی کے ٹوٹے باندھ
اور اس بے جان لوہے کی پٹڑی کی
انمتر نوتی[4] دو باہیں
اور کشتج[5] پر اُگتی ریل گاڑی
ایک درشیہ[6] جٹا دیں
میرے پنّوں پر انکر گڈھ سکیں[7]
ٹھہرو!
گذرنے دو ریل گاڑی کو
جھانکتے چہروں کی سلوٹوں کو
اُجو لتاؤں[8] کو
ذرا ہاتھ ہلاؤ
ذرا مسکراؤ
کہ ان بھاگتی کہانیوں میں نئے ادھیائے[9] جڑ سکیں
نئے سورج اُگ سکیں
یا نئے کشتج وِستّرت[10] ہوں۔

ٹھہرو!
میں جیون گیت گا رہا ہوں
بھیگی گودی میں سر گاڑے
نہیں گنواؤ اپنی اَن گنت سسکیاں
جو میری کوِتا میں جڑ کر
ہو سکتی ہیں بھاسور[11]
تمہیں نا امیدی ہی ملی جیون بھر
انصاف تمہارے حق میں تھا
لیکن تم رہے تاکتے
جب کئی بار تمہارے سامنے سے
پروسی تھالی چھینی گئی
تو کیا ہوا؟
اُٹھو!
شاید کل کی دھوپ ادِھک ہو پرکھر[12]
کہ تمہارے آنسو سوکھ سکیں
جیو
شاید کل صبح اچانک
لوگوں میں ہمدردی ہو جاگرت[13]
ختم ہوئی ہو بے ایمانی

---

(۱) شہادت (۲) صفحات (۳) ہموار خاموشی (۴) دعوت نہ دیتی ہوئی (۵) اُفق (۶) منظر (۷) کونپل گڈھ سکیں (۸) روشنیوں کو (۹) باب (۱۰) پھیل جائیں (۱۱) روشن (۱۲) تیز (۱۳) جاگ جائے

سری ور اپنی "راج ترنگنی" میں لکھتا ہے کہ بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر میں دو عظیم ادیب یودھ بھٹ اور سوم پنڈت پیدا ہوئے۔ یودھ بھٹ کشمیری زبان کا ایک پختہ کار شاعر تھا۔ اس نے بڈشاہ کی زندگی کے ایک واقعے پر کشمیری زبان میں ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ اس ڈرامے کا نام زینہ ولاس تھا۔ لیکن اس ڈرامے کا صرف ذکر ہی ملتا ہے اور بدقسمتی سے اس کا مسوّدہ بھی ضائع ہوا ہے۔

کشمیر نے زمانے کے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کشمیر صدیوں سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ لیکن پچھلے کئی سو سال یہاں حالات ایسے ناسا عد رہے کہ یہاں کے فنونِ لطیفہ کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اُنہیں ختم کرنے کی کئی منظم کوششیں بھی کی گئیں۔ چنانچہ ہمارے پاس نہ ہی مارتنڈ بنانے والے عظیم سنگتراش رہے اور نہ ہی اندر پربھا جیسی رقاصائیں اور نہ ہی وہ پُرانے عظیم ڈرامہ نگار۔ ہاں البتہ ڈرامے کی ایک مدہم لَو یہاں کے لوک ناٹکوں میں ضرور موجود رہی۔ جنہوں نے یہ زبردست طوفان برداشت کئے۔ جو وقت کے سیلاب میں ڈوب کر ختم نہیں ہوئے بلکہ جنہوں نے اپنے آپ کو ان دھاروں کے ساتھ بہا دیا اور اس طرح اپنا آپ بچالیا۔ یہ لوک ناٹک کشمیر میں" بھانڈہ جشن " کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل میں یہاں بھی ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح پیشہ ور ناٹک منڈلیاں تھیں جو گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتی تھیں اور لوگوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ یہ ناٹک منڈلیاں مذہبی قصے کہانیاں لوگوں کے سامنے ڈرامے کی شکل میں پیش کرتی تھیں۔ ہمیں یہاں کی تواریخ میں ان لوک ناٹکوں کے بارے میں کئی مفصل حوالے ملتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان لوک ناٹکوں کے موضوع بھی بدلتے رہے اور یہ مذہب سے سماج کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُنیسویں صدی کے وسط تک یہ بھانڈہ جشن فنّی اعتبار سے کافی معیاری تھے۔ اُس وقت سویہ بگ اور واہتھورہ کے بھانڈ اس فن میں یکتا مانے جاتے تھے۔ لیکن ۱۸۷۷ عیسوی میں کشمیر میں زبردست قحط پڑا۔ اور سویہ بگ کے بھانڈ اسی قحط کا شکار ہوئے۔ اس طرح سے اس علاقے میں یہ فن قریب قریب ختم ہوا۔ اور واہتھورہ کے بھانڈوں کے فن میں بھی زوال آیا۔ والٹر آر لارنس اپنی کتاب Valley of Kashmir میں ان بھانڈوں کے بارے میں لکھتا ہے —— "یہ بھانڈ دیہی زندگی کی صحیح اور نہایت عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے ملبوسات اور ان کا میک اپ بھی کافی اُونچے معیار کا ہے۔ یہ دیہات کی زندگی کے طور طریقے خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں —" کہتے ہیں کہ جس وقت مہاراجہ گلاب سنگھ کشمیر پر قابض ہوا تو اُس نے یہاں کے گاؤں کی نظم و نسق کی جانکاری ان ہی لوک ناٹکوں سے حاصل کی۔ ان بھانڈ جشنوں کے پلاٹ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ پٹواری اور نمبردار

اپنی بھی لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ غریب کسان بادشاہ کے سامنے واویلا کرتا تھا۔ شروع میں وہ بڑی شدت سے فریاد کرتا تھا، لیکن جب وہ وزیر اور پٹواری کو آپس میں کانا پھوسی کرتے دیکھتا تھا تو اُس کے حوصلے پست ہو جاتے تھے اور نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ نمبردار اور پٹواری بری کر دئے جاتے تھے اور بیچارے کسان پر بادشاہ کا سارا نزلہ گرتا تھا۔ اس تھیم کے علاوہ بھی ان لوک ناٹکوں میں دیہی زندگی کے کئی واقعات کی خوبصورت تصویرکشی کی جاتی تھی۔ مثلاً کسان کا ہل جوتنا، بیج بونا، گڈائی کرنا، فصل کاٹنا وغیرہ۔ ان ناٹکوں کے لئے بھانڈوں نے مخصوص نام رکھے تھے۔ ان میں سے یہ لوک ناٹک ابھی بھی واہتھورہ اور بمی کے بھانڈ کھیلا کرتے ہیں۔ وازہ پاتھر، دازہ پاتھر، بٹہ پاتھر، ناؤ دِ پاتھر، شکار پاتھر وغیرہ۔ ان میں سے کئی ناٹکوں میں کردار خوبصورت ماسکوں (Masks) کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ واہتھورہ اور سویہ بگ کے علاوہ اکن گام کے بھانڈ بھی کافی مشہور ہیں۔ ان میں سے کئی جماعتیں ابھی بھی یہ لوک ناٹک کھیلا کرتی ہیں۔ یہ بھانڈ ٹھہرپورہ کے علاقے میں رہتے ہیں۔ اکن گام کے بھانڈ کشمیری پنڈت طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی اداکاری اونچے معیار کی تھی۔ ان میں سے کئی ناٹک منڈلیوں کے پاس ہزاروں روپے کی مالیت کے ملبوسات تھے۔

بھانڈوں کو سماج اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ اکن گام کے بھانڈ یہ لوک ناٹک دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے سٹیج کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی سماج اُن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں دیوی نے ان بھانڈوں کے جدِّ امجد کو خواب میں درشن دیا۔ اُس کے ہاتھ میں کشمیری سارنگی تھما دی اور کہا ــ "اُٹھ اور ایک نغمے کو جنم دے۔" وہ کوئی ساز نہیں بجا سکتا تھا۔ اُس نے دیوی کو جواب دیا ــ "میں معذور ہوں۔ میں کوئی بھی ساز بجا نہیں سکتا۔" دیوی بولی۔ "میری نگاہوں پر اپنی نگاہ مرکوز کر اور بجا۔" اور اس طرح اُس نے ایک لاہوتی نغمے کو جنم دیا۔ اُس کے بعد دیوی نے اُسے حکم دیا کہ وہ گاؤں کے قریب ایک پرانے دیودار کے سایے میں بیٹھ کر دیوی کی خوشنودی کے لئے سارنگی پر سنگیت کو جنم دیتا رہے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد گاؤں والوں نے اُسے طعنے دینے شروع کئے اور اُسے برادری سے خارج کر دیا۔ فن کار سماج کے اس روّیے سے تنگ آیا اور اُس نے اپنا ساز ایک طرف پھینک دیا اور گاؤں کا رُخ کرنے لگا۔ لیکن اُسی وقت اُس کی بینائی چلی گئی اور وہ سراسیمگی کی حالت میں پور ویلی کی طرف بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں کہ یہی دیوی اُس علاقے کے حاکم کے پاس اُسی طرح خواب میں نمودار ہوئی اور اُسے حکم دیا کہ وہ اُس فن کار کو اکن گام کے علاقے میں واپس لے آئے اور

اس طرح سے وہ واپس اپنے گاؤں آیا، جس کے ساتھ ہی اُس کی بینائی لوٹ آئی۔ اور اُس کے بعد اُس نے اور اُس کے بعد اُس کی اولاد نے یہ ساز اور یہ فن اپنے گلے سے لگالیا۔ تاکہ وہ دیوی کے قہر سے بچیں۔ آہستہ آہستہ اکن گام کے بھانڈوں نے مذہبی موضوع کے علاوہ سماجی موضوعات پر بھی ناٹک تیار کرنے شروع کئے۔ لیکن یہ فن بھی وقت کی دست رس سے نہیں بچ پائے اور اس فن میں بھی ایک طرح سے جمود آگیا۔ دِن بدن اس فن کا معیار گرنے لگا اور اس وقت اس فن کے جو کھنڈر باقی بچ گئے ہیں وہ نہایت پست معیار کے ہیں۔ اُن میں نہ ہی موضوع کی شگفتگی ہے اور نہ ہی اداکاری کی تابندگی۔ ان کی اصل صورت اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ یہ جاننا مُشکل ہو گیا ہے کہ ان کا اصل حُلیہ کیسا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان لوک ناٹکوں میں تبدیلی آگئی۔ انہوں نے اپنے آپ کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی۔ یہ لوک ناٹک وقت کے حاکموں کے سامنے کھیلے جاتے تھے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان میں اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ بھانڈ جشن کے جو نمونے اس وقت ہمیں ملتے ہیں اُن میں مغلوں اور پٹھانوں کے زمانوں کی چھاپ ہے۔ حاکم شکستہ فارسی یا پشتو بولتا ہے جس کے معنی کسان کو ایک کارندہ سمجھاتا ہے اور جو جواب اُس سے بن پائے، کارندہ اُس کا ترجمہ حاکم کو سُنا دیتا ہے۔

پلاٹ کے لحاظ سے یہ نمونے ادھورے ہیں، بالکل نامکمل۔ آج کل کے ان لوک ناٹکوں میں اداکاروں کی اداکاری اور معیار کافی پست ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لئے اداکار اپنے آرٹ کے بجائے نہایت نازیبا مکالموں کا سہارا لیتا ہے۔ ان لوک ناٹکوں کا حُلیہ اتنا بگڑ چکا ہے کہ ان میں یُو، پی کی نوٹنکی، مہاراشٹر کے تماشہ اور بنگال کی جاترا کی طرح نئی رُوح پھونکنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ریڈیو کشمیر کے سرینگر سٹیشن نے ان لوک ناٹکوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ جہاں جہاں ایسی کوئی ناٹک منڈلی تھی، اُن کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے کئے گئے اور ان کے بیچ یہ لوک ناٹک کھیلے گئے۔ اس سلسلے میں ان بھانڈوں کو نئے نئے پلاٹ دیئے گئے۔ لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پارسی تھیٹر، آغا حشر کاشمیری، بے تاب اور ماسٹر رحمت کے ڈراموں نے سٹیج کو نئی زندگی بخشی۔ فن کے دِل دادہ کئی کشمیریوں کو شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یہ ڈرامے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ ان ڈراموں کی مقبولیت دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے کشمیر میں بھی اسی طرح کا ایک سٹیج بنانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اُس دوران راس لیلا کھیلنے والی کئی جماعتیں ریاست باہر کے علاقوں سے یہاں آئیں۔ چنانچہ اُنہیں یہاں بھی کافی

مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طرح سے کئی کشمیری گلنے بھی اس طرح کی راس لیلا میں ہی شامل کئے گئے۔ اور اس طرز پر کشمیری راس لیلا کھیلنے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن ان فن کاروں کی راہ میں دو مشکلیں تھیں ایک سماج میں ان فن کاروں کی آیندہ حیثیت اور دوسرے یہاں کے لوگوں کا غیر پختہ شعور۔ یہاں کے عوام کے سامنے پیشہ ور بھانڈ تھے جنہیں وہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ یہاں ایک سٹیج قائم کرنے کے متمنی ان فن کاروں کو بھی وہ نیچی نظر سے دیکھنے لگے۔ لیکن پھر بھی ان فن کاروں کی ہمت قابلِ داد ہے کہ وہ لوک راج سے ڈرے نہیں۔ کیونکہ تھیٹر اور اُس کا شوق اُن کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ اُس زمانے میں یہاں ایک پیشہ ور ڈرامٹک کمپنی قائم کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ اس کمپنی میں زنانہ کردار ادا کرنے کے لئے باہر کی کچھ ایکٹریسیں بھی ملازم رکھی گئیں۔ لیکن یہ کمپنی زیادہ دیر چل نہیں سکی اور یہ ایک دو ڈرامے سٹیج کرنے کے بعد ہی ٹوٹ گئی۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں کا شعور اتنا بیدار نہیں تھا کہ وہ اس فن پر پیسہ خرچ کرتے۔ اس دور میں جو ڈرامے سٹیج کئے گئے وہ اُردو زبان میں تھے بلکہ کئی تو آغا حشر بے تاب اور ماسٹر رحمت کی کمپنیوں سے مستعار لئے گئے تھے۔ گو ان ڈراموں میں سے کوئی بھی کشمیری زبان میں نہیں تھا، پھر بھی ان کے سٹیج کئے جانے سے ایک فائدہ ہوا۔ وہ یہ کہ ان کی مقبولیت دیکھ کر کئی لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کشمیری زبان میں بھی ڈرامے سٹیج کئے جائیں تاکہ یہاں کے بیشتر لوگ جو کشمیری کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے، اس فن سے مانوس ہوں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم یافتہ طبقہ کشمیری زبان کو عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا اور کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کشمیری زبان میں بھی ادیب افسانہ، ناول اور ڈرامے لکھ سکتے ہیں۔ وہ حقارت سے کشمیری زبان کو "لوبر لولو" کے نام سے پکارتے تھے۔ ایسا طبقہ کشمیری زبان اور ادب کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں یہاں کے ایک ادیب نند لال کول نے کشمیری زبان کا پہلا سٹیج ڈرامہ "ستیچ کہہ وُٹ" لکھا۔ یہ ڈرامہ لکھ کر انہوں نے یہ ثابت کیا کہ کشمیری زبان کا دامن بھی وسیع ہو سکتا ہے اور اُس میں بھی ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ڈرامہ صرف لکھا ہی نہیں گیا بلکہ کامیابی کے ساتھ سٹیج بھی ہوا۔ یہ ڈراما لوگوں میں اتنا مقبول ہوا کہ سرینگر کے بچے بچے کی زبان پر اس کے مکالمے اور گانے تھے۔ کشمیری زبان میں ڈرامے کی تاریخ دراصل اسی ڈرامے سے شروع ہوتی ہے!

گو کشمیری ڈرامہ "ستیچ کہہ وُٹ" مرحوم نند لال کول نے پارسی تھیٹر اور اُس وقت کے اُردو ڈراموں سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ لیکن اس پر سنسکرت ڈرامے کی بھی چھاپ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب

ہوگا کہ اس ڈرامے میں دونوں تیکنیکوں کا حسین امتزاج ہے۔ اس ڈرامے کے ڈائیلاگ آغا حشر کے طریقے پر لکھے گئے ہیں۔ کردار اُسی طرح اپنے جذبات کی شدّت کا اظہار شعروں میں کرتے ہیں۔ لیکن کرداروں کا تصوّر خالص سنسکرت ڈرامے کا سا ہے۔ اسی طرح سُوتر دھار سٹیج پر آتا ہے اور ڈرامے کا تعارف کرتا ہے اور جب ٹریجڈی شدّت اختیار کرتی ہے۔ وِدُوشک یعنی —— Comedian سٹیج پر آتا ہے اور لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف حربوں کا استعمال کرتا ہے۔

ڈرامہ "سِتیچ کہہ وُٹ" کا پلاٹ راجہ ہریش چندر اور تارامتی کی کہانی ہے۔ یہ کہانی یہاں کے کئی لوگوں میں پہلے سے مقبول تھی اور اس کے کردار جانے پہچانے۔ لیکن کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ حق وصداقت کی یہ کہانی کشمیری زبان میں ڈرامے کی صورت میں سٹیج کی جاسکے گی۔ اس ڈرامے میں مُصنّف نے جو مکالمے لِکھے ہیں وہ کرداروں کے جذبات کی پُوری ترجمانی کرتے ہیں۔ گو اس ڈرامے میں کئی جگہ سنسکرت زبان کے الفاظ کا غلبہ ہے لیکن مُصنّف نے کوشش کی ہے کہ مجموعی تاثر ٹھیٹھ کشمیری زبان کا رہے۔ اس میں تشبیہات اور استعارے خوبصورت ہیں۔ سبھی کشمیری نہیں لیکن مُصنف نے انہیں اس خُوبی سے استعمال کیا ہے کہ وہ ہمیں اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ جہاں تک شعروں کا تعلق ہے کچھ محض تُک بندی کی سطح سے اُوپر نہیں اُبھرتے، لیکن زیادہ تر شعر خوبصورت اور دِل کو چھُونے والے ہیں۔

اُردو ڈرامے میں گانوں کا رواج مراٹھی سٹیج سے آیا ہے اور اس کا اثر ہندوستانی فلموں میں ابھی تک موجود ہے۔ جذبات کی شدت کا اظہار کردار گانوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ نندلال کول نے جو ڈرامے لِکھے ہیں اُن میں گانوں کے لئے مُناسب Situations پیدا کی گئی ہیں۔ "سِتیچ کہہ وُٹ" کے بعد جو ڈرامے نندلال کول نے لِکھے ہیں اُن میں کئی گانے زبردستی ٹھونسے گئے ہیں۔ اُن کے لئے مُناسب ماحول بھی پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ڈرامہ "سِتیچ کہہ وُٹ" کے لئے ہر گانے کے لئے مناسب ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ اور اگر ہم یہ گانے ڈرامے میں سے الگ کر دیں تو ہمیں ایک خلا سا محسوس ہوگا۔ نکھتر کا مزاحیہ گانا "رنگس گیہ بے رنگی" تارامتی کا چکّی پیستے ہوئے دِل سوز آواز میں فریاد کرنا "کری ہر ہرائے میانی گر بِٹنے" اور ہت اور راج کماروں کا پھُول توڑتے ہوئے گانا "واہ واہ پوشہ وار سانی!" اتنے مقبول ہوئے کہ اگر آج بھی کوئی ناٹک منڈلی ہریش چندر ڈرامہ سٹیج کرتی ہے، یہ گانے اُسی انداز، اُسی طرز میں اس میں شامل کئے جاتے ہیں۔

نندلال کول نے اور بھی ڈرامے لِکھے ہیں جن میں "ساوتری ستیہ وان" "کرشن سُداما" وغیرہ

کتابی صورت میں شائع بھی ہوئے۔ یہ ڈرامے سٹیج بھی کئے گئے مگر اُنہیں وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو ڈرامے "ستیچ کہہ وُٹ" کو ملی تھی۔ ان ڈراموں کے مسودے بھی آج دست یاب نہیں۔ ڈرامہ "ستیچ کہہ وُٹ" کا ایک مسوّدہ ریڈیو کشمیر سرینگر نے کافی محنت اور کاوشوں کے بعد حاصل کیا۔ یہ ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔

نندلال کول کے لکھے ہوئے ان ڈراموں کے پلاٹ ہندو دیومالا سے لئے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا کیریکٹر خالص کشمیری ہے۔ ان ڈراموں کے مقبول نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ سرینگر میں سینما کا قیام تھا۔ یہاں بھی ملک کے دوسرے حصوں کی طرح سینما سٹیج کے مقابلے میں آ کھڑا ہوا۔ اور اُس نے سٹیج کے پودے کو پنپنے سے پہلے ہی مُرجھا دیا۔ تھیٹر کے لئے یہاں کے لوگوں میں جو ذوق پیدا ہونے لگا تھا وہ اُستوار ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود سری پرتاپ کالج کے طلبا نے یہاں سٹیج ڈراموں کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کافی کوشش کی۔ ان طلبا نے کئی اچھے ڈرامے سٹیج کئے جن میں انجام، ہٹلر، انارکلی اور نیلم قابل ذکر ہیں۔ لیکن سینما نے جو زک تھیٹر کو یہاں پہنچائی اُس سے وہ جاں بر نہیں ہو سکا۔

سری پرتاپ کالج ڈراماٹک کلب کے علاوہ ۱۹۴۴ء میں یہاں ایک دو اور بھی ڈراماٹک کلب قائم ہوئے۔ ان میں سے اسلامیہ ہائی سکول ڈراماٹک کلب، نیشنل ڈراماٹک کلب اور سُدھار سمتی ڈراماٹک کلب کافی دیر تک سماجی سُدھار سے متعلق چھوٹے بڑے ہر طرح کے ڈرامے سٹیج کرتے رہے۔ ان ڈراموں میں سے "وِد واہ" نامی کشمیری ڈرامے کو سری نگر کے چند علاقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ڈرامے میں ایک وِدواہ کی دردناک داستان پیش کی گئی تھی۔ اس ڈرامے کے لئے گانے عبدالستار عاصی نے لکھے تھے یہ گانے کافی مقبول ہوئے۔ اس دوران جو ڈرامے سٹیج کئے گئے اُن میں بیشتر کے مسوّدے اتنے جان دار نہ تھے کہ وہ کشمیری ادب میں کسی طرح کا اضافہ کرتے۔ ان کی مقبولیت ان میں اِکا دُکا اداکاروں کی ادا کاری کی مرہونِ منّت ہے۔

کشمیر میں تھیٹر اور ڈرامے کو کلچرل تحریک کا ایک اہم حصہ بنانے کی پہلی سنجیدہ کوشش ۱۹۴۶ء میں کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں کی قومی تحریک ایک فیصلہ کُن مرحلے پر پہنچ رہی تھی۔ اور یہ بات لازم تھی کہ یہاں کے ادیب اور دیگر فن کار اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ یہاں کی قومی بیداری کی تصویر کشی اُن افسانوں اور نظموں میں ملتی ہے جو اُس وقت لکھی گئیں۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں انڈین پیوپلز تھیٹر نے عوام میں ڈراموں اور گانوں کے ذریعے بیداری لانے کی ایک منظم تحریک شروع کی تھی۔ انڈین پیوپلز تھیٹر عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اُن ہی دنوں

مشہور اداکار بلراج ساہنی، جو کہ اُس وقت انڈین پیوپلز تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے، کشمیر آئے۔ وہ ریاست کی تحریکِ آزادی سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایکٹر ہونے کے علاوہ ایک ادیب بھی ہیں اور مفکر بھی۔ وہ یہاں کی ادبی نشستوں میں بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد وہ یہاں کے اُن فن کاروں سے ملے جو یہاں تھیٹر کی ایک باضابطہ تحریک شروع کرنے کے خواہش مند تھے۔ تھیٹر کے بارے میں بلراج ساہنی کا واضح نقطۂ نظر دیکھ کر یہاں کے فن کار اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے بڑی سنجیدگی سے یہاں IPTA کی ایک شاخ قائم کرنے کی مہم شروع کی۔ اُس وقت کی حکومت نے یہاں فکر و سخن پر بھی پابندی لگائی تھی۔ یہاں IPTA کی شاخ قائم کرنا قریب قریب محال تھا۔ لہذا یہ طے ہوا کہ پہلے ایک وسیع پیمانے پر کوئی ڈرامہ سٹیج کیا جائے اور اُس کے بعد ہی کسی طرح کی انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اُسے IPTA کا ہی نام دیا جائے۔ ڈرامہ لکھنے کا کام مرحوم پریم ناتھ پردیسی کے سپرد ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ یہ ڈرامہ کشمیری زبان میں ہونا چاہیئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھ سکیں۔ چنانچہ مرحوم پردیسی نے "بٹہ ہر" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے یہاں فکر و سخن پر پہرے تھے۔ اس لئے کسی طرح کا پروگرام، چاہے وہ ڈرامہ ہو یا کوئی ورائٹی پروگرام حکومت سے سنسر کرائے بغیر سٹیج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ ڈرامہ گورنر کشمیر کے پاس سنسر کے لئے بھیج دیا گیا۔ اُس نے یہ ڈراما سٹیج کرنے کی اجازت نہیں دی اور ساتھ ہی یہ فتویٰ صادر کیا کہ اس میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالاں کہ یہ ڈراما ایک کسان گھرانے سے متعلق تھا اور اس کا سیاست کے ساتھ کسی طرح کا واسطہ نہیں تھا۔ اس طرح یہاں ۱۹۴۶ء میں ڈرامے کی یہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ختم کی گئی۔ اور یہ جان دار ڈرامہ "بٹہ ہر" کاغذ کے کفن میں ہی دفن ہوا۔ اس ڈرامے کا مسودہ بھی اسی کارروائی میں ضائع کیا گیا۔ لیکن اس حوصلہ شکنی کے باوجود بھی ان فن کاروں میں تھیٹر کا جنون برقرار رہا۔ اور ۱۹۴۷ء میں جب ہمارا وطن آزاد ہوا، یہاں کے معاشرے میں ایک انقلاب آیا۔ لوگ سیاسی طور بیدار ہو چکے تھے اور اب اُن میں سماجی شعور بیدار کرنے اور یہاں کے ادب اور آرٹ کو ترقی دینے کا وقت آ چکا تھا۔

آزادی قبائلی حملے اور بربریت کو اپنے ساتھ لے آئی۔ قبائلی درندے یہاں کے نہتے اور بے گناہ لوگوں کو اپنے قہر اور جور و استبداد کا تختۂ مشق بنا رہے تھے۔ اُس وقت یہاں کے بچے بچے میں دشمن کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ ایک طرف یہاں کے نوجوان، جنہیں بزدل اور کاہل الوجود کہا

جاتا تھا، بندوقیں تھامے دُشمن کے خلاف صف آرا ہوئے اور دوسری طرف یہاں کے ادیب اور فن کار اپنے وطن کی آبرو بچانے اور انسانیت کے تحفّظ کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑے اور اس طرح سے اُنہوں نے قومی کلچرل محاذ کی بُنیاد ڈالی۔ قبائلی حملے کے خلاف کشمیریوں کے عظیم حوصلے اور ہمت کی تصویر کشی اُردو ڈرامے "کشمیر یہ ہے" میں کی گئی۔ یہ ڈرامہ یہاں کے سٹیج کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ڈرامہ اتنا مقبول ہوا کہ قبائلی حملے کے دو سال بعد تک اس کے شوز ہوتے رہے۔ یہ ڈرامہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ مرد اور عورتوں نے ایک ساتھ کام کیا۔ اس سے پہلے جتنے بھی ڈرامے ہوئے اُن میں زنانہ کردار بھی مرد ہی ادا کرتے تھے۔ گو یہ ڈرامہ اُردو زبان میں تھا، لیکن اس کا ماحول اور اس کے گانے کشمیری زبان کے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جو پہلا کشمیری ڈرامہ سٹیج کیا گیا وہ مرحوم پردیسی کا "شہید شیروانی" تھا۔ شیروانی کی شہادت کی خبر ایک طرف سخت المناک تھی لیکن اُس کے ساتھ ہی اُس کی شہادت ساری قوم کے لئے وطن پر پروانہ وار نثار ہونے کی ایک عظیم مثال تھی۔ شیروانی کے حوصلے اور وطن کے لئے اُن کی محبّت دیکھ کر یہاں کے ادیب اور فن کار بے حد متاثر ہوئے۔ قبائلی ابھی رام پور میں ہی تھے کہ قومی کلچرل محاذ کے فن کاروں اور ادیبوں کی ایک جماعت بلا خوف و خطر بارہ مولہ چلی گئی تاکہ وہاں موقعہ پر جا کر شہید شیروانی کی زندگی کے حالات اور اُن کے شہید ہونے کی پوری تفصیلات جمع کر سکیں۔ چنانچہ مناسب مواد حاصل کر کے یہ ڈرامہ کچھ ہی دنوں میں لکھا گیا اور اُس کے بعد مہینے بھر میں سٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ جلدی میں لکھا گیا، اس لئے اس میں تیکنیکی پختگی نہیں تھی۔ مواد کی کمی نہیں تھی اور نہ ہی ایسے واقعات کی، جن میں ڈرامائیت ہو۔ لیکن پھر بھی یہ ڈرامہ جاندار نہیں بنا۔ شاید اس لئے کہ جن واقعات میں ڈرامائیت تھی وہ سٹیج کی مشکلات اور کوتاہیوں کی وجہ سے اس ڈرامے میں شامل نہیں ہو سکے۔ مکالمے زوردار تھے اور کردار نگاری بھی خوب تھی۔ اس ڈرامے میں گانوں کے لئے مناسب مقامات کا تعین کیا گیا۔ اور اُن کے لئے مناسب ماحول پیدا کیا گیا۔ مہجور مرحوم نے یہ سارا ڈرامہ سُنا اور وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کے لئے گانے لکھنے کی پیش کش کی۔ سٹیج پر اس ڈرامے کی عمر بہت کم رہی۔

یہ ڈرامے سٹیج کرنے کے بعد قومی کلچرل محاذ کے فن کاروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ سٹیج کی یہ تحریک گاؤں گاؤں پہنچنی چاہیئے۔ چنانچہ اسی دوران Open Air Theatre

شروع کرنے کا تجربہ بھی کیا گیا۔ یہ تجربہ گاؤں میں نہایت ہی کامیاب رہا۔ اس مقصد کے لئے جو چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے گئے اُن میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ وہ گاؤں کی زندگی سے بالکل قریب ہوں۔ اور دیکھنے والے اُن میں اپنے دُکھ سُکھ کا پرتو دیکھیں۔ ایسے کئی ڈرامے گاؤں گاؤں، کھلیانوں کے پس منظر میں چناروں کے سایے تلے، کسانوں کی جھونپڑیوں کے سامنے کھیلے گئے اور ہزاروں دیہاتی ان سے محظوظ ہوئے یہاں کے معاشرے میں انقلاب لانے کے لئے اُس وقت جو ترقی پسند اقدامات عوامی حکومت کر رہی تھی اُن کی وضاحت کرنے اور اُن کے فائدوں سے کسانوں کو رُوشناس کرانے کے لئے ایسے کئی ڈرامے وادی کے کونے کونے میں کھیلے گئے۔ گاؤں کے لوگ ان ڈراموں سے کافی متاثر ہوئے۔ وہ ان ڈراموں میں کام کرنے والے فن کاروں کو عزّت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اُنہیں پیار کرنے لگے۔ کیونکہ اُنہوں نے محسوس کیا کہ یہ فن کار اپنے ہی تو ہیں، یہ ہمیں صرف اپنے مزاح سے ہنساتے ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے دُکھ سُکھ کے شریک بھی ہیں۔ ان ڈراموں میں ۳/۴ اور "زمین گریسی سنز" کافی مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں کا پلاٹ، اداکار اور مُصنّف مل بیٹھ کر طے کرتے تھے۔ اُس پر بحث کرتے اور اُس کے بعد مُصنّف اُسے ایک باضابطہ شکل دیتا۔

ڈرامہ ۳/۴ کسانوں کو ایک وقتی زرعی اصلاح کی اہمیت سے رُوشناس کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہاں کی عوامی حکومت یہاں کے کسانوں، مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقے کی تقدیر سنوارنے کے لئے سنجیدگی سے کارروائی کر رہی تھی۔ زمین کسان کے نام پُوری طرح سے منتقل کرنے کے پیشتر یہاں ایک زرعی اصلاح نافذ ہوئی۔ جس کی رُو سے فصل کا ۳/۴ ہل جوتنے والے کسان کا تھا اور باقی ۱/۴ زمیندار کا۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس سے کسانوں کو اُن کی محنت کا بہتر معاوضہ مِلنے کی ضمانت تھی۔ لیکن کچھ شرپسند عناصر سیدھے سادے کسانوں میں عجیب عجیب طرح کی افواہیں پھیلاتے تھے تاکہ یہ زرعی اصلاح ناکام ہو جائے! چنانچہ قومی کلچرل محاذ کے فن کاروں نے شرپسند عناصر کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اسی مقصد کے لئے یہ ڈرامہ لکھا گیا۔ گو یہ ڈرامہ کافی مقبول ہوا لیکن یہ ایک وقتی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دوران سامراجی طاقتوں کی طرف سے دُنیا کے اس حسین ترین گوشے میں اپنے پیر جمانے کی کئی کوششیں کی گئیں اور اس طرح سے اس ریاست میں امن کے خطرے میں پڑ جانے کا احتمال تھا۔ ایک طرف یہاں کے شاعر اور ادیب امن کے موضوع پر نظمیں اور افسانے لکھے گئے تو دوسری طرف یہاں کے تھیٹر ور کر لوگوں کو "ڈالر صاحب" جیسے ڈرامے دکھا کر جنگ بازوں کے خلاف منظم کر رہے تھے۔

ڈرامہ "ڈالر صاحب" اس دور کی پُوری عکاسی کرتا ہے۔ امن کو اُس وقت تک خطرہ ہے جب

تک کہ جنگ باز اپنا جال بُنتے رہیں گے۔ امن ایک لافانی موضوع ہے اور امن پر لکھے گئے کسی بھی ادب پارے کی حیاتِ جاودان ہو گی۔ لیکن اس سلسلے میں جو بھی ڈرامے وقتی ضرورت کی خاطر یا نعرہ بازی کا مقصد لے کر لکھے جائیں گے وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ "ڈاکٹر صاحب" بھی ایک ایسا ہی ڈرامہ ہے

ان ڈراموں کی کامیابی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اُس زمانے میں کئی گاؤں میں چھوٹے چھوٹے ڈرامائک کلب وجود میں آئے۔ اس طرح سے یہ وقت تھیٹر کی تواریخ کے لئے کافی روشن تھا۔ اس دَور کی ایک دین یہ بھی ہے کہ یہاں کے کئی افسانہ نگاروں اور دیگر ادیبوں نے کشمیری زبان میں ڈرامے لکھنے کی طرف بھی رجوع کیا۔ ان میں نور محمد روشن، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، امین کامل اور پُشکر بھان کے نام قابل ذکر ہیں۔

قومی کلچرل محاذ نے یہاں کے آرٹ اور ادب کی نشو و نما اور ترقی کے لئے جو کام کیا ہے اُس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ کلچرل محاذ کے بعد کلچرل کانگرس وجود میں آئی اور اُس کے بعد آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس بنائی گئی۔ ان سبھی انجمنوں کا مقصد ہر مرحلے پر یہ رہا کہ یہاں کا ادب اور آرٹ ایک مضبوط بُنیاد پر کھڑا ہو۔ کشمیری زبان کی نثر اور کشمیری میں ایک باضابطہ رسالہ شروع کرنے کا سہرا بھی اسی انجمن کے سر ہے۔ ان انجمنوں کو کئی مرحلوں پر حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ ان انجمنوں نے یہاں تھیٹر کی ایک منظم تحریک چلانے کی مسلسل کوششیں کیں۔ ان کا ایک اہم کام وادی کے ہر حصے میں لوگوں میں تھیٹر اور ڈرامے کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ اس انجمن کے کارکن اس نتیجے پر پہنچے کہ گاؤں میں Open Air Theatre جلد اور آسانی سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ Open Air Theatre کی تحریک سرگرمی کے ساتھ کافی دیر تک جاری رہی۔ ان ثقافتی انجمنوں نے ۱۹۵۰ء تک کئی ڈرامے سٹیج کئے۔ اس سلسلے میں سٹیج تکنیک سے متعلق کئی جدید تجربے بھی کئے گئے۔ جن میں Folk Ballet کی تکنیک قابل ذکر ہے۔ یہ Folk Ballet بچہ نغمہ کی بُنیاد پر تیار کئے گئے تھے۔ اسی دوران ایک طویل شیڈو پلے (چھایا ناٹک) نیا کشمیر کی راہ پر بھی سٹیج کیا گیا جس میں کشمیر کی تحریک آزادی کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا۔

۱۹۵۰ء کے بعد سٹیج ڈرامے کی اس منظم تحریک میں ایک جمود طاری ہوا۔ اور ہمیں ۱۹۵۳ء تک کشمیری ڈرامے کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش وقفہ ملتا ہے جس کے لئے کوئی ہمیں معاف نہیں کر سکتا۔

۱۹۵۳ء میں یہاں کی سیاست میں ایک اور انقلاب آیا اور لازمًا اس کا اثر یہاں کے ادب اور آرٹ پر پڑا۔

ان حالات سے متاثر ہو کر دینا ناتھ نادم نے کشمیری زبان میں ایک اوپیرا "بُمبر ہُمبر زل" لکھا جس میں سامراجی سازشوں کی ناکامی دکھائی گئی ہے۔ شاعر نے "بھونرے اور نرگس کی روایتی محبت اور ایک دوسرے کے فراق میں تڑپنے کے موضوع کو لے کر یہ اوپیرا لکھا۔ اس اوپیرا کے کردار ہیں بھونرا، نرگس، گلِ لالہ، ٹیکہ بٹبنز، ارکیوم اور چمن کے بیری طوفان اور خزاں۔ یہ ایک symbolic اوپیرا ہے۔ جس میں لوگوں کی نمائندگی چمن کے پھول کرتے ہیں اور جنگ باز طاقتوں کی طوفان اور خزاں، جن کے مقابل عوام کی ہمت، عزم اور ایکتا ایک آہنی دیوار بن جاتی ہے۔ اس اوپیرا کی شاعری، اس کی اُٹھان اور کردار نگاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تھیٹر کی تاریخ اس پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ اوپیرا کشمیری ادب میں بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ "بُمبر ہُمبر زل" پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں سٹیج کیا گیا۔ اس اوپیرا کی موسیقی یہاں کے عوامی سنگیت پر ترتیب دی گئی تھی۔ اس لئے اس کے گانے بہت جلد لوگوں میں مقبول ہوئے۔ لیکن جہاں تک سٹیج کی دیگر لوازمات کا تعلق تھا، اس میں کافی خامیاں رہی تھیں۔ دوسری مرتبہ یہ اوپیرا اُس وقت سٹیج کیا گیا جب روسی لیڈر مارشل بُلگانن اور مسٹر کروسچیف کشمیر کے دورے پر آئے تھے۔ روسی لیڈر اس اوپیرا کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ اُس وقت اس اوپیرا کی پروڈکشن میں سبھی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"بُمبر ہُمبر زل" کے بعد کشمیری ڈرامے کی تاریخ میں ۱۹۵۵ء تک ایک اور جمود آیا۔ یہ بات نہیں کہ اس دوران کشمیری زبان میں کوئی ڈرامہ نہیں لکھا گیا یا سٹیج نہیں کیا گیا۔ لیکن کسی ایسے ڈرامے کی تخلیق نہیں ہوئی جو قابلِ ذکر ہوتا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں یہاں ڈرامے کی تاریخ میں ایک اور دور کا آغاز ہوا۔ حکومت کی طرف سے پہلی بار جشنِ کشمیر منایا گیا۔ اس جشن کے دوران کئی سرگرمیاں رہیں۔ جشن کمیٹی کی طرف سے مختلف ڈرامائک کلبوں، سکولوں اور کالجوں کے لئے الگ الگ مقابلے منعقد کئے گئے۔ اور سب سے اچھے ڈراموں کو انعامات دئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی ڈرامے ایک ساتھ سٹیج کئے گئے۔ لیکن ان میں سے دو ایک ہی کشمیری زبان میں تھے۔ اس جشن کے دوران جشن کمیٹی کی طرف سے بھی ایک وسیع پیمانے کا اوپیرا سٹیج کیا گیا۔ یہ اوپیرا "ہی مال نائگ راے" کی محبت کی داستان پر دینا ناتھ نادم اور نورمحمد روشن نے مشترکہ طور پر لکھا تھا۔ جہاں تک اس اوپیرا کے گانوں کا تعلق ہے وہ نہایت ہی حسین تھے۔ ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جو کشمیری شاعری میں مناسب مقام پائیں گے۔ لیکن جہاں تک اوپیرا کی تکنیک کا تعلق ہے اُس میں کئی خامیاں تھیں۔ اس میں سٹیج کی تین تکنیکوں

کا امتزاج تھا۔ اوپیرا شیڈو پلے سے شروع ہوتا تھا۔ اوپیرا کی تکنیک سے گذر کر ڈرامے میں ختم ہوتا ہے۔ یہ امتزاج بہت ہی گراں گذرا۔ اس کی موسیقی دِل آویز تھی۔ لیکن اس کے گانوں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو "بُومبُر یمبرزل" کے گانوں کو نصیب ہوئی۔ اس اوپیرا میں سٹیج پر پلے بیک کا تجربہ بھی ہوا۔ ہی مال کا کردار ایک لڑکا ادا کرتا تھا۔ لیکن گانے ایک زنانہ فن کار نے گائے تھے چنانچہ گانوں اور مکالموں کی آوازوں میں جو فرق تھا وہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا۔

"ہی مال ناگہ رائے" ایک ایسی لوک کہانی ہے جس میں ایک کامیاب اوپیرا بننے کی ساری خوبیاں ہیں۔ اس میں کردار کافی جان دار ہیں اور پلاٹ میں بھی کئی ڈرامائی عناصر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کہانی میں ایسے کئی واقعات رُونما ہوتے ہیں جن کا سٹیج پر دِکھایا جانا مُشکل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس اوپیرا کا مسوّدہ تیار کرتے وقت سٹیج کی تمام مُشکلات کو مدِّنظر رکھا جائے۔

جشنِ کشمیر سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہر سال کچھ ڈرامے سٹیج کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ڈرامے بھی لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کشمیری ڈراموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

پہلے جشنِ کشمیر میں اور بھی دو کشمیری ڈرامے لکھے گئے جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے۔ ایک ہندو ہائی سکول کے طلبا نے سٹیج کیا۔ یہ ایک منظوم ڈرامہ تھا جس کا عنوان تھا "نیکی تہ بدی۔" اور دوسرا محمد امین کامل کا لکھا ہوا ڈرامہ "حبہ خاتون" تھا۔ "نیکی تہ بدی" بھی ایک Symbolic ڈرامہ تھا۔ اس کا موضوع تھا پیار اور محبت۔ اس ڈرامے کا مسوّدہ کافی جان دار تھا اور اسے چھوٹے چھوٹے بچوں نے نہایت خوبصورتی سے پیش کیا۔

محمد امین کامل نے ڈرامہ "حبہ خاتون" کے لئے مواد جمع کرنے میں کافی محنت کی تھی۔ اس ڈرامے کی کردار نگاری بھی اچھی ہے اور ڈائیلاگ بھی زوردار۔ لیکن اس ڈرامے کی ہر خوبی کو اس کی کمزور پروڈکشن نے زائل کر دیا تھا۔ ایکٹنگ، سیٹنگ، میک اپ، ملبوسات غرض ہر اعتبار سے یہ ڈرامہ کمزور تھا۔

۱۹۵۵ء میں یہاں عوام اور حکومت کی طرف سے وادی کو سیلاب کی بھیانک آفت سے بچانے کے لئے ایک منظم کوشش کی گئی۔ اس نیک کام میں یہاں کے فن کاروں نے پُورا ساتھ دیا۔ چنانچہ علی محمد لون، محمد امین کامل، نُور محمد روشن اور پُشکر بھان نے عوام کو اپنے کھیت کھلیان سیلاب سے بچانے کے لئے رضاکارانہ کام پر مائل کرنے کے لئے سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کے ڈرامے لکھے۔ ان میں سے علی محمد لون کا لکھا ہوا ڈرامہ "وِذ چھ سانی" اور پُشکر بھان کا لکھا ہوا "Shkat" یا

زبانوں کے کئی مشہور ڈراموں کے ترجمے بھی نشر کئے۔ اس ادارے نے کشمیری زبان کو کئی ایسے مزاحیہ کردار دئے جو عوام میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ شاید ہی کوئی کشمیری ہوگا جو "مچامہ" کے کارناموں سے واقف نہیں ہوگا۔ اسی ادارے کے ذریعے پُشکر بھان نے کشمیری زبان میں ——— farce لکھنا شروع کیا۔ ریڈیو کشمیر کے ثقافتی کلب آکاش وانی کلب نے تھیٹر کو بڑھاوا دینے میں بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کلب نے کئی ڈرامے نہایت کامیابی کے ساتھ سٹیج کئے۔ ان میں دو ڈرامے کشمیری زبان میں تھے۔ ایک "ہیرو مچامہ" اور دوسرا "وقتک لُقمان"۔ پُشکر بھان کے لکھے ہوئے ان مزاحیہ ڈراموں کے متعدد شوز سرینگر کے ٹیگور ہال میں ہوئے۔

کشمیری ڈرامے کی تحریک کو ایک منظم طریقے پر چلانے کے بارے میں جن کوششوں کا ذکر میں نے کیا اُن کے باوجود یہاں ڈرامے کے مستقبل پر ابھی دُھندسی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں مُناسب اور اہل اداکاروں کی کمی ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ اچھے ڈراموں کی کمی ہے۔ اگر یہاں کے فن کار اور ادیب ایک مشترکہ کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں تھیٹر ایک مستحکم بُنیاد پر کھڑا نہ ہو۔ شاعری کے میدان میں ہماری عظیم روایات ہیں۔ افسانوی دُنیا میں بھی ہم نے اپنا مقام بنانا شروع کیا ہے۔ ادب کی صرف دو اصناف ہیں جن کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے، ایک ناول اور دوسری ڈرامہ۔ یہاں کے ادیبوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ ڈرامے جیسی زوردار صنف کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتے۔ آخر ہم کب تک دوسری زبانوں کے ڈراموں پر تکیہ کرتے رہیں؟

(کشمیری سے ترجمہ)

ویریندر پرشاد سیکسینہ

مثنوی "دافع عذاب"

شری ستیہ نرائن جی کی کتھا کو مثنوی " دافع عذاب " کے نام سے منشی جوالا شنکر امیر بریلوی شاگرد رشید حضرت نسیم دہلوی نے ۱۸۴۰ء میں منظم کیا تھا۔ یہ مثنوی ۱۸۶۷ء میں تیسری مرتبہ نظر ثانی کے بعد امیر بریلوی نے مطبع ماہ پرتو واقع شہر بریلی میں بااہتمام پنڈت نتھو لال طبع کرائی۔ امیر بریلوی کے والد منشی گنگا دت بریلی کے ایک اعلیٰ مکینہ کا تھیہ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور بریلی کے رؤسا میں ان کا شمار تھا۔ شعر و شاعری سے بھی ان کو شوق تھا۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے منشی جوالا شنکر کو فارسی اور اُردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندی کی بھی تعلیم دِلوائی۔ منشی جوالا شنکر امیر بریلوی کا شمار اساتذۂ سخن میں ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم نے آج تک ان کا ذکر کسی معتبر تذکرے میں نہیں دیکھا۔ اُردوئے مُعلّیٰ علی گڈھ ماہ فروری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں اُس کے ایڈیٹر مولانا حسرت موہانی مرحوم نے شاگردانِ نسیم دہلوی میں مولوی باسط علی شوکت لکھنوی، واجد علی خان واجد لکھنوی، سیّد آغا جانی، شیخ جعفر علی قمر لکھنوی، منشی خیراتی لال شگفتہ، آغا شکوہ لکھنوی، حکیم بانکے لال مسیح کے نام گِنائے ہیں۔ لیکن منشی جوالا شنکر امیر بریلوی کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی مثنوی " دافع عذاب " کو تمام شمالی ہند کے پنڈت شری ست نرائن جی کی کتھا کے موقع پر ہندوؤں کو سُناتے تھے اور اب بھی منشی بنواری لال شعلہ کی بزم بندرا بن منشی گور سہائے ملتجی کے سوامان چرتر منظوم اور حضرت جگر بریلوی کی مثنوی پیام ساوتری " کی طرح لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو اس مثنوی کا پاٹھ کرتے دیکھا گیا ہے۔ ہمارے ادبی مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے اُردو زبان کو بڑا زبردست نقصان پہنچایا ہے کیونکہ انہوں نے کبھی ایسی مذہبی مثنویوں کا ذکر نہیں کیا جن کے ذریعہ اُردو عوام میں پھیلی ہے۔ اگر میں اُردو کے کرشن بھگت اور رام بھگت مثنوی نگار شعرا کا ذکر چھیڑ دوں تو یہ کہانی بہت طولانی ہو جائے گی۔ افسوس

کے ساتھ یہ بھی لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے ادبی مؤرخوں نے کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

امیر بریلوی نے مثنوی "دافع عذاب" کو اپنے مخلص دوست للتا پرشاد لائق کی تحریک سے نظم کیا تھا۔ سببِ تالیف کتاب میں امیر بریلوی فرماتے ہیں :-

بریلی شہر میں اِک نامور ہے — رئیس عہد ہے والا گہر ہے
جہاں کو للتا کا یاد ہے نام — اسی سے للتا پرشاد ہے نام
لیق ہے اس کا لقب شاعری میں — لیاقت کچھ عجب ہے شاعری میں
سجل ہے اُس سے کلکٹری کا دفتر — وہ ہے سر رشتہ دار نیک اختر
یہ ظلِّ چتر گپت آیا جہاں میں — کہوا ئیٹا نہ ہندی کی زبان میں
نکلتے حرف ہیں اُس کی قلم سے — مطابق کلک قدرت کی رقم سے
سخی ابن السخی ابن الخی ہے — کہ حاتم اُس کے در پہ ملتجی ہے
کرم فرما ہی رہا ہے وہ ذی جاہ — ہم اُس کے صدقِ دل سے ہیں ہوا خواہ
ہوئی جب یہ تمنّائے دلِ صاف — بیان ہوں ست نارائن کے اوصاف

مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے :-

زباں پر ست نارائن کا ہے نام — کہ جس سے جان کو ہے تن میں آرام
اُسی کی ہر طرف جلوہ گری ہے — کہیں زہرہ کہیں پر مشتری ہے
جمال اُس کا تماشا رُو برو ہے — چمن میں گل ہے گل میں رنگ و بو ہے
جُدا ہے سب سے لیکن ہے ہر اک جا — دُوئی سے دُور ہے یکتا ہے یکتا
جو شے موجود ہے اُس سے ہے پیدا — وہ صانع بھی ہے صنعت میں ہویدا
بہت نزدیک ہے اور دُور بھی ہے — نہاں بھی ہے وہی مشہور بھی ہے
بیاں کیا کر سکے یہ پیکرِ خاک — بجز اس کے کہ ہے وہ ایزدِ پاک

امیر بریلوی اپنے بارے میں مثنوی میں یوں فرماتے ہیں :-

بہم ہو کر جو لالا اور سخنور — ہمارا نام آتا ہے زباں پر
امیر اپنا تخلّص ہے سخن میں — جگہ ملتی ہے بزمِ اہلِ فن میں
پدر کا نام گنگا دت ہے مشہور — کہ جن کے سب ریاست کے ہیں دستور

ہمارا قوم سکسینہ عیاں ہے　　بریلی شہر میں اپنا مکان ہے

نیم نشار ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

مقام نیمکھار اِک ہے جو مشہور　　گنہگاروں کے کرتا ہے گنہ دُور
بڑا ممتاز تیرتھ ہے جہاں میں　　کہ جس کی دُھوم ہے ہندوستاں میں

نارد جی نے تمام عالم کی سیر کی تو تمام مخلوق کو پریشان پایا۔ اس کی تصویر آمیر بریلوی نے کس اُستادانہ شان سے کھینچی ہے :۔

غمِ فرقت میں کوئی مبتلا تھا　　کوئی پامال جورِ دلربا تھا
جوانی میں کوئی محتاج ہم خواب　　کوئی وحشت سے تنہائی کی بیتاب
ضعیفی میں کسی کو رنجِ فرزند　　غمِ دختر میں کوئی سخت پابند
عوارض میں کوئی تھا سینہ افگار　　بسانِ ابر دائم دیدۂ زار
نہ حاصل تھی کسی کو راحتِ تن　　کسی کو رات دن تھا خوفِ دُشمن
کسی کو تھی عزیزوں سے جُدائی　　کسی کی بند تھی حاجت روائی
پریشان کوئی فکرِ بے زری میں　　کوئی آوارہ خشکی و تری میں
کوئی برسات میں تھا گھر سے باہر　　کسی پر بند تھا آرام کا در
کسی کا ہاتھ خالی تھا درم سے　　کوئی ناآشنا راہِ کرم سے
کسی کو دین سے گمراہ پایا　　کسی پر صدمۂ جانکاہ پایا
کوئی بدکار، کوئی تھا گنہگار　　کوئی جھوٹی قسم کھانے کو تیار
کوئی محسن کُش و احسان فراموش　　بیانِ نام حق سے کوئی خاموش
کوئی عورت عدوئے جان شوہر　　برادر کوئی خونخوارِ برادر
ملازم تھا کوئی آقا کا دشمن　　کوئی آقا بھی تھا نوکر سے بدظن
جزائے فعلِ بد سے اپنے وہ لوگ　　طبیعت میں لگا بیٹھے تھے اک روگ
نہیں ہوتے تھے حاصل اُن کے مقصد　　دلوں میں جاگزیں تھے رنج بے حد
نظر آیا کوئی زحمت کشیدہ　　ز فورِ غم سے کوئی آب دیدہ
کوئی فریاد کرتا تھا شب و روز　　نکلتی تھی کسی کی آہ جان سوز

کوئی بے تاب تھا سیماب کی طرح　　کوئی تھا ماہیٔ بے آب کی طرح

جب نارو جی نے جب تمام مخلوق کو پریشان دیکھا تو شری بھگوان سے التجا کی کہ کوئی ایسا برت بتلایئے جس سے دُنیا کا تمام دُکھ درد دُور ہو جائے :۔

یہ فرمایا کہ نارو کیا ہے مطلب　　بیانِ مدّعا اب کیجئے سب
کہا تب اُن سے نارو نے مہاراج　　گیا تھا عالمِ فانی کو میں آج
وہاں مخلوق کو غم ناک پایا　　طبیعت نے میری صدمہ اُٹھایا
بتا ایسی عبادت کوئی معبود　　کہ جس سے رنج و غم ہو جائے نابود
سوال اُن کا بروئے بشن آیا　　کہ اُس میں فائدہ عالم کا پایا
کہا اِک ست نارائن کا ہے برت　　بشر کو وے گا وہ ہر ایک شے برت
عروجِ ماہ کے ایّام میں جب　　کمالِ ماہ کی جس روز ہو شب
ہو اُس سے قبل یا دِن بارہویں کا　　کریں اس برت کو اہلِ تمنّا
اُٹھے جب بسترِ شب سے سحر کو　　جھکائے ڈنڈوت میں اپنے سر کو
خیالِ صورتِ معبود کر کے　　بیانِ حاجت و مقصود کر کے
کہے دِل میں کرونگا برت میں آج　　برائے ست نارائن مہاراج

شری بھگوان نے نارد جی کو بتلایا کہ جو کوئی مخلوق شری ست نارائن کا برت رکھے گا اور کتھا کرائے گا تو اُس کے حسب ذیل دُکھ دُور ہو سکتے ہیں :۔

شری نارد سے فرماتے ہیں بھگوان　　نہیں رہتے ہیں اس سے دل میں ارمان
کرے اس برت کو جس آرزو سے　　وہ حاصل ہو بشر کو چار سُو سے
جُدا ہو جو کوئی اپنے صنم سے　　چھُٹے فی الفور فرقت کے الم سے
نہ جس کا رنج جاتا ہو کسی دم　　نہ جس کو چین آتا ہو کسی دم
جگر میں درد ہو دِل میں قلق ہو　　وفورِ غم سے جس کا رنگ فق ہو
طبیعت میں ہو جس کی بے قراری　　جو کرتا ہو ہمیشہ آہ و زاری
خوشی جس کو نہ ہوتی ہو میسّر　　جو ہر اِک لحظہ رہتا ہو مکدّر
کریں نارائن اُس کا رنج سب دُور　　دِکھائیں حالتِ اصلی کا دستور
کسی کا ہو اگر دُشمن زبردست　　کریں نارائن اُس کو پست سے پست

اگر ہو جیل خانہ میں کوئی قید	تو اُس کے چھوٹ جانے کی ہے اُمید
اگر ہو عارضہ مُہلک کسی کو	شفا ہو جائے حاصل آدمی کو
جو اندھا ہو تو اُس کی آنکھ کھُل جائے	... ...
کسی کو ہو اگر اولاد کا رنج	تو اُس کے دِل سے جائے سب شش و پنج
نہ کاشانہ ہیں جس کی ہو کوئی زن	ملے محبوبہ اُس کو بساحتِ تن
نہ آتا ہو جسے تحصیل سے عِلم	تو حاصل ہو اُسے تسہیل سے عِلم
کرے جو کوئی مُفلس خواہش زر	تونگر ہو تونگر ہو، تونگر
غرض ہوتے ہیں سب مقصود حاصل	اگرچہ ہوں بہت مُشکل سے مُشکل

شری بھگوان نے نارد جی سے کہا کہ سب سے پہلے یہ برت بنارس کے سدانند نامی برہمن نے رکھا تھا جو مُفلسی سے پریشان تھا، لیکن اُس کی بیوی ایشور بھگتی میں رنگی ہوئی تھی اور ہر وقت پتی ورت دھرم کا پالن کرتی تھی۔ کیا خوب فرمایا ہے :-

مگر اُس کی جو عورت پارسا تھی !	فقط اُس کی وہی اِک آشنا تھی !
نہیں غم خوار تھا اُس کا کوئی اور	کہ تھے افلاس سے سب طور بیطور
مزا اُس نے جوانی کا نہ پایا	نتیجہ زندگانی کا نہ پایا
برہنہ دُھوپ میں گورا بدن تھا	جینئو کے سِوا کیا پیرہن تھا
فقط جو ایک دھوتی تھی کمر میں	لپٹا ایک ٹکڑا اُس کا سر میں
جو کرتا تھا گدائی میں میسّر	تو کھاتے تھے زن و فرزند مِل کر

ایک روز سدانند برہمن گدائی کے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں شری بھگوان سے مُلاقات ہو گئی اور اُس نے اپنا سب احوال سُنایا۔ بھگوان نے اُس سے کہا کہ تم شری ست نارائن جی کی کتھا بول دو۔ تمہارے سب دُکھ درد دُور ہو جائیں گے :-

کہا اُس سے یہ نارائن نے اے مرد	نہیں رہنے کا مطلق یہ ترا درد
کتھا تو ست نارائن کی دے بول	کہ دم میں دیگی سب عقدے ترے کھول

یہ بتلا کر بھگوان اُس جگہ سے غائب ہو گئے۔ برہمن نے فوراً منّت دِل میں مانی کہ جو کچھ گدائی سے حاصل ہو گا اُس سے شری ست نارائن جی کا برت رکھوں گا۔ وہ اپنے گھر آیا اور اپنی پتی ورتہ استری کو یہ سب احوال سُنایا۔ استری سے اجازت لیکر گدائی کے لئے گیا اور اُس کو اُس روز دو چند رزق ملا۔ کیا خوب فرمایا ہے :-

گدائی میں جو ہم لائے ہیں تو لے
کتھا کا کام سب انجام کر دے

کریں گے کل جو نارائن کا ہم برت
کرے گا دُور سب رنج و الم برت

وہ عورت خوش ہوئی اس گفتگو سے
کہا سُن کر یہ مردِ نیک خو سے

کہا جو آپ نے بے شک کروں گی
یہی میں آج سے کل تک کروں گی

برہمن کو غرض اس برت کے بعد
ہوا معلوم زورِ طالع سعد

زرِ وافر ہوا حاصل کہیں سے
فلک تک ڈھیر تھا جس کا زمین سے

رہا پھر وہ کسی شے کا نہ محتاج
ہوا مشہور شکل صاحبِ تاج

ہوا کچھ اور اُس کا کارخانہ
کہ حیرت میں رہا سارا زمانہ

شری بھگوان نے نارد جی کو بتایا کہ سدانند نامی برہمن شری ست نارائن جی کی کتھا ہر ماہ کرتا تھا۔ ایک روز جب کتھا ہو رہی تھی، ایک ہیزم فروش اُس کے یہاں آگیا اور اُس نے شری ست نارائن جی کی کتھا سُنی اور خاتمہ پر پرشاد لیا اور برہمن سے پُوچھا کہ یہ تمہارے دُکھ درد کیسے دُور ہو گئے۔ برہمن نے اُس سے کہا کہ اگر وہ شری ست نارائن جی کی کتھا کرے گا تو اُس کی طرح اُس کے دن بھی پھر جائیں گے۔

وہ لکڑی والا پیاسا ہو کے اِک بار
ہوا اُس وقت پانی کا طلب گار

برہمن کے یہاں آیا وہاں پر
کتھا اُس وقت ہوتی تھی جہاں پر

پیا آبِ حیات اُس نے رہِ گوش
محبّت کا طبیعت میں ہوا جوش

مِلا جب ختم کے وقت اُس کو پرشاد
ہمیشہ کو ہوا وہ ذائقہ یاد

تعارف اُس نے پہلے کا جو پایا
برہمن سے وہ لکڑی والا بولا

کہ تھے نانِ جویں کو آپ محتاج
نظر آتا ہے یہ جاہ و حشم آج

بتا دو ہم کو یہ کیا ماجرا ہے؟
تمہارے دن پھرے شکرِ خدا ہے

کِیا ہو تم نے جو کچھ ہم کریں اب
غم اپنا دُور اے ہمدم کریں اب

برہمن نے شتاب اُن کو بتایا
یہ ہم نے ست نارائن سے پایا

کرے گا تو بھی برت اُن کا جو اے یار
ترا جاتا رہے گا سب یہ ادبار

سُنا جب یہ برہمن کی زبانی
وہیں پر اُس نے اپنے دِل میں ٹھانی

کریں گے ہم ضرور اس برت کو کل
وہ پانی پی کے واں سے پھر دیا چل

تو پھر ہر روز کی قیمت سے دونا
بِکا اُس روز گھٹا لکڑیوں کا
کیا برت اُس نے جیسا تھا ارادہ
ہوا سامان ہمت سے زیادہ
مِلی دولت اُسے بھی حد سے افزوں
کہ جس سے ہو گئی حالت دِگرگوں
وہ لکڑی
چل کر کئی کوس
گیا سب بھول در پر جب بجا کوس
جہاں تھا لکڑیوں کا سر پہ گٹھا
چمکتا تھا وہاں ٹوپی میں لچکا
زن و فرزند سے آرام پایا
ہمیشہ عیش کا ہنگام پایا

سُوت جی مہاراج نارد کو بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں اُلکھ نام کا ایک راجا ہوا تھا۔ وہ بڑا دین دار تھا شری ست نرائن جی کی کتھا پریم سے کرتا تھا۔ ایک روز جنگل میں دریا کے کنارے شری ست نرائن کی کتھا کر رہا تھا، وہاں ایک بنیئے کی ناؤ آئی۔ شاعر نے بنیئے کا سراپا کس خوبصورتی سے کھینچا ہے:

وہاں پر ویش کی اِک ناؤ آئی
کتھا کی اُس نے جب آواز پائی
اُتر آیا وہ کشتی سے زمین پر
امارت کی چمک جس کی جبین پر
گلے میں موتیوں کا ہار پہنے
نہایت خوشنما زنار پہنے
تجارت پیشہ و ذی حوصلہ تھا
دِل عالی میں اس کے ولولہ تھا!

بنیئے کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے اُس کی بیوی اور وہ ہر وقت غم زدہ رہتے تھے۔

نہ تھی اولاد اُس کے تھا یہی غم
نہ دِل سے رنج جاتا تھا کسی دم
اسی غم میں زن اُس کی مُبتلا تھی
گرفتارِ الم صُبح و مسا تھی
نہ جس میں پھُول پھل ہو وہ شجر کیا
نہ ہو اولاد جس کے وہ بشر کیا

ویش نے راجا سے پُوچھا کہ کتھا کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ راجا نے جواب دیا کہ جو جس کا مطلب ہو گا وہ پُورا ہو جائے گا۔ ویش نے کہا کہ اگر کوئی بیٹا یا بیٹی میرے یہاں ہو گی تو میں شری ست نرائن جی کی کتھا کراؤں گا۔ پرماتما کی مہربانی سے لڑکی کا جنم ہوا لیکن وہ کتھا کرانا بھُول گیا۔

ویش کی بیوی نے اپنے خاوند سے کہا کہ جس کے واسطے تم نے کتھا بولی تھی وہ مقصد پُورا ہو گیا۔ یعنی تمہارے گھر میں لڑکی کا جنم ہو گیا اور لڑکی بھی جوان ہو گئی۔ لیکن تم کو اب تک کتھا کرنے کا خیال نہ آیا۔ اب تم کو کتھا کرنا چاہیئے اور اُس کی شادی کی فکر کرنا چاہیئے۔

کہا جس وقت ہوگی کتخدائی   تو ہم کردیں گے پھر منت ادائی

والد نے لڑکی کی شادی ایک مردِ عاقل کے ساتھ کردی لیکن شری ست نرائن جی کی کتھا کرنے کا خیال اُس کو نہ رہا۔

ہوئی جس وقت وہ شادی کے قابل   پدر نے ڈھونڈ کر اِک مردِ عاقل
کیا جس طور سے ہے شاستر میں   ادا کر کے مراسم اپنے گھر میں
دیا بیٹی کا اُس کے ہاتھ میں ہاتھ   کیا ہے عمر بھر اس کا تِرا ساتھ
دیا اُس کو بہت سامال و اسباب   وہ چیزیں دین کہ ہوں دُنیا میں نایاب
جو تھا حد سے زیادہ اُس کا دلشاد   نہ آئی ست نارائن کی کچھ یاد
طبیعت میں خوشی کا تھا بہت جوش   کتھا سُننا ہوا اُس کو فراموش

جس وقت وہ شادی سے فارغ ہوگیا تو وہ اور اُس کا داماد تجارت کے لئے نکلے، راستے میں ایک شہر میں ٹھہرے جس کے راجا کا نام چندر گپت تھا۔ شری ست نرائن سوامی ویش اور اُس کے داماد کو سزا دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اسی رات راجا کے یہاں چوری ہوگئی اور چور مالِ مسروقہ وہاں پھینک آئے جہاں بنیا اور اُس کا داماد فروکش تھے۔ اب کیا تھا، راجہ کے مُلازموں نے دونوں کو راجا کے سامنے پیش کیا۔ راجا نے اُن کو جیل خانہ بھیج دیا۔

وہاں لوگوں نے سب اسباب پایا   تو اُس بے جرم کو سارق بنایا
وہیں پر باندھ کر مشکیں شتابی   دِکھائی سخت ذلّت اور خرابی
وہی حالت ہوئی داماد کی بھی   کہ تہمت مال کی دونوں پہ رکھی
حقیقت میں یہ دونوں بے خطا تھے   مگر کچھ موردِ قہرِ خدا تھے
کیا راجا نے اُن کو پا بہ زنجیر   کہ ثابت ہوگئی چوری کی تقصیر
جو مال اُن کا تھا وہ بھی کرلیا ضبط   کہ ہے ادبار کو ادبار سے ربط

اِدھر بنیئے اور اُس کے داماد کو شری ست نرائن سوامی نے سزا دی، اُدھر اُس کے گھر میں بھی چوری ہوگئی اور بنیئے کی بیوی اور اُس کی بیٹی در در جا کر بھیک مانگنے لگیں۔ یہ ہیں خُدا کی قدرت کے کرشمے۔

ہوا یہ حال اُن کا جب سفر میں   یہاں چوری ہوئی تب اُن کے گھر میں
نہیں چوروں نے اِک تنکا بھی چھوڑا   سِوا اس کے کہ جو تھا تن پہ جوڑا

وہ دونوں عورتیں محتاج ہو کر — گدائی کے لئے پھرتی تھیں گھر گھر
رہا افسوس کچھ پر وہ نہ اُن کا — کہ جن کو چاند سورج نے نہ دیکھا
گدا آتے تھے صدہا جن کے در پہ — درِ عالم پہ وہ کھاتی تھیں ٹھوکر
بدن جن کے دوشالوں میں پلے تھے — عرق میں اُن کے سب کپڑے گلے تھے
یہ کہتی تھیں کہ اپنا دم نکل جائے — میسّر جو غذا ہو سم نکل جائے
غم و اندوہ سے اُن کا یہ تھا حال — مشبک تھا جگر سینہ تھا غربال
اُدھر تھی اپنے شوہر سے جُدائی — اِدھر قسمت نے یہ ذلّت دِکھائی

ایک روز شام کے وقت بنیئے کی بیٹی کلاوتی در در بھیک مانگتی ہوئی ایک برہمن کے مکان پر آئی۔ وہاں شری ست نرائن سوامی کا برت ہو رہا تھا اور کتھا ہو رہی تھی۔ اُس نے کتھا کو دِل لگا کر سُنا اور وہیں شری ست نرائن سوامی کی یاد میں ایسی رنگ گئی کہ گھر کا جانا بھول گئی اور دیر میں اپنے مکان پر آئی تو اُس کی والدہ نے کہا ؎

خفا ہو کر کہا لیلاوتی نے — تجھے کھو یا تری بے پردگی نے
کہاں تھی شام سے تو ہے یہ کیا بات — اب آئی گھر کو جب گذری پہر رات
نہیں معلوم کیا دِل میں ہے تیرے — اُڑے جاتے ہیں سارے ہوش میرے
گدائی اور ہے آوارگی اور — ہوئے معلوم مجھ کو سب ترے طور
نصیحت سچ ہے یہ اہلِ ہُنر کی — فقط اچھی ہے بیٹی اپنے گھر کی
نہ کھے اپنے گھر رختِ جوان کو — کہ باندھا کس نے ہے آبِ روان کو

کلاوتی نے جب اپنی والدہ کی یہ گُفتار سُنی تو اُس کے دِل کو ایک چوٹ لگی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور والدہ سے کہا کہ میں برہمن کے یہاں شری ست نرائن سوامی کی کتھا سُن رہی تھی۔ کتھا سُننے کا یہ اثر ہوا کہ جس راجا نے اُس کے خاوند اور والد کو قید کیا تھا، فوراً اُس کے رہا کر دینے کا حکم سُنایا کیونکہ رات کو شری ست نرائن سوامی نے راجا کو ایک خواب میں بتایا کہ فوراً تم بنیئے اور اُس کے داماد کو رہا کر دو۔

کہا راجا نے جب مرشد سے یہ خواب — اجازت اُس نے دی پھر ہو کے بے تاب
کہ دونوں قیدیوں کو چھوڑ دو جلد — مُناسب ہے یہی اب آپ کو جلد

تب اُن کی بیڑیاں کٹوا کے فی الفور — کہا یہ ہو گیا تم پر بڑا جور
مری غفلت ہے اور میری خطا ہے — مجھے اب تم سے اُمیدِ عطا ہے
نہلوا کر پنہائی اُن کو پوشاک — کھلایا پھر طعام افضل و پاک
کیا رُخصت سب اُن کا مال دے کر — دیا اپنی طرف سے اور کچھ زر

پرماتما نے پھر بنیئے اور اُس کے داماد کو آزمایا۔

چلے وہ دونوں پھر اپنے وطن کو — وہیں پر چھوڑ کر رنج و محن کو
سوارِ کشتیٔ دلچسپ ہو کر — یہ کہتے تھے کہ اب نزدیک ہے گھر
تو نارائن نے اُن کو آزمایا — گدا کی شکل میں جلوہ دِکھایا
کہا کیا جنس کشتی میں بھری ہے — کہ بخشش کی ہمیشہ جڑ ہری ہے
وہ بولے اس میں سب پتے بھرے ہیں — نہ باقی مال مطلق دوسرے ہیں
گدا نے کہہ دیا ہنس کر وہاں سے — وہی ہوگا جو نکلا ہے زبان سے
ہوا بالکل وہ مال اسباب پتّا — ہوا زربفت اور کمخواب پتّا
یہ حالت دیکھ کر حیرت میں آئے — لبِ دریا پہ کشتی کھینچ لائے

فوراً ہی بنیئے اور اُس کے داماد نے گدا کے پیر پکڑ لیئے۔

قدم پکڑے شتابی اُس گدا کے — سخن کہنے لگے پھر التجا کے
ہوا جب عاجزوں کا عجز منظور — تب ان کی ہو گئی حالت بدستور

اب پرماتما نے پھر جلوہ دِکھایا۔

چلے آگے وہاں سے پھر وُہ تجّار — متاعِ وصلِ جاناں کے خریدار
لبِ دریا تھا اُن کا شہر آباد — نہایت دیکھ کر اُس کو ہوئے شاد
کیا گھر کو روانہ آدمی جلد — خبر آمد کی گھر والوں کو دی جلد
کتھا ہوتی تھی اُن کے گھر میں اُس دم — خبر لے کر وہاں پہنچا جو آدم
خوشی دِل میں کلاوت کی سمائی — ہوئی طیار و تازہ پھول آئی
پھڑکتا تھا بدن اُس کا خوشی سے — بھرا جوبن میں تن اُس کا خوشی سے
ہوئی لیلاوتی بھی اس قدر خوش — کہ ہو جتنا نہ کوئی عمر بھر خوش

کہا مادر نے دختر سے کہ پیاری
ہوئی سب آرزو حاصل ہماری

وہیں جاتی ہوں میں دریا کنارے
جہاں ہیں باپ اور شوہر تمہارے

کتھا ہو ختم جب تک تم رہو گھر
بہت بیتاب ہوں ٹھہروں میں کیونکر

وہاں سے جب قدم مادر کا اُٹھا
کتھا سُننے سے دل دختر کا اُٹھا

ترستی تھی پئے دیدار شوہر
چلی مادر کے پیچھے وہ سمن بر

حیا کچھ تھی نہ مطلق اُس کو تھی شرم
وفورِ عشق سے سب چھوڑ دی شرم

کتھا کا خاتمہ ہونے نہ پایا
نہ اُس دِلدار نے پرشاد کھایا

خفا اُس دم ہوئے نارائن اُس پر
تو دریا میں ڈُبایا اُس کا شوہر

جب بنیئے کی بیٹی نے اپنے خاوند کو نہ پایا تو آہ و بکا کرنے لگی اور دریا میں ڈوبنے کو تیار ہو گئی۔

وہاں جاکر جو دیکھا ماجرا یہ
تو بولی رو کے پھر وہ دِلربا یہ

کدھر آئی کدھر جانا پڑا اب
پدر مادر کو ہے صدمہ بڑا اب

مجھے کیا میں چلی شوہر کے ہمراہ
فقط ماں باپ کو ہے نالہ و آہ

کھڑاؤں لے کے شوہر کی وہ دِلدار
ہوئی پھر ڈوب جانے کو تیار

پدر مادر نے سر کو اپنے پیٹا
کہا نارائن اس دم ہو گیا کیا

اُسی دم غیب سے آواز آئی اور خدا نے پھر جلوہ دِکھایا۔

اُسی دم غیب سے آئی یہ آواز
نہیں واقف ہے تو ہے اس میں کچھ راز

کتھا کو چھوڑ کر آئی یہاں یہ
تو آنا ہو گیا ہے رائیگاں یہ

مُناسب ہے کہ کھائے جا کے پرشاد
مِلے گا اُس کو شوہر ہو گی دِلشاد

یہ سُن کر وہ پری پھر گھر میں آئی
تسلّی خاطرِ مضطر میں آئی

لیا پرشاد نارائن کا جس دم
نظر آیا خوشی کا ایک عالم

کہ وہ شوہر تہہِ دریا سے نِکلا
کچھ اچھا گوہر یکتا سے نِکلا

ہوئی حاصل نہایت شادمانی
ہوا سرسبز نخلِ نوجوانی

پدر مادر کو بھی جوشِ طرب تھا
خوشی دِل میں تبسّم زیرِ لب تھا

گئے گھر کو وہ سب مِل کر وہاں سے
بہت دِلشاد تھے عیشِ جہاں سے

کیا تاجر نے نارائن کا تب برت ۔ زمانہ میں یہ نکلا ہے عجب برت

آخر میں کتھا کا خاتمہ اس ادھیائے پہ ہوتا ہے :-

چہارم ادھیا ہوتا ہے تحریر ۔ ہمارے کلک کو حاصل ہے توقیر
عطائے بشن نارد پر نظر ہے ۔ دکھوں پہ سوت کی رحمت اِدھر ہے
چتر بھیج تھا کوئی راجا جہاں میں ۔ قضا کا تیر تھا جس کی کمان میں
مٹا دی اُس نے سب شیروں کی شیری ۔ نہ باقی تھی دلیروں میں دلیری
گیا صحرا کو بہرِ صید اک بار ۔ گریزاں ہو گئے شیرانِ خونخوار
جو صید افگن ہوا مردِ دلاور ۔ نہ ہاتھی بھی کوئی ٹھہرا وہاں پر
جہاں تھا اِک بہائم کا چراگاہ ۔ وہاں رونق فزا جب ہو گیا شاہ
وہیں اِک نخل کے سایے میں چوپان ۔ کہ جس کے ظاہر و باطن تھے یکسان
بہت سے پھول پھل لا کر فراہم ۔ کتھا سنتے تھے نارائن کی اُس دم
جو چاروں آدھیا آخر پہ آئے ۔ تو راجہ کے لئے پرشاد لائے
جو ناواقف تھا بالکل وہ جہاں دار ۔ کیا پرشاد کے لینے سے انکار
یہ نادانی بھی لاتی ہے خرابی ۔ حماقت بھی دکھاتی ہے خرابی
ہوا وہ ست نارائن کا مقہور ۔ ہوئی تھوڑے دِنوں میں سلطنت دُور
ہوئے اِک دن میں سو فرزند اُس کے ۔ درِ فرحت ہوئے سب بند اُس کے
جو سمجھا ست نارائن کے اسرار ۔ کیا تقصیر کا تب اپنی اقرار
کتھا کہوائی صدقِ دل سے فی الحال ۔ میسر ہو گیا سب مِلک اور مال
ہوئے فرزند پیدا اُس کے گھر میں ۔ ثمر آیا تمنا کے شجر میں

مثنوی "دافع عذاب" اس قابل ہے کہ اس کا ایک شاندار ایڈیشن شائع کیا جائے ۔ کیونکہ اس مثنوی میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے ۔ اس مثنوی کی ادبی حیثیت اُردو کی مشہور مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔ یہ مثنوی مختلف مطبعوں سے بیسیوں بار شائع ہو چکی ہے لیکن یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ کسی معتبر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر اُردو کی مشہور مثنویوں کے سلسلے میں نہیں کیا ۔

علی محمد خان

کشمیر کا ایک ممتاز صحافی اور مصنف۔ فوقؔ

منشی محمد الدین فوقؔ صاحب ۱۸۸۴ء میں موضع کوٹلی ہرنرائن میں پیدا ہوئے، جو سیالکوٹ پنجاب کے جنوب میں دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ جہاں اب بھی موضع ہردو شیوہ (زینہ گیر تحصیل سوپور) میں کچھ اراضی آپ کی ملکیت ہے۔ آپ کے جدّ میاں حسن ڈار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں کشمیر سے نکل کر پنجاب آئے، اور موضع گھرٹل ضلع سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ آپ کے دادا منشی رجب علی ڈار سکھوں کی فوج کے میر منشی کی حیثیت سے اس جنگ میں شامل تھے، جو سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ۱۸۴۹ء میں بمقام چیلیانوالہ (ضلع گجرات) ہوئی ہے۔ آپ کے والد مولوی لدھا خان ڈار ریاست پونچھ (کشمیر) میں سررشتہ داری کے عہدہ پر فائز تھے۔

آپ کی شاعری کی ابتدا قصبہ جامکے ضلع سیالکوٹ سے ہوئی۔ جہاں آپ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۴ء تک[1] مڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے شعر گوئی سے ناآشنا ہونے کے باوجود حضرت نظیر اکبر آبادی کی مسدس ؎ کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ بس پھر کیا تھا سارے سکول میں ان کی شاعری کا چرچا ہو گیا، اور آپ کی حیاتِ شاعری کی تمہید یہی واقعہ بن گیا۔

۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد سیالکوٹ میں جاکر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ ملازمت کی تلاش میں جموں آگئے۔ وہاں میاں فیروز الدین صاحب گورنر ریاست پونچھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ صاحب مذاق تھے۔ یہاں منشی رحیم بخش صاحب رمزؔ اور منشی محمد اسماعیل صاحب ساغرؔ بعد میں بلیغ۔ قاضی فقیر علی صاحب عاقلؔ اور منشی نور الدین صاحب عنبرؔ کی صحبت میں شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا۔ آپ نے سب سے پہلی غزل "پیام یار" رسالہ "پیام یار" لکھنؤ میں اشاعت کے لئے بھیجدی ؎

تجدد آباد ہے لیلیٰ ترے دیوانے سے

---

[1] سات برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کسی صورت میں قابلِ فہم نہیں ہے۔ شاید مقالہ نگار سے سنین کے سلسلے میں چوک ہوئی ہے! (ایڈیٹر)

آپ اُس زمانے میں شوقؔ تخلص فرماتے تھے ... ... "مگر جب آپ نے ایک غزل رسالہ "انتخاب لکھنؤ" میں اشاعت کے لئے بھیجدی، مدیر اخبار نے اس بنا پر اس غزل کو شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کے دوست مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوقؔ نیموی عظیم آبادی کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شوقؔ کی غزل اس رسالہ میں جگہ نہیں پا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی مدیر اخبار نے فوقؔ تخلص تجویز کر دیا۔ جس کو منشی صاحب مسرت کے ساتھ قبول کیا اور تخلص شوقؔ سے فوقؔ تبدیل کیا۔

ایک شعر میں فرماتے ہیں

اے فوقؔ یہ تخلص کیا خوب ہے ہمارا

اس سے ہے ادج ہم کو ہم آسمان پر ہیں

پیسہ اخبار کے دفتر میں چار سال ملازمت کی۔ اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کر لی۔ ۱۹۰۵ء تک غزلیں انہیں کو دکھائیں۔

حضرت داغؔ کا پہلا خط آپ کے نام یوں آیا۔

"ایک غزل نمونے کے لئے بھیج دو۔ تاکہ تمہاری طبیعت کا اندازہ لگایا جائے۔ مر کر بچا ہوں۔ اس واسطے جواب میں دیری ہوئی۔ ابھی تک صحت کامل نہیں"

فصیح الملک داغ دہلوی ۲۰ ستمبر ۱۸۹۸ء حیدر آباد دکن۔ "فوق صاحب میں تمہاری طبیعت سے بہت خوش ہوا۔ اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمہارا نام شاگردوں کی فہرست میں درج کر لیا گیا ہے۔ نیاز دلادینا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ۔ حضرت شاہ نصیر رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت اُستاد ذوقؔ کے نام کی"۔

۱۹۰۱ء میں فوق صاحب، نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کرکے اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا۔ حضرت داغ نے یہ قطعہ لکھ کر خوشنودی کا اظہار کیا۔

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری
خریدار د نیا اخبار دیکھو

جناب فوقؔ کی گلکاریوں سے
ہوا اخبار یہ گلزار دیکھو

یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دِل کو
نہ ہوگا اس سے دِل بیزار دیکھو

سُنا دو مصرعۂ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جو ہر دار دیکھو

جناب محمد عبداللہ قریشی بی، اے اس اخبار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اخبار پنجۂ فولاد ۱۳۱۹ھ کی اٹھان حسینوں کی نوخیز جوانی کی طرح دلکش تھی۔ مضامین شباب کی شوخی رقص کرتی تھی۔ خبروں کے انتخاب میں عام دلچسپی کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نوٹ بے حد مفید اور کارآمد ہوتے تھے۔ بعض عنوان بزم فوقؔ۔ رزاقِ سخن۔ علمی تنظارہ ضامنِ صحت۔ لطائف۔ مراسلات۔ مشاہیر ہند اور دنیا بھر کی خبریں مستقل تھے ہر کالم منہ سے بولتا تھا۔ کہ مجھے دستِ شوقؔ (فوقؔ) سے لکھے جانے کا شرف حاصل ہے۔ طبیعت میں شاعری کا جوش موجزن تھا۔ ایک ایک سطر بہار کی بیاںی بن کر رنگین و شاداب پھول برساتی تھی۔ خبروں کے عنوان عام طور پر مصرعے ہوتے تھے جو نہایت موزونی سے تجویز کئے جاتے تھے۔

ابو الاعجاز حضرت احسان شاہ جہانپوری نے انہی چیزوں سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

فوقؔ کی مضمون نگاری میں کشش ہے حسن کی
خود فدا ہونے کو آتی ہے۔ خبر اخبار پر

علامہ اقبالؔ کی ایک طویل نظم کے یہ چند اشعار انہی دنوں کی یادگار ہیں۔

پنجۂ فولاد اِک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے

رنگ آزادی ہے ہر مضمون میں
سرد ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے

ہے روش اس کی پسند خاص و عام
واہ واہ کیا معتدل اخبار ہے

کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر
بات تو یہ قابلِ اظہار ہے

نام ہے اس کا محمد دین فوقؔ
عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے

اخبار پنجۂ فولاد ناساعد حالات کے اندر ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ اس پر فوقؔ صاحب نے نہایت لطیف انداز میں ایک ہی شعر میں نکتہ چینیوں کا منہ بند کیا۔ فرماتے ہیں

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں نازنیں
اے فوقؔ اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

اخبار "پنجۂ فولاد" کے بند ہونے کے ساتھ ہی آپ نے ۱۹۰۶ء میں "کشمیری میگزین" کے نام سے ایک

ماہوار رسالہ جاری کر دیا جو ۱۹۱۳ء میں ترقی کرتے کرتے ہفتہ وار اخبار کی شکل میں تیس سال تک آپ کے قلمی و ذہنی کمالات کی نمائش کرتا رہا۔ یہ اخبار ۱۹۴۴ء میں بند ہو گیا۔ لیکن اس کے لگائے ہوئے پودے آج خوب برگ و بار دے رہے ہیں ؎

جینے والوں میں وہ بعد موت بھی ممتاز ہے
ساز میں ہر دل کے اس کی گرمئی آواز ہے (سیماب)

اس اخبار نے آپ کی تمام توجہ۔ خاص دلچسپی اور گہری وابستگی کشمیر اور اہل کشمیر کے لئے وقف کر دی۔ آپ سال کے چھ مہینے لاہور میں اور چھ مہینے کشمیر میں رہتے تھے۔ فوق صاحب اور کشمیر کے گہرے تعلق کا خاکہ جناب محمد عبداللہ قریشی بی۔ اے نے یوں کھینچا ہے۔

"کشمیر کی فضائے بکسر معمور حسن اور تمام تر لبریز محبت ہے۔ اور جس میں سانس لینا گویا شعر کی دنیا میں رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وادئ شعرستان کے حسین و جمیل مناظر موسموں کے تغیر و تبدل۔ سورج چاند کی گردشیں صبح و شام کے رنگ برنگے قوس قزحی نظارے۔ برف سے لدے ہوئے سبز پوش اونچے اور نیچے پہاڑ۔ اناج کے سرسبز شاداب کھیت۔ رنگین اور لذیذ پھلوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے درخت۔ چاول کی خوشبودار فصلیں۔ مختلف قسم کے خوش رنگ و خوش آواز پرندے۔ گھنے جنگل۔ صاف و شفاف جھیلیں۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے قدرتی چشمے۔ پہاڑی ندی نالے۔ پھولوں کی آبادبستیاں۔ شگوفوں کی نکہت بیزیاں۔ آبشاروں کی ترنم ریزیاں۔ بادو باراں کی حشر خیزیاں۔ انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں۔ حکام کی چیرہ دستیاں۔ صداقت کے لئے قربانیاں۔ اقتصادی بلندیاں اور پستیاں۔ سماجی خوبیاں اور برائیاں۔ اور سیاسی مدوجزر آپ کی شاعری کے خاص جذبات و تاثرات کے عکس دوسروں کے دلوں پر نقش کرتے ہیں۔

یہ نظم جو فوق صاحب نے سات اگست ۱۹۲۶ء میں کُد اور بٹوت ضلع اودھم پور کے جنگلات سے متاثر ہو کر لکھی ان جملہ باتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دامن قرار دل کے سب تار تار دیکھے — جب تیری وادیوں کے کچھ آبشار دیکھے
جس نے تری خزاں کے ایسے نکھار دیکھے — گلزار خلد کی پھر وہ کیا بہار دیکھے
ہر صبح کی جھلک میں ہر شام کی شفق میں — سو سو طرح کے ہم نے نقش و نگار دیکھے
بادل کا گر کے آنا کُد کی پہاڑیوں پر — اے کاش وہ نظارہ پھر چشم زار دیکھے

اک پردہ پوش عالم کو بے نقاب دیکھا ‏ جب سبز پوش تیرے یہ کوہسار دیکھے

کچھ زرد زرد چہرے تھے سرد سرد آہیں ‏ غم آفریں مناظر یہ بے شمار دیکھے

گو سبز سر زمیں تھی وہ دلفریبیاں ہیں ‏ جو ایک بار دیکھے وہ بار بار دیکھے

کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے کشمیر اور اہل کشمیر کی محبت فوقؔ صاحب کی رگ رگ میں سما چکی تھی۔ فرماتے ہیں :۔

والہانہ عشق ہے کشمیر سے ‏ روح زخمی ہے وطن کے تیر سے

وہ اپنے کشمیری بھائیوں کو ان کے پُر شکوہ ماضی سے آگاہ کرکے بتاتے ہیں۔ کبھی حال کی بے حالی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ؎

اپنے مستقبل کو تو ماضی کے آئینے میں دیکھ

شکر خالق کا کہ اب تک کچھ نشان باقی تو ہیں۔

اب بھی تو چاہیے تو روشن نام ہو اسلاف کا

مشعلِ رہ نقشِ پائے رہرواں باقی تو ہیں

———o———

انقلاب اس عالمِ ایجاد کی تقدیر ہے ‏ خوب ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے

زندگی کی آگ سے اب تک فروزاں ہے چنار ‏ ہے نمو کے جوش سے ہر فصل میں فصلِ بہار

———o———

تجھ میں غیرت ہو تو غالب تجھ پر آسکتا ہے کون

تجھ میں جرأت ہو تو پھر آنکھیں دکھا سکتا ہے کون

ہاں نہ گھبرا رحمتِ حق مہرباں ہو جائے گی

جنتِ کشمیر اک دن پھر جواں ہو جائے گی۔

اُٹھ کہ ہیں صدیوں کے اب سوئے ہوئے بیدار کک

جس کو ہم مجبور کہتے تھے وہ ہیں مختار سب

کشمیر کی سوئی ہوئی برادری کی فوجی سپرٹ کو یوں اُبھارتے ہیں۔ ؎

ناقابلِ اخراج ہیں اِس قوم کے فرزند ‏ جس قوم سے محمود کا بھاگا تھا رسالا

وہ قوم بھی کیا خون رگوں میں نہیں رکھتی — جس قوم کے چہرے سے پشیماں ہو لالا

پرچم کبھی لہرایا ہے پنجاب میں اپنا — ڈیرا کبھی افواج نے لنکا پہ ہے ڈالا

برسوں ہی رہا تبت و قندھار پہ قبضہ — تاریخ کو پڑھ جو تجھے لینا ہو حوالا

جو خوبیاں ہیں اپنی ہیں نظر آئینگی تجھ کو — جب دور کبھی ہوگا تیری آنکھ کا جالا

کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے — جاگے گا تو مشکل سے نہ جائیگا سنبھالا

جس دم وہ دھاڑے گا تو گونج اُٹھے گی دنیا
لرزے گی زمین ہوں گے سمندر تہ و بالا

ہم فوق ہیں اور فوق رہے گا ہمیں سب پر
کچھ غم نہیں گردش نے جو چکر میں ہے ڈالا

حصولِ تعلیم کا شوق اپنی بے علم قوم کو یوں دیتے ہیں ؎

دل توڑ کے بیٹھے ہو یہ اچھا نہیں کرتے — ہمت کے دھنی جو ہیں وہ ایسا نہیں کرتے

تعلیم اگر عام ہو بیکار کہاں ہو — افسوس کہ تم اس نکتے کو سوچا نہیں کرتے

تعلیم ہی اک چلتا ہوا جادو ہے ایسا — جس جادو پہ عاقل کبھی ٹونا نہیں کرتے

اس پسماندہ قوم کی ہمت یوں بندھاتے ہیں۔ ؎

تم اپنے پاؤں کے چھالوں کو رو رو کر نہ یوں دیکھو
کسی دن پھول برسیں گے انہی تلووں کے چھالوں سے

علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ "اِن معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے۔ اور کسی قدر اپنی بساط سے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے"۔

فوق صاحب مذہب کے لحاظ سے مسلمان تھے۔ اور ہندوستان میں رہنے کے لحاظ سے ہندوستانی تھے فرماتے ہیں:—

ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ
حُبِّ وطن ہی کامل ایمان ہے ہمارا

سنہ ۱۹۳۲ء کے سفرِ کشمیر میں اپنے دوست ڈاکٹر عبدالواحد کے واقع سری نگر مقیم تھے۔ مرض الموت میں مبتلاء تھے۔ ۸ر اگست کی رات کو سخت دردِ سر اٹھا۔ لیکن اس حالت میں بھی ایک مردِ مومن کی مانند موت کو ہنستے کھیلتے لبیک کہنے پر تُلے رہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حُبّ الوطن مِن الایمان کو تازہ دکھا۔ فرماتے ہیں:۔

جس سے مایوس مسیحا ہے وہ بیمار ہوں میں
موت ہی جس کا مداوا ہے وہ آزار ہوں میں

حوصلہ دیکھ میرے جذبۂ سودائی کا
گو ہوں بے مایہ مگر تیرا خریدار ہوں میں

جرم ہمدردئ مخلوق کی عادت ہے مجھے
جس پہ رحمت تیری صدقے وہ گنہگار ہوں میں

سببِ شورشِ کشمیر تو جو کچھ ہو مگر!
آج کشمیر کہتا ہے کہ بیدار ہوں میں

ترکِ ذوقِ مے و معشوق مبارک اے فوقؔ
آج کل اپنے تصوّر ہی میں سرشار ہوں میں

---o---

تر پسینہ سے نہیں سینہ و حلقوم و جبیں
عرقِ شرمِ گنہ نے کیا غرقاب مجھے

آ بھی اے مرگِ مفاجات کسی بھیس میں آ
اب بھلا تیری جُدائی کی کہاں تاب مجھے

میں بھی تو خون کی دھاروں سے پلا ہوں آخر
کیا ڈراتا ہے تو اے دیدۂ خوں ناب مجھے

بارہا دیکھ چکا پھر بھی تمنا ہے یہی

ایک بار اور دکھا دے کوئی لولاب مجھے

۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات کو مرنے سے قبل عالم خواب میں یہ دو شعر کہے اور پھر نہ بولے۔

رنج دے راحت دے یا تکلیف یا آرام دے

جو خوشی تیری مجھے تیری خوشی سے کام ہے

ستر و توکر اسے پاکر قبولیت عطا

تیرے بندوں کو تو تیری بندگی سے کام ہے

فوق صاحب کے کلام کا ایک چھوٹا سا مجموعہ پہلے پہل ستمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس مجموعہ کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں ۱۸۹۵ء سے نومبر ۱۹۰۱ء تک کا کلام درج تھا۔ اس میں غزلیں زیادہ اور نظمیں کم تھیں۔ اس میں غزلوں کے علاوہ جدید طرز کی نظمیں بھی تھیں۔ جولائی ۱۹۳۳ء میں پروفیسر علم الدین صاحب سالک ایم۔ اے کے پُرزور دیباچہ کے کلام کے ساتھ کلامِ فوق کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں اپریل ۱۹۳۳ء تک کا تمام کلام شامل تھا۔ اپریل ۱۹۳۳ء سے آخر دسمبر ۱۹۴۰ء تک کا کلام "نغمہ و گلزار" (۱۳۵۹ھ) کے تاریخی نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ کلام فوق کے محاسن کے متعلق لسان العصر حضرت اکبرآبادی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں لکھا ہے:۔

"کلام فوق بلاشبہ قابل دید ہے۔ جب خیالات اچھے ہیں۔ تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے۔ اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی اور ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر توجی چاہتا ہے کہ داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچر کی کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کی شانِ نزول نے تو آپ کی جدت آفرینی کا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔

میر نثار علی صاحب شہرت دہلوی لکھتے ہیں:۔

جو چیز ہو اچھی وہ پسند آتی ہے سب کو
ہر اک کی زبان پر ہے برابر سخنِ فوق
ہر شعر ہے آئینہ کی مانند مُصفا
بے شک ہے نصیبہ کا سکندر سخنِ فوق

منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی مرحوم تلمیذ حضرت نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی نے کلام فوق کا قطعہ

تاریخ لکھتے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے :-

جناب فوقؔ نے چھپوا دیا کلام اپنا ! — عروج پر ہوئی اب شان و شوکت اُردو
نیا نہیں ہے یہ پبلک میں کارنامہ فوقؔ — اُنہوں نے کی ہے لڑکپن سے خدمت اُردو
ہر اِک زمین میں دوڑا ہے فکر کا توسن — ہر ایک رنگ میں طے کی مسافت اُردو
ہر اِک مذاق کے انسان کا خیال رہا — جناب فوقؔ نے کی خوب دعوت اُردو
لکھا ہے میں نے وجاہت یہ مصرعہ تاریخ — کلام فوقؔ سے ہے آج رفعتِ اُردو

علامہ اقبال مرحوم نے "کمال نظر فوق" سے اِسکی تاریخ ۱۳۲۷ھ جو نکالی تھی۔ اور فرمایا تھا :-

شستہ ہے زبان جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نظرِ فوقؔ

تاریخ و سیاست جن کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوتی۔ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ قوم سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں :-

یہاں کیا قابلیت کا تری سکہ ہو کابل تک — مگر اس کے لئے تو کوئی نند رام پیدا کر
نظر آئے تجھے عکسِ رُخ بیدارئ کشمیر — مگر جو رشک جام جم ہو تو وہ جام پیدا کر
سیاست کا تیری چرچا ہو پھر سارے زمانے میں — کوئی مہدی علی خان یا کوئی جے رام پیدا کر
تو پھر علم و ادب کھویا ہوا واپس کہیں سے لا — تجھے جس نام سے شہرت تھی تو وہ نام پیدا کر

پنڈت نند رام ٹکو زمان شاہ والئے کابل کے مقربان خاص میں تھا۔ اس کے متعلق تاریخوں میں مشہور ہے کہ "سکہ زد در مُلکِ افغان نند رام"۔ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان کاشمیری نواب آصف الدولہ بہادر بادشاہ اودھ کے وزیر تھے۔ لکھنؤ کا مشہور گھرانہ "خاندان خواجگان شیش محل" انہی کی اولاد سے ہے۔ پنڈت جے رام بھان کاشمیری محمد شاہ رنگیلا بادشاہ ہندوستان کا معتمد خاص تھا اور سیاست میں یکتا تھا۔ درد اور صعوبت میں کہے گئے اشعار میں رہ رہ کے کشمیر خیال آتا ہے۔ واقعی "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ فوقؔ صاحب کشمیری تھے۔ کشمیر کے لئے پیدا ہوئے۔ کشمیر کے لئے جیئے اور کشمیر کے لئے اور اسکی محبت میں مرے۔ رہ رہ کے ہر شعر میں خواہ کسی بھی موضوع پر ہو کشمیر کی یاد زندہ ہوتی ہے۔

ٹیلیفون اپنی لگا لی جائے گی — داستان غم سنائی جائے گی
ڈاکٹر صاحب ! جگر میں درد ہے — یہ تو کہیئے فیس کیا لی جائے گی
ان کے کوچہ میں اگر جانا پڑا — زندگی بیمہ کرائی جائے گی

قحط جائیگا تو جائے گی وباء ساتھ سالے ہی کے سالی جائے گی

ضعف معدہ کی شکائت ہے مجھے ایک گالی خیر کھالی جائے گی

میرے گھر بھی آئیگا دانہ کوئی یا نچوڑے ہی ہیں شالی جائے گی

فوقؔ کو کشمیر میں جانے تو دو اسکی توجہ آزمالی جائے گی

آپ نے فلسفیانہ پیچیدگیوں اور پُر کیف بندشوں میں اُلجھے بغیر سیدھے سادھے الفاظ میں کشمیر کا راگ الاپا اور پُر سوز نغموں سے کشمیری قوم کے تن مردہ میں زندگی کا خون دوڑایا ہے۔ فوقؔ صاحب کے پیغامات نے نوخیز افراد خطہ کے قلوب میں حب الوطنی اور عالی حوصلگی کے جذبات کو موجزن کیا۔ خود فرماتے ہیں۔ ؎

خطۂ کشمیر پہلے اور تھا اور اب اور ہے

چھاپے خانے بھی ہیں اب ملک میں اخبار بھی ہیں

تب تھا خاموش وطن اب لب اظہار بھی ہے

ان میں بیدار بھی ہشیار بھی احرار بھی ہیں۔

گولیوں سے ہے جنہیں خوف نہ تلواروں سے

ہول اب جن کو نہیں تیروں کی بوچھاڑوں سے

کشمیریوں کی قدامت پرستی مسلم تھی۔ وہ پرانی لکیر کی فقیری کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے قدیم رسم ورواج کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا کفر سے کم نہ تھی۔ مگر فوقؔ صاحب نے یہ محسوس کر کے ایسا کہا۔

شامت اعمال کے پردے میں آئی کانگڑی

... ...

کہہ رہا ہے ان کا بوسیدہ پھرن — میں تن مردہ کا ہوں کہنہ کفن

تیغ جوہر دار برسوں تک رہی قومی نشان

کانگڑی ہے یا پھرن بس اب نشان کشمیر

اے انقلابِ عالم گردش ادھر بھی کوئی

کہنہ لباس تونے ہر قوم کا اُتارا

یہ نقشہ سامنے رکھ کر فوقؔ صاحب نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا ؎

اللہ دے سمجھ تو پھرن کو اُتار دو

گھٹنوں کے بل جوانوں کو جس نے بٹھا دیا

اس آواز معجز نما نے اثر کیا۔ پتھر میں گداز پیدا ہوا۔ نوجوانوں نے آپ کے جذبات کی گرمی کو محسوس کیا۔ اب پھرن کا استعمال دم توڑ رہا ہے اور وہ سستی دور ہوتی جاتی ہے۔ جس کا گلہ اس مایہ ناز قومی شاعر کو تھا۔

کشمیر کی محبت فوقؔ صاحب کی زبان سے کیا کیا نہیں کہلواتی ہے۔ کشمیر میں قیامِ یونیورسٹی کی چاہت اور آرزو علامہ اقبالؔ مرحوم نے اپنی چٹھی ۱۲ ارمارچ ۲۲ء بنام مہجور کشمیریوں کی تھی۔

"اور اگر کبھی کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کا نصاب بھی اس کا کورس ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے" یہ ایک پیشین گوئی تھی جو پوری ہوئی۔ جناب فوقؔ صاحب کے یہ اشعار جن میں قیام یونیورسٹی کی جانب دلی خواہش کا عاشقانہ ولولہ موجود ہے۔ اس پیش گوئی کو حقیقی لبادہ پہنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، فرماتے ہیں ؎

چمن کا پتہ پتہ دے رہا ہے یہ پتہ مجھ کو ۔۔۔ کہ بن بن کر برسنے کو ہے اب کے رحمتِ باری

میرا کشمیر بھی ہندوستان بھر میں غنیمت ہے ۔۔۔ جہاں علم و ہنر کے دیر تک چشمے رہے جاری

بہت نازاں ہیں میسور و دکن یونیورسٹی پر ۔۔۔ الٰہی آئے گی کشمیر کی بھی کیا کبھی باری

مگر کشمیر کی یونیورسٹی ہو تو ایسی ہو ۔۔۔ کہ جس کے دم قدم سے قومیت کی لہر ہو جاری

زبان میں سادگی اور سلاست۔ محاورات میں درستی و صحت۔ بیان میں روانی و ندرت۔ خیالات میں شستگی و متانت اور ادائے مطالب میں بے ساختہ پن فوقؔ صاحب کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ مولانا ظفر الملک علوی مدیر الناظر لکھنؤ پنجاب میں اردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

" اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین صاحب فوقؔ اور میر غلام بھیک صاحب نیرنگؔ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی ایسا نہ تھا جن کا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشاء صحیح اردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ "

سچ ہے ؎

اِن کی نظمیں نسخۂ اکسیر ہیں

وہ حقیقی شاعر کشمیر ہیں

فوقؔ صاحب شاعر بھی تھے اور مورخ بھی۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے۔ جناب فوقؔ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ؂

"جناب فوقؔ بقول ترجمان حقیقت لسان الاسرار حضرت علامہ سر اقبال اہل کشمیر کی دیرینہ قومی و ملکی خدمات کے لحاظ سے "مجدد کشامرہ" ہیں۔ بلکہ حال ہی میں مولانا عبدالسلام رفیقی کوپنگ ٹیمورر (جزائر شرق الہند) نے آپ کو محسن کشامرہ کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ آپ کی علمی اور ادبی سرگرمیاں قابل صد رشک اور باعث صد مباہات ہیں۔ آپ کی زندگی ایک سرگرم عمل زندگی ہے جو انتہائی خاموشی کے باوجود اپنے اندر ایک طوفان حیات پنہاں رکھتی ہے۔ یہ زندگی آجکل کے نوجوانوں کے لئے بہترین رہنما کا کام دے سکتی ہے۔

"حضرت فوقؔ ایک مقصد کو لیکر نکلے تھے۔ اور آج نہایت تیقن سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے مقصد دحید میں کامیاب اور فائز المرام نظر آرہے ہیں۔ آپ نے سن شعور سے تاریخ کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ اور اسلاف کے زریں کارنامے آپ کی بدولت قعر گمنامی سے نکل کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔

دھرم چند پرشانت

انسان اور قدرت

مُصوّر کی بنائی ہوئی تصویر کی خوبصورتی اور اُس میں بھرے ہوئے جذبات کو دیکھ کر راجہ حیرت میں ڈوب گیا۔ اُس نے گلیر قلم کے کتنے ہی مُصوّری کے نادر نمونے دیکھے تھے۔ لیکن اس تصویر نے اُسے کافی حیرانی میں ڈال دیا تھا۔ تصویر کے رنگ کافی چمک رہے تھے اور اُس پر اُتارا گیا ہر ایک نقش اپنے منہ بول رہا تھا۔

ایک خوبصورت جنگل ہے پیچھے پہاڑ اور جنگلی پھولوں کی بھرمار۔ زمین ہری ہری گھاس سے سرسبز۔ ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے ہرن کھڑا اپنی پرچھائی دیکھ رہا ہے۔ اُسے اپنی پرچھائیں ایک اور ہرن دکھائی پڑ رہا ہے اور وہ اُس پر کُود پڑنے کی تیاری میں ہے۔ پانی میں پرچھائیں اصل ہرن سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔

مُصوّر روچین آج صبح بسوہلی کے راجہ امرت پال کے دربار میں اپنے والد کے ہمراہ حاضر ہوا تھا۔ اُس کے بوڑھے والد نے راجہ سے روچین کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "مہاراج میرا لڑکا گلیر میں رہ کر وہاں کے سب سے بڑے مُصوّر مانک سے مُصوّری کی تعلیم پاکر آیا ہے۔ اِس کے فن پر سبھی عاشق ہیں۔ اگر آپ اسے اپنا درباری مُصوّر بنا کر رکھ لیں، تو ہم دونوں کی زندگی کا مقصد پُورا ہو جائے گا۔"

امرت پال نے دیکھا کہ مُصوّر اچھا نوجوان ہے اور ساتھ ہی خوبرو ہے۔ اس کی وجہ سے دربار کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ راجہ نے بوڑھے سے کہا۔ "آج سے یہ ہمارا درباری مُصوّر ہوا۔ اِس کے بنائے ہوئے اِس نادر فن کے نمونہ کو دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے ہیں"۔

دوسرے ہی لمحہ راجہ نے مُصوّر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہمارے دربار میں تمہیں پہلی تصویر ایک باغیچے میں پانی میں نہاتی اور کھیلتی ہوئی عورتوں کا بنانا ہوگا۔ چلتے ہوئے پھوّاروں کے پیچھے رقص کرتی ہوئی ننگی عورتوں کے جسموں کا ہر ایک عضو صاف صاف دِکھائی پڑے۔

راجہ کا حکم سن کر مُصوّر چپ ہو گیا۔ اُس نے سوچا کر راجہ دولت اور حکومت کے بل بوتے میرے فن کو نیلام کرنا چاہتا

ہے۔ وہ کہہ اٹھا" مہاراج میں نے قدرت سے پیار کیا ہے۔ قدرت کا شاہدہ کیا ہے۔ انسان سے ہمیشہ دور بھاگتا رہا ہوں۔ نہ جانے مجھے انسان سے اتنی نفرت کیوں ہے"۔

مصور کا جواب سن کر امرت پال کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ غصہ میں بھر کر بھی اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ شاید مصور کی خوبصورتی پر اسے رحم آگیا ہو۔ لیکن اس نے کہہ ہی دیا کہ اسے انسانیت بھی قدرت ہی کی طرح عزیز ہے۔ قدرت اور انسان ایک ہیں الگ نہیں۔ اسے راجہ کا حکم بجالانا ہی ہوگا۔

اسی دن لوچن کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ اس کے باپ نے گھر آکر اسے کافی کوسا کہ اس نے راجہ کے حکم کو نہ مان کر بڑی سمنت غلطی کی ہے۔ اپنی زندگی کے ساتھ مذاق کیا ہے۔

مصور اپنے اصول پر ڈٹا رہا وہ چل پڑا اس جگہ کی تلاش میں جہاں آٹھوں پہر قدرت اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ جو اس زمین کی جنت ہے وہ بنی کے جنگل میں پہونچا۔ وہ اپنے ساتھ قلم اور رنگوں کی پیالیاں لئے تھا۔ مصور نے دیکھا بنی سچ مچ ہی جنت ہے۔ جنت کے باغوں سے بھی زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ان پر برف کی سنگ مرمر کی طرح سلیں پڑی ہیں۔ سارا جنگل ہری ہری گھاس سے ڈھکا ہے۔ چاروں طرف کئی رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پتے پتے پر بہار رقص کر رہی ہے۔ آس پاس دیودار کے درخت ہیں جن پر طرح طرح کے پرندے میٹھی میٹھی بولیاں بول کر جنگل میں منگل کر رہے ہیں۔ مصور نے دیکھا سامنے نالے کے پار اور بھی زیادہ خوبصورت جنگل ہے۔ جیسے جنت کا ایک ٹکڑا زمین پر اتر پڑا ہو۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا رہا لوچن ہاتھ میں قلم لیکر اور ادھر ادھر رنگوں کی پیالیاں بکھیر کر بیٹھ گیا۔ ایک کاغذ پر وہ سامنے والا نظارہ اتارنے لگا۔ ایک سفید چٹان ہے۔ اور اس پر نہایت خوبصورت بھیڑ کا میمنا اچھل کود کر رہا ہے۔ وہ اس کی اس اچھل کود کو ابھی دماغ میں بٹھا ہی رہا۔ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ قدرت اور انسان کا آپس میں کیا رشتہ؟ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ وہاں سے چلی جائے۔ مگر وہ اس بھیڑ کے بچے کے ساتھ کھیلتی رہی۔

دوسرے دن وہ پھر اپنا سامان لیکر وہاں جا پہونچا پچھلی رات اس نے گدیوں کے گھر بتائی تھی۔ آج بھی وہاں وہی بہار تھی مستی تھی۔ اس نے برش سنبھالا اور سامنے والے جنگل کا منظر کینوس پر اتارنے لگا۔ آج بھی وہی کل والا بھیڑ کا بچہ چٹان پر کھیل رہا تھا۔ کل کی طرح ہی چھلانگیں مار رہا تھا۔ آج وہ بہت ہی بشاش تھا اور اس نے موڈ میں تصویر اتارنا شروع کر دی، مگر وہ الہڑ حسینہ پھر آ ٹپکی اور بھیڑ کے بچے کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ لوچن کو غصہ آگیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے زبردستی وہاں سے نکال دے۔ وہ سامنے کی جانب بھاگ پڑا۔ آگے نالہ

تھا، جس کا پانی چھل چھل کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ پانی کی دھار اتنی تیز تھی کہ اُسے پار کرنا مشکل تھا۔ اُس نے سُنا کہ وہ الہڑ لڑکی اب گا رہی تھی۔ اُس کی لے میں مٹھاس تھی اور دل میں ایک ہلچل سی مچا رہی تھی۔ وہ نالہ کے کنارے کھڑا ہو کر اُس کے گیت کو سُننے لگا۔ اُس کے دل نے کہا۔ "تم اس لڑکی کو یہاں سے ہٹانے والے کون ہوتے ہو؟ یہ بھی تمہاری ہی طرح ایک فن کار ہے۔ قدرت سے یہ بھی پیار کرتی ہو تو...... ؟

مصور لوٹ کر واپس اپنی جگہ پر آگیا اور سوچنے لگا۔ آج بھی وہ تصویر نہیں بنا سکا اور واپس اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔ تیسرے دن جب وہ پھر تصویر بنانے بیٹھا تو وہ لڑکی پھر وہاں آپہونچی۔ آج مصور کے چہرے پر کوئی شکن نہیں کوئی غصّہ نہیں تھا۔ اُس نے برش اُٹھایا اور تصویر بنانا شروع کر دی۔ وہ بار بار اُٹھ کر نالے کے کنارے تک جاتا اور اُس لڑکی کے چہرے کے نقوش غور سے دیکھ کر واپس آجاتا۔ آج بھی اُس لڑکی کے گانے کی دلفریب اُس کو تنہائی دے رہی تھی۔

کئی دِنوں تک وہ تصویر بناتا رہا۔ بہت محنت کرنی پڑی تھی لوچن کو تصویر بنانے کے لئے۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار کسی انسان کی تصویر بنائی تھی اور جس خوبی سے مصوّر نے اُس لڑکی کو کاغذ پر اُتارا تھا اگر کوئی دوسرا اُس تصویر کو دیکھتا تو عش عش کر اُٹھتا۔ اُس نے رنگوں میں چمک دِکھائی، پہاڑ، جنگل، پھول اور بھونرے، تتلیاں سبھی کچھ چمکنے لگا تھا۔ اور اُس سب کے درمیان وہ لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے لوچن نے اپنے دل سے کہا۔ "آج تک تو میں غفلت میں رہا۔ انسانیت تو قدرت سے واقعی خوبصورت ہے"۔

تصویر تیار تھی۔ مصور نے سوچا اگر یہ تصویر اُسے دِکھائی جائے تو کیا رہے۔؟ مگر پہاڑی نالہ اُن دونوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ دوسرے روز مصوّر نے درختوں کی نرم و نازک ٹہنیوں کو توڑ کر اُن سے ایک رسہ بنانا شروع کیا اور تین چار دن کے بعد ایک بڑا موٹا اور لمبا رسہ بن گیا۔ نالے کے اِس کنارے کھڑے ایک مضبوط درخت سے اُس رسّے کو باندھا۔ اور ایک پلورا لیکر وہ پار پہونچ گیا۔

آہستہ آہستہ وہ اُس لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس کا دِل دھڑک رہا تھا۔ اُس کے قدم آگے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ جب وہ اُس کے بالکل قریب پہونچا تو وہ حیرانی سے ٹھٹھک گیا۔ آہا۔ سچ مچ جوانی کا نشہ تھا، زندگی کی مستی تھی وہ — وہ الہڑ لڑکی اپنے ہی خوابوں میں ڈوبی گا رہی تھی۔ کتنا جادو تھا اُس کے سنگیت میں کتنی مٹھاس تھی اُس کے گلے میں —

اچانک پاؤں کی آہٹ سن کر وہ لڑکی کانپ اُٹھی۔ گھبرا گئی۔ اُس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" اجنبی جان پڑتے

ہو؟" منصور خاموش رہا۔

اس نے پھر پوچھا" بولتے کیوں نہیں۔ میرے پاس آؤ۔ تم اس پار سے آئے ہو نا؟"

منصور پھر بھی خاموش رہا۔

اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب دو تم کون ہو؟ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی ہوں۔ میں اندھی ہوں!"

'اندھی!' اس جملہ کو سن کر منصور کانپ اٹھا۔ جس کو خوش کرنے کے لئے اتنے دن گذارے۔ اتنی محنت کی۔ وہ اندھی ہے"!

منصور خاموش کھڑا تھا۔ اس نے اپنے تخیل میں جو بلند محل تیار کیا تھا۔ وہ گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور ادھر ادھر سہارے کے لئے ہاتھ مارتی ہوئی منصور کے نزدیک آگئی۔

"تم اس پار سے آئے ہو نا؟ بولو" اس نے منصور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہاں کے سوا کچھ بھی نہیں بول سکا۔ لڑکی منصور کو کھینچ کر اسی چٹان کے اوپر لے گئی اور کہنے لگی۔ "ماں کا کہا ٹھیک ہی نکلا آخر۔ تم آ ہی گئے ہو۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ تم ضرور آ ؤ گے۔

لوچن کے لئے یہ ایک معمہ بن گیا۔ کیا مجھے یہ جانتی ہے؟ منصور نے اپنے دل سے پوچھا۔ اس نے کہا۔" کیا تم مجھے جانتی ہو؟

منصور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ بولی۔ اس دن ماں جو تمہیں لے آئی تھی میرے پاس۔

"یہ ماں کون ہے"؟ منصور نے دریافت کیا۔

او! ماں، تم نہیں جانتے!" لڑکی نے حیرانگی سے پوچھا۔

وہی تو ان پہاڑوں کی ماں ہے، وہی جگہ مبا مائی ہے"۔ جو ہم سب کی محافظ ہے"!

لوچن سمجھ گیا کہ یہ مانتا سر تھل کی بات کہہ رہی ہے۔

اس نے کہا۔ مگر میں تو تمہیں پہلے کبھی نہیں ملا۔ پھر ماں کب تمہیں میرے پاس لے آئی تھی؟"

خواب میں لے آئی تھی۔ یہ بات کہتے کہتے اندھی ہنس دی۔

وہ کہتی رہی۔ ماں کبھی غلط نہیں کہتی۔ جب بھی وہ خواب میں کوئی بات کہتی ہے تو وہ ہمیشہ سچ نکلتی ہے۔

'کیا کہا تھا ماں نے؟"

خوشی سے جھوم کر اندھی نے جواب دیا۔ ماں نے کہا تھا۔ اس پار سے ایک دن کوئی تمہیں لینے آئے گا۔ وہ تمہیں

بسوہلی کے راجہ امرت پال کے پاس لے جائے گا۔ راجہ کے پاس اندھوں کو ٹھیک کرنے والا میرا ہے۔ اُس سے میری آنکھیں ٹھیک ہوں گی۔ مجھے سب کچھ نظر آنے لگے گا۔ میری آنکھوں کا نور لوٹ آئے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

اندھی مصور کو اپنے گھر لے گئی۔ دیودار کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں اُن کا گھر تھا۔ بڈھیا بہت خوش ہوئی اُس نے کہا۔ "بیٹا تمہیں ماں نے ہی ہمارے پاس بھیجا ہے۔ اسے راجہ کے پاس لے جاؤ۔ وہ اسے اس کی آنکھوں کا کھویا ہوا نور لوٹائے گا۔

مصّور نے سوچا۔ اس اندھی کے لئے مجھے راجہ امرت پال کے پاس جانا پڑے گا۔ لیکن انسان کی تصویر بنانا تو مجھے اسی اندھی نے سکھایا ہے۔ مجھے اس کے لئے جانا ہی پڑے گا۔

لوچن اُس اندھی کو اُسی طرح چھپالی کے بنے رسّے کے سہارے پار لے گیا۔ انسانیت سے نفرت کرنے والا آج انسان کو راج دربار میں لے جا رہا تھا۔ جہاں وہ ایک لمحہ بھی ٹک نہیں سکتا تھا۔

(ڈوگری سے ترجمہ)

کشمیری شاعروں کا انتخاب

اکادمی کی جانب سے کشمیری زبان کے مشہور شاعروں کو اُردو دُنیا سے متعارف کرانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان کتابچوں میں شاعر کی زندگی، اُس کے کلام پر تبصرہ، کلام کا مختصر انتخاب اور اُس کا اُردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اب تک اس سلسلے میں للّ دید، حبّہ خاتون، پرمانند، مقبول شاہ کرالہ واری، رسول میر، شمس فقیر، عزیز اللہ حقانی، وہاب پرے، عبدالاحد نادم، آزاد اور مہجور کے بارے میں کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیلات اکادمی کے پتے سے دریافت کی جا سکتی ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

کاروانِ کیف و مستی

(اکادمی کے گرما کے پروگرام کا ایک جائزہ)

گرما کے مہینوں میں اس سال وادی میں اکادمی کے پروگرام ایک خاص ترتیب کے تحت پیش کئے گئے اور اس بات کی شعوری طور کوشش کی گئی کہ پروگرام کا پھیلاؤ سارے سیزن پر ہو۔ تاکہ اُس قسم کی ناگوار صورت حال پیدا نہ ہوجائے جب بے ہنگم طور پر پروگراموں کی ہڑبونگ رہتی ہے اور اس کثرت سے سامعین کا ظرفِ تماشا بھی لبریز ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سال اکادمی نے اپنے پروگراموں کو زیادہ ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی اور انہیں شہر کی تنگیوں سے باہر لاکر دیہات کی کھلی فضاؤں میں متعارف کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ اکادمی نے خاص اہتمام سے صرف معیاری پروگراموں پر ہی توجہ مبذول رکھی جن کا مقصد فقط وقتی تفریح ہی نہ ہو۔ بلکہ جو مختلف فنون میں بہتر قدروں کی ترویج اور اُن کی رفتار میں سُرعت پیدا کرنے کا باعث بنیں۔ آج جب موسم کے اختتام پر ان تمام پروگراموں پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالی جاتی ہے تو اطمینان ہوتا ہے کہ نہ صرف سامعین کے ذوق کو آسودگی بخشنے کے سامان کئے گئے بلکہ واقعی اس طرح سے بہتر اور مہذّب روایات کو پروان چڑھانے میں بھی مدد ملی۔

ان پروگراموں کی ڈائری پیش کرنا صرف واقعات کی کھتونی ہوگی۔ اس وقت میرے ذہن میں بعض خاص پروگراموں کا عکس ایک کیف کی طرح چھایا ہوا ہے۔ لہٰذا گوشہ وار ترتیب کی بجائے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک رواں دواں تبصرہ کیا جائے۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ان کی جو جھلکیاں محفوظ رہ گئی ہیں اُنہیں روزنامچے کے صفحات کی خانہ پُری کی بجائے اُن نقشِ پا کے خاکوں میں روشنائی ڈالی جائے جو اس کاروانِ کیف و مستی نے اپنے خرام کی یادگار چھوڑے ہیں۔

یہ بات شک و شُبہ سے بالاتر ہے کہ اس سلسلے کی سب سے کیف آور چیز اندرانی رحمان کا رقص تھا۔ اندرانی مُلک کی چوٹی کی رقاصہ کے طور اپنا لوہا کب کا منوا چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہماری

قدیم سنسکرتی کی حسین و جمیل سفیرہ بن کر یورپ اور امریکہ گئی اور وہاں اپنے فن کی داد حاصل کی۔ اُس کے کومل جسم کے ساتھ جب ناچ کی رعنائیاں شامل ہوگئیں تو مغربی ممالک عش عش کر اُٹھے۔ اُنھوں نے اُس کے وجود میں ہماری پراچین کلا کے سب سے موہنے رُوپ کا نظارہ کیا۔ سرینگر جیسے دُور اُفتادہ شہر میں شائقین تک یہ شہرت پہنچ گئی تھی۔ لیکن ہمارے یہاں اس قسم کی لطیف ثقافتی سرگرمیوں کا جو کال ہے اُس کی وجہ سے ہم صرف امریکی رسالوں میں اندرانی کے سحرکار رقص کے رنگین اور بولتے ہوئے پوز دیکھ کر ہی نظروں کو بہلاتے تھے۔ جب اکادمی نے اندرانی رحمان کے رقص کا اعلان کیا تو سرینگر کے شائقین میں حیرت آمیز مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹیگور ہال کی تمام نشستوں کی ٹکٹیں پیشگی بک گئیں۔ پہلے دن جب ٹیگور ہال کے سٹیج پر اندرانی کے رُوپ میں نُور کا ایک صاعقہ لپکا تو مجھے بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ؂

اِک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
بولی کہ مجھے رُخصتِ تنویر عطا ہو

اندرانی کو رخصتِ تنویر ہی نہیں بلکہ اذنِ تسخیر عطا کیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اگلی نشستوں پر اکادمی کے سرپرست ڈاکٹر کرن سنگھ اور مہارانی صاحبہ بھی یہ مظاہرہ دیکھنے کے لئے تشریف رکھتے تھے۔

اندرانی کے رقص میں تیز رفتاری نہیں ہے بلکہ ایک لطیف دھیما پن۔ اُس کا جسم اُس کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ بعض حلقوں کا دعویٰ ہے کہ اچھا فن ٹیک لینے کی لاٹھی کا محتاج نہیں ہے اور صرف اپنے جادُو کے بل پر ہی اپنا زور منواتا ہے۔ میں اس بات کو نصف حقیقت ہی مانتا ہوں۔ اچھے خیالات کو جب اچھا اسلوب میسّر ہوتا ہے تو اچھی شاعری وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح جب سحر انگیز آواز اور جادُو اثر ساز ملتے ہیں تو دل نواز نغمہ جنم لیتا ہے۔ لیکن فنِ رقص میں تو یہ بات قاعدۂ کلیہ بن جاتی ہے۔ پیکرِ زیبا کے بغیر بڑے سے بڑا رقاص بھی بے ہنگم معلوم ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ کم خوبصورتی کو عظیم رقص کی قبائے جمال بڑی کامیابی سے چھپا سکتی ہے۔ لیکن جب نغمہ اور ساز دونوں کمال کے نقطۂ عروج پر ہم آہنگ ہو جائیں تو پھر "شاہکار" کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ اندرانی کا رقص فن اور پیکر طرازی کے اسی امتزاج کا "گُلِ نغمہ" ہے سٹیج پر وہ بڑی آہستگی سے داخل ہوتی ہے۔ رقص کی حرکات میں طوفانی لہروں کا سا طلاطم نہیں آجاتا۔ بلکہ مینائے مے کے اُتار چڑھاؤ کی طرح ہلکا ہلکا اُبھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس کے رقص سے کچھ ایسی ہی

کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جیسے میر کے اشعار پڑھ کر۔ جو سادگی، دھیما پن، تہذیب، پُرکاری، تُرشی ہوئی خوبصورتی اور دلآویز تاثیر میر کے اشعار کا خاصہ ہے، وہی باتیں اندرانی رحمان کے رقص کی خصوصیات بھی ہیں۔ اس کے فن کا خمار پا لینے کے لئے رقص کی مجنونانہ حرکت سے لُطف اندوزی کے بدلے ہلکے ہلکے اشارات کی بے انتہا معنویت، نازک اداؤں کے ذریعے ظاہر کی جانے والی شائستہ نفاست اور باسلیقہ ضبط کے پیمانے میں لرزنے والے ملائم ارتعاشات کو سمجھ لینے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ اُس نے ایک کشمیری تھیم "بومبر یمبرزل" (نرگس اور بھونرا) کو بڑے کم وقفے میں تیار کرکے سٹیج پر پیش کیا۔ اس فن پارے کے مشاہدے کے وقت اُس کی فنّی عظمت کی قوسِ قزح پُوری شان کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس دِل نشین اشاریاتی رقص کو خالص کشمیری لوک دُھنوں پر اُس نے جس انجذاب سے پیش کیا، اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے کس طرح اس موضوع کو اپنی رُوح میں اُتار لیا ہے۔ وہ بھونرے اور نرگس کے اضطراب و انتظار کی مجسم کیفیت معلوم ہو رہی تھی۔

سرینگر کے شائقین کے لئے یہ بات لابدی تھی کہ وہ اندرانی کے مظاہرۂ فن کو دیکھنے کے بعد یامنی کرشنا مورتی کو یاد کرلیں اور ان دو ساحراؤں کا مقابلہ کریں۔ یامنی بھی دو سال قبل ٹیگور ہال کے اسی اُفق پر بجلی بن کر چمکی تھی اور اُس کے خیرہ کُن رقص سے اب تک ہماری آنکھیں چندھیا رہی ہیں۔ یہ دونوں رقاصائیں جسم، رنگت، خدوخال، عمر اور رقص کی کیفیت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فن کا شعلہ دونوں کے یہاں پُوری آب و تاب سے روشن ہے اور ان دونوں کو دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فن کی دیوی کا جادو کتنا متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ یامنی کڑی کمان کا تیر، ایک چڑھتی ہوئی لہر اور ایک شعلۂ تُند خو ہے۔ اُس کا وار بے پناہ اور اُس کی تسخیر طوفانی ہے۔ لیکن اندرانی شبنم کی پھوار، ایک جُوئے عنبر بیز اور چاندنی کا ایک آبشار ہے۔ اُس کی فتح بڑی غیر محسوس، لیکن بے انتہا بھرپُور ہوتی ہے۔ یامنی ایک مسکتا ہوا غنچہ اور ایک چٹکتی ہوئی کلی ہے۔ شباب کی چڑھتی ہوئی منزل میں اندرانی ایک کھلا ہوا گلاب ایک بھرپُور پھُول ہے۔ جوانی کے غروب ہوتے ہوئے سُورج کی آخری کرنوں کے شفق میں نہاتی ہوئی۔ یامنی کی رنگت کُندن کی طرح سانولی ہے۔ اندرانی چاندی کے پھوارے کی مانند شفاف ہے۔ یامنی کے چہرے پر جسمانیت کی اشتہا آمیز شوخی اور البیلا پن ہے۔ اندرانی کا چہرہ اسرار و رموز کے کیف سے باخبری کی ایک شانِ بے نیازی لئے ہوئے ہے جو جسم کے بندھنوں سے دامن چھڑا کر اب رُوح کی وُسعتوں کی طرف مائلِ پرواز ہے۔ یامنی شکنتلا کے الھڑ پنے کا تازہ رُوپ معلوم ہوتی ہے۔ کسی قدیم مندر

کی دیوداسی کا عکس۔ لیکن اندرانی قدیم ہند کے کسی مندر میں پتھر کے سانچے میں ڈھلی کسی دیوی کی مورت جیسی نظر آتی ہے۔ یامنی جب اپنے رنگین ترین کاسیوٹم زیب تن کرتی ہے تو غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے؎

چو غنچہ جوشِ صفائے تنش زِ بالیدن
دریدہ برتنِ نازک قبائے تنگش را

لیکن اندرانی زیادہ شوخ کاسیوٹم کا سہارا نہیں لیتی اور زیادہ تر سفید پوشاک پہنتی ہے۔ یامنی کا رقص بے انتہا تیز رفتار اور اُس کی حرکات صاعقہ بردوش ہوتی ہیں۔ وہ ایک تھرکتی ہوئی بجلی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا چڑھتا ہوا شباب اُس کے پاؤں میں حرکت، تموج اور طوفان کے پازیب باندھتا ہے۔ اور اُس کے رقص کا مجموعی تاثر جسمانیت کے چٹخارے سے ملوث ہو جاتا ہے۔ اندرانی کی ڈھلتی ہوئی عمر نے اُسے ضبط، ٹھہراؤ اور تمکین کی ضیا بخشی ہے۔ اُس کے رقص کا حتمی تاثر جسمانیت سے بلند ہو کر روحانیت کی وادیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں گلاب کے رنگ کی خوبصورتی بھی اُس کی خوشبو کے روپ میں ہی ذہن کے دریچے کھولتی ہے۔

اکادمی کے پروگرام کی سب سے اونچی صف میں بمبئی کے اُستاد امیر خان کا گائن بھی شامل ہے۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے اس بے نظیر اُستاد نے ٹیگور ہال میں اپنی نورانی آواز سے کیف کا سماں باندھ دیا۔ گھنٹوں بلکہ پہروں سامعین کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے تھے۔ اُنھوں نے "ترانے" میں اپنے کمال کا خاص طور سے مظاہرہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے رُوح کی اندرونی بستیوں میں زیر و بم پیدا کر کے حُسن کے خواب زار کی تعمیر کر دی ہے۔ جس وقت تین گھنٹوں کے بعد اُن کے گائن کے اختتام پذیر ہونے کا اعلان کیا گیا تو جیسے سب لوگ ایک خواب سے چونک پڑے۔

سچن شنکر اور اُن کے بیلے ٹروپ نے بھی سرینگر کے سامعین سے کافی داد وصول کی۔ اُنھوں نے جس طرح سے موسیقی اور رقص کے امتزاج سے ہماری دیومالا کی کئی کہانیوں (خاص طور چھایا کی کہانی) پیش کی، اُس پر ایک ایسے آدمی کی چھاپ تھی جو بس اب کمال کے ایوان میں داخلے کا انتظار کر رہا ہو۔ اُن کے بھائی اودے شنکر ہمارے بیلے کے سب سے ممتاز فن کار ہیں اور سچن شنکر اپنے شہرۂ آفاق بھائی کے نقشِ قدم پر چل کر اُن کی روایات کا پرچم اونچا رکھے ہوئے ہیں۔

اکادمی کی طرف سے اس سال ڈراموں کا جو انعامی مقابلہ ہوا، اُس میں "آرام حرام ہے" اور "کنجوس" (دونوں اردو) ڈراموں کو دوسرے انعامات ملے۔ پہلا انعام کسی ڈرامے کو نہیں ملا۔ یہ دونوں ڈرامے کشمیر

کے فن کاروں نے پیش کئے تھے۔ گو ان میں بہت سی جگہوں پر خامیاں نظر آتی تھیں لیکن ان کا مجموعی تاثر بڑا حوصلہ افزا تھا۔ خاص طور اداکاری کے میدان میں تو کشمیر کے فن کار بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

کشمیری کلاسیکی موسیقی اور لوک موسیقی کے دو الگ الگ کنسرٹ پیش کئے گئے۔ جن میں کشمیر کے سربرآوردہ فن کاروں نے حصہ لیا۔ دونوں کنسرٹ اپنے اپنے دل دادگان کی صفوں میں بے انتہا پسند کئے گئے۔ خاص طور صوفیانہ موسیقی کے کنسرٹ نے توخلافِ توقع کامیابی کی نئی روایت قائم کر دی۔

ایک ایکٹ کے ڈراموں کے مقابلے میں اکن گام کے بھانڈ گروپ کی طرف سے "سون وطن" (کشمیری) سکول آف فائن آرٹس کی طرف سے "شاہکار" (اردو) آزاد ڈرامائک کلب کی طرف سے "درخواست" (اردو) اور آریہ تری پاٹھشالہ کی طرف سے "اشوک" (ہندی) پیش کئے گئے۔ ان ڈراموں میں بھی اُمید کی نئی کرنیں نظر آتی تھیں اور کشمیری تھیٹر کے بارے میں خوش آئند توقعات قائم ہوتی تھیں۔

اکادمی نے سرینگر میں حسبِ روایت اس سال بھی آرٹ ایگزیبشن منعقد کی۔ جس میں ریاست کے چیدہ چیدہ فن کاروں کی تصاویر رکھی گئی تھیں۔ اس ایگزیبشن میں پہلا انعام تریلوک کول، دوسرا پی، این کاچرو اور تیسرا وِدیا رتن کھجوریہ نے حاصل کیا۔ آرٹ ایگزیبشن کی سیر سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی تھی کہ مصوّری کے فن میں ریاستی فن کار کتنی معیاری تخلیقات پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کا فن کس طرح بلوغت کی طرف چلا جا رہا ہے۔

نوعمر آرٹسٹوں کی مصوّری کے مقابلے میں بھونیش نے پہلا انعام حاصل کیا۔ لیکن اُن کی تخلیقات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ بہت جلد ان میں کئی ہونہار مصوّر ملک بھر میں اپنی دھاک منوائیں گے۔

ادبی پروگراموں کی ابتدا "شامِ غزل" سے ہوئی۔ اس میں اُردو اور کشمیری کے شعرا نے غزلیں سُنائیں اور محفل کو آہنگ غزل کے زیر و بم سے مسحور کر لیا۔

کشمیری مشاعرے کے لئے چار طرحیں مقرر کی گئی تھیں۔ غزلوں کے لئے یہ دو مصرعے ؏

(۱) سۂ یاون مُژ چھ پاٹھ رتھ جاپہ پھٹیتھے (رسول میر)

(۲) پننے خیالکی پانسی زولانہ بناوِم (مہجور)

اور نظموں کے لئے یہ دو مصرعے ؎

(۳) صُبح پھوّل بُلبلَو تُل شور و غوغا ـــــ (مقبول)

(۴) کوہ تہ بال ڈِینٹھِم نارہ سیتی دزان۔ آب مے درینٹھ آم کولیئے (شمس فقیر)

اکثر شعراء نے غزلیں اور بعض نے مقبول کے مصرعے پر طبع آزمائی کی تھی۔ چوتھے مصرعے پر کوئی چیز موصول نہ ہوئی۔ اس طرح سے کشمیری شاعری کو ۲۴ نئی منظومات ملیں جن میں سے بعض تو واقعی قدرِ اوّل کی چیزیں ہیں۔

آل انڈیا اردو مشاعرے میں ریاست کے باہر سے آنے والے بہت سے شعرائے کرام نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں حاضرین کافی تعداد میں موجود تھے اور حسبِ روایت یہ محفل بھی بڑی بھرپور اور پُرکیف ثابت ہوئی۔

اکادمی نے اس سال شہر کے مختلف حصوں اور دیہات میں مطبوعات کی نمائش کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اس طرح سے مطبوعات کی تشہیر کے ساتھ ساتھ اکادمی کے کام کے بارے میں زیادہ جانکاری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مواقع پر کشمیری کے بہترین شعرا کا کلام کشمیر کے بہترین گلوکاروں سے پیش کیا گیا۔ اور بہترین کشمیری افسانے اچھے اداکاروں کی زبانی پیش کئے گئے۔ ایسی تقریبات سرینگر کے وُومنز کالج، اننت ناگ اور شوپیان میں ہوئیں۔ شوپیان اور اننت ناگ میں ان موقعوں پر مقامی شعرا کے مشاعرے بھی منعقد کئے گئے اور یہ بات سامنے آگئی کہ ہمارے دیہات میں کتنے ذہین اور اعلیٰ شاعر موجود ہیں، جن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ شائقین نے اکادمی کی مطبوعات اور اس کے پروگرام سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

اکادمی کی طرف سے بچوں کی مصوّری کے ـــــ On the spot مقابلے اور موسیقی کے مقابلے بھی منعقد کئے گئے اور ہر دو صورتوں میں یہ بات نمایاں ہوگئی کہ ہماری نئی نسل کتنی ہونہار ہے اور اگر ان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے تو ہمارے ثقافتی کاروان کو یہ کس طرح کشاں کشاں منزلِ کامرانی کی طرف لے سکتے ہیں۔

آخر پر ۳ نومبر کو سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں ایک دعوتِ عصرانہ منعقد ہوئی جس میں انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔ اس موقعہ پر اکادمی کے پریزیڈنٹ جناب غلام محمد صادق مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے اور اُنہوں نے ہی انعامات تقسیم کئے۔ سیکرٹری اکادمی پروفیسر کول نے اکادمی کی کارکردگی کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا اور صاحبِ صدر کی توجہ اس طرف دلائی کہ اکادمی کو اب ایک الگ عمارت کی ضرورت ہے۔

صادق صاحب نے اپنی تقریر میں اکادمی کی سرگرمیوں پر اطمینان کا اظہار کیا اور فرمایا کہ مجھے اُمید ہے کہ آنے والے برسوں میں یہ زیادہ لگن کے ساتھ ہمارے عظیم تمدّنی ورثے کو فروغ دینے کے سلسلے میں کام کرتی رہے گی اُنہوں نے اس بات پر اظہارِ اطمینان کیا کہ فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ میں ریاست میں اچھے فن کاروں کی بہت بڑی تعداد اُبھر رہی ہے۔ صادق صاحب نے فرمایا کہ تمدّنی قدروں کی بالیدگی کے بغیر کسی سماج کی صحت کی ضمانت نہیں